اسلامی جنگجوئی اور اس کا سدباب

اسرار الحق

مترجم

نسرین طلعت صاحبہ

بیاد پروفیسر عبدالجبار شاکر ۱۹۴۷ء ۔ ۲۰۰۹ء

۲۰۱۰ء ۱۴۳۱ھ

نام کتاب : اسلامی جنگجوئی اور اس کا سد باب

مؤلف : اسرار الحق

مترجم : نسرین طلعت صاحبہ

اہتمام : بیت الحکمت، لاہور

مطبع : روشن پرنٹرز، لاہور

فضلی بک
فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 32212991-32629724

فہرست

❀ اظہار تشکر ۵

❀ پیش لفظ ۷

❀ اسلامی جنگجوئی..... اسباب اور سدِ باب ۸

❀ اس کی نوعیت اور مضمرات ۸

❀ اس کا اسلامی جواز اور اس کا موثر ہونا ۱۳

❀ ایک غلط فہمی کا ازالہ ۲۰

❀ اسلام پر مغرب کی یلغار ۲۳

❀ اس کا سدباب ۴۰

❀ صاحب مضمون ۵۰

امریکہ کا لمحہ حقیقت ۵۲

❀ اختتام خیال خام (شکست شعبدہ گری) ۵۲

❀ اسلام اور مغرب کا تصادم ۵۲

ریاستہائے متحدہ کی ناکام یک طرفیت

نئی امریکی صدی کے لیے منصوبہ ۵۳

❀ ریاستہائے متحدہ کی قومی دفاعی حکمت عملی ۶۱

❀ ریاستہائے متحدہ کی فوجی اور معاشی مطلق العنانی ۸۳

❀ نرم قوت بہ مقابلہ سخت قوت ۸۵

❀ امریکی حاکمیت للکار کی زد میں ۸۹

❀ اعلیٰ تکنیکی جنگ کی حدود ۱۰۰

❀ کیا اقوام متحدہ باقی بچ سکے گا؟ ۱۰۶

جنگ عراق کا نظریاتی رقبہ ۱۲۰

❀ جنگِ عراق کی ارضی حکمت عملی کی وسعتیں ۱۳۸

❀ عراق میں بعداز جنگ لوٹ مار اور غارت گری ۱۵۰

❀ عراق کا ویت نام بن جانا ۱۶۸

❀ بغاوت کا پھوٹ پڑنا ۱۹۱

❀ عراق کو انتقالِ ''خودمختاری'' کا لغو دعویٰ ۲۰۸

❀ صدام کے مقدمہ کی لغویت ۲۱۳

❀ عراق بعداز انتخابات...... چند خیالات ۲۲۰

افغانستان...... سامراجی طاقتوں کا قبرستان ۲۳۰

❀ افغانستان میں امریکی ''فتح''، کتنی فتح مند ہے ۲۳۰

❀ افغانستان ایک ناکام ریاست ۲۵۶

مجسمۂ آزادی۔ ریاستہائے متحدہ نے تجھے کیا بنادیا ... ۲۶۹

❀ مجسمہ آزادی: تصور اور حقیقت ۲۶۹

❀ گوانتانا موابوغرائب: انسانیت پر دھبہ ۲۸۸

❀ پیٹریاٹ ایکٹ ۳۰۲

❀ ڈیموکلیس کی تلوار جو عوام کی آزادی اور تخلیے پر لٹک رہی ہے ۳۰۲

امریکی سامراج۔ ذرا مختلف ۳۲۲

دہشت گردی کے خلاف جنگ کا حال کیا یہ جنگ امریکہ کے حق میں جارہی ہے؟ ۳۵۳

❀ دہشت گردی کی جنگ میں ریاستہائے متحدہ کی حالیہ پسپائیاں ۴۱۳

اظہار تشکر

دہشت گردی کے عنوان سے اسلامی دنیا پر مسلط کردہ امریکی جنگ کے تناظر میں
انگریزی زبان میں میری تالیف کردہ کتاب :

America's Moment of Truth: The End of Illusions

Islam's Encounters with the West

کے زیر عنوان لاہور کے نامور اشاعتی ادارے کتاب سرائے کے زیر اہتمام
۲۰۰۶ء میں چھپ کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اس چشم کشا کتاب کے
چھٹے باب بعنوان: Islam's Encounters with the West کا ترجمہ ''اسلام
اور مغرب کا تصادم'' کے نام سے ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔ اردو دان طبقے میں اس ترجمے کو
کافی سے زیادہ پذیرائی ملی۔ چھٹے باب کے اس ترجمے کی ذمہ داری سے میرے نہایت
قابل احترام قریبی عزیز محترم وسیم الحق عمادی سبکدوش ہوئے تھے۔ اردو زبان پر کامل
دسترس کی بنا پر جناب وسیم الحق عمادی نے اس باب کا ترجمہ نہایت سلیس' رواں' شستہ
اور پر اثر اسلوب میں کیا تھا۔

جبکہ اس کتاب کے بقیہ ابواب کا ترجمہ اب محترمہ نسرین طلعت صاحبہ کے قلم
سے ''اسلامی جنگجوئی اور اس کا سد باب'' کے زیر عنوان آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اپنی
عمر رسیدگی' پیرانہ سالی اور ضعف کی وجہ سے میں خود اس کتاب کے ترجمہ سے عہدہ برآ
نہیں ہو سکتا تھا۔ اس صورتحال میں اس کتاب کا اردو ترجمہ کر کے میری عزیزہ نسرین

طلعت صاحبہ نے نہ صرف مجھ پر بلکہ وسیع تر تناظر میں دنیا بھر کے اہل علم اور بالخصوص امت مسلمہ کے اربابِ حل وعقد پر احسان کیا ہے۔ میں ان کی اس مخلصانہ محنت وکاوش پر ان کا انتہائی طور پر شکرگزار ہوں' اور دعا گو ہوں کہ رب قدوس کی ذاتِ کریم ان کے علم وعمل کی صلاحیتوں میں برکت عطا فرمائے۔ آمین!

اسرار الحق......اسلام آباد

❀❀❀

پیش لفظ

''دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ''، جس پر مضمون نگار نے اپنی کتاب The End of Illusions (ناشر: کتاب سرائے' الحمد مارکیٹ' اردو بازار لاہور) میں تفصیل سے بحث کی ہے اور مختصراً ان صفحات میں بھی روشنی ڈالی ہے' دراصل اسلام کے خلاف جنگ ہے' پیغمبرؐ اسلام کے خلاف جنگ ہے' قرآن حکیم اور خانۂ کعبہ کے خلاف جنگ ہے۔ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے کہ دنیا کے مسلمان اپنے سارے گروہی' نسلی اور سیاسی اختلافات بھلا کر ایک ذات کی حیثیت سے متحد ہو جائیں تاکہ وہ اپنی تمام تر قوت کے ساتھ اسلام کے خلاف اس جنگ کا مقابلہ کر سکیں۔

جو قارئین مضمون نگار کے خیالات سے متفق نہیں' انھیں مخلصانہ دعوت ہے کہ وہ بے لاگ تنقید اور تبصرے کریں۔ اگر مضمون نگار مطمئن ہو گیا تو اپنی رائے تبدیل کرنے میں خود کو خوش دلی سے آمادہ پائے گا۔

مسلمان اٹھ کھڑے ہوں اور اپنے آپ کو منوائیں۔

اسرار الحق

مکان نمبر ۲۶' اسٹریٹ نمبر ۴۳

سیکٹر: G-7/4 اسلام آباد۔ پاکستان

ٹیلی فون: 2891827 (051)

ای میل: Israrulhaq27@yahoo.com

اسلامی جنگجوئی......اسباب اور سدِّ باب

اس کی نوعیت اور مضمرات

چاہے اس کی کتنی ہی مذمت کی جائے' اس سے کتنی یہ نفرت کی جائے گہرائی میں جائیں تو اسلامی جنگجوئی اس کا تقاضا کرتی ہے کہ اسے قائل کرنے سے پہلے' اس پر پوری سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

کسی انتخابی جلسے میں ہی نہیں بلکہ ایک منتخب مجلس میں اظہار خیال کرتے ہوئے ریپبلکن صدارتی امیدوار ٹینکریڈو (Tancredo) کی یہ دھمکی کہ اگر امریکہ پر ایٹمی حملہ ہوا تو مکہ اور مدینہ پر بمباری کر دی جائے گی' مفسدانہ مضمرات کی حامل ہے۔ ممکن ہے یہ محض اسلامی جنگجوئی کے مسئلے کو بھڑکانے کے لیے ہو۔ ٹینکریڈو اس سوچ تک کس طرح پہنچے کہ امریکہ کو اسلامی جنگجوؤں کی طرف سے ایٹمی حملے کا خطرہ ہے؟ نیشنل انٹیلی جینس اسٹیٹ (National Intelligence Estate) کے تازہ ترین انکشاف میں بھی ایسا کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے کہ القاعدہ امریکہ پر حملہ کرنے کی بڑھتی ہوئی صلاحیت حاصل کرنے کے باوجود کوئی ایٹمی استعداد بھی حاصل کر سکا ہے۔ ٹینکریڈو کی اس دھمکی کو اس وسیع تناظر میں دیکھنا ہوگا جو امریکی قیادت میں مغرب اور اسلام کی بنیادی تعلیمات اور تقدیس کو تسلسل کے ساتھ نشانہ بنائے ہوئے ہے۔

اسلامی جنگجوئی جس کا اظہار اکثر خودکش بمباری سے ہوتا ہے ایک انتہائی الجھا ہوا کثیر الجہت مسئلہ ہے جس کا تجزیہ کرنے کے لیے اور اسے سمجھنے کے لیے گہرائی میں جا کر اس کے عوامل و عواقب پر غور کرنا ہوگا۔ اب تک ساری توجہ اس کے فوجی پہلو پر رہی ہے۔ اس کے سیاسی اور نظریاتی پہلوؤں کو عمداً مستور رکھا گیا ہے۔ اس سے نمٹنے کے

لیے خالص فوجی نقطۂ نظر اپنایا گیا ہے جو اسے مکمل طور پر ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

زیرِ نظر مضمون میں اسلامی جنگجوئی کو مسئلے کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ہم مسائل کے تمام پہلوؤں کو گرفت میں لا کر ان کے حل کا ایک باعزت راستہ تلاش کر سکیں۔

جنگجوؤں کو تحریک اور استقامت اس ارفع و اعلیٰ تصور سے ملتی ہے کہ اس طرح انسان شہادت کے بلند مرتبے پر فائز ہوتا ہے جو ایک بلند ترین منشائے الٰہی ہے۔

البتہ یہاں ایک انتباہ ضروری ہے کہ معمول کے حالات میں خودکش بمباری جیسا فعل اسلام میں سخت ممنوع ہے اور یہ اللہ کی راہ میں جہاد کا کوئی حصہ نہیں۔

سائنسی حقائق انسان کی دنیاوی زندگی سے آگے کا ادراک نہیں کر سکتے اور ان حتمی اور گہری حقیقتوں تک نہیں پہنچ سکتے جنھوں نے انسان کی اخروی زندگی کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ مشاہداتی اور سائنسی علوم انسان کی مادی سہولت و آسائش کے علاوہ اور کچھ نہیں بتاتے۔ جدید فلسفے انسان کی سوچ اور عمل کو ان خارجی عوامل کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں جو نیوٹن کے طبیعیاتی قوانین کی روشنی میں حاصل ہوتے ہیں' یا ڈارون کے فطری ماحول کے قانون سے ملتے ہیں' یا مارکس کے ان قوانین سے روکے جاتے ہیں جو ذرائع پیداوار کی بنا پر تاریخ انسانی کو بیان کرتے ہیں' یا فرائڈ کے ان غیر شعوری تصورات پر مبنی ہوتے ہیں جو انسانی فکر و عمل کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی جدید فلسفہ انسان کی دنیاوی زندگی سے آگے کی بات نہیں کرتا۔ ان فلسفوں میں انسان کے جذبہ شہادت کی وجوہ اس کی مایوسی' محرومی' حقوق کے حصول میں رکاوٹ اور اس کے فریب نظر کو بتایا گیا ہے۔

عالمی ادارۂ صحت کے مطابق ہر تیس سیکنڈ پر خودکشی کا ایک واقعہ رونما ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً تین ہزار انسان ہر روز خودکشی کی کوشش کرتے ہیں۔ خودکشی کے ان پریشان کن واقعات کا سبب عالمی ادارے نے سماجی' معاشرتی اور ماحولیاتی خطرات کو

قرار دیا ہے جنھوں نے انسان کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ ایک اور ذریعے نے بتایا ہے کہ امریکہ میں جو لوگ تکلیف دہ مہلک امراض میں مبتلا ہوتے ہیں وہ اپنے معالجوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ان کے لیے کوئی ایسی دوا تجویز کر دیں جس سے ان کی موت جلد واقع ہو جائے۔ دماغی اور جسمانی امراض' اخلاقی انحطاط' ذہنی پستی' ایک یا دوسری شکل میں خودکشی کو فروغ دینے کے اسباب ہیں۔ یہ بات انتہائی اہم ہے کہ کسی اعلیٰ تصور اور بلند مقصد کے حصول کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے میں خودکشی والے ان عوامل کی کوئی گنجائش نہیں جو اوپر بیان کیے گئے ہیں۔

ایک خوش باش' مطمئن' روشن خیال اور اس دنیا میں کامیاب شخص شہادت کی تمنا کیوں کرتا ہے' یہ جدید فلسفوں سے بالکل علیحدہ ایک شے ہے اور جدید انسانی سوچ کے لیے بھی اجنبی ہے' الوہی سچائیوں کو سمجھے بغیر آخرت کی غیر فانی زندگی کی حقیقت اور شہادت کے مرتبے کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

قرآن کے مطابق سچا مسلمان وہ ہے جو اللہ' اس کے رسولؐ (سے سچی محبت رکھتا ہو) اور اللہ کی راہ میں جہاد کو ہر دوسری چیز سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ چاہے وہ چیز اس کے لیے کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہو۔ (توبہ:۲۴) اس کی عبادتیں' قربانیاں اور زندگی سب کچھ اللہ کے لیے ہیں۔ (الانعام:۱۶۲) اللہ نے اس کے جان و مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے۔ (توبہ:۱۱۱)

لہٰذا ایک مسلمان کا اعلیٰ ترین مقصد حیات اپنی قوت و صلاحیت کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ اللہ نے مسلمانوں کو لوگوں کے درمیان بہترین امت قرار دیا ہے۔ (آل عمران:۱۱۰)

ایک مسلمان کی زندگی محض زندہ رہنے کے لیے نہیں ہے بلکہ اللہ کی مرضی اور منصوبے کو روئے زمین پر قائم کرنے کے لیے ہے۔ جنگ کے لیے کوئی دوسرا موثر ہتھیار نہ ہونے کے سبب' خاص طور پر جب مقابلہ کہیں بڑی فوجی' سیاسی اور معاشی قوتوں سے ہو۔ جیسا کہ فلسطین' چیچنیا' کشمیر' افغانستان اور عراق میں ہو رہا ہے تو اس

صورت میں اپنے اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے' خودکش حملہ ہی مسلمانوں کے بس میں ہے' ویسے اس طریقے کو اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے۔ اگر امریکہ کی قیادت میں اتحادی افواج کی افغانستان اور عراق میں اس بے جگری سے مزاحمت نہ کی جاتی تو دوسرے مسلمان ممالک جیسے ایران' شام اور ممکن ہے کہ سعودی عرب اور پاکستان بھی جارحیت کا شکار ہو جاتے اور ان پر بھی قبضہ کر لیا جاتا۔

قرآن پاک کا فرمان ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مصائب کا شکار ہوتے ہیں' اپنے گھروں سے نکالے جاتے ہیں' جنگ کرتے ہیں' فوت ہوتے ہیں یا قتل کیے جاتے ہیں' وہ سیدھے جنت میں جاتے ہیں۔

''.....جنھوں نے اپنا گھر بار چھوڑا' اپنے گھروں سے نکالے گئے' جنھوں نے میری راہ میں مصائب برداشت کیے' جنگ کی یا قتل کیے گئے' جان لو کہ میں ان کے تمام گناہ دھو ڈالوں گا اور اپنی اس جنت میں داخل کروں گا' جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔'' (النساء:۱۹۵)

کم و بیش اسی طرح کے وعدے سورۂ آل عمران (آیت:۹۰) اور سورۂ توبہ (آیات:۲۰ اور ۱۱۱) میں کیے گئے ہیں۔ یہاں اللہ کی راہ میں لڑنے کو اللہ پر ایمان لانے کی شرط کے طور پر بیان کیا ہے' جبکہ اس یقین کی نفی ایسی ہے جیسے کسی برائی کے حق میں جنگ کی جائے۔

کمزور اور مظلوم مرد و عورت کے حق میں جنگ کرنا' اللہ کی راہ میں لڑنے کے برابر ہے (آل عمران:۷۵) اسی طرح فتنہ و فساد کے خلاف اس وقت تک لڑتے رہنا جب تک اللہ کی ذات کا یقین اور عدل قائم نہ ہو جائے' اللہ کے راستے میں جنگ کرنا ہے (البقرہ:۱۹۳) حدود سے تجاوز کرنے کو سختی سے منع کیا گیا ہے۔ (البقرہ:۱۹۰) حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ جس دن اہل ایمان جہاد سے منہ موڑ لیں گے' وہ دن ان کی ذلت و نکبت کا دن ہوگا۔ آپؐ نے اس دن سے بھی خبردار کیا ہے جب اہل ایمان موت سے ڈرنے لگیں۔

قرآنی احکامات کے بالکل برعکس بائبل کے باب ۲۰ کی آیات ۱۱۶ اور ۱۱۷ میں جنگ کے عمل کو اجاگر کرتے ہوئے اپنے دشمنوں کا مکمل طور پر صفایا کرنے کو مقدس کام کہا گیا ہے:

''لیکن ان شہروں میں جن کا تمھارے آقا اور تمھارے خدا نے تمھیں وارث بنایا ہے، تمھیں کسی جاندار کو زندہ نہیں چھوڑنا ہے۔'' مزید کہا گیا ہے کہ ''اور تم انھیں مکمل طور پر تباہ کرو گے یعنی حتی ایموینی اقوام کو (Hitlites Ammonites)......'' بائبل کے مندرجہ بالا احکامات نہ صرف یہ کہ دشمنوں کا مکمل طور پر صفایا کرنے کو کہتے ہیں، بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ رواداری سے رہنے کی بھی گنجائش نہیں رکھتے۔ شاید بائبل کے انھی احکامات کی روشنی میں سابق پوپ نے دنیا کے عیسائیوں کو اس امر پر ابھارا تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف خون ریز جنگ کریں۔ نہ صرف یروشلم کو واگزار کرانے کے لیے بلکہ ''اسلام کی برائی'' کو تباہ کرنے کے لیے۔ بائبل کے ان احکامات کے بالکل برعکس جہاد کے قرآنی احکام کو سختی سے ان مقاصد اور حدود کے اندر رکھنے کی تاکید کی گئی ہے جو اللہ نے مقرر کیے ہیں۔ ''تم ان سے اللہ کی راہ میں جنگ کرو جو تم سے لڑتے ہیں مگر حد سے آگے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (البقرہ:۱۹۰)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ کا اسلامی نقطۂ نظر کس قدر انسان دوست ہے۔ انسانی تاریخ میں جنگ کبھی بھی غیر قانونی یا ممنوع قرار نہیں دی گئی ہے۔ سینٹ آگسٹائن (Saint Augustine) اور سینٹ اکیوناکس (Saint Aquinas) نے منصفانہ جنگ کا نظریہ پیش کیا ہے جسے سابق صدر بش نے پہلی خلیجی جنگ میں اپنایا۔ واٹر لیپ مین (Water Lippman) نے ایسی جنگ کو جائز قرار دیا ہے جو کسی قوم کی قیمتی اقدار و مقاصد پر حملے کے خلاف لڑی جائے۔

انسانی ارواح ہمیشہ سے اس دن کی منتظر رہی ہیں جب وہ موت پر فتح پا لیں۔ انگریز شاعر جان ڈون (Jon Donne) نے کہا ہے: ''موت، اب تو باقی نہیں رہے

گی۔'' مسلمان خودکش بمباروں نے قبضے اور ظلم کے خلاف لڑتے ہوئے موت کو فتح کر لیا ہے۔ لہٰذا انھیں شکست نہیں دی جا سکتی۔

اس کا اسلامی جواز اور اس کا موثر ہونا

بعض دینی اور سیکولر دونوں حلقوں میں خودکش بمباری کے جواز کے بارے میں تحفظات ہیں۔ قرآن میں بعض احکامات ایسے ہیں جن کی تعبیر سے بعض جبری حالات میں خودکش بمباری کا جواز تلاش کیا جا سکتا ہے۔

مجبوریوں کے بعض حالات میں جیسا کہ اسلام کے خلاف نہ رکنے والی نظریاتی اور فوجی یلغار کے آگے مسلمان جانباز سینہ سپر ہیں' خوش کش بمباری کا جواز اس آیت الٰہی میں تلاش کیا جا سکتا ہے کہ سور کا گوشت کھانا اگرچہ حرام قرار دیا گیا ہے لیکن اپنی جان بچانے کے لیے اس کا استعمال ناگزیر ہو تو اس کی اجازت ہے (البقرہ:۱۷۳) اگر یہ محض ایک فرد کی جان بچانے کے لیے جائز ہے تو پھر کتنا زیادہ جواز اس کے لیے اس وقت بن جاتا ہے جب لاکھوں مسلمان افغانستان' چیچنیا' فلسطین اور عراق میں دشمنان اسلام کے ہاتھوں بے دردی سے ذبح کیے جا رہے ہوں؟ اللہ نے میدان جنگ سے منہ پھیرنے کو اس حد تک منع کیا ہے کہ ایسا کرنے والا اللہ کے غضب کو دعوت دیتا ہے اور اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لیتا ہے۔ لیکن اس قدر شدید مذمت کے باوجود' یہ عمل اس وقت جائز قرار دیا گیا ہے جب اسے ایک فوجی چال کے طور پر اختیار کیا گیا ہو (الانفال: ۱۵'۱۶) کس قدر زیادہ اس کا جواز پیدا ہو جاتا ہے اگر فوجی' معاشی اور سیاسی لحاظ سے بہت ہی طاقتور دشمن کے خلاف جس نے اسلام کی شناخت' سالمیت اور تقدس کے خلاف ہی جنگ چھیڑ رکھی ہو' خودکش بمباری کے سوا اور کوئی موثر ہتھیار باقی نہ بچا ہو۔

یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ عراق میں اور بعد میں افغانستان میں مسلمان جانبازوں نے خودکش بمباری کے ذریعے دنیا کی مضبوط ترین فوجی قوت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اسی طرح فلسطین اور چیچنیا میں انھوں نے خودکش بمباری کر کے مزاحمت کے شعلوں کو بھڑکائے رکھا ہے' اس کے باوجود کہ ان کا سامنا ایٹمی طاقتوں سے

ہے۔

اللہ نے حکم دیا ہے کہ وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ اپنے اور اللہ کے دشمنوں کے ساتھ لڑیں اور ان کے دلوں میں خوف بٹھا دیں۔ (الانفال: ۶۰) اسلام کے خلاف جاری جنگ سے مخلص مسلمانوں کا ایک گروہ برسرپیکار ہے جسے کسی ریاستی طاقت کی مدد حاصل نہیں۔ اعلیٰ اسلحے اور دوسرے سامان ان کے خلاف بے رحمی سے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ ایسی مجبوری اور بے کسی کی حالت میں یہی ایک ہتھیار ہے جس کے ذریعے وہ دشمن کا موثر مقابلہ کر سکتے ہیں اور ان کے دلوں میں خوف بٹھا سکتے ہیں۔

دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ حقیقتاً اسلام کے خلاف جنگ ہے' دہشت گردی کے خلاف جنگ کے پس پردہ اصل مقصد اسلام کی اس اساس کو تباہ کرنا ہے جو قرآن وسنت میں محفوظ ہے۔ اس کا تازہ ترین ثبوت کسی اور نے نہیں خود صدر بش نے مہیا کیا ہے۔ ستمبر کے شروع یا اگست ۲۰۰۷ء کے آخر میں ملائیشیا کی ایک خبر رساں ایجنسی (یا ٹی وی) کو دیے گئے انٹرویو میں انھوں نے ''خلافت کے دوبارہ قیام یا شریعت کی توسیع'' کے کسی بھی اقدام کے خلاف اپنے شدید غم و غصے کا اظہار کیا ہے اور عہد کیا ہے کہ وہ اس کی زبردست مخالفت کریں گے اور اگر ممکن ہوا تو اپنے دوست مسلم ممالک کو بھی اس مخالفت میں شامل کریں گے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ اللہ نے قرآن میں وعدہ کیا ہے کہ اگر مسلمان اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلے تو اللہ انھیں زمین پر خلافت عطا کرے گا۔ اسی طرح قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ اللہ نے شریعت تمام لوگوں کے لیے نافذ کی ہے اور ایک مسلمان کے لیے شریعت ہی اس کا ضابطۂ حیات ہے۔ صدر بش خلافت کے قیام اور شریعت کی تبلیغ کے خلاف لڑنے کا عہد کر کے مسلمانوں کو اپنے ایمان اور اپنی روایات کے مطابق زندگی گزارنے کے حق سے محروم کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔

بعض حلقوں میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ افغانستان' عراق' فلسطین اور چیچنیا میں مسلم جانبازوں کی خودکش بمباری کا موازنہ سری لنکا میں تامل باغیوں کی بمباری اور

جاپانیوں کی ہارا کیری (Hara Kiri) سے کیا جائے۔ اسلامی جانبازوں کی بمباری کا تامل اور جاپانیوں کی بمباری سے موازنہ کا کوئی جواز ہے ہی نہیں۔ تامل جو سری لنکا میں اقلیت میں ہیں ملک کی معاشیات پر چھائے ہوئے ہیں اور جنوبی ہندوستان کے تامل باشندوں کی سرپرستی میں ملک کی اکثریت سنگالی باشندوں اور ملکی حکومت کا استحصال کر رہے ہیں۔ جب اکثریتی طبقے یعنی سنگالیوں نے اپنے جمہوری حقوق پر زور دیا اور تامل باشندوں کو ان کے حق سے زیادہ ملی ہوئی مراعات کم کیں تو تامل باشندے اس جمہوری دباؤ سے سمجھوتہ کرنے کی بجائے ہندوستان کی شہہ پر اپنے آبائی وطن سری لنکا کی سالمیت اور خودمختاری کے ہی خلاف کمربستہ ہو گئے۔ اس لیے تامل اس اعلیٰ اخلاقی اور سیاسی محاذ پر ان مسلم جانبازوں کے برابر نہیں کھڑے ہو سکتے جو فلسطین، چیچنیا، کشمیر، افغانستان اور عراق کی بیرونی جارحیت کے ساتھ نبرد آزما ہیں۔

جہاں تک جاپانی ہارا کیری کا تعلق ہے تو یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہ جاپانی شاہی فوج تھی جو شہریوں کو بادشاہ کے نام پر ہارا کیری کے لیے اکساتی تھی۔

ڈان (Dawn) کی ۲۳/ اگست کی رپورٹ کے مطابق بینظیر بھٹو نے صدر مشرف کے ساتھ شرکت اقتدار کا معاملہ طے کیا ہے "تا کہ دہشت گردوں کے خلاف جنگ کو قوت بخشی جائے۔" اگر افغانستان اور عراق کی منتخب (؟) حکومتوں کے تعاون کے باوجود امریکی قیادت میں ان ممالک پر قابض طاقتوں کی بغاوت کو کم نہ کر سکیں تو یقیناً بینظیر بھی صدر مشرف کے ساتھ شریک اقتدار ہو کر جاری شورش میں کوئی فرق نہیں پیدا کر سکیں گی، البتہ اگر وہ کچھ کر سکیں گی تو یہی کہ سرکش بیل کو سرخ کپڑا دکھانے کا کام کریں گی۔ حضور اکرم ﷺ کا قول ہے کہ وہ گروہ جس کی قیادت ایک عورت کر رہی ہو، لازمی طور پر تباہی سے ہم کنار ہو گا۔ مزید یہ کہ چونکہ بینظیر نے لال مسجد آپریشن کی حمایت کی ہے، ان کی اقتداری شرکت سے سرحد میں شورش اور تیز ہو گی اور اس میں وہ مذہبی عناصر بھی شامل ہو جائیں گے جو غیر جانبدار یا لاتعلق تھے۔

خالص فوجی اور معاشی اقدامات سے جنگجوئی کو کمزور نہیں کیا جا سکتا، نہ اسے دبایا

جا سکتا ہے' نہ ختم کیا جا سکتا ہے۔

صدر بش سخت غلطی پر ہیں' اگر وہ یہ سوچتے ہیں کہ امریکہ فوجی اقدامات اور معاشی تعاون کے ذریعے پاکستان میں اسلامی جنگجوئی پر قابو پا سکتا ہے۔ انھیں اس کا ادراک نہیں کہ جتنی زیادہ فوجی طاقت استعمال کی جائے گی' اتنی زیادہ اسلامی جنگجوؤں کی طرف سے مزاحمت بڑھے گی۔ شہادت کی آرزو ایک ایسا جذبہ ہے جو دشمنوں پر کئی گنا طاقت سے اثر انداز ہوتا ہے۔

اسلامی جنگجوؤں نے افغانستان اور عراق میں دنیا کی طاقتور ترین افواج کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور نہ صرف اپنے عزم اور حوصلے کی بدولت ان پر برتری حاصل کر لی ہے بلکہ جنگی مہارت' چال اور حکمت عملی میں بھی ان پر سبقت لے گئے ہیں۔ افغان جنگ کے بہت ہی ابتدائی مرحلے میں چیئرمین جوائنٹ چیف آف اسٹاف جنرل مائرز (General Mayers) کو اعتراف کرنا پڑا کہ ''افغانستان میں دہشت گردی کے خلاف جنگ اپنی قوت کھو رہی ہے۔ القاعدہ ہمارے مقابلے میں' اپنی تدبیروں میں کہیں زیادہ کامیاب رہی ہے۔ الیکٹرونک مواصلاتی ذریعے سے اس نے اپنی جنگی چال سے اپنے وجود کو ثابت کر دیا ہے اور ترسیل زر کے ذرائع میں کسی رکاوٹ کو حائل نہیں ہونے دیا ہے۔'' جان۔ ایف۔ برنز (John F. Burns) نے نیویارک ٹائمز کی ۳۰ ستمبر ۲۰۰۲ء کی اشاعت میں کہا ''سیٹلائٹ ٹیکنالوجی' ہیلی کوپٹرز اور جدید اسلحوں سے لیس ایک طاقتور فوج سے مقابلہ کر کے اسامہ نے خود کو مسلم دنیا کے بچھڑے ہوئے نوجوانوں کے لیے ایک مقدس شخصیت بنا دیا ہے۔ مردہ یا زندہ اسامہ افغانستان میں امریکہ کی فتح پر ایک مہیب سایہ بنا رہے گا۔ اور اس لیے امریکہ کی حمایت کردہ حکومت ختم ہو سکتی ہے اور طالبان دوبارہ برسر اقتدار آ سکتے ہیں۔'' حال ہی میں باغیوں نے IEDS استعمال کرنا شروع کر دیا ہے جس سے وہ ایک گاڑی کے ٹائر کو اڑا دیتے ہیں اور جب مسافر گھبرائے ہوئے دوسری گاڑی میں سوار ہوتے ہیں تو وہ دوسرے IED سے اسے بھی تباہ کر دیتے ہیں۔ یوں دو گاڑیاں شکار ہو جاتی ہیں۔

ایون تھامس (Even Thomas) اور جان بیری (John Berry) نے ''نیوز ویک'' کی ۲۰ اگست ۲۰۰۷ء کی اشاعت میں انکشاف کیا ہے کہ ''جیسے جیسے امریکی اپنے فوجیوں کو بچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ اسلحہ استعمال کر رہے ہیں' عراقی ہوشیار سے ہوشیار تر ہوتے جا رہے ہیں۔ تھامس اور بیری افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں ''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم پسپا ہوتے جا رہے ہیں اور وہ بہتر سے بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔'' آخر میں وہ کہتے ہیں کہ آپ ایسی قوت کو کس طرح شکست دے سکتے ہیں جو لاکھوں ڈالرز کی مشینوں کو ایسے اسلحے سے تباہ کر سکتے ہیں جو انٹرنیٹ کے ذریعے بنائے جا سکتے ہوں اور جن کی قیمت ایک پیزا (Pizza) کی قیمت کے برابر ہو' اور خاص بات یہ کہ وہ مرنے سے نہیں گھبراتے۔'' ایک پیزا کی قیمت پر بنائے ہوئے ہتھیار کس قدر مہلک ہیں اس کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ ۲۰۰۴ء میں تقریباً ہر تین فوجی جوانوں میں ایک کی موت IED سے ہوئی' اب یہ تعداد پانچ میں جا رہی ہے۔ ہر ماہ تقریباً پچاس فوجی اس ہتھیار سے ہلاک ہو رہے ہیں۔ تازہ ترین رپورٹ بتاتی ہے کہ خودکش بمباری زیادہ سے زیادہ مہلک اور تباہ کن بنتی جا رہی ہے۔ ۱۵ اگست کو تقریباً ۲۵۰ کرد (Kurds) جو امریکی قابض فوجوں کے حمایتی تھے' مارے گئے اور یہ اس وقت سے صرف دو ہفتہ قبل ہوا جب امریکہ' جنرل ڈیوڈ پیٹرائس (David Patraeus) اور امریکی سفیر ریان کروکر (Rayeon Crocker) کی مشترکہ رپورٹ پر غور کرتے ہوئے عراق سے امریکی افواج واپس بلانے کا فیصلہ کر سکتا تھا۔

مغربی پریس میں اور دوسری جگہوں پر بہت شور و غوغا ہے کہ اسلامی خودکش بمبار معصوم لوگوں کو بہیمانہ طور پر قتل کرنے میں مصروف ہیں' مزید شور یہ مچایا جا رہا ہے کہ تاریخ میں اس کے قبل کے مظلوم و محکوم لوگوں نے قابض اور ظالم طاقتوں کے خلاف اپنی مسلح جدوجہد میں کبھی بھی معصوم لوگوں کو اس بربریت سے قتل نہیں کیا ہے۔

یہ الزامات کتنی ہی شدت سے لگائے جائیں یہ تاریخ کو کھلم کھلا جھٹلانا ہے۔ فریڈرچ اینجل (Friedrich Engel) نے ان بیانات کو قطعی طور پر رد کر دیا ہے اور

یورپ والوں کو یاد دلایا ہے کہ دوسری جنگ افیون (Opuim war) کے دوران چین نے' جس کا برطانوی فوج سے کوئی موازنہ نہ تھا' دشمن پر اس سے بھی کاری ضرب لگائی تھی۔ دوبدو جنگ لڑنے کی بجائے' انھوں نے چالبازی سے کام لیا۔ انھوں نے ہانگ کانگ کی پوری آبادی والے علاقے میں روٹی میں زہر ملا دیا۔ ہانگ کانگ کے جن یورپی باشندوں کو اس طرح ہلاک کیا گیا ان میں شاید ہی کوئی فرد جنگ افیون میں شریک رہا ہو۔ وہ اپنی آستینوں میں اسلحہ چھپائے تجارتی کشتیوں پر سوار ہو جاتے اور دوران سفر کشتی کے عملے اور یورپی مسافروں کو قتل کر کے کشتی پر قبضہ کر لیتے۔ غیر ملکیوں میں سے جو بھی ان کے ہاتھ لگا اسے قتل کر دیا یا اغوا کر لیا۔ اس طرح بربریت سے قتل کیے جانے والوں میں معدودے چند ہی لوگ ہوں گے جنھوں نے جنگ افیون میں حصہ لیا ہو۔ لیکن لڑائی کے اس حربے سے انھوں نے برطانوی فوج کی جنگ لڑنے کی صلاحیت اور اپنا قبضہ جاری رکھنے کی خواہش کو مفلوج کر دیا۔

اپنے ملک کی سرحدوں سے باہر بھی چینیوں نے مغربی لوگوں کے خلاف حملہ کیا۔ اینجل (Engel) لکھتا ہے کہ غیر ممالک میں جانے والے کسی بھی جہاز پر وہ بغاوت کر دیتے اور جہاز پر قبضہ کرنے کے لیے لڑائی شروع کر دیتے اور ہتھیار ڈالنے کی بجائے جہاز کے نچلے حصے میں اتر کر خود کو شعلوں کی نذر کر دیتے۔

آج کے امریکہ کی طرح اس وقت کے یورپین بھی نہ ختم ہونے والی جنگ اس وقت تک لڑتے رہنے پر کمر بستہ تھے جب تک چین مکمل طور پر زیر نگین نہ ہو جاتا۔ بالکل یہی کام آج صدر بش' ڈک چینی جیسے اپنے ٹولے کے ہمراہ کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے یورپین کے خلاف ایسا طریقہ جنگ کیوں اپنایا؟ اینجل (Engel) اس کا جواب یوں دیتا ہے کہ اس کا سبب یہ تھا کہ چینیوں کا یورپی فوجی طاقت کے ساتھ کوئی موازنہ ہی نہیں تھا۔ کمزور پارٹی تھی اور اینجل کے مطابق' لڑائی میں اس طرح کی چالبازی سے دشمن کی کمزوری پر ضرب پڑتی ہے اس کی طاقت پر نہیں۔" یورپین کس طرح دشمن چین پر فتح پا سکتے تھے۔ اس نے مغربی ٹیکنالوجی کو بے اثر کر دیا اور دشمن کا

ہدف بننے سے انکار کر دیا۔ اور یوں اس نے بہادری اور ہوشیاری سے انسانی قوت کو استعمال کیا جو جان کا نذرانہ دینے کے لیے ہمیشہ تیار تھی۔ مغرب کو افغانستان اور عراق میں بالکل اسی نوع کی صورت حال کا سامنا ہے۔ وہ دلدل میں پھنس چکا ہے اور اس پریشان کن حالت سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں پا رہا۔

سرکشی کے خلاف انتہا درجے کی مذمت اور شور پر کہ خودکش بمباری میں بہت زیادہ شہری ہلاک ہو رہے ہیں' کہا جا سکتا ہے کہ جو شہری ہلاک ہو رہے ہیں وہ یا تو مخالفت سمتوں کی گولہ باری سے مر رہے ہیں یا اس لیے کہ وہ قابض افواج یا ان کی مسلط کردہ حکومت کی بالواسطہ یا بلاواسطہ حمایت کر رہے ہیں۔

برطانوی خفیہ ایجنسی کے ایک سابق افسر اور ایک سال قبل تک جیویر سولانا (Javier Solana) کے مشیر السٹائر کروک (Alistair Crooke) نے ایک پیغمبرانہ بات کہی ہے: ''میں نے بغاوت کو بمباری سے شکست کھاتے کبھی نہیں دیکھا۔'' اس نے اسرائیل کے Jenin Paradox کی مثال دی ہے کہ اس نے مغربی کنارے پر اپنے حملے کو اس طرح جائز قرار دیا ہے کہ اگر وہاں دس دہشت گرد ہوتے تھے تو فضائی حملے میں چھ ہلاک ہو جاتے تھے اور چار بچتے تھے' لیکن جلدی دہشت گردوں کی تعداد بڑھ کر چوبیس ہو جاتی تھی۔ کروک کہتا ہے کہ ایک برتر فوجی قوت ضرب کا عمل کرتی ہے' تفریق کا نہیں۔

Jenin Paradox کا مظاہرہ القاعدہ اور طالبان کے زیادہ قوت کے ساتھ ابھرنے میں کیا جا سکتا ہے۔ افغانستان پر قبضے کے فوراً بعد صدر بش نے اعلان کیا تھا کہ گو اسامہ پکڑا نہیں جا سکا ہے لیکن اس کے پورے نیٹ ورک کو اور حملہ کرنے کی اس کی صلاحیت کو مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ چار پانچ سال بعد اپنے خلاف بڑھتی ہوئی فوجی قوت کے باوجود وہ دوبارہ واپس آ گئے ہیں...... امریکہ پر براہ راست حملہ کرنے کی بہت بڑی صلاحیت کے ساتھ۔

قرآن پاک کے مطابق ایک سچا مسلمان وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ

کو اپنی انتہائی قیمتی شے پر بھی مقدم رکھتا ہے۔ وہ اللہ کے لیے زندہ رہتا ہے' اللہ کے لیے مرتا ہے۔ شہادت ایک سچے مسلمان کی ہمیشہ آرزو رہی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

نیویارک ٹائمز کی ۵ مئی ۲۰۰۳ کی اشاعت میں اسکاٹ ایٹرام (Scot Atram) نے اپنے ایک تحقیقی مضمون میں اس تصور کا پردہ چاک کیا ہے کہ شہدا غریب' اداس اور محروم طبقے سے بھرتی کیے جاتے ہیں۔

آخر اپریل ۲۰۰۳ء میں تل ابیب کے ایک کیفے پر ایک خودکش حملہ آور اور اس کے ساتھی برطانیہ کے ایک نسبتاً خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور پلے بڑھے تھے۔ انھوں نے کالج میں تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ پرنسٹن کے اکنامسٹ کنگر (Kingar) اور دوسروں نے ۲۰۰۲ء میں ایک مطالعاتی رپورٹ شائع کی جس میں بتایا گیا ہے کہ اس کا امکان کم ہے کہ حزبُ اللہ کے اراکین غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہوں بلکہ اس کا امکان زیادہ ہے کہ وہ ثانوی درجے تک تعلیم یافتہ ہوں۔ ایک پاکستان ریلیف کے عہدے دار ماثرا حسین (Masra Hussain) نے خودکش بمباری کے تقریباً ۲۵۰ امیدواروں کا انٹرویو لیا جس سے یہ معلوم ہوا کہ ان میں کوئی بھی غیر تعلیم یافتہ' غریب و پسماندہ' سادہ ذہن یا دل شکستہ نظر نہیں آیا۔ آرمی ڈیفنس انٹیلی جنس (Army Defence Intelligence) گوانتاموجیل میں مقید سعودی بمباروں سے تفتیش کے دوران اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ مشہور دانشوران ہیں جن کو دہشت گرد کا نام دے دیا گیا ہے خاص طور پر وہ افراد جو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے ان سبھوں کی تعلیم ملازمت کے حصول کے لیے معمول کی تعلیمی صلاحیت سے بلند تھی۔ ان کی ایک معقول تعداد کے پاس ڈگریاں تھیں اور ان کا تعلق خوشحال گھرانوں سے تھا۔ ان کا جذبہ اور ان کے عہد و اقرار ان کی اس خواہش سے بالکل عیاں تھے کہ وہ فطری آرام و آسائش کو ترک کر کے اپنے خرچ پر طویل مسافت کا سفر طے کرنے پر آمادہ تھے۔ ان کو نہ تو دشمن کا خوف تھا اور نہ وہ خود کو بے یارومددگار سمجھتے تھے۔ کچھ کھونے کے خوف سے وہ بالکل بے

پروا تھے۔ ایس رضا نے ڈان (Dawn) کی ۲۱/جولائی ۲۰۰۷ء کی اشاعت میں خودکش بمباری کے امیدوار بعض نوجوانوں سے انٹرویو کے ذریعے ان کی حسب ذیل امتیازی خصوصیات بتائی ہیں:

1. سوال کرنے پر انھوں نے صرف یہ جواب دیا کہ وہ اسلام کے لیے کام کر رہے ہیں۔
2. یہ ان لوگوں کو نشانہ بنا رہے ہیں جو اسلام کے مقصد کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔
3. پنی گرفتاری یا حراست کے دوران ان کا جذبہ سرد نہیں ہوتا۔
4. ان کی عمر ۱۸ سے ۲۴ سال کے درمیان تھی۔
5. وہ احساس کمتری کا شکار تھے اور ان کو زندگی میں کوئی کشش نظر نہیں آئی تھی۔
6. وہ اپنی گرفتاری یا سزا پر پچھتاتے نہیں تھے۔

اس کے سوا یہ کہ خودکش بمباروں کا تعلق غریب گھرانوں سے تھا اور پنی زندگی میں آگے کی طرف دیکھنے کے لیے کوئی کرن ان میں نظر نہیں آتی تھی باقی تمام دوسری معلومات اوپر دی ہوئی خصوصیات کے مطابق پائی گئیں جو ان کے مقاصد اور عزائم کو واضح کرتی ہیں۔ البتہ پاکستان میں لال مسجد آپریشن کے بعد اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ جو لوگ شہادت کے متلاشی ہیں وہ دل شکستہ اور مایوس لوگوں کا گروہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جامعہ حفصہ کے طلباء کی اکثریت غریب گھرانوں سے تعلق رکھتی تھی جن میں وہ بھی شامل تھے جن کے والدین سرحد اور آزاد کشمیر کے ہولناک زلزلے میں جاں بحق ہو گئے تھے، لیکن ان کی اپنے مقصد سے اس قدر وابستگی تھی اور وہ اتنے اعلیٰ کردار کے مالک تھے کہ جب جامعہ حفصہ سے باہر آنے پر حکومت نے ان کو پانچ پانچ ہزار روپے کی رقم دی تو اکثر نے اسے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ جو طلباء و طالبات اس آپریشن سے بچ گئے تھے انھوں نے جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے پر کسی پچھتاوے یا افسوس کا اظہار نہیں کیا۔

ایک خطرناک لیکن غلط تصور یہ ابھر رہا ہے کہ اسلام کے ماننے والے عام طور پر

ناشائستہ' غیر مہذب' غیر متحمل اور فتنہ و فساد کی طرف مائل ہوتے ہیں لیکن یہ تصور بہت زیادہ صحیح نہیں۔ ڈینیئل پائپس (Daniel Pipes) جو اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی اور ریشہ دوانی میں بدنام ہے اس نے بھی اپنی کتاب Islam Reaches America Militant (جنگجو اسلام امریکہ پہنچ گیا) میں اعتراف کیا ہے کہ اسلام کے ماننے والے آرٹ اور کلچر سے بڑا لگاؤ رکھتے ہیں اور مغربی طرز زندگی اور تہذیب کے حسن و زیبائی کے معاملے میں بہت ہی حساس ہیں۔ شقوقی (Shiquqi) جو مالٹا میں ۱۹۹۵ء میں اپنی شہادت تک اسلامی جہاد کی سربراہی کر رہے تھے' شیکسپیئر' ٹی ایس ایلیٹ' چیکوف (Chekov) اور سارتر (Sartre) کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے۔ ان کے جانشین یونی ورسٹی آف ساؤتھ فلوریڈا میں پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر تھے۔ ایاز اسماعیل جو ٹریڈ سنٹر کے بمباروں سے تھے' امریکہ کے ساتھ خصوصی میلان رکھتے تھے۔ سوڈان کے تراب علی کے پاس یونی ورسٹی آف لندن اور سوربون (Sorbonne) کی اعلیٰ ڈگریاں تھیں' الجیریا کے اسلامک سالویشن فرنٹ (Islamic Salvation Front) کے رہنما عباس مدنی نے یونی ورسٹی آف کناڈا سے تعلیم میں ڈاکٹریٹ کی ہوئی تھی۔ ترکی کے سابق وزیر اعظم نجم الدین اربکان نے جرمنی میں تعلیم حاصل کی تھی' حماس کے سربراہ ابومرزوق نے یونیورسٹی آف لووی زیانا (Lovisiana) سے انجینئرنگ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہوئی تھی۔ یہ ساری معلومات ڈینیئل پائپس نے فراہم کی ہیں۔

مشی گن مارک ٹیسلر (Michigan Mark Tessler) یونی ورسٹی کے پولیٹیکل سائنس کے ایک پروفیسر نے کہا ہے: ''یہ ہمارا عمل ہے جسے وہ (مسلمان) پسند نہیں کرتے۔'' ۱۹۹۷ء کی ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۹۶ء میں سعودی عرب کے الخبر ٹاور پر خودکش بمباری کے سلسلے میں ایک ڈیٹا (Data) سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں امریکہ کے ملوث ہونے اور امریکہ کے خلاف بین الاقوامی حملوں میں ایک ربط ہے۔

بروس ہاف مین (Bruce Haffman) نے ماہنامہ اٹلانٹک (Atlantic)

میں لکھا ہے کہ حماس کے رہنماؤں نے یہ بات جان لی ہے کہ اسرائیل کے عیش پسند لوگ دوسروں کے مقابلے میں زندگی کو بہت عزیز رکھتے ہیں اور موت کو ترجیح نہیں دیتے جبکہ مسلمان شہادت کو مسکراتے ہوئے قبول کرتا ہے۔

اسلام پر مغرب کی یلغار

۱۱ ستمبر سے بہت پہلے' مذہب اسلام اور مسلمانوں پر امریکی قیادت میں مغرب کے حملے نے اسلامی جنگجوئی کے جذبے کو بھڑکایا ہے۔ امریکی قیادت میں مغربی مفکرین اور دانشور ۱۱ ستمبر سے کہیں پہلے اپنے طرز حیات اور تہذیب پر اسلام کی طرف سے خطرے کا راگ الاپتے رہے ہیں اور اب یہ مغرب خاص طور پر امریکہ کی میراثِ دانش کا ایک حصہ بن گیا ہے۔

امریکہ کے سابق صدر رچرڈ نکسن نے اپنی کتاب (Seize of the Moment) میں اس حقیقت پر کسی قسم کی پردہ پوشی کیے بغیر صاف صاف کہہ دیا ہے: ''اکثر امریکی روایتی مسلمانوں کو غیر مہذب' گندہ اور وحشی سمجھتے ہیں۔'' سابق امریکی نائب صدر کوالے (Quyale) کا یہ بیان ریکارڈ پر ہے کہ فاشزم اور کمیونزم کے بعد امریکہ کو جس سب سے بڑے چیلنج کا سامنا ہے وہ اسلام ہے۔

کاؤنٹ ڈی مارکے (Count de marche) جو فرانس کی ایک خفیہ ایجنسی کا ایک عشرے تک سربراہ رہا ہے' اس نے اپنی کتاب ''چوتھی عالمی جنگ'' (Forth World War) میں جو ۱۹۸۶ء میں پہلی بار اور ۱۹۹۳ء میں مزید اضافے کے ساتھ شائع ہوئی' دنیائے اسلام کی آخری صلیبی جنگ کی اس طرح دہائی دی ہے: ''ہمیں دور و نزدیک اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ہمارے دشمن جو ہمارے چہار طرف ہیں' اپنی زندگی قربان کرنے کے آرزومند ہیں' وہ اپنے دین پر جان دینے کے لیے تیار ہیں' جبکہ ہم نہیں ہیں' ہمارے ایمان و یقین کی بنیاد بہت زیادہ مادی خوشیوں پر استوار ہے۔''

نیٹو (Nato) کے ایک سابق سیکرٹری جنرل کی یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ ''نیٹو کی

برطانوی کمیشن (UK Commission for Rational equety) کے چیئر مین ٹریور فلپس (Trevor Phillips) اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''مسلمان نئے سیاہ فام ہیں جس طرح ماضی میں ویسٹ انڈیز (West Indies) کی سیاہ فام اقلیت نسلی امتیاز کا شکار رہتی تھی' اس طرح آج برطانوی مسلمان ہدف بنے ہوئے ہیں۔'' امریکی جریدے ''نیشنل ریویو' (National Review) کے ایک کالم نگار نے بلا تردد صاف صاف کہہ دیا: ''ہمیں ان ممالک پر حملہ کر دینا چاہیے' ان کے رہنماؤں کو قتل کر دینا چاہیے اور مسلمانوں کو عیسائی بنالینا چاہیے۔''

بعض بڑے عیسائی پیشوا اور مغرب کے مؤقر جریدے مذہب کے عقیدے' اس کے تقدس اور اس کی حساسیت پر لعن طعن کرتے رہتے ہیں۔ پادری فرینکلن گورہم (Fraklin Gorhom) نے کہا ہے: ''اسلام بہت ہی برا اور گندہ مذہب ہے۔'' پادری وائنس (Vines) نے حضور اکرم ﷺ کی شان میں ہرزہ سرائی کرتے ہوئے آپ ﷺ کو ''بچوں سے جنسی رغبت رکھنے والی ایک بدروح'' کہا ہے۔ نعوذ باللہ۔

امریکی جریدے نیشنل ریویو نے اپنی ۱۴ مارچ ۲۰۰۲ء کی اشاعت میں صاف صاف کہہ دیا کہ ہم نے جن لوگوں سے بات کی ان میں مکہ پر ایٹم بم گرانے کے لیے اکثر لوگ بہت جذباتی تھے۔'' ری پبلکن صدارتی امیدوار نے پوری اسلامی دنیا کے مذہبی جذبات اور وابستگی کو اپنی اس دھمکی سے تیغ پا کر دیا ہے کہ اسلامی دہشت گردی کے جواب میں مکہ اور مدینہ پر بم برسائے جائیں گے۔

ڈینیئل پائپس (Daniel Pipes) نے جو بش انتظامیہ میں ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے اعلان کیا ہے کہ ''دہشت گردی کے خلاف جنگ کی آخری منزل اسلام کو ایک اعتدال پسند' جدید اور امریکہ دوست مذہب بنانا ہے۔'' اس نے مزید زور دے کر کہا ہے کہ ''امریکہ میں اسلام کو امریکی اسلام بن کر رہنا ہوگا ورنہ وہ ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔'' اس لیے اس شخص کو معاف کر دینا چاہیے جو یہ سمجھتا ہے جیسا کہ اکثر مسلمان سمجھتے ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ دراصل اسلام کے خلاف جنگ ہے اور

اس لیے اس مسلمان کو بھی معاف کر دینا چاہیے جو اسلام کی سالمیت اور تقدس کو محفوظ رکھنے کے لیے خود شہادتی کا ہتھیار استعمال کرتا ہے۔

اب یہ بات بالکل عیاں ہے کہ یہ اسلامی جنگجوئی نہیں ہے جس نے امریکی قیادت میں دشمنی کو ہوا دی ہے بلکہ بات اس کے بالکل برعکس ہے۔

اسلام کے خلاف مغربی عناد کی ابتدا' ۱۱ ستمبر کے حملے سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا بھی کوئی معتبر ثبوت نہیں ہے کہ اس حملے کا منصوبہ اسامہ نے بنایا تھا' گو عام خیال یہی ہے ایک حلقۂ خیال ایسا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اس حملے کا منصوبہ اسامہ نے نہیں بنایا تھا۔ جو حلقے ایسا سمجھتے ہیں ان کے خیال میں ۱۱ ستمبر کا ڈرامہ امریکی انتظامیہ نے خود اسٹیج کیا تھا۔ ایک جرمن عدالت کے اخذ کردہ نتائج کے مطابق ۱۱ ستمبر کی سازش ہیمبرگ میں بنائی گئی تھی' افغانستان میں نہیں اور اس کا کوئی تعلق اسامہ سے نہیں بنتا۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کا برتاؤ کریں جو ان کے دین کے خلاف نہیں لڑے اور انھیں ان کے گھروں سے نہیں نکالا۔ (الممتحنہ: ۸)

اللہ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ مسلمان اہل کتاب سے نہ لڑیں' یعنی عیسائیوں اور یہودیوں سے تاوقتیکہ وہ ان کے ساتھ زیادتی نہ کریں۔ (العنکبوت: ۴۶)

اسلام غیر مسلموں کے ساتھ عدل و انصاف کی اساس پر مبنی تعلقات استوار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لیے دوسرے مذہب کے لوگوں کے ساتھ دشمنی کرنا اسلام میں روا نہیں۔ لہٰذا دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلام کی دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مغرب کا اسلام کے خلاف تعصب اور جانبداری کس قدر گہری ہے' یہ اس بات سے ظاہر ہے کہ مغرب یورپی یونین میں ترکی کے داخلے کا سخت مخالف ہے حالانکہ ترکی ایک سیکولر ملک ہے اور نیٹو میں شامل ہے۔ سابق فرانسیسی صدر ایک طرف تو اس قدر شدید سیکولر تھے کہ انھوں نے مسلم طالبات کو سر پر دوپٹہ نہیں اوڑھنے دیا جبکہ دوسری

طرف وہ یورپی یونین میں ترکی کی رکنیت کے سخت مخالف تھے' کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح یورپ کے مذہب میں آمیزش ہو جاتی۔ فرانس کے موجودہ صدر سرکوزی (Sarkozy) فرانسیسی مسلمانوں اور دنیائے اسلام کے اور زیادہ ہی مخالف نکلے۔ انھوں نے اس قانون کو پاس کرانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کی رو سے ترکوں کے ہاتھ آرمینیوں (Armanians) کے مبینہ قتل عام پر سوال اٹھانا جرم ٹھہرا۔

صدر بش نے اس راز کی اصلیت کو چھپایا نہیں کہ "خدا نے انھیں القاعدہ پر حملہ کرنے کو کہا اور صدام پر حملہ کرنے کی ہدایت کی۔ سو انھوں نے ایسا کیا۔" جبکہ اسامہ یا عمر یا احسن فاخر یا احمدی نژاد نے دوسری اقوام پر حملے کے اس طرح کے خدائی احکام کا دعوی نہیں کیا۔ لہٰذا اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ اس طرح کے بیانات نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے دفاع اور مسلم دنیا پر اس (خودساختہ) خدائی حکم کے سہارے حملہ کرنے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اس معاملے میں جس حد تک جانا پڑے جائیں۔

اب ۱۱ ستمبر کے کمیشن کی ۴۰۰ صفحات پر مشتمل جانبدارانہ رپورٹ کی طرف آئیں جس میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ اسلامی دہشت گردی مغرب کے لیے بڑا خطرہ ہے اور یہی ۱۱ ستمبر کے حملے کی ذمہ دار ہے۔ یہ کمیشن نہ صرف یہ کہ اسلام کے خلاف اپنے مذمتی اظہار کے ساتھ سامنے آیا بلکہ اس نے اسلام کے خلاف طویل اور مسلسل جنگ کا نظریہ بھی پیش کیا اور کہا ہے کہ القاعدہ اور اس کے ساتھیوں کے بعد بھی اسلام کا بنیادی نظریہ مغرب کے لیے خطرہ بنا رہے گا۔ کمیشن کے اس نظریے کے مطابق یہ اسلام کا بنیادی تصور ہے جو اصل خطرہ ہے' اسامہ یا اس کے ساتھی نہیں۔

نوم چومسکی (Noam Chomasky) نے ۱۱ ستمبر کے واقعے کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے اس کے صحیح تناظر میں پیش کیا ہے۔ اس نے وضاحت کی ہے کہ "پچھلے کئی سو سال میں امریکہ نے اپنی آبادی کے لاکھوں لوگوں کو ملیامیٹ کر دیا۔ میکسیکو کو فتح کیا' آس پاس کے علاقوں میں پرتشدد مداخلت کی' ہزاروں' لاکھوں افراد کو قتل کرتے ہوئے

فلپائن اور ہوائی کو زیرنگیں کیا اور پچھلی نصف صدی میں دنیا کے بہت سارے علاقوں میں طاقت آزمائی کی' نشانہ بننے والوں کی تعداد بہت بڑی ہے۔ پہلی بار بندوق کا ہدف ایک دوسرے انداز میں متعین کیا گیا۔''

چومسکی مزید کہتا ہے: ''یہ جنگ جمہوریت اور دہشت گردی کے درمیان نہیں ہے۔ یہ ۱۹۹۶ء میں امریکی میزائل فلسطینی گھروں میں گرائے جانے سے متعلق ہے۔ ان کا اتحادی اسرائیل مہاجر کیمپوں میں چیرتے پھاڑتے' بے آبروئی اور قتل کرتے ہوئے گھس پڑا۔''

جیمس بیمورڈ (James Bamford) نے ۲۰۰۱ء میں چھپنے والی اپنی کتاب (Body of Secrets) میں خود اپنے شہریوں پر دہشت گردوں کے ایک حملے کو بے نقاب کیا ہے' جس کا الزام کیوبا پر لگا کر امریکہ نے اس ملک پر حملہ کرنے کا جواز پیدا کیا۔ Bay of Pigs پر حملے میں ناکامی کے بعد چیئرمین امریکی جوائنٹ چیف آف اسٹاف نے اپنے ہی لوگوں کے خلاف ایک خونی جنگ کا خفیہ منصوبہ بنایا۔ منصوبہ یہ تھا کہ بے قصور لوگوں کو امریکی شاہراہوں پر مارا جائے' اور ان کشتیوں کو جن میں ریفیوجی سفر کر رہے ہوں' کھلے سمندر میں ڈبو دیا جائے۔ تشدد اور دہشت گردی کی ایک لہر واشنگٹن ڈی' سی' میامی اور دوسری جگہوں پر دوڑ گئی۔ لوگوں پر ان بمباریوں کا الزام لگایا گیا جو انھوں نے کی نہیں تھیں' جعلی شہادتوں پر ہوائی جہازوں کا اغوا کیا گیا اور اس سارے کام کی تہمت کاسٹرو (Castro) پر لگائی گئی۔ دہشت گردی کا ایسا قبیح منصوبہ امریکہ کا اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کا ایک مکروہ طریقہ تھا۔ چومسکی نے امریکہ کے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے تشدد اور دہشت گردی کے اس سلسلے کو ماضی بعید میں ۱۸۱۸ء سے جوڑا ہے جب صدر آدمس (Adams) نے ''انڈین اور نیگرو جتھوں سے نمٹنے کے لیے'' دہشت گردی کے طریقۂ کار کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔

سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے آدمس (Adams) کا دہشت گردی کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کا نظریہ امریکہ کی اس تازہ ترین دستاویز میں نظر آئے گا جو

۱۹۹۷ء میں امریکہ کے نئی صدی کے منصوبے (Project for New American Century) کے نام سے بنایا گیا۔ منصوبے میں ایسے حیاتیاتی ہتھیار بنانے کی سفارش کی گئی ہے جو کسی مخصوص حیاتیات پر حملہ آور ہو اور اہم بات یہ ہے کہ ''دہشت گردی کے عمل کو سیاسی مفاد کے لیے ایک مفید آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا جائے۔''

نئی دہلی کے ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے نوم چومسکی نے امریکہ کو بین الاقوامی دہشت گردی کا عامل قرار دیا۔ انھوں نے نشاندہی کی کہ عالمی عدالت انصاف نے صرف ایک ملک کی بین الاقوامی دہشت گردی کے طور پر مذمت کی ہے اور وہ ملک امریکہ ہے۔ سی آئی اے (C.I.A) نے جنرل سوہارتو سے مل کر صدر سیوکارنو کا تختہ الٹنے کی سازش کی۔ حالانکہ سیوکارنو نے دوسری جنگ عظیم میں جاپان کے خلاف جنگ کر کے انڈونیشیا کو آزاد کرایا تھا جبکہ جنرل سوہارتو نے جاپانیوں کے ساتھ ساز باز کی تھی۔ جیسی کہ منصوبہ بندی کی گئی تھی' اقتدار پر قبضہ کرنے کے فوری بعد سوہارتو نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا اور پانچ لاکھ آدمی ہلاک کر دیے گئے۔ امریکہ نے پول پوٹ (Pol Pot) کی رقم اور اسلحے سے مدد کی جو دس لاکھ انسانوں کے قتل کے لیے استعمال ہوئے۔

۱۹۵۶ء میں جنرل مرحم (General Murham) کو دیے گئے انٹرویو میں شیرون نے شیخی بگھاری کہ ''میں بین الاقوامی اصول جیسی کسی شے کو نہیں مانتا۔ میں عہد کرتا ہوں کہ میں ہر فلسطینی عورت اور بچے کو جلا ڈالوں گا کہ وہ مردوں سے زیادہ خطرناک ہیں' کیونکہ ہر فلسطینی بچہ اس بات کی علامت ہے کہ فلسطینی نسلیں بڑھتی رہیں گی' میں عہد کرتا ہوں کہ اگر میں ایک معمولی اسرائیلی شہری بھی رہا اور میری ملاقات کسی فلسطینی سے ہوگی تو میں اسے مارنے سے پہلے اسے جلا دوں گا تاکہ وہ اذیت سے مرے۔ رفاہ (Rafah) میں ۱۹۵۶ء میں ایک حملے سے میں نے ۷۵۰ فلسطینی ہلاک کیے۔ میں اپنے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کروں گا کہ وہ عرب لڑکیوں کی عصمت دری کریں کیونکہ فلسطینی عورت ہماری غلام ہے اور ہم جو چاہیں اس کے ساتھ کریں۔'' یہ

سب سے بڑی درندگی اور دہشت گردی ہے جو روئے زمین پر کی جارہی ہے' جس نے انسانیت کی تذلیل کر دی ہے۔ ایسا تو کسی جانور نے بھی کبھی نہیں کیا۔ یہ وہی شیرون ہے جو وہائٹ ہاؤس کی آنکھوں کا تارا تھا اور نہ جانے کتنی بار اسے وہائٹ ہاؤس میں مدعو کیا گیا' جبکہ یاسر عرفات جو پکا سیکولر تھا' کسی قابل نہیں سمجھا گیا اور مکمل سرد مہری کا شکار رہا۔

اسلام کے خلاف امریکہ کا ازلی تعصب اس وقت کھل کر سامنے آ گیا جب ۱۲ اپریل ۲۰۰۵ء کو اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے کمیشن کی ایک خالص انسانی حقوق کی قرارداد کی امریکہ اور یورپی ممالک نے مخالفت کی۔ اس قرارداد میں محض یہ کہا گیا تھا کہ دہشت گردی کی جنگ میں خاص طور پر اسلام کو مطعون کرنے سے احتراز کیا جائے۔ اقوام متحدہ کے ۵۲ اراکین نے یہ قرارداد منظور کر لی مگر امریکہ اور یورپی ممالک نے اس بنیاد پر اس کی مخالفت کی کہ قرارداد غیر متوازن ہے چونکہ اس میں دوسرے مذہبی طبقوں کے مسائل کا ذکر نہیں لیکن جن ممالک نے قرارداد کی مخالفت کی انھوں نے یہ نشاندہی کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ دوسرے اور کون سے مذاہب ہیں جنھیں اس طرح بدنام کیا جا رہا ہے۔ اس حقیقت کے پس منظر میں کہ باقی دنیا کے بیشتر رکن ممالک نے جہاں سارے مذاہب کے لوگ آباد ہیں' اس قرارداد کے حق میں ووٹ دیا' اس حقیقت کو بھی واضح کرتی ہے کہ ان ممالک کے تمام مذاہب کے ماننے والے اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ حقیقتاً بدنامی کی مہم اسلام کے خلاف چلائی جا رہی ہے اور یہ کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے مفروضے پر مسلمان تفریق کا شکار ہو رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے کمیشن میں ووٹنگ کا انداز اور قرارداد کی خلاف ورزی کا کوئی نوٹس لینے میں ناکامی کے سبب مختلف یورپی ممالک کے دارالحکومتوں میں حضور اکرم ﷺ کی توہین اس تلخ حقیقت کا صاف صاف اظہار ہے کہ امریکی قیادت میں نہ تھمنے والے حملوں میں مسلمان اپنی عزت و وقار کو' اپنے مذہب کو اور اپنے ہم مذہبوں کو بچا نہیں سکتے اور نہ انھیں کوئی ایسی جگہ یا ادارہ میسر ہے جس کے دروازے پر جا کر وہ انصاف مانگ

سکیں۔لہٰذا ان کے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں کہ وہ جہاد کا راستہ اختیار کریں۔

امریکہ کے معروف اخبار بالٹی مورسن (Baltimore Sun) نے جہاد کے پورے مسئلے کو اس کے صحیح تناظر میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے کہ مغرب کا سامراجی نظام' مسلم ممالک پر اس کا تسلط' فلسطین کا ناسور' سوویت یونین کا افغانستان پر حملہ اور امریکہ کا خطے میں طاقت کا بے رحمانہ استعمال وہ عوامل ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو جہاد کا راستہ اپنانے پر مجبور کیا ہے۔

اسلامی دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنے کے منصوبے کو اب فوجی حکمت عملی میں تبدیلی کر کے امریکہ نے اسلامی دنیا کے گرد گھیرا ڈال کر اور اسے محصور کر کے اس پر اپنی فوجی گرفت مضبوط کر لی ہے۔اس فوجی حکمت عملی پر ایرک مورگولیس (Eric Morgolis) نے ڈان (Dawn) کی اگست ۲۰۰۵ء کی ایک اشاعت میں اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''امریکی سامراجیت کی بقا مسلم دنیا پر واشنگٹن کی مضبوط گرفت میں ہے۔ بلغاریہ' رومانیہ' عراق اور خلیج میں امریکہ نئے فوجی اڈے قائم کر رہا ہے یا کر چکا ہے تاکہ اپنی جنگجوئی کی مہم کو دوبارہ استوار کر سکے۔ کناڈا میں بنی ہوئی ہلکی فوجی گاڑیوں سے بھاری فوجی ٹینکوں اور توپوں کو تبدیل کیا جا رہا ہے۔فوجیوں کو شورش کے خلاف جوابی کارروائی کرنے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ سادہ کنول جیسے فوجی اڈے تیزی سے بنائے جا رہے ہیں اس طرح امریکی افواج کو دنیا کے چاروں طرف مینڈکوں کی صورت میں پھیلایا جا رہا ہے۔

اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے کمیشن کی قرارداد سے قطع نظر جس میں رکن ممالک کو اسلام کو بدنام کرنے کی مہم کے خلاف مدافعت کرنے کو کہا گیا ہے' پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں گستاخی اور اسلام کو بدنام کرنے کی مہم بلا روک ٹوک جاری ہے' دنیا بھر میں مسلمانوں کے شدید احتجاج کے باوجود ڈنمارک کے ایک بڑے اخبار کی طرف سے توہین رسالت کو یورپ اور کسی حد تک امریکہ کی جانب سے آزادی خیال و اظہار کی بنیاد پر درست قرار دیا گیا ہے' جبکہ ہولوکاسٹ (Holocaust) کی تاریخی

حقیقت اور ترکوں کی طرف سے آرمینیوں کے مبینہ قتل عام کی صداقت پر لب کشائی کی اجازت نہیں۔ پوپ بنی ڈکٹ Benedict نے اسلام کے نظریۂ جہاد پر برہمی کا اظہار کیا اور یہ بھی تاثر دیا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ اسلام کی توہین کا تازہ ترین واقعہ سلمان رُشدی کو نائٹ ہڈ (Kinght hood) کا خطاب دینا ہے۔ جبکہ دنیا کے سارے مسلمان اس کی کتاب ''شیطانی آیات'' (The Satanic Verses) کے حوالے سے مذمت اور اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اس کتاب میں اس نے حضور اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے خلاف ہرزہ سرائی کی ہے۔توہین رسالت کا ایک اور واقعہ وہ کارٹون ہے جو سویڈن کے ایک اخبار میں اگست (۲۰۰۶ء) یا اس کے لگ بھگ شائع ہوا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ سویڈن کے وزیر اعظم نے اظہار رائے کی آزادی کے نام پر اس کو درست قرار دیا اور آزادیٔ اظہار کے دفاع میں اپنی ثابت قدمی پر ڈٹے رہے۔ کچھ ہی دن قبل ڈچ پارلیمنٹ کے ایک رکن نے ۸ اگست ۲۰۰۷ء کو یہ مطالبہ کیا کہ نیدرلینڈ میں قرآن پر پابندی لگا دی جائے کیونکہ یہ ایک ''فسطائی کتاب'' ہے۔ کراچی کے روزنامہ ایکسپریس (Express) نے اپنی ۷ ستمبر ۲۰۰۷ء کی اشاعت میں رپورٹ کیا ہے کہ ایک اشاعتی ادارے نے حال ہی میں نیو یارک میں ایک عمارت تعمیر کرائی ہے جسے خانہ کعبہ کی شکل دی گئی ہے اور اس کا نام مکہ کا سیب (Apple of Mecca) رکھا گیا ہے۔ یہ توہین اسلام کی تازہ ترین مثال ہے جس نے ساری دنیا کے مسلمانوں کے جذبات بری طرح مجروح کیے ہیں۔ حضرت پیغمبر ﷺ کی بار بار کی توہین اور اسلام کے خلاف رسوا کن مہم ایک بار پھر اس تلخ حقیقت کو سامنے لاتی ہے کہ اپنے مذہب کی سالمیت اور تقدس کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کے پاس مکالمے یا گفت وشنید کا کوئی ذریعہ نہیں۔

اس کے باوجود ایسے اعلیٰ مرتبت ناصحین کی کمی نہیں جو مسلمانوں کو پند و وعظ کرتے رہتے ہیں کہ وہ پُر امن ذرائع سے دنیا کو ایسے مسائل سے آگاہ کرتے رہیں' اس کی پروا کیے بغیر کہ اس کے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہو رہے' دنیا کے ضمیر کو جگانے

کا کام اس کی ہمدردی اور حمایت حاصل کرنے کے لیے کرتے رہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کے مسائل اور مشکلات کا منصفانہ اور دیانتدارانہ حل تلاش کرنے کے لیے سارے پُر امن ذرائع دنیا کی منافرت اور دشمنی کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے ہیں۔

یہ کس قدر بے نتیجہ اور مایوس کن بات ہے کہ سلامتی کونسل کی قرار دادوں سے قطع نظر کشمیر اور فلسطین کے منصفانہ عادلانہ حل ڈھونڈنے کے لیے نہ ختم ہونے والے طویل مذاکرات ہوتے رہے' لیکن جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے' یہ مسئلہ پاکستان اور ہندوستان کے مابین بے شمار گفت وشنید اور اعلیٰ ترین سطح پر مذاکرات کے ملبے تلے تقریباً نصف صدی سے دبا ہوا ہے۔ اور مسئلہ فلسطین میڈرڈ (Madrad) کانفرنس' اوسلو معاہدہ وائی ریور (Wye River) کی بلند ترین سطح کے مذاکرات اور کلنٹن کی کیپ ڈیوڈ (Cap David) کی گفت وشنید کے علاوہ شرم الشیخ اور مصر میں خوبصورت ماحول میں کی گئی ملاقاتوں کے ملبے میں دفن ہے۔

سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی نے قرار داد پاس کی جس میں اسرائیل کو ۱۹۶۷ء سے پہلے کی سرحدوں پر لوٹنے کے لیے کہا گیا۔ ان اداروں کی بعد کی قرار دادوں میں مشرقی یروشلم کو خالص عرب علاقہ قرار دیا گیا اور دنیا کے رکن ممالک کو وہاں اپنے سفارت خانے منتقل کرنے سے روکا گیا' نیز اسرائیل کو اپنا دارالحکومت وہاں لے جانے سے منع کیا گیا۔ لیکن اسرائیل نے ان قرار دادوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر واپس آنے سے انکار کیا بلکہ اس نے اپنا دارالحکومت بھی یروشلم منتقل کر دیا۔ یہ بات اور بھی افسوسناک ہے کہ چند برسوں بعد امریکی کانگرس نے اقوام متحدہ کی قرار دادوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک قرارداد منظور کی جس میں امریکی انتظامیہ سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنا سفارت خانہ مشرقی یروشلم منتقل کرے۔ وقت گزرنے کے ساتھ فلسطین پر اقوام متحدہ کی قرار دادوں پر عمل درآمد کی کوئی مخلصانہ کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ دنیا کی بڑی طاقتوں خاص طور پر امریکہ کی یہ کوشش

رہی ہے کہ ان قرار دادوں کے اکثر مندرجات اور مقاصد کو غیر موثر بنا دیا جائے۔ جبکہ اقوام متحدہ کی قرار داد میں ۱۹۶۷ء کی جنگ میں قبضہ کیے ہوئے علاقے سے مکمل انخلاء کے لیے کہا گیا ہے۔ دوسری طرف اوسلو معاہدہ اور بعد کے وضع کیے ہوئے طریقۂ عمل (Road Map) کی روشنی میں مغربی کنارے سے انخلاء اور مشرقی یروشلم کی حیثیت کو مزید گفت وشنید سے جوڑ کر ان معاملات کو اور الجھا دیا گیا ہے جنھیں اقوام متحدہ کی قراردادوں نے سلجھا دیا تھا۔

مغربی کنارے پر دیواریں کھڑی کرنے کے خلاف عالمی عدالت انصاف کے فیصلے کو بھی اسرائیل نے نہیں سنا اور دیواریں اٹھائے جانے کا عمل جاری رکھا' وہ بھی امریکہ کی پشت پناہی سے۔

اسرائیل' اقوام متحدہ کی قرار دادوں کی کھلی خلاف ورزی کرنے اور عالمی عدالت انصاف کے فیصلے کو نہ ماننے کے باوجود' امریکی قیادت میں مغرب کی آنکھوں کا تارا بنا ہوا ہے اور اقوام متحدہ کا رکن ہوتے ہوئے بھی اس کے منشور کی خلاف ورزی کیے جا رہا ہے جبکہ حماس کو' جس نے غالب اکثریت کی حمایت سے فلسطین میں اقتدار حاصل کیا' سرکش اسرائیل کو تسلیم کرنے کے لیے دبایا جا رہا ہے اور قوموں کی برادری سے اسے خارج کیا جا رہا ہے۔

کاسترو' جس نے کسی زمانے میں فلوریڈا کی سرزمین پر سوویت میزائل گرانے میں تعاون کیا' چند سال قبل جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے خصوصی اجلاس سے خطاب کرنے گیا تو جہاں جہاں وہ گیا اسے کھلے بازوؤں سے خوش آمدید کہا گیا اور اس کا والہانہ استقبال ہوا۔ اس کے برعکس ایرانی صدر احمدی نژاد' جن کا ملک ایٹمی عدم توسیع کے دائرے میں رہتے ہوئے پُرامن مقاصد کے لیے یورینیم کی افزودگی کر رہا ہے اور جس کی آئی۔اے۔ای۔اے (IAEA) کے سربراہ البرادعی نے بارہا تصدیق کی ہے کہ ایران کا جوہری پروگرام عالمی امن کے لیے کوئی خطرہ نہیں' مغرب کے غم و غصے کا ہدف بنے ہوئے ہیں' اس کے علاوہ انھیں جنگ کی دھمکی بھی ملتی رہتی ہے۔ ایرانی صدر

جب جنرل اسمبلی کے اجلاس سے خطاب کرنے کے لیے امریکہ گئے اور اس دوران جب . . یل امریکی یونی ورسٹی میں خطاب کرنے گئے تو ان کا بڑی برہمی کے ساتھ استقبال کیا گیا اور ان کی تذلیل کی گئی۔ بعد میں جب وہ اقوام متحدہ کی ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرنے جا رہے تھے کہ وہ اس تاثر کو ختم کریں جو امریکی قیادت میں اٹھایا جا رہا ہے کہ ایران امریکہ یا اسرائیل کے خلاف کوئی جارحانہ منصوبہ بنا رہا ہے' تو اقوام متحدہ کی حفاظتی کمزوری کے سبب کئی اسرائیلی طیارے کانفرنس کے مقام میں گھس پڑے اور افراتفری پھیلا دی۔ یہ سب ظاہر کرتا ہے کہ اسلامی دنیا اور مغرب کے درمیان پُر امن مکالمے کی راہ میں ایک مضبوط دیوار کھڑی کر دی گئی ہے۔

اوپر بیان کیے ہوئے واقعات اس حقیقت کا خود ثبوت ہیں کہ مسلمان اپنی مشکلات کو اجاگر کرنے اور ان کا حل ڈھونڈنے کے تمام وسائل اور ذرائع استعمال کر چکے ہیں لیکن لا حاصل۔ اقوام متحدہ کے ذریعے بھی انھوں نے اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا چاہا مگر وہاں بھی مایوسی ہوئی۔ اس طرح اسلامی دنیا اور مغرب کے ہاں کوئی مشترک پلیٹ فارم اب نہیں جہاں وہ مکالمہ یا گفت وشنید کر سکیں۔ اسلام کو بدنام کرنے کے خلاف انسانی حقوق کے کمیشن کی قرارداد کے باوجود توہین رسالت کا عمل جاری ہے جسے اظہار رائے کے بہانے جائز قرار دیا جاتا ہے اور یہ آزادی اس قدر مقدس ہے کہ اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی جا سکتی۔

قابض اور ظالم قوتوں کے خلاف مسلمانوں کی مزاحمت کو دہشت گردی کا نام دے دیا گیا ہے۔ جبکہ فلسطین' چیچنیا' کشمیر' افغانستان اور عراق میں ریاستی دہشت گردی کو یہ کہہ کر قانونی جواز مہیا کر دیا گیا ہے کہ یہ دہشت گردوں کے خلاف کارروائی ہے۔ اس طرح جو شے اسلامی دنیا کے لیے زہر ہے وہی چیز مغرب کے لیے شیرینی ہے' اور جو چیز اسلامی دنیا کے لیے شیرینی ہے وہ مغرب کے لیے زہر ہے !! اسی صورت حال میں' اسلامی دنیا اور مغرب کے درمیان افہام وتفہیم اور مصالحت کی کہاں گنجائش ہے۔

ہر طرف سے اس بری طرح دبائے جانے اور محصور کیے جانے کے بعد مسلمانوں

کے پاس اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ وہ جنگجوئی اختیار کرلیں۔

امریکی قیادت میں مغرب نہ صرف نام نہاد اسلامی دہشت گردی کے خلاف صف آرا ہے بلکہ اسلام کی شناخت' اس کی سالمیت اور اس کے تقدس پر بھی حملہ آور ہے۔ انھوں نے اسلام کے بنیادی عقائد اور اس کی حرمت کے خلاف فوجی اور نظریاتی مہم چلائی ہوئی ہے۔ عراق کے کیمپ کروپر (Cropper) میں جب قابض افواج مسلمان نوجوانوں کو قیدی بناتی ہیں تو قرآن پاک میں دی گئی جہاد کی تعلیم ان کے ذہنوں سے کھرچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ڈینیئل پائپس (Daniel Pipes) نے ترقی پسند اسلام کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے جس کا مقصد اسلام کو جدید اور خالص امریکی اسلام بنانا ہے۔ ایک مصدقہ ذریعہ سے کچھ دن قبل اطلاع آئی تھی کہ امریکہ میں ایک زبردست تحریک چلی تھی کہ سعودی عرب پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ مکہ کو ایک کھلا شہر قرار دے دے۔ اسلام کے قلعے سعودی عرب کی وزارت تعلیم دینی مدارس کے نصاب سے ایسا تمام مواد نکالنے میں مصروف عمل ہے جو کسی صورت بھی مسلم نوجوانوں میں جہاد اور شہادت کے جذبات جگانے کا سبب بن سکتا ہو۔ حکومت کے اس عمل کے خلاف کم از کم ڈیڑھ سو سعودی ججوں' دانشوروں' اور یونی ورسٹی کے اساتذہ نے سخت احتجاج کیا۔ یہی عمل کویت اور اردن میں ہو رہا ہے۔ اس وقت کی صدر بش کی سلامتی کی مشیر (اب وزیر خارجہ) کونڈ ولیزا رائس کی یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ امریکہ کی ہدایت پر پاکستان کے نظام تعلیم کو از سر نو مرتب کیا جا رہا ہے۔ امریکہ کے انتہائی مقتدر حلقۂ دانش (Think tank) رینڈ کارپوریشن (Rand Corporation) نے اپنی ایک دستاویز میں امریکی انتظامیہ کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ وہ بنیاد پرست مسلمان جو مغربی تہذیب کو قطعی گوارا نہیں کرتے اور نظریے اور اقدار کو اپنائے ہوئے ہیں جو جدید دور سے متصادم ہیں' وہ مغرب کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں اور انھیں مغرب کا سب سے بڑا دشمن سمجھنا چاہیے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک نیا اسلام ایجاد کیا جائے جو اس اسلام سے سراسر مختلف ہو گا جس کی قرآن و سنت نے تعلیم دی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام

میں جدیدیت کی آمیزش کی جائے' جیسے ازدواجی زندگی سے باہر جنسی تعلقات قائم کرنا' مذہب کو افراد کا بالکل ذاتی مسئلہ بنانا' وہ اس کے لیے آزاد ہوں گے کہ جب چاہیں اور جتنی بار بھی چاہیں اپنا مذہب تبدیل کر لیں' اور یہ کہ مسلمان لڑکیوں کی غیر مسلم لڑکوں کے ساتھ شادی پر بھی کوئی پابندی نہیں ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

قرآن پاک کہتا ہے: ''عیسائیوں اور یہودیوں کی اس وقت تک تشفی نہیں ہوگی جب تک تم ان کے مذہب کی پیروی نہ کرو گے۔'' قرآن مزید کہتا ہے ''اللہ کی رہنمائی ہی اصل رہنمائی ہے۔'' اللہ کی طرف سے تمھارے پاس آئے ہوئے علم کے بعد بھی اگر تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی' تو تم اللہ کے خلاف کوئی محافظ یا مددگار نہیں پاؤ گے۔'' (البقرہ: ۱۲۰)

۱۱ ستمبر کے کمیشن کی رپورٹ میں بھی یہ بات زور دے کر کہی گئی ہے کہ اگر اسامہ اور القاعدہ ختم بھی کر دیے جائیں' اسلام کا بنیادی نظریہ مغرب کے لیے خطرہ بنا رہے گا' اور یہ کہ اسلام کے بنیادی نظریے اور مغرب کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ لہٰذا ان دونوں کے درمیان کسی مفاہمت یا مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں۔ مسلم دنیا اپنے دین اسلام ہی کے خلاف اس قدر سخت خطرے سے دوچار ہے کہ اس کے پاس اپنے مذہب کی شناخت' بقا اور سلامتی کے لیے ہتھیار اٹھانے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ اسلامی جنگجوئی بار بار اپنا اظہار خودکش بمباری سے کرتی ہے کہ مسلم دنیا کو اسلام سے دور کرنے کی امریکی قیادت میں برپا کی جانے والی مہم اور اس کے مکروہ فوجی عزائم کے خلاف یہی موثر ترین ہتھیار ہے۔

جب سے امریکہ نے خلیجی ممالک بحرین' قطر اور کویت میں اپنے قدم جمائے ہیں' وہاں عشرت کدے آباد ہو گئے ہیں۔ فائیو اسٹار ہوٹلز' قمار خانے' شراب خانے اور قحبہ خانے عام ہیں۔ نشہ اور شراب ایک متعدی مرض بن گیا ہے۔ ہفتہ وار ٹائم نے دسمبر ۲۰۰۲ء کے شمارے میں عراق کے کردار اور کلچر کے تنزل پر ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں بتایا ہے کہ اس برائی کا سبب امریکہ کی قابض افواج ہیں۔ صدام کے دور میں شراب

اور قحبہ خانوں پر سخت پابندی تھی۔ قابض افواج کی سرپرستی میں یہ دوبارہ منظر عام پر آ گئے ہیں۔ مضمون میں کہا گیا ہے کہ صدام کے زمانے میں چند دکانوں میں شراب نوشی کی اجازت دی ہوئی تھی' ویسے اس پر سخت پابندی عائد تھی۔ قحبہ خانوں پر اس قدر سخت قدغن تھی کہ اگر کوئی طوائف اس جرم میں پکڑی جاتی تو اس کا سر قلم کر دیا جاتا تھا۔ عراق کے کرنل کے عہدے کے ایک بہت ہی سینئر افسر نے بتایا کہ جب پولیس نے بہت ساری طوائفوں کو گرفتار کیا تو قابض فوج نے فوراً مداخلت کی اور انھیں رہا کرا لیا۔ عراقی اب فحاشی کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ سینما ہال میں فلم بینی کے دوران میں اگر کوئی غیر فحش منظر سامنے آتا ہے تو شور برپا کر دیتے ہیں۔

ایک دوسرے باوثوق ذریعے کے مطابق' افغانستان میں طالبان کا تختہ اُلٹے جانے کے بعد وہاں کی حکومت نے ہندوستانی گانوں اور عریاں فلموں کی اس حد تک سرپرستی شروع کر دی تھی کہ احتجاج کی ایک لہر دوڑ گئی اور ٹی وی حکام کو متعلقہ وزیر کی خفگی کے باوجود ان پروگراموں کو بند کرنا پڑا۔ کویت میں بھی عملاً امریکی قبضے کے بعد نائٹ کلب اور جوا خانے تیزی سے پھیل گئے ہیں۔

جیسا کہ نارتھ ایسٹرن یونی ورسٹی (North Eastern University) کے شاہد عالم نے وضاحت سے کہا ہے کہ ''اسلام کو ایک مضروب' زخم خوردہ تہذیب کی حیثیت سے آویزش کے میدان میں کھینچ لیا گیا ہے اور یہ پچھلی دو صدیوں کے مغربی تسلط کے سبب تحقیر کا شکار ہے اور کسی مرکزی منطقے کے نہ ہونے کی وجہ سے غیر موثر سیاسی اکائیوں میں تقسیم ہے۔ تیل کے ذخائر سے مالا مال ہونے کے باوجود یہ اپنے قلب میں ایک نو آبادیاتی سیکولر حکومت کے قیام پر قابو نہیں پا سکا جس نے زخموں کو اور گہرا کر دیا ہے۔'' اس نے صحیح نشاندہی کی ہے کہ ''تاریخ نے ایک تلخ حقیقت کو آشکار کر دیا ہے۔''

لیون۔ ٹی۔ ہارڈر (Leon T. Harder) نے فارن افیئر ز (Foreign Affairs) کے موسم بہار کے شمارے میں اسلام کے خلاف تیزی سے بڑھتی ہوئی منافرت کی' جس نے دنیا کے چہار سمت سے اسلام پر معاندانہ حملہ کیا ہوا ہے' اس طرح

تصویر کشی کی ہے: ''ہندوستان' پاکستان کے اسلامی تشخص کے آگے سینہ سپر ہے۔ سرب قوم پرستوں نے لسانی صفائی کو اپنی پالیسی کا حصہ بنایا ہوا ہے تاکہ اسلام کو یورپ میں پھیلنے سے روکا جائے۔'' ہارڈر مزید کہتا ہے ''اسلام کی حالت یہ ہے کہ ایک متحدہ قوت کے طور پر وائنا کے دروازے یا اسپین کے کنارے پہنچنے کی بجائے آج وہ یوگوسلاویہ میں مدافعتی پوزیشن میں ہے۔ بوسنیا اور کوسوو کی مغرب پرست اور سیکولر مسلم آبادی کو سرب قوم پرستوں کی طرف سے مٹا دیے جانے کا خطرہ ہے۔'' یہ بات ذہن میں رہے کہ مغرب پرست بوسنائی مسلمان اپنے عیسائی ہم وطنوں سے قریب تر آنے اور ان سے گہرے مراسم رکھنے کی غرض سے شراب نوشی کرتے' رقص و سرود کرتے' اسلام کے حکم کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے سور کا گوشت کھاتے' یہاں تک کہ اپنی لڑکیوں کی ان سے شادی کر دیتے' لیکن انھی عیسائی سربوں نے سرب مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے۔ اگر بوسنیا کے مسلمان عیسائی سربوں کے خلاف جنگ میں پورے طور پر نہ کود پڑتے جس میں تینتیس ائمہ مساجد نے حصہ لیا اور ان میں تقریباً ۱۴ شہید ہوئے' تو بوسنیا سے مسلمانوں کا مکمل صفایا ہو جاتا۔ جب بوسنیا کے مسلمان بیہاج (Behaj) میں بری طرح گھیر لیے گئے تو امریکی وزیر دفاع نے اعلان کرنا مناسب سمجھا کہ بوسنیا کا سقوط چند دنوں کی بات ہے اور امریکہ اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن مسلمانوں نے اللہ کی نصرت اور اپنے غیر متزلزل یقین کی بدولت امریکی وزیر دفاع کی پیشین گوئی غلط ثابت کر دکھائی اور شاندار کامیابی حاصل کی۔ بوسنیا کے جانبازوں کا رہنما اصول یہ تھا ''ہم اللہ کے سپاہی ہیں اور اسلام کے لیے جنگ کرتے ہیں۔'' سربوں کے خلاف ان کی کامیابی ایک معجزہ تھا۔ آئن اسٹائن کا کائنات کے بارے میں وہ نظریہ جس پر عمل کرتے ہوئے دنیا کے نامور سائنسدان بوہر (Bohr) پلانک (Plank) اور ہائزن برگ (Heisonberg) اس نتیجے پر پہنچے کہ حقیقی کائنات میں کبھی کبھی نہ سمجھ آنے والا کوئی عجوبہ رونما ہو جائے۔ افغانستان کے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس طالبان اور دنیا کی قوی ترین افواج سے نبرد آزما عراقی سرفروش' اس حقیقی دنیا میں سمجھ میں نہ آنے والا

عجوبہ ہی ثابت ہوتے ہیں۔

اس کا سد باب

اس وسیع پس منظر میں اسلامی جنگجوئی کی اس لہر کو دیکھنا چاہیے جو مسلم دنیا میں اٹھی ہوئی ہے' جو واقعات اسلامی دنیا میں رونما ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں' اُنھی پر گہری نظر رکھتے ہوئے اسلامی جنگجوئی کی حقیقت کو سمجھنا چاہیے۔ اسلامی جنگجوئی کے علاوہ چارہ کار کیا ہے؟

امریکہ کے حلقہ ہائے دانش (Think tanks) کافی غوروفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ مسلمان ہیں جو جرم کرنے سے زیادہ جرم کا شکار ہو رہے ہیں۔

ہم خیالوں کا ایک نیا گروہ Safe America کے نام سے وجود میں آیا ہے جس میں سابق نامور قانون ساز اور قومی سلامتی کے اعلیٰ مشیر شامل ہیں۔ اس گروہ نے اپنی یہ مستحکم رائے قائم کی ہے کہ دہشت گردی ایک سیاسی طرزِ عمل ہے اور اس سے سیاسی طور پر نمٹا جائے جس میں مسلم دنیا کے مسائل کو بھی زیرِ بحث لانا چاہیے۔ نیو امریکن فاؤنڈیشن (The New American Fondation) کے فیلو' نیر روزن (Nir Rosen) نے کہا ہے کہ ''مسلمان ہم سے نفرت نہیں کرتے' بلکہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اس سے نفرت کرتے ہیں...... '' مسلم دہشت گردوں کے مقاصد کوئی راز نہیں اور بارہا یہ بات کھلے الفاظ میں کہی گئی ہے کہ اس کی وجہ وہ مظالم ہیں جو فلسطین' عراق' افغانستان' چیچنیا اور گوانتاناموبے میں کیے جا رہے ہیں۔ دوسرا سبب آمرانہ اور بدعنوان حکومتوں کی امریکی حمایت ہے۔ اس لیے وہ یہ مشورہ دیتا ہے کہ عراق سے امریکہ کی اور فلسطین سے اسرائیل کی واپسی دہشت گردوں کی جنگ کے خلاف زیادہ موثر ہو سکتی ہے۔

امریکی حلقہ ہائے دانش (Think Tanks) کی ان سفارشات کی بنیاد اس ریسرچ پر ہے جو ان حلقوں نے کی۔ یہ ان موجودہ تصورات کی سختی سے نفی کرتے ہیں کہ اسلامی جنگجوئی کے اسباب مسلمانوں کی مغرب کی آزادی اور خوشحالی سے منافرت یا مدرسوں میں تشدد کی دی جانے والی تعلیم ہیں۔

برطانوی پارلیمانی کمیٹی نے لندن کی خارجہ حکمت عملی پر اپنی رپورٹ میں زور دیا ہے کہ مغرب حزب اللہ اور حماس سے، جنھیں اس نے دہشت گرد تنظیم قرار دیا ہوا ہے، مذاکرات کرے۔ پاک افغان سرحد کی ہر دو جانب سے ۵۰۷ ارکان پر مشتمل اس جرگے نے ۵۰ ارکان کی ایک کمیٹی تشکیل دی ہے جس میں دونوں طرف سے ۲۵،۲۵ ارکان لیے گئے۔ اس کمیٹی کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ اعتدال پسند طالبان اور افغان حکومت کے درمیان مفاہمت اور مصالحت کرائے۔ خیبر ایجنسی کے بعض بزرگ قبائلیوں نے بھی حکومت پاکستان پر زور دیا ہے کہ وہ طالبان کے ساتھ مکالمہ شروع کرے کیونکہ ان کے تعاون کے بغیر امن واستحکام کا قیام ممکن نہیں۔

ڈیوڈ کلارک (David Clark) نے گارجین نیوز سروس کی اپنی ایک تحریر میں (ڈان ۱۷ اگست ۲۰۰۷) امریکہ پر شدت سے زور دیا ہے کہ وہ عراق سے اپنی فوج واپس بلائے اور ایک آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کی ہر ممکن کوشش کرے جس کے لیے ضروری ہو تو اسرائیل کے فوجی بازو کو بھی مروڑے۔ اس نے گوانتاموجیل کو فوری طور پر بند کرنے کی بھی سفارش کی ہے۔

سابق افغان صدر اور بعد میں شمالی اتحاد کے حکومتی سربراہ پروفیسر ربانی نے، جو طالبان کے کٹر دشمن تھے، کہا ہے کہ طالبان اور گلبدین حکمت یار کی شرکت کے بغیر افغانستان میں امن قائم نہیں ہوسکتا۔ اس دوران، طالبان نے کسی قسم کے تعاون سے اس وقت تک انکار کیا ہے جب تک بیرونی افواج افغانستان سے نکل نہ جائیں۔ کوریا کی حکومت سے براہ راست مذاکرات کے بعد انیس ۱۹ کوریائی یرغمالیوں کی طالبان کی طرف سے رہائی، کرزئی حکومت پر ایک کاری ضرب ہے۔ عظیم افغان مصنف اور تجزیہ نگار واحد مُجدا نے کہا ہے کہ اگر بیرونی دنیا کا کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ افغانستان کے ساتھ کوئی بھی معاہدہ طالبان کے تعاون کے بغیر کرسکتا ہے تو وہ سخت غلطی پر ہے۔'' یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ طالبان ایک حقیقت ہیں اور قوتِ موجود بھی۔'' پاکستان کے آزاد روزنامہ دی نیوز (THE NEWS) نے توجہ دلائی ہے کہ کوریا اور طالبان کے درمیان

براہ راست مذاکرات' کابل کی کمزوری کی علامت ہیں۔ ان مذاکرات نے طالبان کو شناخت اور جواز مہیا کر دیا ہے اور اب ان کا مقام اخلاقی اور سیاسی سطح پر بہت بلند ہو گیا ہے...... یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ملک کے بیشتر حصوں میں طالبان کا کنٹرول ہے اور کرزئی حکومت ان علاقوں میں اپنا کوئی اثر نہیں رکھتی۔

اس کے بعد سے' افغانستان کی فوجی اور سیاسی صورت حال بنیادی طور پر تبدیل ہو گئی ہے۔ حامد کرزئی بھی آخر کار سر عام یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے کہ طالبان کے تعاون کے بغیر افغانستان میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اس سے پہلے وہ اعتدال پسند طالبان کو مذاکرات کی دعوت دیتے رہتے تھے لیکن یہ اعتراف کبھی نہیں کیا تھا کہ طالبان کے تعاون کے بغیر افغانستان میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ چاہے وہ اعتدال پسند طالبان ہوں یا غیر اعتدال پسند۔ زیادہ اہم یہ ہے کہ افغانستان کے سابق صدر اور بعد میں شمالی اتحاد کی حکومت کے سربراہ ربانی جو طالبان کے کٹر دشمن تھے' انھوں نے کرزئی سے پہلے یہ اعتراف کیا کہ طالبان کے تعاون کے بغیر افغانستان میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اس سے قبل مئی ۲۰۰۷ میں افغان سینٹ نے جنگ بندی کی ایک قرارداد منظور کی تھی جس پر سینٹ کے اسپیکر نے کہا تھا کہ یہ قرارداد ظاہر کرتی ہے کہ سینٹ کے اراکین کو اس کا یقین ہے کہ جنگجوؤں سے لڑنے کی بجائے ان سے مذاکرات کا عمل زیادہ موثر ثابت ہو سکتا ہے۔ ایران بھی جو کبھی شمالی اتحاد کا ساتھی تھا اور طالبان کے خلاف تلوار اٹھائے ہوئے تھا' اس نے جیسا کہ امریکہ الزام لگاتا ہے' طالبان کے معاملے میں اپنا ذہن تبدیل کر لیا ہے اور ان کی مدد کر رہا ہے۔ اب جبکہ افغانستان کے سابق اور موجودہ صدر یہ کہہ رہے ہیں کہ طالبان کے تعاون کے بغیر ملک میں امن قائم نہیں ہو سکتا اور ایران بقول امریکہ' طالبان کی مدد کر رہا ہے' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اب فوجی اور سیاسی لہریں طالبان کے حق میں ہو گئی ہیں اور غیر پختون اور ایران بھی کم و بیش طالبان کے ساتھ کھڑے ہیں' افغانستان میں امن' اتحاد اور معمول کے حالات پیدا کرنے میں طالبان ایک تاریخی عامل کی حیثیت سے سامنے آرہے ہیں۔ مزید یہ کہ امریکی قیادت

میں اتحادی افواج افراتفری کا شکار ہیں۔ اور نیٹو (NATO) کے بعض کمانڈر جنوب میں جو اصل میدان جنگ ہے' اپنی فوج اور اسلحہ پہنچانے میں خود کو سخت اعصابی دباؤ میں پاتے ہیں۔ پچھلے دنوں جنرل رے ہینالٹ (Ray Henault) جو کناڈا کے دفاعی سربراہ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں' ایک پریس کانفرنس میں ایک بات کے شاکی نظر آئے کہ ''نیٹو کے بعض ممالک جنوب میں اپنی افواج اور اسلحے بھیجنے سے کتراتے ہیں اور وہاں جنگ کا سارا بوجھ امریکی' برطانوی' کناڈین اور ڈچ فوجوں پر آپڑا ہے۔''

افغانستان میں ان بنیادی فوجی اور سیاسی تبدیلیوں کے سبب' وہاں امریکی قیادت میں نیٹو افواج کی موجودگی بے اثر ہو چکی ہے' بلکہ افغان مسئلے کا بڑا سبب بن گئی ہے۔ یہ اس بات کا مظہر ہے کہ افغانستان سے اتحادی فوجوں کے انخلاء کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔

عراق میں جنگ کی صورت حال امریکہ کے لیے اور پریشان کن ہے۔ عراق میں متعین امریکی سفیر نے ۱۱ ستمبر کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ ''ایسا کوئی وقت نہیں آ سکتا جب امریکہ عراق میں اپنی کامیابی کا دعویٰ کر سکے۔'' سینیٹر جان بڈن (John Beden) نے جو سینیٹ کی خارجہ تعلقات کی کمیٹی کے سربراہ ہیں اس سے بھی آگے بڑھ کر بات کی ''عراق میں کوئی فوجی کامیابی نہیں ہو سکتی۔'' سینیٹر کیری (Kerry) نے مسئلے کو مزید الجھاتے ہوئے کہا ''ہمیں عراقی سیاستدانوں کی خاطر جو ہر مصالحت سے انکاری ہیں' اپنی مزید افواج کو جانیں اور اعضاء قربان کرنے کے لیے نہیں کہنا چاہیے۔'' لہٰذا القاعدہ کی رہنمائی میں سرکشوں کی کامیابی ان کی پہنچ میں ہے۔

امریکہ' عراق میں اپنی جس کامیابی کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے وہ اصل میں امریکہ مخالف سنی اتحاد کے ساتھ ایک اہم قبائلی رہنما ابوریشا (Abu Risha) کی دشمنی ہے جو القاعدہ کی جنگ میں امریکیوں کے ساتھ مل گیا تھا' لیکن کامیابی کا یہ شور وغوغا اس وقت ختم ہو گیا جب ابوریشا ایک مقابلے میں ہلاک ہو گیا' صدر بش کے ساتھ تصویر کھنچوانے کے محض دس روز بعد۔ اس کے علاوہ بصرہ اور جنوبی صوبوں میں شیعوں کی ایک مشترکہ

جدوجہد امریکیوں کے خلاف چل رہی ہے۔

صدر بش اور جنرل پیٹرائس (Patraeus) صوبہ انبار (Anbar) میں اپنی نا نہاد کامیابی کا شور مچا رہے ہیں اور اسے اپنی حکمت عملی کی فتح قرار دے رہے ہیں لیکن کامرانی و کامیابی کے اس غبارے سے اس وقت ہوا نکل گئی جب نہ صرف ابوریشا ہلاک ہوا بلکہ انبار صوبے کے لوگ بھی امریکیوں کی شدید مخالفت جاری رکھے ہوئے ہیں اے بی سی (ABC) نیوز ایجنسی نے اگست ۲۰۰۷ء میں ایک سروے کیا جس میں بی بی سی اور جاپانی براڈ کاسٹر HHK نے یہ رائے ظاہر کی کہ انبار (Anbar) کے ۷۳ فیصد رہائشی امریکی افواج پر قطعی اعتبار نہیں کرتے (مارچ میں یہ تعداد ۴۹ فی صد تھی) اور چاہتے ہیں کہ امریکی عراق سے فوری طور پر نکل جائیں۔

اب پاکستان کی جنگجوئی کی کارروائیوں کی طرف آئیں۔ ۶ ستمبر ۲۰۰۷ء کے ڈان (Dawn) کے مطابق تازہ ترین اطلاع ہے کہ حکومت پاکستان طالبان کے آگے اس وقت جھک گئی جب انھوں نے تقریباً تین سو فوجیوں کو یرغمال بنالیا' جن کے بارے میں خبر یہ ہے کہ انھوں نے ایک گولی چلائے بغیر ہتھیار ڈال دیے۔ طالبان کی ان بے نظیر کامیابیوں سے حکومت پاکستان گھبرا گئی اور اس نے محسود قبائل کے ان سو قیدیوں کو رہا کر دیا جنھیں ۱۹۰۶ء کے سرحدی جرائم کے قانون (Frontier Crime Regulation) کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ طالبان ایک حقیقت ہیں اور القاعدہ نے خود کو طالبان سے کہیں بڑی حقیقت ثابت کر دیا ہے' اس لیے امریکی قیادت میں مغرب کی اتحادی فوجوں کو افغانستان میں ان کے ساتھ مذاکرات کرنے چاہییں۔ تین سو پاکستانی فوجیوں کو یرغمال بنانا جس میں ایک کرنل اور دو میجر شامل تھے طالبان کی دور رس حربی کامیابی تھی۔ جس کے بعد ایک اور حیرتناک کامیابی سامنے آئی جب انھوں نے راولپنڈی میں جنرل ہیڈکوارٹرز کے قریب اس بے شناخت فوجی گاڑی کو نشانہ بنایا جس میں فوج کے انتہائی خفیہ ادارے کے ملازمین سوار تھے' ان میں ۳۲ ہلاک ہوئے اور ۷۰ زخمی ہوئے۔ کچھ ہی دنوں بعد ایک خودکش بمبار

نے کمانڈو کے ایک مضبوط مورچہ بند فوجی ٹھکانے میں گھس کر ۱۶ فوجیوں کو ہلاک اور بہتوں کو زخمی کر دیا۔ راولپنڈی گیریسن میں یہ دو دھماکے جہاں تک ان کے نشانے' وقت اور مقام کا تعلق ہے' کوئی معمولی نوعیت کے دھماکے نہیں تھے۔ ان دو بہت ہی مربوط دھماکوں نے جسم کو کپکپا دینے والا یہ پیغام دیا ہے کہ جنگجو کہیں بھی اپنی منشا کے مطابق نشانہ بنا سکتے ہیں حتیٰ کہ فوج کے حساس ترین ادارے پر بھی۔ اس سے زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ ان دھماکوں سے دل دہلا دینے والا یہ پیغام بھی ملتا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قومی سلامتی کے اداروں کے اندر جنگجوؤں کے کچھ ہمدرد اور حمایتی موجود ہیں۔ یہ بات یوں ظاہر ہے کہ ان اداروں کے اندر سے اعانت کے بغیر جنگجوؤں کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ خفیہ ایجنسی کی بغیر شناخت والی بس کا صحیح صحیح شیڈول معلوم کر سکتے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جنگجو صدر مشرف کو اپنا دشمنِ اول سمجھتے ہیں جس کی وجہ صدر مشرف کی آزاد خیالی کی غیر اسلامی پالیسی' اسلامی جنگجو گروپوں سے ان کی دشمنی اور نام نہاد دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی جنگ ہے' جو حقیقتاً اسلام کے خلاف جنگ ہے۔ اس سے بھی اہم بات یہ کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ پر بے رحمانہ فوجی آپریشن کے بعد یہ تلخ حقیقت سامنے آئی ہے کہ اس نے اسلامی جنگجوئی کو کمزور نہیں بلکہ زیادہ خونخوار اور ہولناک بنا دیا ہے۔

یہ لال مسجد کے خلاف انتہائی بیہمانہ فوجی آپریشن تھا جس سے قبائلی علاقوں میں انتقام کی ایک آگ بھڑک اٹھی ہے جن میں وہ اضلاع شامل ہیں جو پرسکون تھے جیسے سوات۔ صوبہ سرحد کے سیکرٹری داخلہ اور آئی جی پولیس نے اعتراف کیا ہے کہ ۵۹ دیہاتوں میں حکومت اپنی عملداری کھو چکی ہے اور وہاں علماء کے حمایتیوں نے متوازی حکومت قائم کر لی ہے۔ ان حالات سے مشرف حکومت کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں اور طالبان کے ساتھ فوجی تصادم کی اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور ان کے ساتھ افہام و تفہیم اور مصالحت کی حکمت عملی اپنانی چاہیے' چاہے امریکہ اس بارے میں کچھ بھی سوچے۔

پاکستان کے روزنامہ ڈان نے اپنے ۵ ستمبر ۲۰۰۷ء کے اداریے میں حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ فوجی آپریشن کی بجائے سیاسی حکمت عملی اپنائے جواس کے خیال میں شمالی وزیرستان کے ساتھ گفت وشنید سے آگے جانی چاہیے' جس کی افسوس ہے کہ امریکہ اور مغرب نے تحقیر کردی ہے۔ صدر بش نے اپنے ۵ ستمبر کے تازہ ترین بیان میں فرمایا ہے کہ امریکہ کسی صورت میں عراق سے اپنی فوج واپس نہیں بلائے گا۔ اس بیان نے انجیر کے ان پتوں کو ہوا میں اڑا دیا ہے جن سے فوجی قبضے کو کسی طرح ڈھانپنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اس نے باغیوں کو جنگ جاری رکھنے کا ایک بڑا اخلاقی اور سیاسی جواز مہیا کردیا ہے۔ ۵ ستمبر کو اے ایف پی (AFP) نے یہ رپورٹ کیا کہ محترمہ بینظیر بھٹو نے اپنے اعتدال پسند لیڈر ہونے کی یوں سند پیش کی ہے کہ وہ اسلامی جنگجوئی سے سختی سے پیش آئیں گی' اور طالبان اور انتہا پسندوں کے ساتھ شدت سے نمٹیں گی۔ انھوں نے یہ یقین دلایا ہے کہ وہ افغانستان میں واشنگٹن کے ساتھ اتحاد اور نیٹو (NATO) سے تعاون جاری رکھیں گی جو شاکی ہیں کہ مشرف کافی کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بینظیر امریکہ مخالف لہر کے خلاف جائیں گی' کوئی نہیں جانتا کہ ان کے ساتھ کیا ہو۔

۲۵ اکتوبر کو بلاول ہاؤس پر میڈیا سے باتیں کرتے ہوئے محترمہ بے نظیر بھٹو ان اِداروں پر بہت گرجی برسی ہیں جنھیں انھوں نے سیاسی مدرسوں کا نام دیا۔ انھیں یہ بات یاد دلائی جائے کہ قرآن پاک اسلامی امہ کے سیاسی کردار سے متعلق ہدایتوں سے بھرا ہوا ہے۔ قرآن پاک نے اہل ایمان کی یہ ذمہ داری بتائی ہے کہ وہ معروف کی تعلیم دیں اور منکرات سے لوگوں کو روکیں (آل عمران:۔ الروم: ۴۱)۔ اہل ایمان اپنا یہ مشن کس طرح پورا کریں گے جب تک وہ زمین پر اپنا اقتدار نہ حاصل کریں' یعنی انھیں سیاسی قوت نہ حاصل ہو۔ اس لیے یہ کوئی بری بات نہیں ہے اگر اس مشن کی تکمیل کے لیے مدارس اپنے طلباء کو اسلام کی سیاسی ذمہ داری اور ترویج کی تعلیم دیں۔

انھوں نے نام نہاد سیاسی مدرسوں کو اسلحہ خانہ اور جنگجوؤں کی پناہ گاہ بننے پر دھمکی

دی ہے۔ مشرف حکومت شدّ و مد سے چلائی جانے والی اپنی طویل مہم میں ایک بھی مدرسہ ایسا دریافت نہ کرسکی جو اسلحوں کا ذخیرہ یا جنگجوؤں کی پناہ گاہ ہو۔ اگر انھیں پاکستان میں کسی ایسے مدرسے کا علم ہے تو انھیں اس کی نشاندہی کرنی چاہیے تاکہ حکومت ان کی فوری گرفت کرسکے اور ان کو نشان عبرت بنا دے۔

بغیر کسی ثبوت کے نام نہاد سیاسی مدرسوں کو دھمکی دینے کا مطلب یہ ہے کہ امریکی انتظامیہ اور پریس کے مدرسہ مخالف اور اسلامی جنگجوئی کے خلاف پروپیگنڈے کے شور میں وہ بھی دھن سے دھن ملا رہی ہیں۔ امریکی پریس خاص طور پر اسلام کے نظریۂ جہاد کے خلاف زہر اگل رہا ہے اور مدرسوں کو اسلامی جنگجوئی کی پرورش کرنے پر دھمکی دے رہا ہے۔

مغرب خاص طور پر امریکہ میں، مدرسوں کے نظام تعلیم پر غیر منصفانہ ملامت کی جا رہی ہے اور ان کے بارے میں بے بنیاد خطرات اٹھائے جا رہے ہیں۔ قرآنِ پاک اللہ کی راہ میں، جب اور جہاں ضرورت پڑے جہاد کرنے کے احکامات سے بھرا ہوا ہے۔ اس لیے اس میں کوئی برائی نہیں اگر مدرسے اپنے طلباء کو جہاد اور قتال کی وہ تعلیم دیں جسے قرآن میں واضح کیا گیا ہے۔ امریکہ کے اشارے پر مسلم ممالک کی موجودہ کوشش کہ ان کے اسلامی نظام تعلیم سے جہاد کے موضوع پر مشتمل مواد کو نکال دیا جائے، اسلام کے عقیدے اور یقین پر ایک انتہائی عیارانہ حملہ ہے۔ قرآن میں دیے گئے جہاد و قتال کے نظریے کے مقابلے میں اعتدال پسندی اور روشن خیالی کا نعرہ مسلمانوں کے دلوں سے جذبہ جہاد کو ختم کر دینے کا ایک مکروہ منصوبہ ہے۔ قرآن حکیم میں جہاد مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے (البقرہ: ۱۹۲، ۱۹۳، ۲۱۶، النساء: ۷۵)

صدر مشرف اسلامی جنگجوؤں سے مصالحت کے لیے غالباً اس وقت تک تیار نہیں ہوں گے جب تک اسلامی جنگجوؤں کے معاملے میں امریکی پالیسی یکسر تبدیل نہیں ہو جاتی۔

عراق اور افغانستان میں جاری سرکشی کے سبب امریکہ معاشی نقصان اور سیاسی

عدم استحکام کی صورت میں بھاری قیمت ادا کر چکا ہے۔ ۳۰ ستمبر ۲۰۰۷ء تک ان دو بغاوتوں کے خلاف امریکہ دوسو چار ملین (۲۰۴) ڈالر کی خطیر رقم خرچ کر چکا ہے۔ اگر افراطِ زر کو بھی شامل کر لیا جائے تب بھی یہ رقم ویتنام اور کوریا کی جنگ میں اٹھنے والی رقم سے کہیں زیادہ ہے۔

اگر امریکی قبضہ اگلے عشرے تک جاری رہتا ہے جس کا بہت زیادہ امکان ہے صدر بش کے مطابق عراق میں فوجی موجودگی کم کی جا سکتی ہے مگر فوج کا مکمل انخلاء نہیں ہو سکتا' اس ضمن میں کانگریس کے بجٹ آفس نے خرچ کا جو اندازہ لگایا ہے وہ ۲.۴ ٹریلین (2.4 Trillian) ڈالر کی پریشان کن رقم ہے چونکہ ان بغاوتوں کے خلاف جنگ کے اخراجات قرض لے کر پورے کیے جا رہے ہیں' ان کے برے اثرات امریکی اقتصادیات پر محسوس کیے جانے لگے ہیں۔ ہاؤسنگ سیکٹر جو اندرونی سرمایہ کاری کا ایک بڑا سیکٹر ہے کساد بازاری کا شکار ہو چکا ہے۔ خریداروں کے نہ ہونے کے سبب غیر فروخت شدہ مکانوں کی بہتات ہے۔ اندازہ ہے کہ اس سال رہن پر لیے ہوئے تقریباً ایک ملین مکانات واپس کر دیے جائیں گے کیونکہ جن لوگوں نے یہ مکانات لیے تھے' ان کے پاس رہن کی قسطیں ادا کرنے کے لیے رقم دستیاب نہیں۔

اس لیے امریکہ کے لیے فوری ضرورت یہ ہے کہ وہ غور نہ کرنے والے امور پر غور کرے۔ اگر امریکہ روس سے جسے وہ ایک بری سلطنت سمجھتا تھا بات کر سکتا ہے' اگر وہ ایران سے' جسے وہ بدی کا شیطانی محور سمجھتا ہے' بات کر سکتا ہے تو آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا اگر امریکہ اسامہ کی صلح کی پیشکش کو قبول کر لے۔ اسامہ نے ایک حاوی قوت ہونے کے باوجود منصفانہ بنا پر قائم رہنے والی طویل صلح کی صورت میں زیتون کی ایک شاخ پیش کی جسے امریکہ نے حقارت سے جھٹک دیا۔ جیسا کہ الجزیرہ نے ۱۹ جون ۲۰۰۶ء کے اپنے نشریے میں بتایا۔ یہ بات یاد دلائی جا سکتی ہے کہ اسامہ یونٹ کے انچارج سی آئی اے کے سابق ڈائریکٹر نے تصدیق کی ہے کہ ''اسامہ دہشت گرد نہیں ہے بلکہ جنگ کا ماہر ایک معزز اور منکسر المزاج شخص ہے۔'' لہٰذا اسلامی جنگجوئی کی بڑھتی

ہوئی لہر سے نکلنے کے لیے اسامہ ہی وہ شخص ہے جس سے مذاکرات کیے جا سکتے ہیں۔
اسامہ کے ساتھ گفت و شنید میں ہچکچاہٹ پر امریکہ' فرانس فوکویاما (Francis Fukuyama) کے اس مفید مشورے پر عمل کرنے سے قابو پا سکتا ہے جس نے کہا ہے کہ وہ (صدر بش) امریکی طاقت کی محدودیت کا خیال رکھے' فوج پر انحصار کم کرے اور دوسرے ممالک کے مفادات و تصورات اور ابھرتے ہوئے بین الاقوامی طرز عمل اور اداروں کا احترام کرے۔ کچھ ہی دن قبل' جولائی ۲۰۰۷ء میں کسی وقت برطانوی کابینہ کے ایک بہت اہم وزیر نے جب وہ واشنگٹن میں تھا' کہا کہ ایک ملک اپنی فوجی طاقت سے نہیں' اپنے نرم رویے سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کی شناخت اشتراک عمل سے ہوتی ہے یکطرفہ عمل سے نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ میں خوش گوار اشتراک عمل کے حق میں' پر سکون فضا ہموار ہونا شروع ہو گئی ہے۔

صاحب مضمون

جناب اسرار الحق ۳ جولائی ۱۹۲۷ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے ۱۹۵۰ء میں پٹنہ یونی ورسٹی سے اقتصادیات میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور ۱۹۸۷ء میں پاکستان انسٹیٹیوٹ آف مین پاور (Pakistan Institute of Manpower) اسلام آباد سے ڈائریکٹر کی حیثیت میں ریٹائر ہوئے۔

آپ مندرجہ ذیل کتابوں کے مصنف ہیں:

۱۔ اسلامی نشاۃ ثانیہ کی طرف (Towards Islamic Renaissance)
(ناشر: فیروز سنز: ۱۹۸۷ء)

۲۔ مین پاور پلاننگ۔ پاکستان کے تناظر میں ایک مطالعہ
(Manpower Planning a case study of Pakistan)
(ناشر: مین پاور انسٹیٹیوٹ، اسلام آباد)

۳۔ دہشت گردی کے محاذ پر امریکہ کی جنگ
(America's war on terror : A Showdon war Islam)
(ناشر: مصنف)

۴۔ امریکہ کا لمحۂ آزمائش: فریب نظر کا اختتام
(America's Moment of truth: The end of Illusions)
(پیش لفظ: آغا شاہی (مرحوم) سابق وزیر خارجہ پاکستان۔ ناشر: بیت الحکمت لاہور)

مندرجہ ذیل سہ ماہی جریدوں میں بھی مضامین لکھے۔

۱۔ پاکستان ڈیولپمنٹ ریویو۔(Pakistan Development Review)
(ناشر: پاکستان انسٹیٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اکانومکس، اسلام آباد)

۲۔ دی مسلم ایجوکیشن (The Muslim Education)

(کیمبرج سے شائع شدہ)

صاحب مضمون ملک کے قومی انگریزی روز ناموں میں بھی مضامین لکھتے رہے ہیں، جیسے

THE DAWN, THE NEWS, THE NATION, THE FRONTIER POST.

America's Moment of Truth

The End of Illusions

Islam's Encounters with the West

امریکہ کا لمحہ حقیقت

اختتام خیال خام (شکست شعبدہ گری)

اسلام اور مغرب کا تصادم

مصنف: اسرار الحق

مترجم۔ نسرین طلعت

باب : ۱

ریاستہائے متحدہ کی ناکام یک طرفیت
نئی امریکی صدی کے لیے منصوبہ

افسوس کہ دنیا اب تک اس غلط فہمی کی قیدی رہی ہے کہ 9/11 کا دہشت گرد حملہ ہی دنیا کے بدل ڈالنے کا سبب تھا۔ جس کی وجہ سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کے پاس اس کہ سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ اپنی حد درجہ متشدد یک طرفہ پیش بند حملوں کی حکمت عملی پر عمل کرے۔ ۱۱ستمبر کے حملوں کے بعد ہمدردی کی جو لہر ساری دنیا میں پھیلی اس نے لوگوں کو اس قابل ہی نہ چھوڑا کہ وہ جذبات کی سطح سے بلند ہو کر منطقی سوچ کے ذریعے امریکہ کی اس حکمت عملی کی پشت پر موجود اصل ارادوں کو بھانپ سکتے، جس نے اقوام متحدہ اور عالمی امن و سلامتی کے داعیوں کو روند ڈالا ہے۔ اب جبکہ (۱۱ستمبر کے متعلق سچائیاں نظر آنے لگی ہیں) یہ بات واضح ہوتی جارہی ہے کہ ۱۱ستمبر نے امریکی یک طرفیت کی ابتدا کرنے سے بہت آگے بڑھ کر (Project for new American Century)PNAC یعنی نئی امریکی صدی کے مجوزہ نقشہ پر کام کے آغاز کا بہانہ فراہم کردیا ہے۔ یہ منصوبہ ہے کیا؟ اس کی مفصل تصویر مائیکل میشیل (Michael Michele) نے جو ۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۳ء تک برطانوی کابینہ میں وزیر ماحولیات رہے ہیں اپنے مقالہ میں بیان کی ہے۔ یہ مقالہ مانچسٹر گارڈین میں شائع ہوا تھا۔ یہ منصوبہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء سے بہت پہلے ۱۹۹۷ء میں Project for new American Century کے نام سے نئے امریکی بنیاد پرستوں نے تیار کیا تھا جو کہ جناب بش کی

بطور صدر ریاستہائے متحدہ امریکہ حلف برداری سے بھی پہلے کی بات ہے۔ ۹/۱۱ کے بارے میں زمین کو ہلا دینے والی حقیقت آخرکار باہر آنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ ایرک مارگولیس (Eric Margolis) نے یہ حقیقت بے نقاب کی ہے کہ کچھ دن قبل جرمن عدالتیں اس نتیجہ پر پہنچ گئی ہیں کہ ۹/۱۱ کا منصوبہ ہیمبرگ میں تیار ہوا تھا نہ کہ افغانستان میں اور عدالت کو القاعدہ کی اس ضمن میں کسی منصوبہ بندی کا کوئی اشارہ نہ مل سکا۔ اس پر تو دنیا کو غنودگی سے باہر آ کر ۱۱ ستمبر کے متعلق ان باتوں پر غور کرنا چاہیے جواب تک قابلِ غور نہیں سمجھی گئیں خصوصاً وہ کچھ جو اس کے نتیجہ میں ہو رہا ہے۔

تاریخی پس منظر گواہ ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ اپنے عوام کی خواہش کے خلاف جنگ میں کود پڑنے کے لیے جھوٹے بہانے تراشنے کی عادت میں مبتلا رہا ہے۔

امریکی انتظامیہ کو پرل ہاربر پر حملہ کے جاپانی منصوبہ کی خبر تھی لیکن اس نے بڑی احتیاط سے بحرالکاہل میں اپنے بحری بیڑے کو خبر نہ ہونے دی کیونکہ اسے اس حملہ کی ضرورت تھی تاکہ امریکیوں کو جنگی جنون میں مبتلا کر کے دوسری جنگ عظیم میں جھونکا جا سکے۔ انھوں نے خلیج ٹونکن (Tonkin) میں امریکی بحریہ کے جہاز پر حملہ کا بہانہ تراشا تاکہ ویت نام پر حملہ کر سکیں۔ اسی طرح فلپائن کے ساحلوں اور کیوبا پر حملہ کرنے کی خاطر ایک امریکی بحری جہاز پر کیوبا کی آبدوز کے حملہ کا جواز تخلیق کیا گیا۔

اس سلسلہ کی جدید ترین کڑی عراق پر اس بہانہ سے حملہ ہے کہ صدام نے تخریب عام کے لیے ڈھیروں ہتھیار جمع کر رکھے ہیں۔

ایسے میں ۱۱ ستمبر کے حملے افغانستان اور دوسرے ممالک پر پیش بند حملوں کے لیے جواز کے طور استعمال کیے گئے تو اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ یہ سب کچھ ساری دنیا پر بلاشرکت غیرے امریکی تسلط اور PNAC منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تھا تاکہ امریکہ پوری دنیا پر اپنی اقدار بلا روک ٹوک مسلط کر سکے۔ امریکی انتخابات سے ذرا پہلے ہی PNAC نے امریکی دفاع کی تشکیل نو کے لیے ایک رپورٹ تیار کی تھی جس میں فوجی اخراجات بڑھانے' ساری دنیا میں امریکی طاقت کی حفاظت اور جہاں ضرورت

محسوس ہو فوجی طاقت (Constabulary force) کے استعمال پر زور دیا گیا۔

اس منصوبہ کی جڑیں متنازعہ مسودہ Defence Planning Guidelines (DPG) میں ہیں جو پال وولفوٹز نے ۱۹۹۲ء میں تیار کیا تھا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ دنیا پر مکمل طور پر اور بلا مقابلہ حاوی ہو یہ خیال شدت پسند (Neo conservative) امریکیوں کے دماغوں پر چھایا رہا ہے' ان لوگوں کی قیادت سابقہ سیکرٹری دفاع وولفوٹز کرتے ہیں جو حکومتوں کی تبدیلی کے حامی ہیں۔ دوسرے جدید بنیاد پرستوں کے ساتھ انھوں نے اس تجویز کو تقویت دی کہ جہاں بھی امریکی مفادات کے لیے ضروری ہو حکومت تبدیل کر دینی چاہیے۔ چنانچہ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں فلپائن کے صدر مارکوس کو جو طویل عرصہ تک قصرابیض کو عزیز رہے تھے، جب امریکہ کے لیے اہم نہ رہے تو فلپائن کو منظر سے ہٹانے کی ترکیبیں اختیار کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی گئی۔ اسی طرح انڈونیشیا میں سوہارتو امریکی آشیر باد سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں اشتراکیوں اور سوئیکارنو کے حامیوں کو قتل کر کے برسراقتدار آئے تھے انھیں امریکی مفادات کے مطابق کام کرنے کے لیے بے انتہا چھوٹ تھی لیکن جیسے ہی ان کی افادیت باقی نہ رہی انھیں IMF کے انتظامات کے تحت اقتدار چھوڑنا پڑا۔ ان دونوں صدور کو ہٹانے میں وولفوٹز نے قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔ سرد جنگ کے اختتام پر فوجی انتظامات کم کرنے کے بجائے بنیاد پرستوں نے پیش بلند حملوں کے ذریعے دفاع کرنے کے لیے فوجی تیاریوں میں اضافہ کا مطالبہ کیا جیسا کہ بوسٹن گلوب نے ۱۳/اپریل ۲۰۰۳ء کو لکھا تھا۔ انھوں نے دشمن نمبر ایک کے طور پر اسلامی دنیا پر نظریں گاڑ دی ہیں۔

اس طرح ۱۹۹۶ء میں سرد جنگ کے بعد مشرق وسطی مرکز توجہ بن گیا۔ fieth اور Perle مشترکہ طور پر تحریر کردہ پالیسی پر مبنی مقالہ میں دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ آمروں کے تختے الٹائے جانے کے زنجیری سلسلہ (Domino Effect) پر زور دیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہ شام کو کس طرح لگام دی جائے۔ اسی مقصد سے تمام تر توجہ صدام کو اقتدار سے ہٹانے پر مرکوز ہوئی۔

جدید بنیاد پرستوں نے صدام کے دو سو فیٹ اونچے کانسی کے مجسمے کے انہدام کو دیوار برلن گرائے جانے سے تشبیہ دی۔

یہ نظریہ Pax Americana' جس کی بنیاد ڈومینو (Domino) والے نظریہ پر ہے وولفوٹز اور ان کے شدت پسند ساتھیوں کا مرتب کردہ تھا جو ایسے عالمی نظام کے حامی ہیں جس میں امریکہ کل عالم کا شہنشاہ ہو اور اس کے مقابل کوئی نہ ہو۔ اس Pax Americana کا مطالبہ یہ ہے کہ امریکی طاقت کو عالمی طور پر مربوط کیا جائے تا کہ وہ امریکہ اور اس کے حواریوں کے مفادات پر جہاں بھی ضرب لگنے کا امکان نظر آئے یا عالمی تعلقات میں رخنہ پڑنے لگے اور بین الاقوامی حالات انتشار و تشتت کا شکار ہونے لگیں تو کارروائی کر سکے۔ اس نظریہ کا اقوام متحدہ کے میثاق، عالمی قوانین یا اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ اس میں ایک مبہم لفظ ''اغلاط'' (wrongs) شامل کیا گیا ہے جن کو درست کرنے کی ذمہ داری امریکہ کی ہے جسے حق ہونا چاہیے کہ جہاں وہ چاہے غلطیوں کو درست کرنے کے لیے تو سخت اقدام کرے جبکہ عین اسی وقت کسی دوسرے ملک میں ایسا ہونے پر اُسے نظر انداز کر دے اور آنکھوں پر تجاہل عارفانہ کی عینک چڑھا لے۔

یہ نظریہ عملی صورت میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے لیے کھلم کھلا دہرے معیار میں ڈھل گیا ہے۔ مثال کے طور پر جہاں وہ سلامتی کونسل کی قراردادوں پر عمل نہ کرنے پر عراق کے اوپر پوری طاقت سے حملے کر دیتا ہے وہاں ہندوستان اور اسرائیل کی اِس سے کہیں شدید خلاف ورزیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ عراق کی فوج سے صدام کا تختہ الٹنے کو کہنے میں اسے کوئی باک نہیں' ایرانیوں کو یہ مشورہ دیتے ہوئے کوئی جھجک نہیں ہوتی کہ اسلامی حکومت کو ختم کر دیں لیکن اسی سانس میں فلسطینیوں، کشمیریوں اور چیچنیوں کو دہشت گرد قرار دے کر مذمت کرتا ہے جو غیر ملکی قبضہ اور جبر کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔

وولفوٹز کے Defence Planning Guidelines نامی گناہ سے جس کا اوپر

تذکرہ کیا گیا ہے PNAC اور دوسرے گناہوں نے جنم لیا۔ رمزفیلڈ کی مجوزہ فوجی تبدیلیاں جو فوجی تحفظ کی حکمت عملی قرار پائیں آخر کار ۱۰ دسمبر ۲۰۰۲ء کی اس صدارتی ہدایت پر منتج ہوئیں کہ ہلکے قسم کے جوہری ہتھیار دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پیش بند حملوں کے لیے استعمال کیے جائیں۔

جہاں وولفوٹز کے DPG نے امریکی دفاعی حکمت عملی کے لیے بصارت' ہدف اور عقلی جواز مہیا کیا نئی امریکی صدی کے متشدد منصوبہ نے جو ۱۹۹۷ء میں ترتیب پا چکا تھا اس خیال کو مستقبل کے امریکی دفاعی نقشوں میں ثبت کر دیا۔ اس نقشہ کے نمایاں نکات مندرجہ ذیل ہیں:

اس کے مطابق ریاستہائے متحدہ امریکہ کی انتظامیہ کے لیے ضروری ہے کہ خلیج پر مکمل اختیار حاصل کرے چاہے صدام برسراقتدار ہوں یا نہ ہوں۔ نقشہ میں کہا گیا ہے اگرچہ عراق کے ساتھ غیر حل شدہ جھگڑا فوری جواز مہیا کر دیتا ہے' خلیج میں بڑی تعداد میں امریکی فوجوں کی موجودگی صدام حسین کے اقتدار کے مسئلہ سے متعلق ہے' PNAC کا خاکہ وولفوٹز کے پیش کردہ سابق مسودہ کی تائید کرتا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے لیے صنعتی طور پر ترقی یافتہ کسی بھی ملک کی طرف سے اس کی قیادت کو پکارنے یا اپنے لیے کوئی اعلیٰ کردار حاصل کرنے کی کوشش کی حوصلہ شکنی کرنا لازمی ہے۔

بہر حال یہ مسودہ امریکہ کی عالمی قیادت کو آگے بڑھانے میں برطانیہ کے کردار کو اہم قرار دیتا ہے۔ امریکی سیاسی قیادت کو امن کے لیے کام کرنے والے مشنوں سے اقوام متحدہ کو الگ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ صدام کے منظر سے ہٹنے کے بعد بھی سعودی عرب اور کویت میں امریکی اڈے قائم رکھے جائیں تاکہ ایران کی طرف سے امریکی مفاد کو لاحق خطرے کا مقابلہ کیا جا سکے۔ یہ اس ضرورت کو بھی بیان کرتا ہے کہ چین کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے جنوبی ایشیا میں فوجی موجودگی کو بڑھایا جائے۔ یہ مسودہ امریکہ کے لیے صرف عالمی تسلط پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ خلاء

میں بھی امریکی طاقت کو پھیلانے کے لیے خصوصی خلائی فوج کی تیاری کی تجویز پیش کرتا ہے، ساتھ ہی Cyber Space پر مکمل اختیار اور دشمنوں کو انٹرنیٹ کے استعمال سے روکنے کی بھی وکالت کرتا ہے۔ یہ مسودہ یہاں تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ اس کی تجویز ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ حیاتیاتی ہتھیاروں کی ترویج کرے جن کے ذریعے مخصوص خمیر (Genotype) کو نشانہ بنایا جاسکے اور دہشت گردی کو کامیاب سیاسی حربہ میں تبدیل کیا جاسکے۔

اگرچہ یہ مسودہ ۱۱ رستمبر ۲۰۰۱ء سے خاصا پہلے تیار کیا گیا تھا، اس میں شمالی کوریا شام اور ایران کو خطرناک حکومتیں قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کے وجود کی وجہ سے ایک ''عالمی اختیاراتی تنظیم اور کمان'' کی تشکیل لازمی ہے۔ خبروں کے مطابق رمز فیلڈ عراق پر حملہ کے لیے اس طرح تلے ہوئے تھے کہ اطلاعات کے مطابق انھوں نے CIA کو ہدایت کی کہ وہ ایسے ثبوت تلاش کرے جن کے ذریعے ۹/۱۱ کے ساتھ عراق کا تعلق ثابت کیا جاسکے۔ لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود CIA کو ایسا ثبوت نہ مل سکا (ٹائم میگزین ۱۳ مئی ۲۰۰۲ء)۔ مائیکل کہتا ہے کہ درحقیقت ۹/۱۱ نے PNAC منصوبہ کو عمل میں لانے کے لیے ایک موزوں بہانہ فراہم کر دیا۔ تمام موجودہ شواہد چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ افغانستان اور عراق کے خلاف فوجی کارروائی کے منصوبے ۹/۱۱ سے پہلے ہی موجود تھے۔

Baker Institute of Public Policy نے امریکی حکومت کے لیے تیار کردہ رپورٹ میں اپریل ۲۰۰۱ء میں نشان دہی کی کہ ''ریاستہائے متحدہ اپنے توانائی کے تضاد کی قیدی ہے۔ ۱۸ رستمبر ۲۰۰۱ء کو BBC نے کہا کہ پاکستان کے ایک سابق خارجہ سیکرٹری نیاز اے نائیک کو ایک اعلیٰ امریکی افسر نے برلن کی ایک ملاقات میں جو وسط جولائی میں ہوئی تھی اور جو ۱۱/ستمبر سے بہت پہلے کی بات ہے بتایا کہ افغانستان کے خلاف کارروائی وسط اکتوبر میں ہوگی۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں افغانستان پر اکتوبر ہی میں حملہ ہوا۔ اس بہانہ پر کہ ملا عمر نے اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے نہیں کیا جن پر

۱۱ ستمبر کے حملوں کی منصوبہ بندی کا الزام تھا۔ یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ ۲۰۰۰ء کی ابتدا میں امریکی حکومت طالبان کو وسط ایشیا میں استحکام کا منبع سمجھتی تھی اور ان کا خیال تھا کہ موجودہ صورت حال ترکمانستان، ازبکستان اور قزاقستان سے HydroCarbon Pipeline کی افغانستان اور پاکستان کے راستہ بحر ہند تک تعمیر کے لیے مناسب تھی بدمزگی اس وقت پیدا ہوئی جب طالبان نے امریکیوں کو کھلا لائسنس دینے سے انکار کر دیا جس پر وہ مصر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے نمائندوں نے طالبان قیادت کو بیک وقت لالچ اور دھمکی دی کہ یا تو آپ ہمارا سنہری قالین قبول کر لیں ورنہ ہم آپ کو بمباری کے قالین میں دفن کر دیں گے۔ (۱۵ نومبر ۲۰۰۱ء، Inter Press Service)

وولفوئز کے DPG اور PNAC کے نقشہ کے اس تنقیدی جائزہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جو منصوبہ پہلے سے تیار تھا اس پر عمل درآمد شروع کرنے کے لیے ۱۱ ستمبر نے فقط ایک موزوں اور مناسب بہانہ فراہم کر دیا۔ اس تفصیلی نقشہ میں نہ تو عراق کے کسی WMD کا ذکر ہے نہ صدام حسین کے القاعدہ سے کسی تعلق کا یا دہشت گرد حملوں کے ارادوں کا۔ بلکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے بجائے یہ نقشہ کہتا ہے کہ دہشت گردی کی حقیقت کو کارآمد سیاسی حربہ بنایا جائے"۔

صدام رہے یا نہ رہے اس کا فیصلہ ہو چکا تھا کہ خلیج پر قبضہ کر لیا جائے۔ اسی طرح امریکہ جولائی ۲۰۰۱ء تک افغانستان سے تیل کی پائپ لائن گزارنے کے لیے مذاکرات کرتا رہا تھا۔ ان مذاکرات میں ناکامی کے بعد یہ حملہ کا منصوبہ جو پہلے سے تیار تھا روبہ عمل لایا گیا۔ نقشہ میں دہشت گردی کی کارروائیاں' القاعدہ اور طالبان کے ارادوں کا کہیں ذکر نہیں ان کو دہشت گردی سے منسلک کرنا اور خیالی دہشت گردی کے پہاڑ کھڑے کرنا بعد میں پیدا ہونے والا خیال اور مکمل افترا پردازی ہے۔ PNAC کا نقشہ اس بات کو خفیہ رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا کہ جدید بنیاد پرست جن کی حکومت آج کل امریکہ میں قائم ہے، ایک ایسے ریاستہائے متحدہ پر یقین رکھتے ہیں جس کی اجارہ داری اختیار اور حاکمیت خلاء سمیت پوری دنیا پر قائم ہو اور اس حاکمیت کی راہ میں کوئی

رکاوٹ کھڑی کرنے کی اجازت نہ دی جائے نہ اقوام متحدہ کو نہ عالمی قوانین کو اور نہ ہی اخلاقیات کو۔ اس نقشہ کے مطابق ریاستہائے متحدہ کو یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ کیا درست ہے اور کیا ''غلط'' اور صرف اس کے پاس ہی اختیار ہوگا کہ اس ''غلط'' کو درست کرنے کے لیے جو طریقہ وہ چاہے اختیار کرے۔

یہ نقشہ بش کی دفاعی اور خارجہ پالیسی کے لیے مکمل ایجنڈا فراہم کرتا ہے' یہ مسودہ Anti Ballistic Missile معاہدہ کو مسترد اور عالمی میزائیل سسٹم کی تنصیب اور اس کے استعمال کی حمایت کرتا ہے اور انتظامیہ نے عالمی اختلاف کو رد کرتے ہوئے اس کو اختیار کر لیا ہے۔ مزید یہ دستاویز انتظامیہ کو ہدایت دیتی ہے کہ چھوٹے جوہری ہتھیار ایسے تیار کرائے جو امریکہ کے مخالفین کے زیرزمین سخت مورچوں کو گہرائی میں جا کر نشانہ بنا سکیں۔ اس سال امریکی ایوان نے جس کو GDP کی مشاورت اور رہنمائی حاصل ہے پینٹا گون کو ایسا ہتھیار بنانے کے لیے سبز بتی دکھا دی ہے جبکہ Senate نے ایسا نہیں کیا۔ جب کہ بوسٹن گلوب نے ۱۳ اپریل کو لکھا ہے کہ Eliot Engel نے جو عالمی کمیٹی کے رکن اور شام پر پابندیاں لگانے کے بل کے شریک پیش کار ہیں ۱۱ اپریل ۲۰۰۳ء کو کہا اس کا مطلب صرف یہی نہیں کہ ہم افغانستان جائیں اور پھر گھر واپس چلے جائیں۔ پیش بند حملوں کے داعی امید رکھتے ہیں کہ عراق میں کارروائی مشرق وسطیٰ کی تشکیل کے لیے وسیع کوششوں کو تیز تر کر دے گی' امریکی طرز کی جمہوری اقدار کی ترویج کرے گی اور دہشت گردانہ کارروائیوں کو ختم کر دے گی۔

اس حکمت عملی کے داعی ایک پوری نسل کے لیے جغرافیائی سیاست کو پھر سے تحریر کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں انتظامیہ کے اعلیٰ ترین افسران مثلاً نائب صدر ڈک چینی سیکرٹری دفاع پال وولفوٹز، نائب سیکرٹری دفاع ڈگلس فیتھ اور رابرٹ پرل جو ماضی قریب میں دفاع پالیسی بورڈ کے سربراہ تھے جس کا کام پینٹا گون کو مشورے دینا ہے' شامل ہیں۔ عراق کی آزادی کے ساتھ دہشت گردی کے خلاف جنگ ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ حرکت میں رہے گی' یہ بیان ایک اعلیٰ انتظامی افسر کا ہے۔ شامی غلط حرکات

کر رہے ہیں' ان کو اس کا احساس دلانے کی ضرورت ہے۔ وولفوٹز نے Senate کی سالانہ کمیٹی کو بتایا اور دھمکی دی کہ اگر وہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے انتباہ پر دھیان نہیں دیں گے تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ اپنی پالیسی پر غور کریں۔

ریاستہائے متحدہ کی قومی دفاعی حکمت عملی

امریکی فوج کی تشکیل کی حمایت کرتے ہوئے رمزفیلڈ(Foreign Affairs جولائی، اگست ۲۰۰۲ء) درحقیقت PNAC کے خاکہ پر ہی عمل کر رہے تھے جو ۱۱ ستمبر سے بہت پہلے سے تیار تھا، اور چھ مقاصد کے حصول کے لیے بنایا گیا تھا (۱) وطن کی حفاظت اور سمندر پار اڈوں کی حفاظت (۲) دور دراز کے علاقوں میں طاقت کا حصول (۳) دشمنوں کو ٹھکانے حاصل کرنے نہ دینا اور ان پر واضح کر دینا کہ دنیا کا کوئی گوشہ بہت دور نہیں ہے کوئی پہاڑ بہت اونچا نہیں ہے کوئی غار یا بنکر بہت گہرا نہیں ہے کوئی SUV اتنا تیز نہیں ہے کہ ہماری پہنچ سے دور پہنچا دے۔ (۴) اپنے اطلاعاتی جال کو حملوں سے بچانا (۵) مختلف امریکی فوجوں کو اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے ذریعے مربوط رکھنا تاکہ وہ متحد ہو کر لڑیں (۶) خلا میں اپنی پہنچ کو بلا رکاوٹ قائم رکھنا اور اپنی خلائی صلاحیتوں کو دشمنوں کے حملہ سے محفوظ رکھنا۔ اس طرح رمزفیلڈ نے خاکہ کی جزئیات طے کیں جس کو سرکاری طور پر ستمبر ۲۰۰۲ء میں قومی دفاعی حکمت عملی میں واضح کر دیا گیا۔

اپنے اہداف اور مقاصد کی مزید تفصیل میں جاتے ہوئے رمزفیلڈ اس خاکہ کا عقلی وقانونی جواز بتاتے ہوئے ۱۱/ ستمبر کے واقعات پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں آج ہمارے مخالف بدل گئے ہیں جس کے ساتھ ان کی مخالفت کا احصاء (Calculus) بھی بدل گیا ہے۔ جن دہشت گردوں نے ۱۱/ ستمبر کو حملہ کیا وہ ہمارے بے پناہ جوہری ہتھیاروں سے نہ رکے۔ نئے مخالفوں کو روکنے کے لیے ہمیں نئے طریقے ڈھونڈنے پڑیں گے۔ اخیر میں ہمیں نہ صرف اپنی موجودہ صلاحیتیں بدلنی ہوں گی بلکہ جنگ کے متعلق سوچنے کا طریقہ بھی۔ یہ PNAC کا خاکہ ہے جس نے NSS کی تشکیل کی، جو

نہ صرف سمت حاصل کرنے بلکہ جنگ کے بارے میں سوچنے کا طریقہ بدلنے کے لیے نظریاتی بنیاد مہیا کرتا ہے۔

رمزفیلڈ جنگ کی حالت میں اتحادیوں کی ضرورت اور پسندیدگی کو کم کر کے انتہائی غیر ضروری دکھاتے ہیں، جنگیں ایک اتحاد کے ذریعے لڑی جا سکتی ہیں لیکن وہ ایک کمیٹی کے ذریعے نہیں لڑی جانی چاہئیں، اتحادیوں کا انتخاب خود مشن کو کرنا چاہیے نہ کہ اتحاد مشن کا فیصلہ کرے۔ یہ نظریہ اجتماعی دفاع کے خلاف ہے جو کہ اقوامِ متحدہ کے میثاق میں شامل ہے۔

جنگ کے متعلق سوچنے کے لیے رمزفیلڈ کے بدلے ہوئے خیالات کی مثال اس انتہائی ڈھیٹ اور متنازع بیان سے ظاہر ہے کہ ریاستہائے متحدہ کا دفاع حفظ ما تقدم اور کبھی کبھی پیش بندی کا مطالبہ کرتا ہے، ہر خطرہ کے خلاف ہر جگہ اور تمام اوقات میں دفاع ممکن نہیں ہوتا۔ دہشت گردی اور نئے ابھرنے والے خطرات سے دفاع کا تقاضا ہے کہ ہم جنگ کو دشمن تک لے جائیں، بہترین اور بعض حالات میں واحد دفاع جارحیت ہوتی ہے۔ دشمن کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم تمام میسر ذرائع ان کو شکست دینے کے لیے استعمال کریں گے اور ہم فتح کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہیں۔

مندرجہ بالا بیان کو اس سے پہلے کے بیان سے ملا کر پڑھا جائے مثلاً ہمیں زیادہ حوصلہ مندانہ انداز کی ہمت افزائی کرنی چاہیے جو لوگوں کو پیش عمل بننے کی ہمت افزائی کرے نہ کہ تعاملی ردعمل کی مانند جو امر شاہی کی طرح کم اور سرمایہ دار کے حکم کی طرح زیادہ ہو، جو خطروں کے ابھرنے اور ان کی توثیق کا انتظار نہیں کرتا بلکہ ان کے ابھرنے سے پہلے ہی اندازہ لگا لیتا ہے۔ اس ساری منصوبہ بندی سے ریاستہائے متحدہ کے پیش بند نظریہ اور یک طرفیت کی وسعت کا پتہ چل جاتا ہے۔

اس عقیدہ سے باخبر اور حوصلہ یافتہ صدر بش نے اوائل جولائی ۲۰۰۲ء میں West point میں ایک پالیسی بیان میں اعلان کیا: ''اگر ہم خطروں کے پوری طرح ابھرنے کا انتظار کریں تو یہ ضرورت سے زیادہ انتظار ہوگا۔ ہمیں لازماً جنگ کو دشمن تک

لے جانا چاہیے۔ Mark Thompson پوچھتا ہے جب دوسری قومیں ریاستہائے متحدہ کی مثال پر اس پیش بند حملہ کو اپنی حکمت عملی میں شامل کر لیں گی تو کیا ہوگا؟ یہی عالمی انتشار کا راستہ ہے۔'' (ٹائم میگزین یکم جولائی ۲۰۰۲ء)

قاری کو بے اختیار ہملر (Himmler) کی وہ ہدایت یاد آجاتی ہے جو اس نے نازی گستاپو کو دی تھی۔ پہلے گولی چلاؤ اور سوالات بعد میں کرو۔ تمھاری حفاظت میں کردوں گا۔ نازی جرمنی کی طرح صدر بش نے بھی تشدد اور عقیدہ کی دنیا اور طاقت پرانحصار کو ترجیح دی ہے، اور جیسا کہ Jorge Surges نے لکھا ہے اگر جرمنی ہار گیا تو کوئی بات نہیں، بات یہ ہے کہ اب تشدد کی حکومت ہے۔ اس طرح بش نے نازی فاشزم کی حیات نو کے لیے میدان ہموار کر دیا ہے۔

اس صدارتی اعلان کے بعد ایک کانفرنس میں نائب صدر ڈک چینی کا بیان آیا۔ اگر ریاستہائے متحدہ فوجی اقدام سے پہلے ثبوت کا انتظار کرے کہ صدام جس نے تباہی کے کثیر ہتھیار حاصل کر لیے ہیں اور اس کا انتظار ضرورت سے زیادہ ہے، اخیر میں ۱۰ دسمبر ۲۰۰۲ء کی صدارتی ہدایت کا اعلامیہ ایسے ممالک اور دہشت گردوں پر جو WMD کے حصول یا دور تک مار کرنے والے میزائل تیار کرنے کے قریب ہوں پیشگی حملہ کی اجازت دیتا ہے۔ اس میں NPT کی مکمل طور پر خلاف ورزی کرتے ہوئے کم طاقت والے ایسے جوہری ہتھیاروں کی تیاری کی اجازت دی گئی ہے جو گہرائی تک مار کرنے کے لیے استعمال ہو سکیں۔

NSS اولاً پاول کے حمایت یافتہ اور موجودہ صدر Counsil of Foreign Relations رچرڈ ہنس نے تیار کیا تھا، جس کی دوبارہ تشکیل کونڈ ولیزا رائس کی زیر ہدایت دسمبر ۲۰۰۲ء میں کی گئی ہے جن کا خیال تھا کہ بش انتظامیہ کو کسی زیادہ جرأت مندانہ چیز کی ضرورت ہے۔ کوئی ایسی چیز جو ماضی کے خیالات کے سخت اختلاف کی نمائندگی کر سکے۔ اس طرح لکھا گیا کہ NSS مندرجہ ذیل اہداف کے حصول کے لیے بنایا گیا ہے (۱) عالمی فوجی تسلط (۲) دشمنوں کے خلاف پیشگی حملے (۳) سمندر پار

جمہوریت کی سخت طریقوں سے ترویج اور (۴) معاہدوں کے کثیر القومی انتظام کو جو ریاستہائے متحدہ کی طرف سے طاقت کے استعمال کو روک سکتا ہے رد کر دینا۔

یہ قومی تحفظ کی حکمت عملی پاول کے خلاف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ (۱) فوجی طاقت واپسی کے لیے واضح حکمت عملی کے ساتھ شروع کی جائے (۲) اس کا استعمال صرف اس وقت کیا جائے جب انتہائی قومی معاملہ سامنے ہو۔ اور (۳) جب اس کا استعمال ہو تو بے پناہ قوت کے ساتھ تاکہ دشمن کو جلد سے جلد نیست و نابود کر دیا جائے۔ پاول نے صدر بش کو متنبہ کر دیا تھا کہ صدام جس کا تختہ الٹنے کے بعد ریاستہائے متحدہ ۲ کروڑ ۵ لاکھ عراقیوں کی دیکھ بھال کا ذمہ دار ہوگا جس کے لیے اس کے پاس کوئی تیاری نہیں۔ ۲۰۰۴ء کے انتخابات میں اپنے مخالف پر ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ ووٹوں کی طوفانی کامیابی کے بعد بش یہی سمجھ رہے تھے کہ انھیں عراق پر حملہ کرنے کا جواز حاصل ہو گیا ہے۔ Dr. Tertrais نے جو Paris Foundation of Strategic Sciences کے ایک اسکالر ہیں اس حکمت عملی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگرچہ فلوجہ میں ریاستہائے متحدہ کی شکست پر اب تک واشنگٹن میں بحث جاری ہے اور امریکہ یہ سمجھتا ہے کہ اکلوتی عالمی طاقت کی حیثیت سے جسے عالمی معاملات پر مکمل اختیار حاصل ہے وہ ایک ہتھوڑا ہے جس کے لیے ہر کیل پر ضرب لگانا ضروری ہے۔ لیکن بہرحال ایک وقت ایسا آنا ضروری ہے جب ریاستہائے متحدہ اپنی حدود کا ادراک کر سکے اور اس پر یہ بات منکشف ہو جائے کہ عراق ایک استثناء تھا اور تدارک اور پیش بندی کی یہ پالیسی دوسروں پر استعمال نہیں ہونی چاہیے۔ فوزیہ کے مطابق جو Institute of Strategic studies لندن کی سابق ریسرچ فیلو ہیں پیش بند حملوں کا عقیدہ جس کی ترویج بش انتظامیہ کرتی ہے اولاً رچرڈ پرل، ڈگلس فیتھ، ڈیوڈ ورمسر اور ان جیسے دوسرے لوگوں نے سوچا اور ترتیب دیا تھا۔

درحقیقت Institute of Enterprise of America کے اقامتی دانشور کی حیثیت سے ورمسر یہاں تک بڑھ گئے کہ انھوں نے اسرائیل اور ریاستہائے متحدہ

کے لیے مشترکہ جنگ کا منصوبہ تیار کیا تھا جس کا مقصد مشرق وسطیٰ میں شدت پسندی کے مراکز پر حملہ کرنا تھا۔ اس لیے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ پیش بند فوجی حملوں کا اصول جدید شدت پسندوں نے ۱۱/ستمبر سے بہت پہلے تیار کرلیا تھا جس کا مطمح نظر شدت پسندی کے مراکز یعنی مشرق وسطیٰ میں اسلامی شدت پسندی کے مراکز پر فوجی حملے کرنا تھا۔ اور ورمسر کا منصوبہ دمشق، بغداد، طرابلس، تہران اور غزہ پر مہلک فوجی حملوں کا تھا اور اس نے اسرائیل اور ریاستہائے متحدہ دونوں کو اکسایا تھا کہ بحرانوں کی تلاش میں رہیں۔ کیونکہ بحران مواقع مہیا کریں گے اور عالمی تجارتی مرکز پر حملے نے ایک بحران کو جنم دیا جن نے پیش بند حملے کا وہ موقع عطا کردیا جس کی شدت سے تلاش تھی۔ سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ پیش بند حملوں کا نظریہ جب کہ اُسے اس کے اصل خالقوں نے تیار کیا تھا، اس میں دہشت گردی یا کثیر تباہی کے ہتھیاروں (WMD) کے ساتھ کسی تعلق کی نسبت سے نہیں بنایا گیا تھا بلکہ یہ مکمل طور پر مشرق وسطیٰ میں شدت پسندی سے جنگ کے لیے بنایا گیا تھا جو دوسرے الفاظ میں اس علاقہ میں آمروں اور رجعت پسند حاکموں کے خلاف ابھرتی ہوئی اسلامی بغاوت تھی۔ اس قسم کے پیش بند حملوں اور یک طرفیت پر مبنی نظریہ ہملر کی گستاپوئیت کی باقیات ہونے کے علاوہ اسی وقت قابل عمل ہوسکتا ہے جب ریاستہائے متحدہ تنہا پوری دنیا کی تسخیر کرلے، نہ صرف دنیا بلکہ پورا خلاء۔ اور اس قسم کی تسخیر کے وجود میں آنے کے لیے ضروری ہوگا کہ اس کے مقابل کھڑے ہونے کے قابل کوئی دوسری طاقت نہ ہو۔ نہ ہی اقوام متحدہ یا عالمی قانون اور اخلاقیات قسم کے ادارے مزاحمت کے لیے باقی ہوں۔ اس کے نتیجہ میں ریاستہائے متحدہ اپنے آپ کو یہ حق عطا کرتا ہے کہ وہ کسی بھی ملک پر کسی بھی وقت حملہ کر سکتا ہے اور اپنی فوجیں اتار سکتا ہے خواہ ان ممالک کی مرضی ہو یا نہ ہو، اور اپنے اڈے جہاں چاہے قائم کرسکتا ہے۔ یہ بہکا ہوا نظریۂ پیش بند مزاحمت اور یک طرفیت دنیا میں لاقانونیت اور انتشار پھیلانے کے خطرہ سے بھرپور ہونے کے علاوہ کیا ہے؟

۱۲ اگست ۲۰۰۲ء نیویارک ٹائمز میں Thomas Shanker اور James

Riden کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اب جناب رمزفیلڈ اور اعلیٰ فوجی افسر جن تجاویز پر گفتگو کررہے ہیں ان کا حتمی نتیجہ ایسے مخصوص اقدام ہوسکتے ہیں کہ مخصوص یونٹوں کو ایسے ممالک میں لمبے عرصے کے لیے دہشت گردی مخالف کارروائیوں کے لیے تعینات کردیا جائے جن کے ساتھ امریکہ کی کھلی جنگ نہیں ہے اور بعض حالات میں اس کا نشانہ بننے والی حکومتیں ان یونٹوں کے وجود سے واقف بھی نہ ہوں۔

ایک اعلیٰ افسر نے دلیل دی کہ "القاعدہ" عالمی پہنچ رکھنے والے دہشت گردوں اوران کے مددگار ممالک سے جنگ آزما ہونے کی صورت میں اگر ہمیں دنیا میں کہیں بھی کسی اہم ہدف کا پتہ چل جاتا ہے اور ہم وہاں پہنچ کران کو ختم کرسکتے ہیں تو ہمیں وہاں پہنچ کران کو تباہ کردینا چاہیے۔

رمزفیلڈ کا تیارکردہ پیش بند مزاحمت کا نظریہ (۱۲اگست ۲۰۰۲ء جولائی اور اگست کا Foreign Affairs) جوقومی دفاعی حکمت عملی میں شامل کیا گیا صرف جنگیں جیتنے کے لیے نہیں بلکہ دوسرے ممالک کے فیصلوں پر اثرانداز ہونے کے لیے بھی ہے۔ اس کے لیے ان پراس قدر زبردست طاقت سے حملہ کیا جائے کہ وہ مقابلہ کے قابل ہی نہ رہیں۔ اس نظریہ کا منصوبہ اس قدر طاقتور فوجی صلاحیتیں حاصل کرنے کا ہے کہ ضرورت پڑنے پر ریاستہائے متحدہ کسی بھی جگہ بغیر کسی کے اِشتراک، اقوام متحدہ کے میثاق کے مہیا کردہ انتظامات یا بین الاقوامی قانون سے کوئی تعلق بنائے اکیلا جنگ کرسکے۔ اتحاد اورمعاہدے اگر ضروری محسوس کیے گئے تو اس قسم کے ہوں گے کہ اس کے ارکان کومشن کے متعلق کسی فیصلہ میں کوئی بات کرنے کا حق نہ ہوگا۔ مثلاً یہ کہ کوئی موقع یا صورت حال بین الاقوامی دہشت گردی ہے بھی یا نہیں یا وہ موقع یا واقعہ فوجی کارروائی کا تقاضا کرتا ہے یا نہیں اور فوجی کارروائی کی صورت میں اسے کس حد تک لے جانا اور کب ختم کرنا ہے اور کن شرائط پر یہ فوجی یک طرفیت اقوام متحدہ کی شق ۴۶ اور ۴۷ کے اصول کو کہ مشترکہ فوجی کارروائی ایک اسٹاف فوجی کمیٹی کے تحت ہوگی ردی کی ٹوکری کی نذر کردیتا ہے۔

ستمبر ۲۰۰۵ء میں اقوام متحدہ کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر امریکیوں کی طرف
سے یہ ۔ لیا تھا کہ اقوام متحدہ کا نظام جس کی بنیاد ہر رکن کے لیے برابر کی خودمختاری پر
ہے اب قابل عمل نہیں رہا' افراد اور غیر حکومتی اداروں کی طرف سے نئے قسم کے خطرات
پیدا ہو گئے ہیں جن پر متعلقہ ریاستیں قابو پانے سے قاصر ہیں۔ غیر ذمہ دار ریاستوں یا
دہشت گرد جماعتوں کے پاس کثیر تباہی کے ہتھیار عالمی امن اور تحفظ کے لیے بہت بڑا
نیا خطرہ ہیں۔ بڑے پیمانہ پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں نے نسل کشی کو راہ دی ہے
جو ریاستی حدود سے باہر پھیلی اور نتیجہ کے طور پر پناہ گیروں کی بڑی تعداد باہر نکلی۔ اس
لیے ایک نئے نظام اور نئے اصولوں کی ضرورت ہے تاکہ اگر سیکیورٹی کونسل طاقت کے
استعمال کی اجازت دینے پر قادر نہ ہو تو وہ ملک جو امکانی طور پر یا حقیقت میں خطرہ میں
ہو اُسے یہ جائز حق حاصل ہو کہ خود پیش بند طور پر ان خطرات کا سدِ باب کرے۔ اب
ان دلائل میں کوئی جان یوں باقی نہیں رہی کہ امریکہ کی طرف سے صدام کے کثیر تباہی
کے ہتھیاروں کو بہانہ بنا کر اور دنیا کو ان سے خطرات کا ڈراوا دے کر اقوام متحدہ کی
مرضی کے اور اس کے تعینات کردہ اسلحہ انسپکٹروں کے حاصل کردہ حتمی نتائج کا انتظار کیے
بغیر عراق پر حملہ اور جنگ کے دوران یا اس کے بعد کسی قسم کے ہتھیاروں کا وجود نہ پائے
جانے کے بعد پیش بند اور یک طرفہ طاقت کے استعمال کا حق اس کے علاوہ کچھ نہیں
کر سکتا کہ طاقتور ملکوں کو اس قابل بنا دے کہ کمزور ملکوں پر حملہ کر کے ان پر قبضہ کر لیں
اور اپنا غلبہ قائم کر کے ان کے وسائل پر متصرف ہو جائیں اور عوام کو زیر دست بنا لیں۔
ریاستہائے متحدہ کی طرف سے پیش کردہ دلائل کے جواب میں یہی دلیل پیش کی جا سکتی
ہے کہ صرف کثیر فریقی طریقوں کی ترویج کی ضرورت بے انتہا اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہی
طریقہ بین الاقوامی امن اور تحفظ کے لیے لازمی ہے۔

اقوام متحدہ کے دوسرے ارکان نے بجا طور پر اس بات کو پھر سے اجاگر کرنے کی
کوشش کی ہے کہ بنیادی طور پر سیکیورٹی کونسل ہی امن اور تحفظ کے قیام کی ذمہ دار ہے'
بہر حال یہ قائدین اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کی پیش کردہ قرارداد کی تائید کروانے

میں امریکہ کی موجودگی کی وجہ سے ناکام رہے جس میں اصرار کیا گیا تھا کہ اس بات کا فیصلہ کونسل کرے کہ خطرہ حقیقی طور پر موجود ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اسے مختصر فوجی عمل کے ذریعے ختم کرنے پر غور کیا جائے۔ اگر کونسل فوجی کارروائی ضروری سمجھے تو اس کے مناسب حد تک استعمال پر مزید غور کیا جائے۔

اس لیے تعجب نہیں کہ یہ امریکی اصول اقوام متحدہ یا NATQ کو جس کا وہ بانی اورسب سے زیادہ فعال رکن رہا ہے یکلخت چھوڑ دینے پر معذرت بھی نہیں کرتا۔ NATO کی دفعہ ۵ کے تحت کسی ایک رُکن ملک پر حملہ سب پر حملہ تصور کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ریاستہائے متحدہ کے لیے لازم تھا کہ اقوام متحدہ کی دفعہ ۵۱ کے تحت اپنے حق خود حفاظتی پر عمل کرتے ہوئے NATO کی دفعہ ۵ پر بھی عمل کرے لیکن ریاستہائے متحدہ نے ایسا کرنے سے احتراز کیا کیونکہ اس صورت میں اسے NATO کونسل کو خاصی حد تک سیاسی اور فوجی اختیار دینا پڑتا۔

امریکی خارجہ پالیسی کے اہداف میں یک طرفیت اور پیش بند حملہ کا جو اصول اسٹیٹ ڈیپارٹ منٹ کے ڈائریکٹر منصوبہ بندی رچرڈ ہاس نے شامل کیا مندرجہ ذیل ہے: (امریکی سامراجیت' Foreign Affairs Ikenberry ستمبر اکتوبر 13 ۲۰۰۷ء) امریکی خارجہ پالیسی کا سب سے اہم مطمح نظر یہ ہے کہ دوسرے ملکوں اور تنظیموں کو ان انتظامات میں ضم کر دیا جائے جو ایک ایسی دنیا قائم کریں جو امریکی اقدار اور ضرورتوں کے مطابق ہو۔

اس امریکی پالیسی کا اسی مصنف نے تفصیلی تجزیہ کیا ہے جو اس طرح ہے :

''سرد جنگ شروع ہونے کے بعد پہلی دفعہ واشنگٹن میں ایک عظیم حکمت عملی پیدا ہو رہی ہے' واضح طور پر اسے دہشت گردی کے جواب کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے لیکن اس کا ایک وسیع تر منظر نامہ اس بارے میں ہے کہ امریکہ کو کس طرح اپنی طاقت استعمال کر کے نظام دنیا کو منظم کرنا چاہیے' اس نئی مثال کے مطابق امریکہ کو دہشت گردوں کے خلاف پیش بند اور یک طرفہ حملے کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں اور عالمی قواعد اور اداروں

کے سامنے زیادہ جواب دہی کی ضرورت نہیں اور بدمعاش ملکوں سے لڑتے ہوئے جو WMD سے لیس بھی ہوں امریکہ عالمگیر نظم کی حفاظت کے لیے اپنی بے مثال فوجی طاقت استعمال کرے گا۔

فوجی تشکیل نو کے لیے رمزفیلڈ کی جوڑ توڑ کا انحصار بے پناہ حملہ آور فوجی طاقت کی تعمیر جو نہ صرف تمام دوسری ریاستوں کو تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو بلکہ تمام ایسی طاقتوں رجحانات اور امکانی صلاحیتوں کو بھی جنھیں ام [illegible] یہ مفادات کے خلاف سمجھتا ہے۔ اس میں خطروں کو ابھرنے سے روکنے [illegible] اہم ترین ضرورت کو مطلقا نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ یہ اس سخت اور تنگ نظر انتظامی نظام کا کوئی نوٹس نہیں لیتا جو امریکی فوجی اداروں میں پایا جاتا ہے اور جس کی نشان دہی جنرل Odum نے جولائی اگست ۱۹۹۷ء کے Foreign Affairs میں اپنے مقالہ میں کی ہے۔ امریکہ کا جارحانہ اور مغلوب کر دینے والے انداز پر اصرار دنیا کے تمام دوسرے ممالک کے لیے خطرہ ہے اور جو یقیناً ان ممالک کی طرف سے جوابی دھمکیوں کو راہ دے گا۔ امریکہ کی طرف سے کسی خطرہ کے ابھرنے سے بھی پہلے پیش بند حملوں پر انحصار کا متکبرانہ اصرار اقوام متحدہ کے ان بنیادی اصولوں اور مقاصد کی صریح خلاف ورزی ہے جو شق نمبر ایک اور قیام امن اور جنگ سے بچاؤ کے لیے اس کی ذیلی شقوں میں میثاق کی شقوں ۳۳، ۳۴، ۳۹، ۴۰ کے ذریعے مہیا کی گئی ہے۔ یہ نظریہ امریکی وزیر خارجہ جناب ویبسٹر (Webster) کے اُس نظریہ سے متصادم ہے جو انھوں نے ۱۸۴۲ء میں پیش بند جنگ کے اصولوں کے لیے پیش کیا تھا اور جو اب بین الاقوامی قوانین کا مستحکم اصول ہے۔ یہ اصول یوں ہے ''کوئی قوم پیشگی جارحانہ عمل کو اسی صورت میں درست قرار دے سکے گی جب اس کی فوری اور بے پناہ ضرورت ہو اور غوروفکر کے لیے کوئی موقع اور وقت باقی نہ رہا ہو۔'' جناب چومسکی نے اس اصول کی اس طرح تشریح کی ہے جب کوئی جنگی جہاز امریکہ پر حملہ کرنے کے لیے بحر اٹلانٹک پر سے گزر رہا ہو تو ریاستہائے متحدہ حق بجانب ہوگا کہ اس جہاز کو گرا دے اور اس اڈے پر بھی حملہ کرے جہاں سے اس نے پرواز کی ہو

اس کے برخلاف امریکی نظریہ کسی بھی توازن، برابری کے اصول اور انصاف سے عاری ہے جو ویبسٹر کے نظریہ اور چومسکی کے منظرنامہ میں ہیں اور اس کی وجہ سے بین لاقوامی تعلقات میں جو بھی مطابقت یا نظم باقی ہے اس کے تہس نہس ہو جانے کا خطرہ ہے۔

امریکی NSS میں جو یک طرفیت اور پیش بند طاقت گندھی ہوئی ہے اس نے وہ طوفان اٹھایا کہ پوری دنیا اٹھ بیٹھنے اور مستقبل میں امریکہ کے ارادوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوگئی۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے عالمی امن اور تحفظ کو امریکہ کی طرف سے اس خطرہ کے جواب میں ۱۹ دسمبر ۲۰۰۲ء کو ایک قرارداد منظور کی جس میں اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ امریکہ اس بات کو یقینی بنائے کہ دہشت گردی کے خلاف اس کا کوئی بھی عمل بین الاقوامی قوانین کے مطابق ان کی ذمہ داریوں کے ذیل میں اور اقوام متحدہ کی قرار دادوں اور انسانی حقوق پر اس کے فیصلوں کے منافی نہ ہو۔ جون ۲۰۰۲ء میں Organization of American States (OAS) نے بھی دہشت گردی کے خلاف اپنے امریکی اجلاس میں اس سے مماثل قرارداد منظور کی۔ اجلاس نے یہ بھی کہا کہ دہشت گردی مخالف کوئی بھی کام رکن ممالک کی طرف سے بین الاقوامی قانون کی مروّجہ پابندیوں کے مطابق ہو جس میں عالمی انسانی حقوق بھی شامل ہیں۔

پیش بند جنگ کا امریکی نظریہ اس ڈراوے سے پھوٹا ہے جسے رمزفیلڈ نے عالمی دہشت گردی کا نام دیا ہے۔ جسے Eliot Cohen نے اپنے مضمون میں (Foreign Affairs مئی جون ۲۰۰۲ء) اسلامی شدت پسندوں کی کارروائیوں کا نام دیا ہے خطرہ کی بنیاد کے بارے میں یہ نشان دہی بہت ہی عمومی، سرسری، مبہم اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نشانہ سے دور ہے اور اس قابل نہیں ہے کہ انصاف سے دیکھ کر درست ہدف طے کر سکے۔ اسلامی شدت پسندوں کی مشغولیات میں سماجی بھلائی کے بہت سے کام ہیں خصوصاً تعلیم، صحت اور قدرتی آفات کے موقع پر مدد اور دوبارہ آبادکاری۔ فلسطین کی حماس، مصر کی اخوان المسلمون، لبنان کی حزب اللہ، پاکستان کی جماعت اسلامی اور کئی دوسروں کی خدمات ان میدانوں میں بے مثال ہیں۔ حماس کے تمام بجٹ کا ۹۵فی صد

سماجی بھلائی کے کاموں پر خرچ ہوتا ہے۔ دوسری شدت پسند اسلامی جماعتوں مثلاً
مصر کی اخوان المسلون اور پاکستان کی جماعت اسلامی کا ریکارڈ قدرتی یا انسانی آفات
کی صورت میں لوگوں کو بچانے اور آبادکاری کے سلسلہ میں حکومتوں سے زیادہ اہم ہے۔
امریکی NSS کو مزید پچاس صفحات کے مقالہ میں آگے بڑھایا گیا ہے جو ۱۶ مارچ
۲۰۰۶ء کو جاری ہوا ہے اور جس میں پیش بند فوجی حملوں کے اصول کی مزید توثیق کی گئی
ہے اور اس سے بڑھ کر جوہری ہتھیاروں پر انحصار کیا گیا ہے اسی لیے اِس بات پر تعجب
نہیں ہونا چاہیے کہ ایران کو فوجی حملوں کی دھمکیاں مل رہی ہیں۔

کیا یہ ایک کھلی حقیقت نہیں ہے کہ وہ واحد ملک جسے عالمی عدالت نے دہشت
گرد قرار دیا وہ ریاستہائے متحدہ امریکہ ہے' نکاراگوا کی شکایت پر اس عدالت نے کہا تھا
کہ ریاستہائے متحدہ اس ملک میں دہشت گردی کی مدد اور پشت پناہی کا مجرم ہے۔
طالبان اور القاعدہ کے قیدیوں کے ساتھ گوانتاناموبے میں اور عراقی قیدیوں کے ساتھ
ابوغرائب میں جو غیرانسانی' وحشیانہ اور بہیمانہ سلوک جنیوا کنونشن کی کھلی خلاف ورزی
کرتے ہوئے کیا گیا اسے کیا کہیں گے؟ جس نے ساری دنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا
ہے؟ انتھونی لیک نے جو صدر کلنٹن کے سابق دفاعی مشیر ہیں اپنے تفصیلی تجزیہ سے
ریاستہائے متحدہ کی طرف سے گوانتاناموبے میں ہونے والے سلوک کے سلسلہ میں
پیش کردہ تمام توجیہات کو یکسر بے وقعت بنا کر بھسم کر دیا ہے (جولائی ۲۰۰۳ء Boston
Globe) ابوغرائب میں جو ہوا وہ گوانتاناموبے سے بھی زیادہ بہیمانہ تھا۔ امریکی افواج
کے سربراہ Joint chief of Staff جنرل رچرڈ مائرز نے اب مشترکہ جوہری
کارروائی کے لیے لائحہ عمل ترتیب دیا ہے جس میں پینٹاگون کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ
دنیا کے کسی بھی ایسے خطہ میں جہاں سے مستقبل میں جوہری ہتھیاروں کے استعمال کا
امکان ہو نیوکلیائی ہتھیار استعمال کرے۔ مزید یہ کہ جوہری جنگ کے لیے فوجیں تیار کی
جائیں۔ لفظ deployment کا مطلب بہت واضح نہیں ہے لیکن یہ بات واضح ہے کہ
اس کا مطلب خطرہ کے متعلق صرف پینٹاگون کا فیصلہ ہی جوہری ہتھیاروں کے استعمال

کی بنیاد کے طور پر کافی قرار دیا جاتا ہے۔ شمالی کوریا، ایران، اور چین واضح طور پر اس اصول کی زد میں آتے ہیں۔ اسی طرح اے، کے خان کے خفیہ جوہری معاملے اس اصول کی تشکیل کے بعد پاکستان کے سر پر ڈیموکلیس کی تلوار کی طرح لٹک رہے ہیں۔

اسرائیل نے ۱۹۵۴ء میں امریکہ کے خلاف جو دہشت گرد کارروائیاں شروع کی تھیں ان کے بارے میں کیا کہا جائے؟ اس نے امریکیوں کے قتل اور مصر میں امریکی تنصیبات کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تاکہ امریکہ کو مصر پر حملہ کے لیے اکسایا جاسکے۔ اسرائیل نے امریکی بحریہ کے جہاز لبرٹی (Liberty) پر ادھورا حملہ کیا جس میں ۳۴ افراد ہلاک ہوئے اور ۲۰امریکی فوجی زخمی ہوئے۔ ۱۹۸۰ء میں اسرائیل نے امریکی یہودی Jonathan Pollard کو امریکہ کے خلاف جاسوسی کے لیے تعینات کیا۔ تعجب کی بات نہیں اگر امریکہ اپنے آپ کو اسرائیل کے رحم وکرم پر پاتا ہے جب کہ ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو شیرون کے پُر غرور بیان سے ظاہر ہوتا ہے ہم یہودی لوگ امریکہ کو کنٹرول کرتے ہیں اور امریکیوں کو اس کا پتہ ہے۔

یروشلم میں وزارت خارجہ کو چار ہزار ایسے یہودیوں کی فہرست ملی جن کے بارے میں یقین تھا کہ حملہ کے وقت وہ لوگ WTC اور پینٹاگون کے اطراف میں رہائش پذیر تھے۔ صدر بش نے قوم کے نام اپنے پیغام میں کہا کہ ۱۳۰ اسرائیلی اس حملہ میں ہلاک ہوئے اگلے دن اسرائیل کے کونسل جنرل Alan Pinkas نے کہا کہ صرف ۱۳ اسرائیلیوں کی موت کی تصدیق ہوئی ہے۔ جن میں سے دو جہازوں میں تھے اور ایک جو کسی کام سے ٹاور میں گیا تھا جسے نشان دہی کے بعد دفن کر دیا گیا (نیویارک ٹائمز، ۱۲ ستمبر ۲۰۰۱ء) اس بات کی تردید اب نہیں کی جاسکتی کہ چار ہزار اسرائیلی جو WTC میں ملازمت کرتے تھے اس دن کام پر نہیں گئے کیونکہ انھیں پہلے سے معلومات تھیں۔ اگر یہ ۱۱ستمبر کی دہشت گردی اسامہ بن لادن کی کارروائی تھی تو یہودیوں کو اس کی اطلاع کیسے مل گئی؟ اسی لیے یہ بات واضح ہے کہ ستمبر کا حملہ غالباً اسرائیل کے زیر انتظام ہوا تھا۔ اقوام متحدہ کو ان کھلی حقیقتوں کی طرف آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہیے۔

آخری مگر اہم بات یہ ہے کہ امریکہ کی اپنے گھر میں پلنے والی دہشت گردی کے بارے میں کیا کہا جائے جو القاعدہ سے کسی طرح کم خطرناک نہیں ہے۔ ۲۷ جولائی ۲۰۰۲ء کے بوسٹن گلوب نے ادارتی تجزیہ میں اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ سفید فام نسل کی برتری کے حامی leo felton اور Erica Chase کا سزا پانا اس بات کی یاد دہانی کراتا ہے کہ دہشت گردی اندرونی بھی ہوسکتی ہے اور اتنی ہی بدنما بھی جتنی القاعدہ کی ہے۔ قوم کی ساری توجہ ۱۱ ستمبر کے بعد سے صرف بین الاقوامی دشمنوں پر ہے اور یہ بات حافظہ سے اتر گئی ہے کہ بعض امریکی ذاتی اور الجھی ہوئی متبرک جنگ لڑتے ہیں جس کا مقصد معاشرے کی تسخیر اور ہر اس فرد کو مٹا دینا ہے جو ان سے اختلاف رکھتا ہو۔ felton اور Chase کو یہودیوں اور افریقی نژاد امریکیوں کے نمایاں نشانات کی تباہی کے لیے بم بنانے کے جرم میں سزا دی گئی ہے۔

مندرجہ بالا دہشت گردانہ اعمال کے برعکس کشمیر، چیچنیا، افغانستان اور عراق میں جو ناجائز قبضہ اور ظلم کے خلاف مزاحمت اور تحاریکِ آزادی جاری ہیں ان کا قانونی اور اخلاقی درجہ کہیں بلند ہے۔

اپنے مضمون غلط جنگ (The wrong war) میں جو Foreign Affairs کے جون جولائی کے شمارہ میں شائع ہوا Byford نے یہ زاویۂ نظر اختیار کیا ہے "ان لوگوں کے بارے میں جو ایک ایسی بے رحم اور طاقتور حکومت کی مخالفت کر رہے ہیں جس پر کوئی بھی حملہ خودکشی کے مترادف ہے کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسی صورت حال میں حکومت کے خلاف کوئی جدوجہد غیر قانونی ہے کیونکہ مخالفین کو شہری نشانوں پر طاقت استعمال کرنی پڑے گی اور یقیناً شہری مارے جائیں گے ایسے جنگجوؤں کو معاف کر دیا جاتا ہے جو ادھورے مقاصد رکھتے ہوں لیکن وہ جو ان سے کہیں بڑے مقاصد رکھتے ہوں اور جن کے پاس اور کوئی چارہ کار نہ ہو شاید کسی قسم کی معافی نہ پاسکیں۔

پچھلے پچاس سالوں میں امریکی تاریخ دہشت گردی اور دہشت گردوں کے ساتھ تال میل سے بھری پڑی ہے بلکہ اس کی نہایت فعال شراکت بھی کچھ ایسے ہی

کاموں میں رہی ہے۔

ریاستہائے متحدہ وقت بہ وقت اپنے مفاد اور ضرورتوں کے مطابق لفظ دہشت گردی سے کھیلتی رہی ہے۔ اس نے دہشت گردی کی پہچان کے لیے کبھی یکساں پیمانہ نہیں استعمال کیا۔ اس کی ذہنی کیفیت چڑیل کا بگڑا ہوا بچہ (The bad son of the witch) جوکہ Allaude تھا سے چڑیل کا اچھا بچہ (The good son of the witch) جوکہ پنوشے تھا، بدلتی رہتی ہے۔ اسرائیل دنیا کا وہ واحد ملک ہے جو دہشت گردی کے ذریعے وجود میں آیا اور کئی ایسے افراد جنھوں نے دہشت گردی کی تنظیم اور قیادت کی تھی عزت مآب وزیراعظم بھی بنے جن کی امریکہ میں بے حد عزت کی جاتی ہے۔

Menacham Begin جو دہشت گرد تنظیم Irgun کے قائدوں میں شامل تھا اور اسی سلسلہ میں مفرور تھا' اسرائیل کا وزیراعظم بنا۔ یہ اسی کی تنظیم Irgun تھی جس نے یروشلم کے کنگ ڈیوڈ ہوٹل کو جس میں برطانوی فلسطینی کمان کا دفتر تھا بم سے تباہ کر دیا تھا۔ Yithzak Rabin بھی جو Haggnah نامی دہشت گرد تنظیم کا سربراہ تھا اسرائیل کا وزیراعظم بنا۔ موجودہ اسرائیلی وزیراعظم جسے بیروت کا قائد کہا جاتا ہے ایک دہشت گرد تنظیم کا سربراہ بھی تھا اور اب صدر بش کے نہایت قریب ہے۔

تباہ حال اور ذلت ونکبت کے شکار عوام پر ظلم اور بدمعاشی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے Noam Chomsky نے جو امریکہ کا ایک مخالف دانشور ہے لکھتا ہے:

''یہ دہشت کے خلاف جمہوریت کی جنگ نہیں ہے بلکہ امریکی میزائیلوں کے فلسطینی گھروں پر برسنے اور ۱۹۹۶ء میں امریکی ہیلی کاپٹروں کے لبنانی ایمبولنس پر فائرنگ اور قانا نامی گاؤں پر امریکی شیلنگ، لبنانی ملیشیا کی جسے اسرائیل کے امریکی دوست تنخواہ اور وادیاں فراہم کرتے ہیں پناہ گزینوں کے کیمپ میں مار دھاڑ، آبروریزی اور قتل عام کے بارے میں بھی ہے۔

نئی دلی کے ایک سیمینار میں تقریر کرتے ہوئے چومسکی نے سب سے بڑی

بدمعاش حکومت کے طور پر امریکہ کی شدید مذمت کی جس کو انھوں نے عالمی دہشت گردی کا مرتکب قرار دیا' انھوں نے نشاندہی کی کہ ہیگ کی عالمی عدالت برائے انصاف نے صرف ایک ملک کی مذمت عالمی دہشت گردی کے لیے کی ہے اور وہ ملک ریاستہائے متحدہ امریکہ تھا۔

صدر بش کے تمام ممالک سے اس سوال کہ وہ امریکہ کے ساتھ ہیں یا دہشت گردوں کے ساتھ' کے جواب میں چومسکی نے کہا کہ عالمی دہشت گرد جو کہ امریکہ ہے اوران لوگوں کے درمیان جن پرالزام لگایا جاتا ہے انتخاب کے لیے زیادہ کچھ ہے ہی نہیں۔

سابق صدر کلنٹن نے انکشاف کیا کہ انھوں نے اسامہ کے قتل کا حکم دیا تھا۔ صرف یہی ایک حقیقت امریکہ کو اسامہ کے خلاف تفتیش یا مقدمہ کے لیے نااہل بنادیتی ہے۔ سابق صدر بش اول نے عراقی فوج کو صدام حسین کا تختہ الٹنے کا مشورہ دیا تھا یہ بات ریکارڈ پر ہے۔ امریکی بحریہ کے ایک ہتھیاروں سے لیس جہاز نے ایک ایرانی مسافر بردار طیارہ کو مار گرایا جس میں تین سو (۳۰۰) بے گناہ مرد عورتیں اور بچے ہلاک ہوئے۔ CIA کو بھی۔ ایک دفعہ پھر قتل کی وارداتیں کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ امریکہ نے قذافی کو نشانہ بنانے کے لیے بغیر اعلان جنگ لیبیا پر بمباری کی جس میں قذافی کا کم سن بچہ ہلاک ہوا۔ اس حرکت کی مذمت برطانیہ اورفرانس کے سواسیکیورٹی کونسل کے ہر رکن نے کی' اس نے خرطوم میں دوائیں بنانے کے ایک کارخانہ پر اس بہانہ سے بمباری کی کہ یہاں کیمیائی ہتھیار بنائے جارہے ہیں بعد میں امریکہ نے اعتراف کیا کہ اس نے غلط اطلاع پر حملہ کردیا تھا۔ No Fly Zone قائم کرنے کے بہانہ سے یہ دن رات عراق پر بمباری کرتا رہا ہے جس کے لیے سیکیورٹی کونسل نے اسے کوئی اختیار نہیں دیا تھا۔ پھراس نے افغانستان پر میزائیلوں سے حملہ پاکستان کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کیا اور اس کے لیے بھی سیکیورٹی کونسل کا کوئی اجازت نامہ اس کے پاس نہیں تھا۔ اب اس نے افغانستان کے خلاف فوجی مہم شروع

کردی ہے اور بلا کسی امتیاز شہری آبادی اور شہری سہولیات کو نشانہ بنا رہا ہے۔ اس نے
قلعہ جھنگی اور مزار شریف میں سینکڑوں جنگی قیدیوں کا قتل عام کیا' یہ سب کچھ اگر دہشت
گردی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس سے بھی شدید قسم کی شرمناک دہشت گردی جس کا منصوبہ
امریکی فوج نے بنایا جو شاید WTEC پر خودکش حملہ کو بھی شرمندہ کردے۔ James
Bamford اپنی کتاب Body of secrets میں جو ۲۰۰۱ء میں The Randon
House Gronp United 20, vanshaul rock London) SW iv,
UK) سے شائع ہوئی ہے مندرجہ ذیل زمین کو ہلا دینے والے انکشافات کیے ہیں:

۱۹۶۱ء میں کیوبا پر Bay of Pigs کے ناکام حملہ کے بعد Chairman
US. Joint Chief of Staff (JCS) نے ایک منصوبہ بنایا اور اس کو منظور کیا۔

اس منصوبے کا مقصد اپنے ہی ملک میں خفیہ دہشت گردی کی خونی جنگ شروع
کرنا تھا تاکہ امریکی رائے عامہ کو دھوکا دے کر کیوبا کے خلاف اس جنگ کی حمایت
حاصل کی جاسکے جو وہ چھیڑنا چاہتے تھے۔ اس منصوبہ کا کوڈ نام North Woods تھا۔
اس منصوبہ میں بے گناہ لوگوں کو سڑکوں پر گولی مارنا اور پناہ گیروں کی کشتیوں کو سمندر میں
غرق کر دینا شامل تھا۔ واشنگٹن' میامی اور دوسری جگہوں پر تشدد کی ایک لہر لائی جانی تھی۔
بے گناہ لوگوں کو بم حملوں میں ملوث کیا جاتا۔ طیاروں کو اغوا کیا جاتا' ان کاموں کے لیے
جھوٹے ثبوت تیار کیے جاتے اور سب کا الزام کیوبا پر لگایا جاتا۔ مقصد اس طرح JCS
کے چیئرمین Lemintzer اور ان کے ساتھی سازشیوں کو وہ بہانہ اور تائید مہیا کرنا تھی
جس کی ضرورت انھیں جنگ شروع کرنے کے لیے تھی۔ ۱۹۶۳ء میں JCS نے جمیکا
اور ٹرینیڈاڈ پر خفیہ امریکی حملہ تجویز کیا جو دونوں ہی برطانوی دولت مشترکہ کے ارکان
تھے' ان پر اس طرح خفیہ حملہ کر کے اور کیوبا پر الزام لگا کر برطانیہ کو کیوبا کے خلاف جنگ
میں الجھا لیا جاتا لیکن ان تمام منصوبوں کو صدر کینیڈی نے رد کر دیا۔

۱۹۶۴ء میں خلیج ٹونکن کا واقعہ جس نے ویت نام کی جنگ کو سلگایا تھا دانستہ طور
پر کیا گیا تھا۔ دس سالہ امن سے بے چین ہو کر JCS جو حقیقت سے بے خبر تھی جنگ

کے لیے بے قرار تھی' کوئی بھی جنگ۔

۱۹۶۰ء میں جب برطانیہ اپنی نوآبادیات کی بساط لپیٹ رہا تھا امریکہ نے برطانیہ کے ساتھ سازش کی کہ پچاس سالوں تک Chagos Archipelago مفت، بلا قیمت حاصل کر لے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۳ء کے درمیان Archipelago سب سے بڑے جزیرے Diego Garcia کو امریکہ کی National Security Administeration کے لیے صاف کرنا تھا تا کہ یہاں ایک سمعی مورچہ (Listening Post) قائم کیا جائے۔ چنانچہ ایک ایک فرد مرد، عورت، بچہ یہاں سے اٹھا کر پریشان اور خوف زدہ حالت میں ماریشس اور سیشلز کے جزیروں میں دھکیل دیا گیا۔ جب کہ ایک انگریز مصنف Simon Winchester نے لکھا ہے:

امریکہ کی اپنے سیاسی مفادات حاصل کرنے کے لیے تشدد سے محبت کے سرے کا کھوج ۱۸۱۸ء تک سراغ لگاتے ہیں جب John Quincy نے غیر قانونی سرخ ہندیوں اور نیگرو لوگوں کے ہجوم کے خلاف دہشت کی قابل تعریف کارکردگی کو سراہا تھا۔

امریکی افواج نے ''پناما اِل چیریلو'' سے پانچ ہزار نفوس کا صفایا کر دیا اور بہانہ یہ تھا کہ نوریگا کو پریشان کر کے نکالنا ہے چونکہ یہ لوگ قوم پرست تھے اور امریکہ کو پناما سے نکالنا چاہتے تھے۔

CIA نے جنرل سوہارتو کے ساتھ سازش کی تا کہ انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو کو نکالا جائے جس نے دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں سے لڑ کر انڈونیشیا کو آزاد کرایا تھا جب کہ سوہارتو نے جاپانیوں سے ساز باز کر لی تھی۔ جیسا کہ طے تھا سوہارتو نے سوئیکارنو کی جگہ لیتے ہی پانچ لاکھ لوگوں کا قتل عام کر دیا۔

امریکہ نے پول پوٹ کا ساتھ دیا اور اسلحہ فراہم کیا تا کہ لاکھوں لوگوں کا قتل کیا جا سکے۔

امریکی حکومت نے کانگو کے واحد مہذب لیڈر کے قتل کا انتظام کیا تا کہ اس کی جگہ جنرل موبوتو کو لایا جا سکے جو ایک لالچی اور وحشیانہ حد تک قاتل آمر تھا۔

نکاراگوا، ال سلواڈور اور گوئٹے مالا میں امریکی پشت پناہی سے لیس دہشت گردوں نے قتل عام کیے۔ اسی دوران امریکہ نے جمہوریت اور آزاد تجارت کا غلط استعمال کیا تاکہ اپنی سخت پالیسیوں کی دنیا کے دوسرے حصوں میں ترویج کر سکے۔

John Kerry نے جو پچھلے انتخابات میں صدارتی امیدوار تھے ویت نام سے واپسی کے بعد Senate Committee کے سامنے گواہی دی تھی کہ ویت نام میں امریکی افواج مادر پدر آزاد ہوگئی تھیں۔ انھوں نے نہ صرف بڑے پیمانہ پر قتل کیے آبروریزیاں کیں بلکہ چنگیز خان کی طرح گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیے۔ شاید چومسکی نے ہی یہ درست نشان دہی کی ہے کہ جب تک ہم اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے دہشت گردی سے کام لیتے رہیں گے کوئی بھی جنگ دہشت گردی کو روک نہیں سکتی۔ دنیا میں اتنے سارے لوگ مرنے کے لیے تیار ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیں وہی مزہ چکھانا چاہتے ہیں جو ہم نے ان کو دیا ہے۔

دہشت گردی کیا ہے اور دہشت گرد کون ہیں؟ اس موضوع پر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک طویل بحث ہوئی تھی۔ جنرل اسمبلی کی قرارداد ۴۴/۲۹ جو ۴/دسمبر ۱۹۸۹ء کو منظور ہوئی تھی وہ آخری قرارداد تھی جس میں قومی آزادی کی تحریکوں کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا گیا تھا اور جو تعریف ۱۹۷۲ء سے استعمال ہو رہی تھی اسے قائم رکھا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ اس قسم کی دہشت گردی اور متشدد رویہ کی وجوہات مصیبت گھبراہٹ شکایات اور ناامیدی میں مضمر ہیں جن کی وجہ سے کچھ لوگ انقلابی تبدیلیوں کی امید میں ہر قربانی حتیٰ کہ اپنی جان تک دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

کینیا اور تنزانیا میں امریکی سفارتخانوں پر حملوں کے بعد سیکیورٹی کونسل نے قرارداد ۱۱۸۹ (۱۹۹۸ء) منظور کی تھی جس میں بین الاقوامی اشتراک عمل کی ضرورت اور ایسے طریقوں پر زور دیا گیا تھا جن سے دنیا پر اثر انداز ہونے والی ہر قسم کی دہشت گردی کو ختم کیا جا سکے۔ ایسا پہلی دفعہ ہوا کہ ناجائز قبضہ اور ظلم کے خلاف ہونے والی مزاحمت کا ذکر یکسر ختم کر دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا سیکیورٹی کونسل کی یہ قرارداد اس سے پہلے کی

جنرل اسمبلی کی ۱۹۷۲ء کی قراردادوں کو رد کرسکتی ہے؟

یاسر عرفات جب تک فلسطین کی آزادی کی جنگ لڑتا رہا سب سے زیادہ قابل نفرت دہشت گرد تھا لیکن جیسے ہی اس نے پلٹا کھایا اسے نوبل انعام کے اعزاز سے نوازا گیا اور قصر ابیض کے چہیتوں میں شامل ہوگیا۔ جیسے ہی اس نے کیمپ ڈیوڈ میں ذرا سی ہمت کا مظاہرہ کیا اور امریکہ اور اسرائیل کی ہدایات ماننے سے انکار کیا اسے بدمعاش قرار دے دیا گیا۔ ایک دفعہ پھر اس نے قلابازی کھائی اور اسلامی جہاد اور حماس پر حملہ کر کے فلسطینی مقتدرہ اور مجاہدین کے درمیان جنگ برپا کرادی مگر امریکہ کی محبت حاصل نہ کرسکا۔ ۱۹۵۶ء میں جنرل Ouze Merhan کے ساتھ ایک انٹرویو میں شیرون نے کہا مجھے نہیں پتہ عالمی اصول کس چیز کا نام ہے، میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ہر فلسطینی عورت اور بچے کو جلا ڈالوں گا جو کہ مردوں سے زیادہ خطرناک ہیں کیونکہ فلسطینی بچے کا وجود یہ بتاتا ہے کہ یہ نسلیں جاری رہیں گی۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر میں فقط ایک اسرائیلی شہری ہوتا اور مجھے کوئی فلسطینی مل جاتا تو میں اسے جلا ڈالتا اور مارنے سے پہلے اُسے اذیتیں دیتا۔ میں نے ایک وار میں ساڑھے سات سو (۷۵۰) فلسطینیوں کو مارا ہے (رفاہ میں ۱۹۵۶ء میں) میں چاہتا تھا کہ سپاہیوں کی ہمت افزائی کروں کہ وہ فلسطینی لڑکیوں کی آبروریزی کریں کیونکہ فلسطینی عورت یہودیوں کی غلام ہے اور ہم اس کے ساتھ جو چاہیں کریں۔

قصر ابیض کا دلارا شیرون موجودہ دور میں کرۂ ارض کا سب سے بڑا بدمعاش اور دہشت گرد ہے۔ جس نے انسانیت کا سینہ اس بری طرح زخمی کیا ہے کہ کسی وحشی جانور نے بھی نہیں کیا اور اس کا وہ فخر و غرور کے ساتھ اعلان کرتا ہے۔

پچھلے دنوں ریاستہائے متحدہ نے دہشت گردی کی نئی تشریح کی ہے جس کے مطابق تمام سیاسی مقاصد خواہ وہ کتنے ہی قابل تعریف اور جائز ہوں ان کے حصول کے لیے طاقت یا تشدد کا استعمال دہشت گردی ہے۔

یہ امریکی تشریح جنرل اسمبلی کی ۱۹۸۵ء کی اس قرارداد کے خلاف ہے جس میں

حق خودارادی یا غیر ملکی قبضہ کے خلاف ایسا کرنا دہشت گردی کی فہرست میں شامل نہیں ہے' اس لیے یہ جنرل اسمبلی کی ذمہ داری ہے کہ دہشت گردی کی ایسی تشریح کی توثیق اور منظوری دے جس کی پاسداری ہر ملک میں لازم اور اس کی پرانی قراردادوں کے مطابق ہو۔

۹ر دسمبر ۱۹۸۵ء کو ایک سو آٹھویں بنیادی اجلاس میں جنرل اسمبلی نے چھٹی کمیٹی کی تیار کردہ قرارداد منظور کی۔ یہ رپورٹ (A/40، ۱۰۳) مزید زور دیتی ہے کہ تمام مما لک الگ الگ ایک دوسرے کے اور اقوام متحدہ کے اداروں کے اشتراک سے بین الاقوامی دہشت گردی کی وجوہات دور کریں اور تمام حالات پر خاص توجہ دیں جس میں نوآبادیات نسلی امتیازات اور ایسے حالات جن میں انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کی صریح خلاف ورزی ہو رہی ہو۔ اسی میں غیر ملکی قبضہ بھی شامل ہے جو بین لاقوامی دہشت گردی پیدا کر سکتا ہے۔ اور اس طرح عالمی امن اور تحفظ کو خطرہ میں ڈال سکتا ہے۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو منظور ہونے والی ایک اور قرار داد میں جو ووٹ لیے بغیر منظور ہوگئی تھی جنرل اسمبلی تمام مما لک کو ذمہ داری ٹھہراتی ہے کہ مسلح دخل اندازی' ملکوں اور علاقوں پر قبضہ اور ایسی تمام حرکات جو لوگوں پر ظلم' دباؤ' امتیازی سلوک' استحصال اور بدسلوکی خصوصاً جو غیر انسانی اور وحشیانہ طریقوں پر مبنی ہیں فوراً بند کریں۔

امریکی جسے دہشت گردی سمجھتے ہیں خاص طور پر جس میں مبینہ طور پر مختلف مما لک کے مسلمان ملوث ہیں دراصل اس لیے ضروری ہوئی ہے کہ انھیں حق خود اختیاری حاصل کرنا ہے یا وہ غیر ملکی تسلط کے خلاف جنگ آزادی لڑ رہے ہیں جیسا کہ جنرل اسمبلی کی مذکور بالا قراردادوں میں نشان دہی کی گئی ہے اور ان ہی کو دہشت گردی کی جانچ کے اوزار کے طور پر استعمال کیا جانا چاہیے۔ ریاستہائے متحدہ نے ۱۱ ستمبر کے بعد دہشت گردی اور جنگ آزادی کے درمیان کوئی خط امتیاز کھینچنے سے انکار کر دیا ہے۔

اس بات کو بھی کہ طاقت کا استعمال شیرون پر نہیں ہونا چاہیے اس حقیقت کے ساتھ مشروط ہونا چاہیے کہ جن پر یہ طاقت استعمال ہو رہی ہے وہ غیر مسلح ہیں یا جنگ

آزادی لڑنے والوں کے خلاف ملازمتوں کی صورت میں یا دوسرے طریقوں سے استعمال نہیں ہو رہے ہیں۔ اسرائیل میں سارے بالغ شہری مرد ہوں یا خواتین فوجی تربیت یافتہ ہیں اور لڑنے کے لیے ہتھیار رکھتے ہیں۔ ماضی میں انھیں جنگوں میں شریک کیا گیا ہے علاوہ ازیں یہ لوگ فلسطینی آبادی کو نشانہ بناتے رہتے ہیں۔

دہشت گردی کی موجودہ تعریف اس تعریف سے بھی متصادم ہے جو ایک مشہور امریکی دانشور Abraham Saler نے جو کہ State Department کے مشیر قانون ہیں اپنی کتاب ''دہشت گردی اور قانون کے نفاذ'' میں کی ہے۔ Saler کہتا ہے ''سیاسی تشدد کا جائز ہونا ایک ایسا خیال ہے جو بین الاقوامی قانون کے نفاذ میں گہرائی تک اتر چکا ہے' زیادہ تر ممالک نے ایسے معاہدے کر رکھے ہیں جو انھیں ذمہ دار ٹھہراتے ہیں کہ دوسرے ممالک میں دہشت گردی پر مبنی جرائم کے مرتکب افراد کو ان کے حوالے کر دیں پھر بھی حوالگی کی درخواستیں اکثر رّد کر دی جاتی ہیں کیونکہ اس عمل کو سیاسی عمل قرار دیا جاتا ہے جس پر حوالگی کا قانون لاگو نہیں ہوتا۔

پچھلے سالوں میں امریکی عدالتوں نے آئرش فوج کے چار مبینہ لڑاکوں کو اس بنیاد پر واپس کرنے سے انکار کر دیا کہ اس علاقہ میں بغاوت ہے جس کی وجہ سے اس سلسلہ کا جرم سیاسی بن جاتا ہے۔ The Geneva Diplomatic Conference نے ایک مضمون میں جسے اب Article (4) of Protocol کہا جاتا ہے ایسی مسلح لڑائیوں پر جو لوگ نوآبادیاتی تسلط یا غیر ملکی قبضہ کے خلاف حق خود ارادی کے لیے لڑ رہے ہوں عالمی جھگڑوں کا قانون لاگو کیا گیا ہے۔ دہشت گردی کے متعلق اس قانونی اور اخلاقی پس منظر میں امریکہ کو دہشت گردی کے لیے نئے تصورات ایجاد کرنا یا ہندوستان کا کشمیری جنگ آزادی لڑنے والوں کو دہشت گرد قرار دینے کی شدید کوششیں کوئی بنیاد نہیں رکھتیں' ماضی میں ہندوستان کا ۲۰ نام نہاد دہشت گردوں کی فہرست دینا اور ان کی حوالگی کا مطالبہ قانونی اور اخلاقی طور پر ایسی کوئی بنیاد نہیں رکھتا تھا کہ اس پر عمل کیا جاسکے۔ دہشت گردی کی یہ تعریف جبر اور انسانی حقوق کی پامالی اور تحاریک آزادی کو

دبانے کے تمام دروازے کھول دے گی۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد مسلمان دانشور ساری دنیا سے جمع ہوئے' مکہ مکرمہ میں چھ دنوں کی گفت وشنید کے بعد انھوں نے دہشت گردی کی تعریف ایسے ناجائز حملہ کے طور پر کی ہے جو کسی فرد' گروہ یا ملک کی طرف سے لوگوں پر کیا جائے اور اس مزاحمت کو جوایسے نوآبادیاتی آبادکاروں اور ان کے ساتھیوں کے خلاف ہو جنھوں نے لوگوں کو ان کی اپنی زمینوں سے بے دخل کر دیا ہے جہاد کہا ہے۔

ستمبر ۲۰۰۵ء میں چار سال بعد بھی عالمی کانفرنس میں جہاں سربراہان مملکت اور حکومتوں کی اب تک کی سب سے بڑی تعداد شریک تھی اس بات کا فیصلہ نہ ہوسکا کہ دہشت گردی ہے کیا؟ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے اس کی تعریف کو آسان بنانے کی یوں کوشش کی کہ شہریوں کے قتل کو دہشت گردی قرار دیا۔ انھوں نے لفظ بے گناہ بھی مٹا دیا جو اولین مسودہ میں تھا۔ ایسی غیر متوازن تعریف امریکی حفاظتی سیکیورٹی گارڈوں Black water firms' اسرائیلی شہریوں کو استثناء مہیا کرنے کے لیے تھی جو خود اور اکثر اوقات طاقت استعمال کر کے آبادیاں قائم کرتے ہیں۔

دہشت گردی کے اسی قسم کے نظریہ پر مبنی قانون سازی برطانیہ میں ہونے والی ہے جس کے ذریعے طاقت کے استعمال کی کسی بھی آئندہ یا بلاواسطہ تحریک پر سزا دی جاسکے تاکہ عراق پر قبضہ کے خلاف ہونے والی مزاحمت کو دہشت گردی قرار دیا جاسکے۔

بین الاقوامی قوانین جنگ اور عرصہ سے مروّج رواج دشمنوں کی لاشوں کے مُثلے (Mutilation) کو ناجائز قرار دیتے ہیں لیکن امریکی سپاہی اس قانون اور عرصہ سے قائم رواج کے خلاف افغانستان میں بربریت میں ملوث رہے ہیں۔ ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو ڈان کے نمائندہ خصوصی نے واشنگٹن سے اپنے مراسلے میں رپورٹ دی کہ آسٹریلوی ٹیلی وژن چینل نے ایسی تصویریں دکھائی ہیں جن میں امریکی سپاہی طالبان کی لاشوں کو جلا رہے ہیں اور سوختہ اور جلتی ہوئی لاشوں کو جنوبی وزیرستان میں پروپیگنڈے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ جس پر امریکی مرکزی کمان نے فوری تفتیش کا حکم دیا۔

ریاستہائے متحدہ کی فوجی اور معاشی مطلق العنانی

PNAC خاکہ کی نظریاتی بنیاد اس وقت کے خیال کے مطابق ریاستہائے متحدہ میں بے چینی کی صورت حال نے مہیا کی تھی۔ مثال کے طور پر:

(۱) ریاستہائے متحدہ فوجی اور معاشی مطلق العنانی حاصل ہونے کے باوجود کئی سمتوں سے عدم تحفظ کا شکار ہے۔

(۲) مزید برآں یہ سمجھا جارہا تھا کہ سست روسفارتی عمل سے محبت کی وجہ سے جس میں اقوام متحدہ کی طرف بار بار رجوع کرنا بھی شامل ہے امریکہ واحد عالمی طاقت ہونے کے باوجود تمام عالمی مسائل اور امریکی مفادات حل کرنے کے مقام پر نہیں ہے۔

جدید رجعت پسندوں (NEO CON) کا خیال تھا کہ سمجھانے بجھانے اور مذاکرات کا استعمال اس وقت تک مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر سکے گا جب تک اس کی پشت پر تیار فوجی کارروائی کی سخت دھمکی موجود نہ ہو۔ اس طرح PNAC منصوبہ کی توانائی اور پہنچنے کی صلاحیت کا اندازہ لگانے کے لیے فوجی اور معاشی میدان میں امریکی اقتدار کاملہ کی نوعیت (Nature) اور دائرہ عمل کی تحقیق فائدہ مند ثابت ہوسکتی ہے۔ بنیاد پرستوں کا خیال تھا کہ کلنٹن اور دوسری حکومتی انتظامیہ کا بہت سا وقت اور صلاحیتیں سست روسفارت کاری اور اقوام متحدہ پر بھروسہ کرنے میں ضائع کر چکی تھیں۔

Huntington کے مطابق کسی سچی عالمی طاقت کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ اہم بین الاقوامی مسائل تنہا حل کر سکے اور دوسری طاقتوں کے کسی بھی اتحاد میں اتنی طاقت نہیں ہونی چاہیے کہ اسے ایسا کرنے سے روک سکے۔ اس معیار کے مطابق ریاستہائے متحدہ کو واقعی ایک عالمی طاقت نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس کے پاس ایسی بے پناہ قوت موجود نہ تھی۔ امریکہ اسرائیل اور فلسطین کے جھگڑے سے ابھرنے والے مسائل حل نہ کرسکا جو کہ اس کے اہم مفادات پر اثر انداز ہورہے تھے۔ ایران شاہ ایران

کی امریکہ حمایتی بادشاہت کو ختم کرنے کے بعد اسلامی ریاست کے طور پر ابھر چکا تھا۔ یہ افریقی ریاستوں میں بدامنی اور خون ریزی کا مسئلہ بھی حل نہ کر سکا جن کی وجہ لوگوں کے قبائلی جھگڑے اور دشمنیاں ہیں۔ مشرق وسطیٰ نائیجیریا اور وینز ویلا میں بدستور سیاسی ہلچل ہے اور امریکہ کو تیل کی فراہمی کا سلسلہ جس پر جلد امریکہ کا انحصار ۲۰۱۰ء تک ستر فی صد سے آگے بڑھ سکتا ہے ہر وقت خطرہ کی زد میں ہے وغیرہ وغیرہ۔

فوجی اور معاشی شعبہ میں مکمل قدرت حاصل ہونے کے باوجود جس کا دنیا میں کوئی مقابل نہیں ہے ریاستہائے متحدہ اہم اور ضروری عالمی مسائل حل کرنے میں عدم صلاحیت کا شکار ہے۔ فوجی تحقیق اور ترقی کے اخراجات میں توازن نہیں ہے حالانکہ ریاستہائے متحدہ اکیلا چھ طاقتور ملکوں سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔ مزید یہ کہ ریاستہائے متحدہ نے یہ فوجی فضیلت اپنے GDP کا صرف ۳۴۵ فی صد خرچ کر کے حاصل کی ہے۔

امریکہ جیسا معاشی غلبہ اور تسلط ۱۹۴۵ء کے بعد کی جدید تاریخ میں کسی بھی طاقت کو حاصل نہیں رہا ہے۔ امریکی معیشت اپنے قریب ترین مقابل جاپان سے دگنی ہے۔ ۱۹۹۹ء میں اسی نے بلا واسطہ غیر ملکی سرمایہ کاری کا ۱/۳ حصہ حاصل کیا ہے۔ ماضی کی نمایاں طاقتیں یا تو بڑی معاشی اور بحری قوتیں تھیں یا بڑی بڑی فوجی طاقتیں، بیک وقت دونوں کبھی نہیں۔ ریاستہائے متحدہ کو یہ انوکھا مقام حاصل ہے کہ وہ سب سے بڑی فوجی طاقت بھی ہے اور معاشی طاقت بھی۔ تاریخ میں ایسے کسی نظام کی مثال موجود نہیں ہے جس میں صرف ایک ملک کو دوسرے تمام خود مختار ملکوں پر اس قدر مکمل برتری حاصل ہو۔ مشرق اور مغرب میں سمندروں اور شمال وجنوب میں کمزور دوست ملکوں سے گھرا ہوا ریاستہائے متحدہ ماضی کے مخالف حاکموں کے مقابلہ میں بہت کم خطرات کے مقابل ہے اور دوسروں کے لیے بھی بڑا خطرہ نہیں ہے۔ اس کی واحد عالمی طاقت ہونے کی حیثیت کے امکانی مقابل مثلاً چین، روس، جاپان اور جرمنی بالکل مختلف حیثیت میں ہیں وہ امریکہ جیسی فوجی حیثیت حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ اس صورت میں وہ اپنے

ہمسایوں کے لیے فوری خطرہ بن جائیں گے اکیلا ریاستہائے متحدہ ہی ہے جو فخر یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ بڑا بھی ہے اور دولت مند بھی جبکہ اس کے ممکنہ مقابل زیادہ سے زیادہ ایک یا دوسری صفت کا دعوی کر سکتے ہیں۔ آج کے بڑے ملکوں مثلاً چین اور ہندوستان کو امیر ہوتے ہوئے کم ازکم ایک نسل گزر جائے گی ان کی گھٹتی ہوئی آبادی کے مدنظر ان کے بہت بڑھنے کی امید نہیں ہے۔۱۹۹۰ء کی دہائی میں امریکی آبادی میں ۳۲۲۳ ملین کا اضافہ ہوا جو برطانیہ اور فرانس کی موجودہ آبادی کا نصف ہے بہرحال یہ کہا جا سکتا ہے کہ یورپی یونین کے لیے ممکن ہے کہ وہ وسیع تر ہو جائے اور امیر تر بھی اور طاقت کا ایک اور محور بن جائے۔ اگر برسلز مقابلہ کی فوجی صلاحیتیں اور ایک ریاست جیسی مشترکہ طاقت حاصل کر بھی لے تو بھی مشترکہ دفاع اور صنعتی صلاحیتیں جو ریاستہائے متحدہ سے مقابلہ کے قابل ہوں حاصل کرنا ممکن نہ ہوگا۔ یورپی یونین ساٹھ ہزار فوجیوں پر مشتمل ایک سریع العمل فوج بنانے کی کوشش کر رہی ہے جو ان کی بھلائی' قیام امن اور بحران کے دوران چھوٹے چھوٹے انتظامی کام کر سکے۔ لیکن پھر بھی فوجی ضروریات مثلاً خفیہ معلومات' ہوائی نقل وحمل، فضائی دفاع، ہوا میں ایندھن بھرنے' بحری نقل وحمل' طبی سہولتوں اور مجموعی تیاری سے محروم ہے۔

نرم قوت بہ مقابلہ سخت قوت

ریاستہائے متحدہ کی یک طرفیت اور فوجی طاقت کے نتائج اور حدود کے بارے میں Joseph S.Nye Jr. نے عراق کے بعد امریکی طاقت اور حکمت عملی کے نام سے ایک مضمون لکھا ہے (NYE.(Foreign Affairs July -Aug 2003 کہتا ہے ایسے وقت جب کہ ریاستہائے متحدہ کے فوجی اخراجات آدھی دنیا کے برابر ہیں کوئی بھی اتحاد روایتی طاقت کا توازن پیدا نہیں کر سکتا۔ جب روم کے پاس ایک قوم ایسی ہو جو دوسروں پر چھائی ہوئی ہو۔ اس فوجی دیوقامتی کے باوجود دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو امریکہ کے بس سے باہر ہیں۔

یک طرفیت کی پہلی مہلک غلطی فوجی طاقت پر ضرورت سے زیادہ انحصار ہے۔
اگرچہ امریکیوں کو اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر لینی چاہییں کہ دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے سالوں تک دوسرے ملکوں کے تعاون، خفیہ معلومات کی فراہمی، پولیس کی مدد، رقوم کی منتقلی کے راستوں کی خبر اور سرحدوں پر کنٹرول کی ضرورت ہو گی۔ مثال کے طور پر افغانستان میں امریکہ کی فوجی کارروائی نے مسئلہ کے سب سے آسان حصہ سے دو دو ہاتھ کیے ہیں، ایک غریب ملک میں ظالم اور کمزور حکومت کا تختہ الٹ دینا۔ لیکن اس تمام جچی تلی بمباری نے القاعدہ کے رابطوں کے بہت ہی مختصر حصہ کو تباہ کیا جس کے مراکز ساٹھ ممالک میں موجود ہیں اور بمباری ہیمبرگ یا ڈیٹرائٹ میں موجود مراکز کا مسئلہ حل نہیں کر سکتی۔

افغانستان میں کامیابی کی یہ گمراہ کن صورت حال اتحاد کی ضرورت کو اجاگر کرتی ہے۔ کثیر قومی دہشت گردی کے خلاف بہترین ردعمل فوجی کارروائی نہیں بلکہ مکمل طور پر معاون حکومتی ادارہ ہے۔ ریاستہائے متحدہ بہرحال اپنی تمام فوجی قوت کے باوجود تجارت، بھروسہ کی قلت (Anti trust) یا تجارتی اصول و قواعد کے مسائل پر یورپی یونین، جاپان اور دوسروں کے متحرک تعاون کے بغیر مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر سکتا دہشت گردی جیسے کثیر القومی امور و مسائل کے لیے دوسرے ممالک کا تعاون کسی حد تک ان کے اپنے مفادات پر منحصر ہے لیکن امریکی موقف اخلاقی اور ثقافتی دل کشی سے بھی اہم ہے۔ نرم دِل طاقت اپنی طرف راغب کرنے کی صلاحیت اور کوشش کے ذریعے کام کرتی ہے نہ کہ زور زبردستی اور کثیر القومی مسائل کے حل میں دوسرے ممالک کے ساتھ کہیں بڑے پیمانہ پر کام کرتی ہے، سخت رَو طاقت یعنی زبردستی کرنے کی صلاحیت بلاشبہ ملک کی فوجی اور معاشی صلاحیت میں مضمر ہے جو روبہ عمل ہو کر مزاحمت پیدا کرتی ہے اور اکثر الٹا اثر دکھاتی ہے، اس کے مقابل نرم رَو طاقت کسی ملک کی دلکشی، ثقافت، سیاسی خیالات اور پالیسیوں سے ابھرتی ہے جب ان کو روبہ عمل لایا جاتا ہے تو بہتر اور دیرپا نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ نرم رَو طاقت کی بنیاد وجوہات اور پالیسیوں کے جائز ہونے

پر ہے۔ یہ پالیسیاں ان لوگوں کو جائز نظر آنی چاہییں جوان کو آگے بڑھا رہے ہیں' سخت رو طاقت بلاشبہ قومیت پر مبنی ان ممالک کے لیے اہم ترین ہے جو اپنی آزادی کی حفاظت کر رہے ہیں لیکن بہرحال وہ نرم رَو طاقت کی ضرورت اور دل پذیری سے جو کثیر القومی مسائل کے اجتماعی تعاون سے حل کرنے کے لیے ضروری ہے صرف نظر نہیں کرتے۔ پہلی خلیجی جنگ کو جو اوسلو امن عمل پر منتج ہوئی تھی جائز قرار دیا گیا تھا جبکہ ماضی قریب کی جنگ کو ایسا نہیں سمجھا گیا۔ امریکی فوجی قوت کے توازن پیدا کرنے میں ناکامی پر جرمنی فرانس روس اور چین نے ایک ایسا اتحاد پیدا کیا جو امریکی نرم رَو طاقت کو اس جواز جنگ سے محروم کر دے جو اسے دوسری صورت میں اقوام متحدہ کی دوسری قرارداد کے ذریعے حاصل ہوتا۔ اگر چہ ایسے توازن کے ذریعے عراق میں جنگ سے بچاؤ نہیں ہوا لیکن اس کی قیمت یقیناً بڑھ گئی ہے۔

اس بات کے ثبوت کثیر تعداد میں موجود ہیں کہ یک طرفیت کے نئے علمبردار بش انتظامیہ پر حاوی ہیں جو امریکی نرم رَو طاقت کو بکھیرنے کے لیے امریکی فوجی طاقت پر انحصار کرتے ہیں۔ جنگ سے پہلے ایک PEW خیراتی ٹرسٹ نے رائے شماری کے ذریعے دریافت کیا کہ گذشتہ دو سالوں کے دوران ۶۷ میں سے ۱۹ ملکوں میں امریکی پالیسی (نہ کہ امریکی ثقافت) نے ناپسندیدگی پیدا کر دی ہے' ان ملکوں میں وہ اسلامی ممالک بھی شامل ہیں جن کی اہمیت دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بے انتہا ہے۔ دوسری رائے شماری سے پتہ چلا کہ نمایاں یورپی ممالک میں امریکہ کی پسندیدگی ۳۰ درجہ کم ہو چکی ہے' ریاستہائے متحدہ کے لیے ضروری ہے کہ اپنی طاقت کے جواز اور وسیع رضامندی کے حصول کی خاطر نئی حکمت عملی کی تشکیل کے لیے کثیر الجہتی کے فوائد کو ایک بار پھر سے دریافت کرے ایسے پیش بند عمل جو کثیر القومی رضامندی کے ذریعے نافذ ہوں کہیں کم خرچ ہوتے ہیں اور امریکہ کے لیے بہت کم خطرناک مثال قائم کرتے ہیں جسے چاہیے کہ اس بات پر زور دینا بند کرے کہ وہ اکیلا ہی جج، جیوری اور جلاد سب کا کردار ادا کر سکتا ہے۔

اکیسویں صدی میں امریکی طاقت کا مسئلہ یہ ہے کہ کثیر تعداد میں ممالک بڑی طاقتوں کے دائرہ اثر سے باہر نکلتے جا رہے ہیں' امریکی طاقت کا تصادم یہ ہے کہ دنیائے سیاست کچھ اس طرح تبدیل ہو رہی ہے کہ روم کے بعد کی بڑی طاقتوں کے لیے اکیلے ہی عالمی مفادات کا حصول ناممکن ہو گیا ہے اور ریاستہائے متحدہ کے پاس نہ تو ایسی عالمی اور ملکی صلاحیت ہے کہ دوسرے ممالک کے داخلی جھگڑے نمٹا سکے اور ساتھ ہی ان عالمی تبدیلیوں پر قابو پا سکے جو خود امریکیوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

آج کے کئی بنیادی مسائل مثلاً عالمی معاشی استحکام' منشیات کا پھیلاؤ' بیماریاں اور خصوصاً نئی دہشت گردی جیسے اہم مسائل کا حل صرف فوجی طاقت میں نہیں بلکہ ایسا کرنا کبھی کبھی الٹے اثرات پیدا کر دیتا ہے۔ نرم رورویہ کی اہمیت کم کر کے نئے یک طرفیت کے حامیوں کا اشتراک جو نئے Jacksonians اور نئے wilsonians پر مبنی ہے واشنگٹن کو نئی قومی دفاعی حکمت عملی رو بہ عمل لانے کے لیے اہم اداروں سے محروم کر رہا ہے۔ اگر وہ اسی رویہ پر قائم رہے تو امریکہ اس امتحان میں ناکام ہو سکتا ہے جو ہینری کسنجر کے الفاظ میں یوں بیان ہوا ہے: ''اس نسل کے امریکی قائدین کا امتحان یہ ہے کہ امریکہ کی بے پناہ طاقت کو مقبول عام میعاد کے پردے میں عالمی رضامندی حاصل کرنے کے لیے استعمال کریں تاکہ ایک مشکوک مستقبل میں امریکی اقدار محفوظ رہیں[1]''

Jack Synder نے اپنے مضمون 'Imperial temptation (Quarterly National Interst 2003) میں پیش بند جنگوں کی دشواریوں کو مزید اجاگر کیا ہے' وہ کہتا ہے آج امریکہ ایسی حالت میں ہے جو بیک وقت بے پناہ طاقت اور کمزوری پر مبنی ہے' فوجی طور پر طاقتور ترین ہونے کے باوجود ایک دہشت گرد حملہ کی وجہ سے مکمل تباہی کا خطرہ ہے۔ اس صورت حال نے ایسی نفسیاتی حالت پیدا کر دی ہے کہ امریکی غیر ملکی حملوں کے بے انتہا ڈر کی وجہ سے فوجی طاقت کے استعمال پر تیار ہیں جو اس ڈر سے بچنے کی خودسوز کوشش ثابت ہو سکتا ہے۔ دہشت گردی کو جوابی حملوں سے ڈرا کر روکنا ممکن نہیں ہے۔ بش انتظامیہ کی جنگ سے متعلق لفاظی بہرحال

ایسا تاثر نہیں چھوڑتی کہ وہ اس امریکی مخمصہ پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں بلکہ نقطہ بہ نقطہ سامراجی نظم کے اولین رکھوالوں کے نظریات کو مسخ کیا جا رہا ہے' مثال کے طور پر طاقت کا پیش از وقت استعمال سامراجی تحفظ کے لیے الٹے نتائج ہی پیدا کرتا ہے کیونکہ اکثر اوقات وہ طاقتیں جواب تک زیر نہیں ہو سکیں یا کسی اور وجہ سے دبی ہوئی ہیں کناروں پر ایسی جنگل کی آگ کو چنگاری دکھا دیتی ہیں جن کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے۔ یورپی مقبوضات کو قائم رکھنے کے لیے نپولین اور ہٹلر نے ماسکو پر یلغار کی' روسی موسم سرما میں گھر گئے۔

۱۲ اپریل ۲۰۰۳ء کے گارڈین میں شائع شدہ ایک مضمون میں کہا گیا ہے کہ Nuremberg میں نازی قیادت پر مقدمہ کے منصفین کے مطابق جارحانہ جنگ نہ صرف بین الاقوامی بلکہ شدید ترین بین الاقوامی جرم ہے۔ منصفین کے تالیف کردہ عالمی قانون کے رہنما اصول بتاتے ہوئے انھوں نے خاص طور پر جرمنی کی طرف سے دوسرے ملکوں پر پیش بند حملوں کی ضرورت پر جرمنی دلیل کو مسترد کر دیا۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ دنیا کے سارے ملکوں میں یہ ریاستہائے متحدہ ہی ہے جس نے پیش بند جنگ کی وہی صورت اختیار کر لی جو نازی جرمنوں کی تھی اور جسے نیورمبرگ مقدمہ کے منصفین نے رد کر دیا تھا۔

امریکی حاکمیت للکار کی زد میں

جس طرح بازنطینیوں اور رومیوں نے مفادات اور اقدار کی بنیاد پر اپنے راستے الگ کر لیے تھے' اسی طرح یورپیوں اور امریکیوں نے کیا ہے۔ بحر اوقیانوس (Atlantic) کے دونوں کنارے عالمی قیادت کے دو مراکز تیار کر رہے ہیں اور ساتھ ہی دو مختلف اور ایک دوسرے کے مدمقابل معاشی' سیاسی اور ثقافتی نظام بھی۔ ماضی قریب میں سارے یورپ میں پابندیاں ہٹائے جانے کے باوجود امریکہ کی آزاد سرمایہ داری اب بھی یورپ کے مرکزیت پر مبنی طریق کار کا الٹ ہے۔ یورپی امریکہ میں معاشی

ناہمواریوں اور مادی فوائد کے لیے سماجی فائدوں کی قربان کر دینے کی روش کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ امریکی ابھی تک اسی اصول کے ساتھ زندہ ہیں کہ حقیقی سیاست کے نزدیک فوجی دھمکی اور زبردستی سفارت کاری کے ضروری آلے ہیں۔ اس کے برخلاف یورپی پچھلے پچاس سالوں سے قانون کی حکومت کے حق میں ہتھیاروں سے دور رہنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ پہلی جولائی کو جب یورپی یونین عالمی عدالت برائے جرائم کی ابتدا پر خوشیاں منا رہی تھی بش انتظامیہ یہ دھمکی دے رہی تھی کہ اگر ان کو اس عدالت کے دائرہ عمل سے مستثنیٰ کیا گیا تو وہ بوسنیا سے اپنی فوجیں ہٹا لے گا' اس کی وجہ ڈھکی چھپی نہیں۔ ریاستہائے متحدہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ تمام انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرے یہاں تک کہ اپنی عالمی حاکمیت اور تسلط کو کسی بھی قیمت پر قائم رکھنے کے لیے جنگی جرائم کا ارتکاب بھی کرتا رہے۔

امریکہ کی زیر کمان افواج کے ہاتھ قلعہ جھنگی میں طالبان کا قتل عام اور امریکہ کا انسانی حقوق کے کمیشن کی طرف سے اس قتل عام کی تفتیش کے مطالبہ کو مسترد کر دینا جنگ اور امن دونوں حالتوں میں امریکہ کی جارحیت اور بربریت پر مبنی طرز عمل کو نمایاں کر دیتا ہے۔ یورپی امریکہ کی طرف سے طاقت کے استعمال پر ضرورت سے زیادہ انحصار کو خطرناک' خودغرضی پر مبنی اور اس کی بے پناہ طاقت کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ امریکی یورپیوں کی کثیر فریقیت. سے اٹوٹ وفاداری کو احمقانہ' خودغرضانہ اور فوجی کمزوری کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ کے درمیان ثقافتی فاصلہ بڑھتا نظر آتا ہے جو بحرا وقیانوس کے دونوں کناروں کو ایک متصادم سماجی راستہ پر لے جا رہا ہے۔ جس طرح یورپی یونین کی ترقی ہو رہی ہے اس کے معاشی اور سیاسی مفادات بار بار امریکی مفادات سے ٹکرا رہے ہیں اور تعلقات میں مزید بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے۔ حال ہی میں یورپی ہوائی کمپنیاں تجارتی طیاروں کی فراہمی میں بوئنگ کو پیچھے چھوڑ چکی ہیں اور NOKIA اب سیل فون کا سب سے بڑا تاجر ہے۔ یہ دونوں ان بہت سی یورپی کمپنیوں میں سے صرف دو ہیں جو امریکی مقابل اداروں کو شکست دے رہی ہیں۔ ۲۰۰۰ء کی دہائی جس نے امریکی

معیشت کو بڑھاوا دیا تھا اب بحر اوقیانوس کے دوسرے ساحل کی طرف مائل ہے اور یورو کو ڈالر کے مقابلہ میں مضبوط کر رہا ہے اور اس طرح یورپی یونین کی شرح پیداوار اور ترقی میں جلد اضافہ ہوگا۔ اب جرمنی سے فرانس کی طرف کار کا سفر ایسا ہی ہے جیسا ورجینیا سے میری لینڈ جانا۔ نہ پاسپورٹ نہ کسٹم نہ زرمبادلہ کا مسئلہ۔ یورپی یونین نے ۱۹۹۹ء میں خارجہ پالیسی کے لیے اپنا پہلا سربراہ مقرر کیا اس کے ذمہ یونین کے لیے فوج کی تشکیل کی نگرانی کے ساتھ مشرق وسطیٰ، بلقان اور دوسرے پراگندہ علاقوں میں سفارتکاری شامل ہے۔ یونین کا گیلیلیو کے نام سے سیٹلائٹ کے جال کے قیام کا فیصلہ امریکی ٹیکنالوجی پر یورپ کے انحصار کو بہت کم کر دے گا۔ ان تحریکوں میں سے جنھیں عوام کی تائید حاصل ہے ستر فی صد شہری پورے یورپی یونین کے لیے واحد حفاظتی پالیسی کے حق میں ہیں۔ یورپی یونین کے سیاسی اور معاشی انضمام کے لیے ایک سیاسی تحریک اب زور پکڑ رہی ہے تاکہ یورپ کی طاقت میں اضافہ ہو سکے۔

ٹونی بلیر نے اعلان کیا ہے ''اس کا مطلب جو بھی ہو آج یورپ صرف امن کی بات نہیں کرتا بلکہ یہ مجموعی طاقت کی نمائش کرنا چاہتا ہے۔ جرمنی کے سابق چانسلر شروڈر نے ایک مربوط اور وسیع تر یورپ کی ضرورت پر زور دیا تھا تاکہ امریکی تسلط ختم کیا جا سکے۔ یورپی یونین اور اس کی انتظامیہ کے صدر Romanio Prodith کے مطابق یونین کے اہم مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ یورپ میں ایک ایسی طاقت پیدا ہو جو ریاستہائے متحدہ کے برابر کھڑی ہو سکے۔ سویڈن کے وزیراعظم Gorman Persson نے حال ہی میں کہا کہ یورپی یونین ان اداروں میں سے ایک ہے جسے ہم امریکہ کے عالمی تسلط کے لیے توازن کے طور پر ترقی دے سکتے ہیں۔ بش کے تنہا روی کے شوق نے یورپ کی حمیت کو خاص طور پر اکسا دیا ہے۔ جیسے جیسے بش بڑھتے ہوئے عالمگیر درجہ حرارت کے لیے بنائے گئے Koyoto ضابطہ عمل، Antiballistic Missile معاہدہ سے دور ہوئے اور ریاستہائے متحدہ کو کئی کثیر القومی اداروں سے الگ کرتے جا رہے ہیں یورپ کے خدشات بڑھتے جا رہے ہیں اور اب یورپ اپنے آپ کو

اس بات پر مجبور پاتا ہے کہ امریکہ کو للکارے بھی اور اپنا راستہ بھی وضع کرے۔ جرمنی کے وزیر خارجہ فشر نے واشنگٹن سے کہا کہ معاہدوں کے حصہ دار طفیلی نہیں ہوتے۔ The Berliner Zietwing نے اظہارِ تاسف کیا کہ اپنے اکیلے چلنے کے طریقہ سے الگ ہونے کے بجائے ریاستہائے متحدہ مواقع کو اپنی سپر پاور والی حیثیت کو مزید مضبوط کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے' اس سے پہلے کبھی کوئی امریکی صدر ہمارے لیے اس قدر اجنبی نہیں رہا۔ اخبار نے ایک اداریہ میں پکار کر کہا اس سے پہلے کبھی جرمن باشندے اپنے سب سے طاقتور اتحادی کی پالیسیوں کے بارے میں اس قدر متشکک نہیں رہے۔

امریکہ اور یورپ کی دہشت گردی کے ذرائع اور اس سے جنگ کے طریقوں پر تکرار بحراوقیانوس کے دونوں کناروں کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو پاٹنے کے بجائے مزید بڑھا سکتی ہے۔ یہ دونوں مشرق وسطی کے بارے میں بھی متفق نہیں ہیں۔ یورپی یونین کی امریکہ کی طرف سے اسرائیل کی مدد میں سخت گیری اور ایران کو ساتھ ملانے کے بجائے اسے بھڑکانے والے رویہ سے اختلاف ہے۔ فولاد اور زراعت پر تجارتی جھگڑے سر اٹھا رہے ہیں۔ امریکہ کے Koyoto ضابطہ عمل سے الگ ہو جانے کے باوجود یورپی یونین سو سے زیادہ ممالک کی تائید کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ امریکی تنہائی پسند رویہ کے خلاف یورپی یونین کے رکن ممالک یہاں تک آگے بڑھ گئے کہ پچھلے سال انھوں نے جوابی طور پر ریاستہائے متحدہ کے خلاف ووٹ دے کر اسے اقوام متحدہ کے کمیشن سے باہر کر دیا۔ برطانوی یورپ سے الگ ہونے کے بعد ریاستہائے متحدہ ایک وفاق کے طور پر یکجا ہوا تھا۔ یہ ایک قائد قوم کے طور پر ابھرا اور یورپی طاقت کے سورج کو گہنا دیا۔ اب یورپ کی باری ہے کہ اٹھے اور امریکہ سے الگ ہو جائے جو اپنی برتری کی مراعات چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ امریکہ کے تنہائی پسند رویے ہی ہیں جنھوں نے یورپ کو جو امریکہ کا سب سے قابل بھروسہ دوست تھا بھڑکا کر اس کے دائرہ اثر سے نکل جانے' اس کی برتری کو للکارنے اور اپنا راستہ الگ بنانے پر مجبور کیا۔ صرف یورپ

ہی نہیں بلکہ لاطینی امریکہ بھی جو ریاستہائے متحدہ کا پائیں باغ ہے اس سے الگ ہو رہا ہے اور اپنے لیے ایک الگ حلقہ بنا رہا ہے کیونکہ تمام علاقائی معاہدوں کے باوجود اسے امریکہ سے وعدہ خلافی اور نظر انداز کیے جانے کی شکایت ہے۔ موقر امریکی جریدے Foreign Policy کے جولائی اگست ۲۰۰۳ء کے شمارہ میں ایک چشم کشا مضمون اس بارے میں ہے کہ لاطینی امریکی ریاستہائے متحدہ کے بارے میں کس طرح سوچتے ہیں۔

جب واشنگٹن سے بش کے معذرت خواہوں کو امریکی سامراج کی تعریف کرتے سنتے ہیں تو لاطینی امریکی تمسخرانہ ہنسی ہنستے ہیں' وہ یہ سب کچھ پہلے بھی سن چکے ہیں اس کے لیے Pax-Americana خارجہ پالیسی کا کوئی قابل فخر کارنامہ نہیں ہے نکاراگوا والے چین امریکی، ڈومینیکن کیوبا والے اور ہیٹی والے فرانسیسیوں کو صدی سامراج کے ساتھ زندگی گزارنے اور شکایات کرنے کے گر سکھانے کو تیار ہیں۔ وہ امریکہ کی طرف سے دوست اور دشمن دونوں کے خلاف گذشتہ ایک صدی سے جاری پیش بند حکمت عملیوں کو سمجھنے کی کلید پوری دنیا کے لیے مہیا کر رہے ہیں جن کے معانی بہت زیادہ دقیق بھی نہیں ہیں' امریکی مرین فوجیوں کا ترانہ اسے صاف بتاتا ہے۔ یہ سب کچھ Hall of Montazuma سے شروع ہوا تھا۔

شاویز کی فتح اور اس کا جنوبی امریکہ میں ریاستہائے متحدہ کی تمام تر کارگزاریوں کے باوجود ہیرو کی حیثیت سے ابھرنا اس کے اپنے نصف کرہ میں امریکہ کی تازہ ترین شکست ہے۔

اسی طرح اپنے ہی صحن میں امریکی استعمار کو Mar del Plata (ارجنٹینا) میں ۲۶/ نومبر ۲۰۰۵ء کو ایک دھچکا لگا جب امریکہ مخالف مظاہرین نے مشتعل ہو کر ایک بینک کو آگ لگا دی اور بش نکل جاؤ کے نعرے لگائے' جنوبی امریکہ کے تمام اہم ممالک نے جو پورے براعظم کی نصف معیشت کے مالک ہیں دونوں امریکاؤں کے درمیان آزاد تجارت کے امریکی نقشے کو مسترد کر دیا۔

صرف دو ہفتوں کے بعد بوسان (جنوبی کوریا) میں ۱۸ نومبر ۲۰۰۵ء کو Asia pacific Economic meeting ہوئی جس میں سربراہانِ سلطنت کے ساتھ صدر بش بھی شریک تھے جہاں پر تقریباً دس ہزار مظاہرین نے امریکہ مخالف نعرے لگائے NO APEC , NO BUSH اور بش دہشت گرد۔

جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا دونوں میں ریاستہائے متحدہ کا تاثر خراب تر ہو گیا ہے۔ Koyoto ضابطہ عمل کے معاہدے اور پھر بین الاقوامی عدالت برائے جرائم میں شرکت سے بش کے انکار نے اس علاقہ کے لوگوں کے اذہان میں بھی سچائی نقش کر دی ہے کہ امریکہ نے کثیر القومی تعلقات کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔

جنوب مشرقی ایشیا دنیا کا وہ کامیاب علاقہ ہے جہاں عالمگیریت' آزادی' اور جمہوریت جڑ پکڑ چکے ہیں' ساتھ ہی ACEAN اور ریاستہائے متحدہ کے درمیان ایک سو بیس ملین ڈالروں سے زیادہ کی دوطرفہ تجارت ہے یہ علاقہ جو امریکہ کو نسبتاً بے ضرر اور مثبت طاقت سمجھتا تھا اب صدر بش کی خارجہ پالیسی کو پسند نہیں کرتا جو جدید بنیاد پرستوں کے زیر اثر ہے' جس طرح سے دہشت گردی کی جنگ لڑی گئی ہے اس نے انسانی حقوق' آزادیٔ ابلاغ' مذہبی رواداری کی علم برداری میں امریکی ساکھ اور استحقاق کو بری طرح مجروح کر دیا ہے۔ مذکورہ جریدہ کے مطابق نہ صرف ایک بلین سے زیادہ مسلمان بش انتظامیہ سے تلخ کام ہیں بلکہ علاقہ کی پوری آبادی خوف اور پریشانی میں مبتلا ہے اور امریکہ کی عزت اور پسندیدگی کم تر ہو گئی ہے۔ تھائی زبان کے اخبار روز نامہ Matoch on نے امریکہ کو یوں متنبہ کیا۔ امریکیوں کے پاس اتنی قوت ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہر کام اکیلے ہی کر سکتے ہیں۔ انھیں اس کی فکر نہیں کہ ان کے فیصلوں کا دوسری قوموں پر کیا اثر ہوگا۔ آج کل ہم ان کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگے ہیں Vincent lim جو کوالالمپور میں Institute of Strategy and International Studies کا تجربہ نگار ہے دلیل دیتا ہے کہ بش کے انتظامی عمل اور اقوام متحدہ کے لیے نہ چھپنے والی تحقیر نے ایک شدید جھٹکا لگایا ہے۔ انڈونیشیا کے

صدارتی مشیر ڈیوی فارتونا انور نے کہا: ''بش نے ذاتی کوششوں سے اقوامِ متحدہ کو عالمگیر ہمدرد کے مقام سے ہٹا کر عالمی جھگڑوں کا ڈھنڈورچی بنا دیا''۔ ملیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد نے اپنی برہمی کو یوں زبان دی کہ ''بش اور ان کے سیاسی مشیر امریکی تاریخ پر بدنمائی کا دھبہ ہیں۔''

امریکی صدر بش منگل ۲۳ ستمبر ۲۰۰۳ء کو جنرل اسمبلی کے سالانہ اجتماع میں اقوام متحدہ کو نظر انداز کر کے عراق پر حملہ کرنے پر سخت اعتراضات کی زد میں آئے۔ سالانہ اجتماع کا افتتاح کرتے ہوئے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے جو اپنے نرم اور مہذب لہجہ کے لیے مشہور ہیں تھوڑی دیر کے لیے اپنی نرمی اور تہذیب سے ہٹ کر صدر بش کے رویہ پر سخت لہجہ اختیار کیا جو انھوں نے اقوامِ متحدہ کی طرف سے اختیار حاصل کیے بغیر پیش بند حملہ کر کے دکھایا تھا' دنیا کو جنگل کے قانون کی طرف واپس لے جانا' مزید انھوں نے کہا کہ اس قسم کی پالیسی آخرکار خودرائی اور لاقانونیت کے رویے اور وجہ یا بلاوجہ طاقت کے استعمال کو فروغ دینے کا باعث بنتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ سیکریٹری جنرل نے یہ بات واضح کر دی کہ خودرائی پر مبنی اور غیر قانونی طاقت کا استعمال اگر جائز وجوہ پر بھی کیا جائے تب بھی دنیا میں لاقانونیت پھیلانے کا باعث بن سکتا ہے۔

۱۷/اکتوبر ۲۰۰۵ء کو پھر امریکہ پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی جب Unesco نے ثقافتی تنوع کی حفاظت کے لیے اتفاق رائے کے رسمی معاہدہ پر رائے شماری کروائی اور ریاستہائے متحدہ اور اسرائیل نے اسی کے خلاف آوازیں بلند کیں۔ یونیسکو کے ثقافتی کمیشن نے چالیس صفحات پر مشتمل مسودۂ قرارداد منظور کیا جس میں ہر ملک کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے علاقوں میں متنوع ثقافتی اظہار کو فروغ دے بلکہ بین الاقوامی تجارت میں بھی، قرارداد کے حق میں ۱۹۱ میں سے ۱۵۱ ووٹ آئے۔ یہ قرارداد انگریزی بولنے والوں کی عالمگیریت کے مقابل مختلف زبانوں، فنون اور ثقافت کی حفاظت کے لیے کامیاب حربہ ثابت ہوگی اور سب سے زیادہ یہ امریکہ کے ثقافتی تسلط کے خلاف کام کر سکتی ہے۔ عالمگیر ثقافتی محاذ پر یہ امریکہ کی فیصلہ کن شکست ہے اور

امریکی اقتدار اور مفادات کے دوسرے ممالک میں فروغ کی راہ میں رکاوٹ ہے گویا دنیا پر امریکی تسلط کے لیے ایک دھچکا۔

فرانسیسی صدر نے اپنے مخصوص' صاف اور فیصلہ کن لہجہ میں ریاستہائے متحدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے الفاظ چبائے بغیر کہا: سیکیورٹی کونسل کی طرف سے جواز کے بغیر جنگ نے کثیر الجہتی نظام کی ہلا دیا ہے اور انھوں نے ریاستہائے متحدہ کو یوں خبردار کیا کہ کوئی بھی ایک فریق سب کی طرف سے عمل نہیں کرسکتا اور کوئی بھی بغیر قوانین سماج کا اقتدار تسلیم نہیں کرسکتا۔

امریکہ کے عالمی تاثر کا جو مسئلہ ہے اس کو The Council of Foreign Relations نے Peter G Peterson کی سربراہی میں واضح کیا ہے۔ (Foreign Affairs Sept. Oct. 2002) نو (9) مسلم ممالک میں گیلپ کی رجحانات کے متعلق رائے شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ کا تاثر عام طور پر زوال پذیر ہو کر اس کے تسلط کو زنگ آلود کر رہا ہے' اس سے ملتے جلتے ردعمل کا اظہار Zogby International Poll کی طرف سے ہوا ہے جو دس ممالک میں ہوتا ہے اور State Department اور Council of Foreign Relations/PEW سروے جو غیر ملکی ذرائع ابلاغ کی آراء، اور حکومت کے اندرونی و بیرونی رجحانات پر نظر رکھتا ہے بھی اسی رائے پر متفق ہیں۔

ان رائے شماریوں کے مطابق امریکیوں پر روزافزوں طور پر بددماغ' خودغرض منافق' بےحس اور کثیر الثقافتی گفتگو کے مخالف یا ناقابل کی مہر لگتی جا رہی ہے۔

ترقی پذیر دنیا میں لوگوں کی پریشانیوں اور دکھ درد پر امریکہ کا مبینہ غیر ہمدردانہ طریقہ جواب دراصل امریکہ کے تاثر کے زوال کا سبب بنا ہے امریکہ کے بے پناہ اثر کے سامنے ان کی مایوسی اور جاری وساری ناامیدی بھی رقابت اور مظلومیت کے احساس کو جنم دیتے ہیں جو غصہ اور بداعتمادی ساتھ لاتے ہیں۔

اپنے ہی شہریوں کے ساتھ امریکی حکومت کا غیر ہمدردانہ رویہ اس وقت نظر آیا

جب غیر معمولی نوعیت کی قدرتی آفت نے طوفان قطرینا کی شکل میں خلیجی ساحل پر امریکی شہریوں کی زندگیوں کی تہہ وبالا کر دیا' بہت سے امریکیوں نے ان ہم وطن شہریوں کے گھروں کو لوٹا جو طوفان کا نشانہ بن چکے تھے ''روم جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجا رہا تھا'' کا المیہ صدر بش نے دہرایا جو عین اس وقت ایک گلوکار سے گٹار کا تحفہ قبول کرتے نظر آئے جب طوفان قطرینا امریکی ساحلوں پر تباہی مچا رہا تھا اور ہزاروں لوگ ہلاک ہو رہے تھے۔

خلائی سفارت پر اپنے مقالہ (Foreign affairs july- Aug. 2003) میں Garvin اور Marwell نے نشان دہی کی ہے کہ کوسوو کی جنگ میں جو کچھ ہوا اس نے یورپ کو امریکہ کی ٹیکنا لوجی میں برتری سے آزاد ہونے کی ترغیب دی' امریکی GPS اب تک سیارے پر مبنی رہنمائی کرنے والا واحد ذریعہ ہے جس کا خرچ امریکی محکمہ دفاع اٹھاتا ہے' اس کا یورپی بدل گلیلیو جان بوجھ کر یورپی مفاد کے اشاروں کو روکنے یا بگاڑنے کے خطرہ کی راہ میں دیوار کا کام کرے گا۔ دسمبر ۲۰۰۱ء میں صدر Jacques chirac نے متنبہ کیا کہ گلیلیو کے بغیر یورپی ممالک امریکہ کی شدید محتاجی کے خطرہ میں مبتلا رہیں گے۔ انھوں نے دوطرفہ ترغیب کا خاص طور پر ذکر کیا جو گلیلیو سے حاصل ہوسکتی ہیں: سیاراتی اشاروں میں یورپی خودمختاری کا دفاع اور امریکہ کی حکمت عملی اور ٹیکنالوجی میں برتری کا مقابلہ کرنا۔ امریکی ٹیکنالوجی کی برتری سے مہمیز پا کر یورپ نے سالوں کے اخراجات کے بعد Air bus اور Ariana کی صنعتیں ایسے وقت میں تیار کر لیں جب امریکی برتری ان میدانوں میں پیچھے روک رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں جو امریکی برتری اور تسلط کا اصل ذریعہ ہے یورپ اسے للکارنے کے لیے تقریباً تیار ہے۔ اپنی کتاب Clash of Civilization in the Remaking of a new world order میں Samuel Huntington مغربی تہذیب کو جس کا سربراہ امریکہ ہے زوال پذیر پاتا ہے' وہ مزید تسلیم کرتا ہے کہ:

سرد جنگ میں مغرب کی کامیابی نے فتح کی سرشاری نہیں بلکہ تھکن پیدا کر دی۔
امریکہ کی سربراہی میں مغرب اپنے داخلی مسائل اور ضروریات کے بارے میں پریشان ہے اور ساتھ ہی اسے سست رفتار معیشت' ٹھہری ہوئی آبادی، بے روزگاری' بڑے حکومتی خسارے' زوال پذیر عملی اصول' بچت کی سست رفتاری اور امریکہ سمیت کئی ملکوں میں سماجی ٹوٹ پھوٹ، منشیات اور جرائم کا سامنا ہے۔ معیشتی طاقت بڑی تیزی سے مشرقی ایشیا کی طرف منتقل ہو رہی ہے اور فوجی طاقت اور سیاسی اثر ورسوخ زوال پذیر ہیں۔
ہندوستان معیشتی پرواز کی طرف مائل ہے اور اسلامی دنیا مغرب کی مخالف ہوتی جا رہی ہے۔ معاشروں کی طرف سے مغربی احکامات قبول نہ کرنے کا میلان اور اس کی نصیحتوں پر عمل تیزی کے ساتھ ہوا میں تحلیل ہو رہا ہے اور اس کے ساتھ مغرب کی خود اعتمادی اور تسلط کی خواہش۔ ۱۹۹۰ء میں ایک متوازن تجزیہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا:

''امریکہ کی اضافی قوت تیزی سے زوال پذیر ہو گی ناپختہ معاشی صلاحیتوں میں امریکہ کی حیثیت جاپان اور آخر کار چین کے مقابلہ میں مزید ختم ہوتی نظر آتی ہے' فوجی شعبہ میں امریکہ اور کئی ترقی پذیر علاقائی طاقتوں کے درمیان پُر اثر صلاحیتوں کا توازن مرکز سے محیط کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ امریکہ کی بعض ساختی صلاحیتیں دوسری قوموں کی طرف رواں ہو جائیں گی اس کی نرم قوت کا کچھ حصہ غیر ریاستی عاملوں کے ہاتھ لگ جائے گا مثلاً کثیر قومی تجارتی ادارے۔ جیسے جیسے امریکی قیادت کی حامل مغربی فضیلت کم ہوتی جائے گی اس کی کچھ قوت تو بس تحلیل ہو جائے گی اور باقی علاقائی بنیاد پر بڑی تہذیبوں اور بنیادی ریاستوں میں بٹ جائے گی۔ ایشیائی تہذیب کی طاقت کو بہت اہم فروغ حاصل ہوگا اور آخر کار رفتہ رفتہ چین ایسے معاشرے کی حیثیت سے ابھرے گا جو عالمگیر اثر پذیری کے لیے مغرب کو للکار سکے۔

برطانیہ میں بس جانے والی امریکی خاتون تجزیہ نگار Currold Gould نے اپنے مقالہ (ڈان ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۴ء) (Dawn October 18, 2004) میں ایک چشم کشا حقیقت بیان کی ہے کہ انگلستان میں امریکیوں سے کس قدر نفرت کی جاتی ہے

خاص طور پر ۱۱ ستمبر کے بعد ایک عینی شہادت بیان کرتے ہوئے وہ لکھتی ہے کہ کس طرح ایک امریکی خاتون سے بس میں بیٹھے ہوئے ذرا سا دھکا لگ جانے پر انگریز خاتون بپھر اٹھی۔ جب امریکی خاتون نے غیر ارادی طور پر ٹکرا جانے کے لیے معذرت کی تو اسے یہ سننا پڑا: جب بھی میں سنتی ہوں کہ ایک امریکی سپاہی مرا تو مجھے بڑا مزہ آتا ہے، تم لوگ پوری دنیا کو تباہ کر رہے ہو۔ بے چاری امریکی عورت احساس نکبت و ندامت سے جواب دیتی ہے: ''میں ذاتی طور پر دنیا کی تباہی نہیں کر رہی ہوں۔''

یہ منکسر سا جواب بھی انگریز خاتون کو بھڑکا دیتا ہے اور وہ چیخ کر کہتی ہے: ''میں چاہتی ہوں کہ تم سب اس ملک سے چلے جاؤ اور پھر کبھی یہاں قدم نہ رکھو''۔ امریکی خاتون رونے لگی اور انگریز خاتون اس پر جھپٹ پڑی اور اُسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس گھناؤنی صورت حال پر Currold نے اٹھ کر چلاتے ہوئے ڈرائیور کو رکنے کے لیے کہا اور انگریز خاتون سے درخواست کی کہ امریکی خاتون کو چھوڑ دے، اس پر انگریز خاتون غصہ میں Currold کی طرف پلٹی اور اسے پکڑ کر چیخی ''ایک اور امریکی۔ تم نکلے''۔ آخر اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی ایک خاتون نے انگریز خاتون کو دھکیل کر ہٹایا جو بس سے اتر گئی جبکہ امریکی خاتون بیٹھی روتی رہی۔

امریکیوں کی مخالفت کا ایک اور تجربہ جو بش سے بہت پہلے اس وقت پیش آیا تھا جب صدر کلنٹن کی حکومت تھی۔ وہ بیان کرتا ہے Saint Woods میں اس کے مقامی سینا گاگ میں انسانی حقوق کی کانفرنس تھی، جب چائے کے وقفہ میں اس نے بوتھ پر کسی سے کتابچہ مانگا تو اس کا لہجہ سنتے ہی اس آدمی نے غصہ سے سرخ ہو کر امریکی استعمار کی جاری کردہ نازیت اور فاشیت کی برائیوں پر چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ ایک سیاہ فام بھی آ گیا اور چلانے لگا: ''امریکہ نے غلامی ایجاد کی'' اور ایک بزرگ خاتون بھی امریکہ کی برائی میں یہ کہتے ہوئے شریک ہو گئی کہ اس نے اپنے پر صیہونیوں کو مسلط کر لیا ہے اور William Pen کے زمانہ سے قتل و غارت کر رہا ہے، جو بات زیادہ خطرناک ہے وہ یہ کہ امریکہ کی یہ شدید مخالفت صرف گنوار قسم کے لوگوں میں نہیں بلکہ پڑھے لکھے

اور دانشور طبقوں میں بھی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ Currold نے ایک یہ سانس روک دینے والا انکشاف بھی کیا ہے کہ انتہا پسند برطانیہ میں ۱۱ ستمبر کے دن شاندار ۱۹ کے لیے جشن منعقد کرتے ہیں اور جب جارج بش امریکہ آئے تھے تو لندن کے میئر Living stone نے ان کے اعزاز میں سرکاری دعوت کا بائیکاٹ کیا تھا اور عوام امریکی پرچم کو روندنے اور جلانے کے لیے ٹریفلگر اسکوائر میں جمع ہوئے تھے۔ Currold افسوس کرتا ہے کہ روشن خیال ساتھی بھی اس سے کہتے ہیں کہ دنیا کو زیادہ خطرہ امریکہ سے ہے بن لادن سے نہیں۔ Currold کہتا ہے کہ اسی وجہ سے بہت سے امریکی جنھوں نے انگلستان کو وطن بنالیا تھا اب برطانیہ چھوڑ رہے ہیں۔

حال ہی میں امریکی برتری کو روس اور چین نے للکار دیا ہے حالانکہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اس کے ساتھ ہیں' ماسکو اور چین جو کبھی دشمن تھے اب قریب آرہے ہیں اور یہ ''ایک خودمختار ریاست کی منطقی سماجی ترقی کے عمل'' کے خلاف ایک اجنبی حکومت کے قیام کی امریکی کوشش کا ردعمل ہے۔ صدر ہو اور پیوٹن نے ماسکو میں کانفرنس کے بعد ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں امریکہ کی دخل اندازی اور تسلط کی کوششوں کو رد کیا گیا تھا۔

مزید برآں شنگھائی گروپ نے امریکہ سے مطالبہ کیا کہ ازبکستان سے اپنے اڈے ہٹالے۔

اعلیٰ تکنیکی جنگ کی حدود

سیکریٹری دفاع رمزفیلڈ نے امریکی فوج کی تبدیل ماہیت کے متعلق جسے بعد میں قومی تحفظ کی حکمت عملی (NSS) میں شامل کرلیا گیا دھماکہ خیز اعلان کیا تھا ''کوئی پہاڑ اتنا اونچا نہیں ہوگا، کوئی غار یا بنکر اتنا گہرا نہیں ہوگا دنیا کا کوئی گوشہ اتنا دور نہیں ہوگا کہ امریکی پہنچ سے باہر ہو'' لیکن یہ شیخی بہت ہی پھس پھسی آواز بن کر رہ گئی جب آج (۲ مارچ ۲۰۰۶ء) تک اسامہ بن لادن اور مُلّا عمر دو ہیں افغانستان میں چھپے ہوئے ہیں

جہاں ہزاروں کی تعداد میں امریکی فوجیں موجود ہیں اور امریکہ کی کٹھ پتلی کرزئی حکومت موجود ہے۔

اور تمام تر فوجی طاقت اور پیسوں کی ریل پیل کے باوجود ان کا پتہ نہیں لگ سکا۔ کون نہیں جانتا کہ ابوصیاف جنوبی فلپائن میں زور شور سے گھومتا پھر رہا ہے اور اس کے نقش پا ہر جگہ موجود ہیں لیکن ۱۲ سو فوجیوں پر مشتمل امریکی دستے اس تک نہیں پہنچ سکتے۔

اس لیے یہ سوال اٹھتا ہے کہ اعلیٰ تکنیکی فوجی طاقت کے پاس تمام تر جادوگری کے ساتھ ایسی نظریاتی تحریکوں کا جواب کیا ہے جس کے کردار شوق شہادت سے معمور ہوں؟

رمزفیلڈ نے یہ غزہ بھی دکھایا تھا کہ امریکی فوجی طاقت اس بلندی پر ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مگر دیکھ لیجیے! چھٹ بھیے طالبان نے اپنی تمام تر قدامت کے باوجود انھیں مقابلہ سے خارج کر دیا ہے اور کسی نے نہیں بلکہ Chairman Joint Chief Staff جنرل مائرز نے تسلیم کر لیا ہے کہ افغانستان میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کا زور ٹوٹ رہا ہے اور تو اور انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ طالبان چھٹ بھیے اور القاعدہ نے امریکی فوج کو اپنے اطلاعاتی رابطوں کی حفاظت، نقل و حرکت اور بھیس بدلنے، چھپنے اور اپنی کمین گاہوں کو چھپانے کے سلسلے میں مکمل مات دے دی ہے۔

The Times میں مشہور جنگی مورخ Sir Michael Howard لکھتا ہے خطابت اور جنگی تجربات نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں اور بہت زیادہ فوجی تجربہ کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ جب سامنا عالمگیر دہشت گردی سے ہو تو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ چابک دست سیاسی انصرام اور تحمل ہے۔ پولیس کا کام امن و امان کا قیام ہے جس کی پشت پر شہری انتظامیہ کی مدد کے لیے حسب ضرورت فوجی طاقت ہو۔ ییل (Yale) کے مؤرخ Paul Kennedy کا کہنا ہے کہ آج کل کی جنگوں سے نئی ازمنہ وسطیٰ کی دنیا میں دیرپا امن اور تحفظ کی گارنٹی دینا ناممکن ہے پوری دنیا میں امریکی مفادات تو الگ خود امریکی سرزمین پر ایسا ممکن نہیں۔ (Atlantic Monthly) کے

ستمبر ۲۰۰۲ء کے شمارہ میں Charles Seaman نے قومی تحفظ پر ایک رپورٹ میں خبردار کیا ہے: ''اپنی حفاظت کے لیے امریکہ کا مجوزہ طرزِ عمل معاملات کو مزید خراب کر دے گا''۔ اس نے کہا ہے کہ امریکہ مکمل محفوظ ٹیکنالوجی کو بھول جائے۔ Identity of Minnesota نے جو کہ انسانی شناخت کا سب سے بڑا تکنیکی نظام ہے خود تسلیم کیا ہے کہ خودمختار ٹیسٹ Software in face it کی کامیابی (93.32%) فی صد ہے کم از کم پچیس ملین مسافروں نے ۲۰۰۱ء میں Logan کا ہوائی اڈہ استعمال کیا۔ اگر ۲۵ ملین لوگوں پر چہروں کی شناخت کا Software استعمال کیا گیا ہوتا تو یہ 170,000 بے گناہ لوگوں کو چن لیتا اور پانچ سو جھوٹے الارم (False Alarm) روزانہ بجتے جس کے نتیجہ میں ریاستہائے متحدہ کا پورا فضائی سفر کا نظام مفلوج ہو کر رہ جاتا۔

امریکی سینیٹ کی مجلس منتخبہ برائے خفیہ اطلاعات 40 کے صدر بش سینیٹر بوب گراہم کا کہنا ہے کہ دہشت گردی کے پیش نظر جو مسئلہ اُبھرا ہے وہ زیادہ اہم ہے کیونکہ اطلاعات حاصل کرنے کا ہمارا تکنیکی نظام دہشت گرد قائدین کے ارادوں اور صلاحیتوں کا احاطہ کرنے میں بہت کم کارآمد ہو گیا ہے' انسانوں پر مشتمل نظام حاصل کرنے کے لیے کسی ایسے شخص کی تلاش ہوتی ہے جو اطلاعات کی بنیاد سے قریب ہو۔ Cato Institute نے بہت جامع تبصرہ کیا ہے' یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ٹیکنالوجی آپ کو بچا نہیں سکتی نظام لوگوں ہی سے بنتے ہیں۔

حکومت ایک نیا حفاظتی ڈھانچہ مانگ رہی ہے' عینیہ (IRIS) پتلی (Retina) اور انگلیوں کے نشانات کے اسکینر ہاتھوں کی جیومیٹری دیکھنے کے آلات' چہرے کی پہچان کے سافٹ ویر، سمارٹ کارڈ جن میں گاہکوں کی پہچان کے چپ ہوں ان سب کا استعمال عین ممکن ہے کہ امریکہ کو اور بھی کم محفوظ کر دے کیونکہ کئی آلات بری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔

آرمی وار کالج میں قومی تحفظاتی مطالعہ کے اسٹنٹ ریسرچ پروفیسر (Foreign Affairs March April 2003) Stephen Biddle نے اپنے قابل توجہ

مضمون میں طالبان کی طرف سے امریکی اعلیٰ تکنیکی حملوں سے بچاؤ کی تدبیروں پر روشنی ڈالی ہے۔ طالبان کی جنگی تدبیروں پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر Biddle کہتا ہے کہ طالبان امریکی طریق کار سے مطابقت پیدا کرنے میں بہت تیز رفتار ہیں اور اسی حساب سے جوابی اقدام کر کے زیادہ تر امریکی نگرانی کو دھوکا دے کر ہوائی حملوں سے بچ جاتے ہیں۔ ۵ نومبر ۲۰۰۲ء تک طالبان بالائی آڑ اور پوشیدگی کا جارحانہ استعمال کرنے لگے تھے۔ شمالی قندھار کی لڑائی میں شہر دادر کی جنوبی شاہراہ کے ساتھ القاعدہ کے دفاعی مورچے طبعی جغرافیہ کو آڑ کے کام میں لا کر اچھی طرح پوشیدہ اور بکھرے ہوئے تھے۔ یہی طریق کار مارچ ۲۰۰۲ء میں آپریشن ''انا کونڈا'' کے دوران جاری رہا۔ اس وقت تک القاعدہ کی فوجیں منظم طور پر حصہ لے رہی تھیں اور راز داری سے رابطہ میں تھیں اور اصل مقام سے توجہ ہٹانے کے لیے پھیلاؤ، کیموفلاج، بالائی آڑ اور طبعی جغرافیہ کے ذریعے پوشیدگی کا باقاعدہ استعمال کر رہی تھیں۔ القاعدہ کے مزاحمت کار مکمل ریڈیائی خاموشی میں زمینی رابطوں اور دوسرے غیر مستعمل زمینی ذریعوں کا استعمال کر کے پیغامات کے پکڑے جانے کا خطرہ اس حد تک کم کر دیتے تھے کہ ان کی کسی خاص جگہ پر موجودگی کا پتہ چلا لینا بہت مشکل ہوتا تھا۔

اس طرح کے اہداف کے خلاف یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل قریب میں نگرانی کی ایسی کوئی ٹیکنالوجی آ جائے گی جس کے ذریعے دور سے نشانہ لینا ممکن ہو سکے گا۔ اس دور جدید میں مسلسل جائزہ بغیر پائلٹ ڈرون (Drone) طیاروں میں فضائی ریڈار، سیارہ جاتی نگرانی، حرارتی سراغ رسانی اور زود حس سرگوشی تک سن لینے والے آلات کی موجودگی میں اس قسم کی حیرت ناک صورت حال کیسے ممکن ہو سکی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ زمین کی سطح ان سب کے باوجود ایک بہت ہی پیچیدہ ماحول کی حامل ہے جس میں طبعی اور انسانی ساخت کردہ مختلف قسم کی آڑ کثرت سے موجود ہے جس سے جنگجو فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ طالبان اپنے لہراتے ہوئے لباس میں دو چار کی تعداد میں چرواہے ہی نظر آتے ہیں جن کا نشانہ لینا مشکل ہوتا ہے۔ جب طالبان نے اس طرز عمل کو اختیار کر لیا تو

انھیں شکار کرنا اور مشکل ہو گیا۔ بیچی BECHI میں خندقوں میں چھپے مزاحمت کاروں کا الگ الگ سراغ نہیں لگ سکتا تھا اس لیے پوری جگہ دو دِنوں سے زیادہ سخت بمباری کی ضرورت پڑی لیکن اس کے باوجود بڑی تعداد اس ابتدائی حملہ سے بچ نکلی۔

مزار شریف کے مغرب میں قلعہ جنگی کے مورچہ میں طالبان قیدیوں کی سرکشی کو مغربی اور اتحادی فوجوں کی فائرنگ کے ذریعے زیر زمین پہنچا کران کے ٹھکانوں پر اتحادی فضائی طاقت استعمال کی گئی۔ اس چھوٹے سے علاقہ پر کئی AC130 طیاروں کا سارا گولہ بارود' Specter جنگی طیاروں اور کم از کم سات' دو ہزار پاونڈ والے سیارہ جاتی رہبری کے حامل بم برسائے گئے۔ کبھی مزاحمت کار بچ گئے اور مزاحمت جاری رکھی طالبان کی مزاحمت اور امریکہ کے اعلیٰ تکنیکی حملوں سے بچ جانا ان کی اعلیٰ فوجی جنگی صلاحیت' غیر متزلزل ارادہ اور طالبان کی اعلیٰ اقدار کی مرہون منت ہے جو الوہی امداد پر ان کے ایمان اور شوق شہادت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اعلیٰ فوجی ٹیکنالوجی انسانی قوتوں یعنی اعلیٰ جذبہ و ارادہ اور الوہی امداد پر غیر متزلزل ایمان پر ہمیشہ حاوی نہیں ہو سکتی۔

اسرائیلی طیاروں کا زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائیلوں سے بچ نکلنا دہشت گردی کے تمام ماہرین کے بدترین خدشات کو بھڑکانے کا باعث تھے' آہستہ رو شہری طیاروں کی ایسے ہتھیاروں سے حفاظت بغیر انتہائی قیمتی نئی ٹیکنالوجی کے ناممکن ہے۔ فضائی تحفظ کے ایک ادارے کا کہنا ہے کہ دہشت گردی کی جدتیں ان کا سامنا کرنے کی ہماری صلاحیتوں سے تیز ہیں۔ یہ خطرہ بعض تاریک ترین حقیقتوں پر مبنی ہے مثلاً دشمن کی گریز پائی' دفاع کا محدود ہونا اور خوف و ہراس پھیلنے کا خدشہ۔

ایک سابق اسرائیلی لیفٹیننٹ کرنل Galluft نے اپنے مضمون میں بعنوان فلسطینی ہائیڈروجن بم (Foreign Affairs July Aug 2002) کہا ہے فلسطینی ہائیڈروجن بموں نے صیہونی ریاست کو ہلا دیا ہے اور لوگوں کی زندگیوں کو یکسر بدل دیا ہے اب پہلے سے زیادہ فلسطینی خودکش حملوں کو جنگی چال یا غریبوں کا ہتھیار سمجھنے لگے

ہیں جو معجزاتی طور پر اسرائیل کی تکنیکی طاقت اور روایتی فوجی تسلط کے خلاف توازن پیدا کر دیتا ہے۔ خودکش حملوں نے انھیں وہ طاقت عطا کی ہے جو کوئی دوسرا ہتھیار نہیں دے سکتا یعنی اسرائیل کے لیے بے پناہ تباہ کن تکلیف اور دکھ۔ ایسی جنگی برابری وہ خواب ہے جس کی طاقت اس قسم کے حملوں سے پرہیز کے لیے بھی دباؤ سے زیادہ ہے اسکے بعد Galluft کا تاریخی فیصلہ ''اگر تاریخ کو رہبر کہیں تو خودکش حملوں کے فلسفہ کو مٹانے کے لیے اسرائیل کی فوجی مہم کی کامیابی ممکن نہیں۔ جن قوموں کا سامنا مرنے کے لیے تیار مخالفین سے ہوا ہے انھوں نے بھگت کر سیکھا ہے کہ ایسے دشمنوں کو مکمل طور پر نیست و نابود کر دینے کے علاوہ کوئی فوجی حل اب ایسا نہیں جو اس مسئلہ کا حل کر سکے۔ اگر فلسطینیوں کا ایمان اللہ پر ہے تو اسرائیلوں کا ٹینکوں پر۔

۶ دسمبر ۲۰۰۲ء کے Independence میں رابرٹ فسک نے اپنے مضمون میں امریکی محکمہ خفیہ اطلاعات کے ایک افسر کا انٹرویو دہرایا ہے جو چھ ماہ تک افغانستان میں کام کر کے لوٹا تھا' اس افسر کا کہنا ہے ہم انھیں نہیں پکڑ سکے جنھیں پکڑنا تھا' ہماری خوش فہمی تھی کہ ٹیکنالوجی اس سے زیادہ کچھ کر سکتی تھی جو اس نے کیا۔ القاعدہ نے سمجھ لیا کہ اگر وہ آلات کے ذریعے رابطہ رکھیں گے تو ہمارے رینجر اُن پر جھپٹ پڑیں گے چنانچہ انھوں نے قاصدوں کا استعمال شروع کر دیا جو دستی خطوط کے ذریعے یا زبانی پیغامات پہنچا دیتے تھے اور اس طرح ہمارے نظام کو اُلجھن میں ڈال دیا' ہماری خفیہ اطلاعات کے ذرائع اعلیٰ تکنیکی ہیں اور وہ جس بنیادی طریقہ پر چلے گئے ہیں وہ امریکیوں کے بس کا نہیں۔

ہفتہ وار Time کے جولائی ۲۰۰۲ء کے شمارہ میں Matth Rees نے یروشلم سے اپنے مضمون میں Luft کے اخذ کردہ نتائج کو اس طرح آگے بڑھایا ہے: ''اسرائیل کی ہر طرح سے لیس افواج اور اعلیٰ ترین خفیہ اطلاعاتی صلاحیتوں کے باوجود اس کے دفاعی ماہرین جانتے ہیں کہ وہ بمباروں کو مکمل طور پر روک نہیں سکتے۔ جب جنگجو اس حد تک راغب ہو جیسے کہ فلسطینی ہیں تو فلسطینی آبادیوں پر اسرائیل کے جوابی حملے ان کے

جذبہ کو مزید بڑھاتے ہیں، جب دہشت کی تکنیک اتنی آسان ہوجائے کہ فقط ایک خواہش مند کو مقامی طور پر بنائے ہوئے بارود باندھ کر انسانی بم بنایا جاسکے تو اس کو روکنا ممکن اور بچاؤ صرف نشانہ لگنے یا نہ لگنے پر منحصر ہے۔

روس جو دنیا کی دوسری فوجی اور تکنیکی طاقت ہے چیچن چھٹ بھیوں کو شکست نہ دے سکا جو پہاڑوں میں انتہائی غربت کی حالت میں رہتے ہیں۔ وسط دسمبر ۲۰۰۲ء میں وہ گروزنی میں روس کی حمایتی حکومت کے مرکز میں گھس گئے اور عمارت کی تباہی کے ساتھ کم از کم پچاس افراد کو ہلاک اور تقریباً اسی (۸۰) کو زخمی کر دیا۔ اس علاقہ کو باڑھوں کی تہری تہیں لگا کر محفوظ کیا گیا تھا پھر بھی چیچن باغی اس حد سے زیادہ محفوظ عمارت میں راستہ بنانے میں کامیاب ہوگئے اس کے بعد انھوں نے روسی سرزمین پر کئی حملے کیے ہیں رپورٹ کے مطابق روسی صدر جناب پیوٹن اس ناقابل یقین چیچن فوجی مہم جوئی پر ششدر رہ گئے جس نے روس کی ٹیکنالوجی کی مہارت کو صفر کر دیا ۲/ ستمبر ۲۰۰۵ء کو روسی سپاہیوں پر چیچن حملہ میں چار سپاہی مارے گئے۔

کیا اقوام متحدہ باقی بچ سکے گا؟

کیا اقوام متحدہ امریکی فوجیوں کی بلا روک ٹوک فوجی یلغار اور یک طرفیت سے جان بچا کر نکل سکتا ہے؟ یہی وہ سوال ہے کہ جس کے پوچھنے اور جواب حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسروں کے ساتھ یہ رمزفیلڈ ہی ہیں جنھوں نے ریاستہائے متحدہ کی تنہاروی اور پیش بند جارحانہ حملوں کی پالیسی تیار کی تھی (Foreign affairs, July-Aug. 2002) ۱۹۹۷ء میں بنائے گئے خاکہ پر عمل کرنے کے لیے مثلاً نیا رجعت پسند نئی امریکی صدی کے لیے منصوبہ (Project for the new American Century) چودہ ستمبر سے بہت پہلے تیار کیا گیا تھا بلکہ صدر بش کے بطور صدر امریکہ حلف اٹھانے سے بھی بہت پہلے۔ یہ خاکہ اس سخت گیر کلیے پر مبنی ہے کہ بعض اوقات جارحیت ہی اچھا دفاع ثابت ہوتی ہے اور اسی سے (U.S.National Security

(Strategy) ریاستہائے متحدہ کی قومی تحفظ کی حکمت عملی پھوٹی ہے جس کا دسمبر ۲۰۰۲ء کو
اعلان کیا گیا تھا جس میں طے کیا گیا ہے کہ قومی مفادات کے لیے ضروری ہے کہ اقوام
متحدہ کو الگ رکھ کر تنہا روی اور پیش بند حملوں کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اِن پیش بند
حملوں کی پالیسی اس سے پہلے صدر بش نے امریکہ کی ریاستی پالیسی میں اس وقت شامل
کی جب انھوں نے West Point میں اعلان کیا کہ ریاستہائے متحدہ پہلے وار کرے
گا اور بعد میں وجہ بیان کرے گا۔ یہ خود رائی اور پیش بند حملوں کی پالیسی اس صدارتی
ہدایت میں تفصیل سے درج ہے جس کا ۱۰ دسمبر ۲۰۰۲ء کو اعلان کیا گیا تھا جس میں
جوہری عدم پھیلاؤ (NPT) معاہدے کے یکسر خلاف دہشت گردی کے خلاف پیش بند
جنگ میں ہلکے جوہری ہتھیاروں کے استعمال کی اجازت دی گئی تھی اور ساتھ ہی اس
بات کی بھی اجازت دی گئی تھی کہ ایسے تمام ممالک یا گروہوں پر پیش بند حملے کیے جائیں
جو کثیر تباہی کے ہتھیار یا دور تک مار کرنے والے میزائل کے حصول کے قریب ہوں کہ
وہ ایسے ہتھیار لے جا سکیں۔ کیا عالمی امن اور تحفظ کے لیے اس سے بڑا کوئی خطرہ اور بھی
ہو سکتا ہے؟ اور اقوام متحدہ کا گلا گھونٹنے کے لیے کیا اس سے زیادہ سازشی قدم بھی اٹھایا
جا سکتا ہے؟

یہ بات کہ ریاستہائے متحدہ نے واقعتاً اب سازشی قدم اقوام متحدہ کا گلا گھونٹنے
کے لیے اٹھایا تھا، William Pfaff نے اپنے مضمون میں بتائی ہے جو بوسٹن گلوب
کے 15 اپریل ۲۰۰۳ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے، وہ کہتا ہے کہ امریکی انتظامیہ جمہوری
ملکوں کے اشتراک سے ایک نئی عالمی جماعت بنانا چاہتی ہے جسے کہنے کے مطابق وہ
اختیارات حاصل ہوں گے جو اقوام متحدہ کے پاس نہیں ہیں اور جو فوری اور کلی طور پر
عالمی نظم (Order) کے خلاف خطروں سے نمٹ سکے گی۔ کولن پاول نے یوں تشریح کی
ہے کہ امریکہ اسی وقت دخل اندازی کرے گا جب بین الاقوامی طور پر اس کے لیے
درخواست ہو یا جہاں امریکی مفادات بلاواسطہ متاثر ہوں، صاف الفاظ میں بش انتظامیہ
ایک ایسی دنیا چاہتی ہے جس کی لگام امریکہ کے ہاتھ میں ہو اور جس کی پشت پر وہی

ریاستیں ہوں جو اس کی حمایت کریں۔ اس کے بیان کا ماحصل یہ تھا کہ خود اس کے پاس
تو بے پناہ فوجی فوائد ہوں اور وہ اپنی فوج سے دوسروں کو جوہری یا کسی اور قسم کا مزاحمتی
نظام حاصل کرنے سے روکتا' اس کا ارادہ جہاں بھی ممکن ہو ایسے ملکوں کو غیر مسلح کرنے کا
تھا جن کے پاس پہلے سے جوہری ہتھیار موجود ہوں' واشنگٹن کسی بھی حکومت کو ایسی
حیثیت میں دیکھنا نہیں چاہتا کہ وہ عالمی ادارہ یا قانونی اختلاف کے ذریعے اس کے
لیے کوئی رکاوٹ پیدا کر سکے اسی لیے اقوام متحدہ کو ختم کر دیا جانا تھا۔ اس صورت میں نئی
رجعت پسند آزادی عمل کے لیے (چین اور روس کی جوہری طاقت کے علاوہ) واحد
رکاوٹ یورپ کی معاشی طاقت اور سیاسی اتحاد ہوئے اور یہاں بھی امریکی فائدہ ان
زیادہ تھا کہ واشنگٹن کے خیال کے مطابق عراق میں فتح ایک نئے مشرق وسطیٰ اور نئے
عالمی نظم کی طرف پہلا قدم تھی۔

اقوام متحدہ کی تشکیل تمام رکن ممالک کے لیے خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے برابر
خودمختاری کے اصول پر ہوئی تھی۔ ان کی مجموعی ذمہ داری عالمی امن اور تحفظ قائم رکھنا
جس کا قابل تعریف مقصد ''آنے والی نسلوں کو جنگ کے عذاب سے بچانا'' تھا اور جیسا
کہ میثاق کی پہلی شق میں لکھا ہے ''انصاف پر مبنی امن کا قیام اور جھگڑوں کے فیصلے عالمی
قانون کے اصولوں کے مطابق کرنا۔'' اس طرح عالمی قانون کو اقوام متحدہ کا لازمی حصہ
بنایا گیا ہے۔ میثاق کی شقوں ۳۴، ۳۵، ۳۶ اور ۴۱ میں جھگڑوں کے حل اور ایسے تمام
مسائل سے بروقت نمٹنے کے لیے مکمل نظام کے قیام کا انتظام کیا گیا ہے جن کی وجہ سے
امن کو خطرہ ہو میثاق میں انسدادی اقدام مثلاً ثالثی مذاکرات' مصالحت اور بین الاقوامی
عدالت کے فیصلوں کے ذریعے ایسے مسائل کے حل کے لیے جو امن کے لیے خطرہ ہوں
انتظام کیا گیا ہے ان انتظامات کی ناکامی کی صورت میں سیکیورٹی کونسل کی شق ۴۲ کے
تحت یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ معاشی پابندیوں' فوجی پابندیوں اور امن فوج کا استعمال
کریں۔ شق ۴۸ اور ۴۹ کے تحت ایک فوجی اسٹاف کمیٹی بنا کر لائحہ عمل طے کر کے
کارروائی کریں۔ اس طرح سیکیورٹی کونسل کے پاس ہر طرح کی ایسی صورت حال سے

نمٹنے کے لیے کافی اختیارات موجود ہیں جو کسی بھی ملک کے خلاف جارحیت کا خطرہ بن سکتی ہو'اس لیے اقوام متحدہ کے کسی رکن کے لیے امریکی قسم کی خود سر اور پیش بند جنگ کا کوئی جواز نہیں ہے۔

دفاع کا حق شق ۵۱ کے تحت صرف اس وقت لاگو ہوتا ہے جب کسی ملک پر حملہ ہوا ور سیکیورٹی کونسل تحفظ کے لیے قدم اٹھائے' دفاع کا حق استعمال کرتے ہوئے بھی اسی شق کے تحت یہ پابندی موجود ہے کہ صورت حال جلد سے جلد سیکیورٹی کونسل کے علم میں لائی جائے اور کونسل کو اختیار ہے کہ اپنے فیصلہ کے مطابق مشترکہ طور پر عمل کرے۔ اس حق دفاع پر عمل کرتے ہوئے امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا اور سیکیورٹی کونسل کو متنبہ کیا کہ وہ دوسرے ملکوں پر حملہ کا حق بھی محفوظ رکھتا ہے اور پھر سارے عراق پر کثیر تباہی کے ہتھیاروں کے بہانہ سے صدام حسین کو غیر مسلح کرنے کے لیے حملہ کر دیا جو سیکیورٹی کونسل کی قرارداد نمبر ۱۴۴۱ کے خلاف تھا۔ بہرحال عراق پر امریکی قبضہ کے بعد ایسے کوئی ہتھیار نظر نہ آئے۔

شق نمبر ۵۱ کو شق نمبر (۴) ۲ سے ملا کر پڑھنا چاہیے جن میں تمام ممالک کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے بین الاقوامی تعلقات میں کسی ملک کی سالمیت یا سیاسی خودمختاری کے خلاف ایسی دھمکی یا طاقت کے استعمال سے گریز کریں جو اقوام متحدہ کے مقاصد کے خلاف ہو۔ عالمی امن کا قیام یہاں تک کہ حق دفاع دونوں کو اقوام متحدہ کی چھتری کے نیچے یکجا کر دیا گیا۔ اور اس کے مطابق امریکی قسم کی خودرائی اور پیش بندی نہ صرف اقوام کے میثاق میں ناپسندیدہ ہے بلکہ عالمی تعلقات میں بھی ایک ممنوعہ کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔

عالمی عدالت انصاف نے نکاراگوا کے مقدمہ (۱۹۹۸ء) میں فیصلہ دیا تھا کہ مسلح اقدامات کے خلاف ملکوں کو مشترکہ جوابی کارروائی کا حق نہیں ہے۔ مسلح حملہ کا مطلب اور حدود کا تعین کرتے ہوئے عدالت نے کہا عدالت اس روایتی قانون کی نفی کرنے کی کوئی وجہ نہیں سمجھتی کہ مسلح حملہ کے جواب میں ایک مسلح گروہ کو دوسرے ملک کی سرحد میں بھیجا

جائے۔ اس صورت میں کہ اگر اس نوعیت کا حملہ با قاعدہ فوج نے کیا ہوتا تو اسے سرحد
جھڑپ کے بجائے مسلح حملہ سمجھا جاتا۔ ۱۱ستمبر کا دہشت گرد حملہ امریکہ کے اپنے بیان
مطابق ۱۹ اغوا کنندگان نے کیا تھا جو مختلف قوموں سے تعلق رکھتے تھے اور صرف
کاٹنے کے اوزار سے مسلح تھے اور انھیں کسی ایک ملک یا کئی ممالک نے نہیں بھیجا
عالمی عدالت انصاف کی نکاراگوا مقدمہ میں میثاق کی شق نمبر ۱۵ کی تشریح کے مطا
۱۱ستمبر کا واقعہ حملہ کی تعریف پر پورا نہیں اترتا۔

نکاراگوا کی شکایت پر فیصلہ کرتے ہوئے عالمی عدالت کی طرف سے مندرجہ
تبصرہ میں کہا گیا کہ امریکہ اس ملک کے خلاف غیر قانونی طاقت کے استعمال کا مجرم
جو کہ بین الاقوامی دہشت گردی ہے۔ امریکہ نے قرارداد کو ویٹو کر دیا جس میں تمام ملک
بشمول امریکہ کو عالمی قوانین کی پابندی کی تاکید کی گئی تھی۔ عدالت نے امریکہ کو منا
تلافی کرنے اور غیر قانونی طور پر طاقت کے استعمال سے باز رہنے کا حکم بھی دیا تھا
ریاستہائے متحدہ نے عدالت کے فیصلہ کو حقارت سے مسترد کر دیا اور جوابی طور پر
حملوں میں مزید شدت اختیار کر لی' آخری چارۂ کار کے طور پر نکارگوا جنرل اسمبلی
پاس گیا جہاں سے ایسی ہی قرارداد حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی جبکہ ریاستہائے
اور اسرائیل دو سال لگاتار مخالفت کرتے رہے گویا اب پہلی دفعہ عراق کے ساتھ نہیں
ہے کہ امریکہ نے اقوام متحدہ کی بے خوفی سے حکم عدولی کی ہے' وہ بہت پہلے نکاراگوا
بھی ایسا ہی کر چکا ہے' اسی طرح مشرقی یروشلم کو سیکیورٹی کونسل اور جنرل اسمبلی دونوں
کئی قراردادوں میں مغربی علاقہ قرار دیے جانے اور اسرائیل کو دارالخلافہ اور رکن مما
کے سفارتخانے یہاں منتقل کرنے کی ممانعت کے باوجود امریکی کانگریس نے اقوام متحدہ
کے اختیار کی مخالفت کرتے ہوئے ان قراردادوں کے خلاف صدر امریکہ سے کہا کہ
سفارتخانہ یروشلم منتقل کر دیں۔ اس طرح اقوام متحدہ کے قیام کے فوراً بعد سے ہی امر
بلاخوف وخطر اس کی حکم عدولی کرتا رہا ہے اور اقوام متحدہ کے اختیارات کی مسلسل خلا
ورزی کرنے والے کی حیثیت سے اسے بجاطور پر دنیا کے ''بدمعاش ممالک''

فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ تعجب نہیں کہ حال ہی میں امریکہ میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں امریکہ کو بدمعاش ملک قرار دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مصنف نے امریکہ میں CNN پروگرام میں تفصیل سے بتایا تھا کہ کس طرح امریکہ بدمعاش بن گیا ہے۔

جب اسرائیلی جیٹ طیاروں نے ۱۹۸۱ء میں Osirak کے بغدادی ری ایکٹر پر بمباری کی اور اسے میثاق اقوام متحدہ کی شق ۵۱ کے تحت حق دفاع کے مطابق جائز قرار دیا تو ساری دنیا نے اسے جارحیت قرار دیا اور مذمت کی اور امریکہ نے بھی اس کی مذمت میں اقوام متحدہ کی قرارداد کی حمایت کی۔

انسانی حقوق کے حامی دلیل دیتے ہیں کہ اگر امریکہ کہتا ہے کہ وہ جنگ لڑ رہا ہے تو اس کے پکڑے ہوئے قیدیوں کو کم از کم اس وقت تک جنگی قیدی سمجھا جانا چاہیے، جب تک کوئی مجاز قانونی عدالت انھیں دہشت گرد نہ قرار دے دے اس سے فرق نہیں پڑنا چاہیے کہ القاعدہ اور طالبان فوجیں جنیوا کنونشن کے مطالبات یا کسی ایک مطالبہ پر عمل کرتی ہیں یا نہیں کیونکہ وہ امریکہ کی خود بیان کردہ جنگ کے باقاعدہ فریق ہیں۔ تاریخی طور پر جن لوگوں کو جنگی قیدی کی حیثیت والی حفاظت حاصل نہیں ہوتی وہ جاسوس اور دہشت گرد ہوتے تھے کسی طرح کی وردی میں نہ ہوں القاعدہ اور طالبان کو باقاعدہ طور پر اپنی فوج کے کمانڈروں کی حیثیت مکمل طور پر حاصل ہے ان کے ساتھ جس قسم کا سلوک کیا گیا وہ اسی وجہ سے عالمی قانون کی صریح خلاف ورزی ہے اور اقوام متحدہ کی بھی۔ یہ سلوک عہد قدیم میں جنگوں کے بعد قیدیوں کے ساتھ روا رکھی جانے والی بربریت کی مثال ہے۔

جہاں تک مختلف ملکوں میں چھپے ہوئے مفروروں کی حوالگی کے حق کا تعلق ہے عالمی قانون میں اس کے اصول اور طریقے طے ہیں مثلاً درخواست کرنے اور وصول کرنے والے ممالک کے درمیان معاہدہ ہونا چاہیے۔ عالمی قانون کے مطابق مانگنے والے ملک کا فرض ہے کہ مفرور کے خلاف ثبوت پیش کرے اور درخواست وصول کرنے

والے ملک کو حق ہے کہ اس بات کا اطمینان حاصل کرے کہ یہ کارروائی حوالگی کے معاہدہ کے مطابق ہے اور مزید یہ کہ مقدمہ کی صورت میں مفرور کو پورا انصاف ملے گا کیونکہ حوالگی کے قانون کے اصول یہی ہیں۔ ملا عمر کی طرف سے اسامہ بن لادن کی حوالگی کا مطالبہ ماننے سے انکار عالمی قانون اور اخلاق کے عین مطابق تھا کیونکہ امریکہ نے اسامہ کے ۱۱ ستمبر کے حملوں میں ملوث ہونے کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا تھا' اسی وجہ سے ایسی کوئی جائز وجہ نہیں تھی کہ امریکہ افغانستان پر حملہ کر دے۔

اس سے بھی زیادہ ظالمانہ عمل عراق پر حملہ ہے جو سیکیورٹی کونسل کی قرار داد ۱۴۴۱ کے یکسر خلاف ہے جس میں امریکہ کو اس بات کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے کہ سیکیورٹی کونسل کی طرف سے فوجی عمل کی اجازت ملنے کا انتظار کرے جو اسی صورت میں حاصل ہوتی جب اقوام متحدہ عراقی ہتھیاروں کا معائنہ مکمل کر لیتا۔ اقوام متحدہ کے معائنہ کاروں کے سربراہ Hans Blix نے ۵ مارچ ۲۰۰۳ء کو اخباری کانفرنس میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ عراق بہت زیادہ تعاون کر رہا ہے اور امید ظاہر کی تھی کہ اب بھی جنگ سے بچا جا سکتا ہے۔ مزید برآں انھوں نے تبصرہ کیا کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو میرے خیال میں معائنہ کے ذریعے ہتھیاروں میں کمی کے طریقوں کی سخت ناکامی ہوگی۔ اخیر میں انھوں نے کہا میں موسم گرما تک معائنہ جاری رکھنے کے منصوبہ کی حوصلہ افزائی کروں گا۔

صدر بش نے کانگریس کی پشت پناہی سے یہ فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا کہ اقوام متحدہ ساتھ دے یا نہ دے وہ عراق کے خلاف جنگ ضرور کریں گے۔ عالمگیر تحفظ کے نظام کے اختتام کی شروعات ۱۲ ستمبر ۲۰۰۲ء کو ہوئیں جب صدر بش عراق کے خلاف مقدمہ جنرل اسمبلی میں لائے اور اقوام متحدہ کو للکارا کہ غیر مسلح نہ ہونے پر عراق کے خلاف کارروائی کرے۔ آستین چڑھاتے ہوئے انھوں نے الٹی میٹم دیا کہ "اگر سیکیورٹی کونسل نے ضروری قرار داد مہیا کر دی تو ہم اس کے ساتھ رہیں گے لیکن اگر اقوام متحدہ نے تعاون نہ کیا تو ہم اکیلے ہی کارروائی کریں گے"۔ واشنگٹن کی دھمکی کی تجدید ایک ماہ بعد کانگریس نے بش کو اقوام متحدہ سے اجازت حاصل کیے بغیر عراق پر حملہ کا اختیار دے

کر کی۔ دو ہفتوں کے بعد ۲۵ اکتوبر کو امریکہ نے باقاعدہ طور پر ایک قرارداد تجویز کی جو عراق کے خلاف جنگ کا جواز عطا کر دے لیکن ساتھ ہی بش نے پھر تنبیہ کی کہ اگر سیکیورٹی کونسل نے اس عمل کو مسترد کر دیا تو پھر بھی وہ اپنی راہ سے نہیں ہٹیں گے۔ بش نے آخری الٹی میٹم یوں دیا کہ اگر اقوام متحدہ میں خواہش اور ہمت نہیں ہے کہ صدام کو غیر مسلح کرے اور صدام غیر مسلح نہیں ہوتا تو ریاستہائے متحدہ غیر مسلح کرنے کے لیے اتحاد کی قیادت کرے گا۔

کونسل نے ۷ نومبر ۲۰۰۲ء کو بش کے الٹی میٹم کے جواب میں یک رائے ہو کر قرارداد ۱۴۴۱ منظور کی جس میں معائنہ کا ایک نیا نظام تشکیل دیا گیا۔ ۲۱ جنوری ۲۰۰۳ء کو Powell نے اس قرارداد سے کھسک جانے کی کوششیں شروع کر دیں اور کہا کہ معائنہ سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا وہ ۵ فروری کو سیکیورٹی کونسل میں واپس آئے اور یہ مقدمہ بنایا کہ عراق نے کثیر تباہی کے ہتھیار چھپا رکھے ہیں اور ۲۰ مارچ کو سیکیورٹی کونسل سے کسی اختیار اور اقوام متحدہ کے معائنہ کی تکمیل کا انتظام کیے بغیر ریاستہائے متحدہ نے عراق پر حملہ کر دیا لیکن کوئی کثیر تباہی کا ہتھیار قبضہ کر لینے کے بعد بھی برآمد نہ کر سکا۔

البتہ اس عمل نے عراق میں ایسی لاقانونیت' انتشار اور لوٹ مار کو فروغ دیا ہے جو کئی اعتبار سے وحشی منگولوں کی بربریت سے بھی متجاوز ہے۔ اس طرح ریاستہائے متحدہ نے نہ صرف دنیا کے ضمیر کی توہین کی ہے بلکہ اقوام متحدہ پر بھی شدید ضرب لگائی ہے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس سے بھی شدید ضرب تو خود سیکیورٹی کونسل کے معزز ارکان نے عراق کے خلاف بلا جواز جارحیت پر جو خود کونسل کی اجتماعی خواہش کے خلاف ڈھٹائی سے کی گئی خاموش تماشائی بن کر لگائی۔ بجائے اس جارحیت کی مذمت کرنے یا مظلوم کی مدد کو آنے کے اس نے اپنی قرارداد ۱۴۸۳ کے ذریعے امریکی قبضہ کو تسلیم کر لیا اور بریمر کی منتخب کردہ کٹھ پتلیوں کی عراقی کونسل کو جائز قرار دیا۔ کونسل کے تمام ارکان میں سے احمد شیلابی کو سربراہ بنایا گیا جس کا پینٹاگون سے پرانا رابطہ تھا اور تیل کے امریکی

مفادات سے بھی۔ وہ چالیس سال پہلے عراق سے فرار ہوا تھا جس پر ابھی تک اردن میں غبن کا فوجداری مقدمہ قائم ہے۔ عراق میں نہ تو اس کا کوئی حلقۂ انتخاب ہے نہ عوامی پذیرائی۔ قرار داد ۱۴۸۳ نے عراقی عوام کو اختیارات کی منتقلی کی کوئی تاریخ مقرر کیے بغیر ہی قابض حکومت کو تسلیم کر لیا۔ یہ بہت بڑی بدنصیبی ہے کہ اس حکومت کو ایسے وقت جواز کی سند عطا کی گئی جب قابض حکومت کے خلاف بڑے پیمانہ پر مزاحمت شروع ہو چکی تھی جو گزرنے والے ہر دن کے ساتھ شدید تر ہوتی جا رہی ہے اور عراقی ابھی تک اس بیرونی تسلط کے خلاف جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔

بہر حال سیکیورٹی کونسل کے لیے اقوام متحدہ کو جان کنی سے نکلنے کا ایک بے مثال موقع آیا جب صدر بش عراق میں یکے بعد دیگرے فوجی ہزیمتیں اٹھا رہے تھے۔ بقیہ اسلامی دنیا کے بھی مزاحمت کار عراقیوں کے ساتھ شامل ہو گئے تھے' شروع کے ۱۰ سے ۲۰ حملوں سے بڑھ کر ۵۰ سے ۶۰ حملے روزانہ امریکی فوجیوں پر ہونے لگے تھے جن میں اوسطاً ایک ہلاکت ہوتی اور دو یا تین زخمی ہوتے اور ایسے وقت میں قرارداد ۱۴۸۳ پر سیکیورٹی کونسل میں بحث ہو رہی تھی۔

ملکی محاذ پر بھی صدر بش سیاسی اور معاشی مشکلوں میں مبتلا تھے' فوجیوں کو عراق سے واپس بلانے کے لیے آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ عراق کے اندر امریکی فوجیوں میں بے چینی تھی اور وہ رمزفیلڈ کو ان کی واپسی میں دیر پر کوس رہے تھے بلکہ ان کے استعفیٰ کا بھی مطالبہ کر رہے تھے اس لیے صدر بش کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ ''اقوام متحدہ تاریخ میں گم ہو رہا ہے'' کے بڑے بول سے نیچے اتر آئیں جہاں سے وہ بے چارگی کی حالت میں اپنی اکڑ چھوڑ کر اقوام متحدہ کی منت کریں کہ ایک کثیر القومی امن فوج کے ذریعے امریکہ کو عراق کی اس دلدل سے نکالے جس کے نقصانات اور اخراجات ناقابل برداشت حد تک بڑھ چکے تھے۔

جب امریکہ کی پیش کردہ قرارداد پر سیکیورٹی کونسل میں ابھی بحث جاری تھی تو اس

کے پاس بہترین موقع تھا کہ ریاستہائے متحدہ کو اس کی اصل اوقات بتادے اور ایسی قرارداد منظور کرے جس کے ذریعے امن فوج کے مکمل اختیارات اقوام متحدہ کے پاس رہیں۔ ساتھ ہی اقوام متحدہ کے زیر نگرانی انتخابات کے ذریعے عراقی عوام کو مکمل اختیارات منتقل کرنے کی قریبی اور حتمی تاریخ مقرر کرے' عراق کی تعمیر نو اور تیل کی آمدنی کے خرچ کی نگرانی کے لیے کمیٹی مقرر کرے اور امریکہ کو محدود کرے کہ جس طرح کویت کی تباہی کے لیے عراق سے تلافی کروائی گئی تھی اسی طرح سقوط بغداد کے بعد کی ساری لوٹ مار کی تلافی کرے' ایسی قرارداد اقوام متحدہ کو نئی طاقت دے کر ایک نئی زندگی عطا کر دیتی اور مستقبل میں اقوام متحدہ کی حکم عدولی کرنے والے خبردار ہو جاتے مگر افسوس سیکیورٹی کونسل کی قرارداد نے عراق میں امریکی قبضہ کو مزید مضبوط کر دیا اور اس ملک کے خلاف امریکی جارحیت کو جائز قرار دے دیا۔

امریکہ اور برطانیہ نے مشترکہ طور پر دوسری قرارداد پیش کی کہ سیکیورٹی کونسل اپنا وفد عراق بھیجے جو کہ قابض حکومت کو امریکی مقرر کردہ کونسل کے بنائے ہوئے آئین کے مطابق عبوری حکومت بنانے میں مدد دے' عراق کے سب سے زیادہ طاقتور شیعہ قائد علی سیستانی نے اقوام متحدہ کو ایک خط میں درخواست کی کہ کوئی بھی وفد بھیجنے سے پہلے اس آئین کو رد کر دے ورنہ وہ عبوری حکومت بنانے میں اقوام متحدہ کے نمائندوں سے تعاون نہیں کریں گے' بعد میں جاری مزاحمت، نوجوان قائد مقتدی کی قیادت میں مکمل بغاوت بن گئی اور مقتدی نے اقوام متحدہ سے درخواست کی کہ امن فوج بھیجے اور امریکہ کے زیر قیادت اتحاد کو فوراً عراق چھوڑنے کو کہا۔ عراق میں پیش آنے والے چیلنج پر اقوام متحدہ کا جو ردعمل رہا اس نے بڑی حد تک خود فیصلہ کر دیا کہ اقوام متحدہ با اثر عالمی ادارہ کی حیثیت سے باقی نہیں رہ سکتا جو اس کے قیام کا مقصد تھا۔

۸ جون ۲۰۰۴ء کو امریکہ اور برطانیہ کی مشترکہ قرارداد کا تیسرا ترمیم شدہ متن مکمل اتفاق رائے سے منظور ہوا' اس میں ایک عبوری حکومت کا انتظام تھا جس کو یہ اختیار

ہوتا کہ قابض طاقتوں کے اختیارات ختم کر سکے جو کہ بہر حال جنوری ۲۰۰۶ء کے اخیر تک ختم ہو جانے تھے۔ تاہم اس قرارداد میں عبوری حکومت کے دائرہ عمل یا انتخابات کے انعقاد میں اقوام متحدہ کے لیے کوئی معنی خیز کردار نہیں تھا' ابھی یہ قرارداد زیر بحث ہی تھی کہ امریکہ کے مقرر کردہ وزیر اعظم علاوی نے اس یقین دہانی کے ساتھ دخل اندازی کی کہ کثیر القومی فوجوں کا اس وقت تک عراق میں رہنا ضروری ہوگا جب تک کہ عبوری حکومت اس قابل نہ ہو جائے کہ عراق میں امن اور تحفظ قائم کر سکے۔ اس یقین دہانی کے ساتھ ہی ۳۰ جون ۲۰۰۴ء کی تاریخ کا جو تصور قرارداد میں تھا محض مذاق بن گیا' صرف یہی نہیں بلکہ جنرل مائرز نے بہر حال یہ بات واضح کر دی کہ امریکی زیر قیادت کثیر القومی فوجوں کی واپسی کے لیے کوئی حتمی تاریخ متعین نہیں کی جا سکتی۔ سیکرٹری دفاع رمز فیلڈ اور صدر بش بار بار کسی حتمی تاریخ کی پابندی سے انکار کرتے رہے ہیں۔ نئے منتخب عراقی صدر نے اپنے انتخاب کے فوراً بعد ۵/اپریل کو امریکی اشارہ کے زیر اثر اس بات پر اصرار کیا کہ اگلے دو سالوں تک امریکی فوجیں عراق سے نہیں جائیں گی جب تک کہ عراقی دفاعی فوجیں اس قابل ہو جائیں کہ عراق میں امن و تحفظ کی ذمہ داری اٹھا سکیں' قرارداد کی یہ حیثیت اور اوقات دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ اقوام متحدہ ایک باثر ادارہ کی حیثیت سے اپنی حیثیت منوانے کا آخری موقع کھو چکا ہے۔

ایک گفتگو میں رازداری کی شرط پر اقوام متحدہ کے ایک سابق اعلیٰ عہدیدار نے Institute of public Accuracy کو بتایا کہ یہ ایک المیہ تھا کہ اقوام متحدہ کو یہ بات سمجھنے میں دیر لگی کہ کس طرح اسے امریکہ کے لیے استحصال کا اوزار بنا دیا گیا ہے۔

اقوام متحدہ کی عزت اور اختیار کی مختارِ کل ریاستہائے متحدہ کی طرف سے مسلسل تحقیر نے شاید دنیا کو جھنجھوڑ کر اس کی متوقع تباہی کا احساس دلا دیا ہے۔ سیکریٹری جنرل کوفی عنان نے اس عالمی ادارہ کے وجود کے لیے بڑھتے ہوئے خطرہ کے ردعمل کے طور پر ساری دنیا سے ۱۶ معزز افراد پر مشتمل ایک پینل ترتیب دیا ہے' یہ لوگ مختلف

میدانوں میں اختصاص کے حامل ہیں یعنی سیاسی' فوجی' سفارتی، معاشی، سماجی۔ ان سے کہا گیا ہے کہ اس بات کا تجزیہ کریں کہ آج انسانیت کو کیا خطرات لاحق ہیں اور وہ اقدام تجویز کریں جو ان کے ادارہ کو ان خطرات سے نمٹنے کے لیے اٹھانے چاہئیں' پالیسیوں میں بھی اور ادارہ میں بھی۔ ہدایات کے مطابق اس پینل نے ایک سال بعد اپنی رپورٹ اور تجاویز دے دیں۔ اس رپورٹ نے ممالک کے دفاع کے حق کی سفارش کی جس میں ایسی صورت حال میں کہ حملہ کا خطرہ واضح ہو پیش بندی کا حملہ بھی شامل ہے۔ مثال کے طور پر ایسی دہشت ناک صورت حال میں جب دہشت گردی اور کثیر تباہی کے ہتھیار ملے ہوئے ہوں ایسے میں اقوام متحدہ کو سیکرٹری جنرل کو پہل کرتے ہوئے زیادہ فیصلہ کن پیش قدمی کرنے کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ رپورٹ میں کونسل کی مدد کے لیے رہنما اصول بھی بتائے گئے ہیں جن سے اسے یہ فیصلہ کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ بیرونی خطرہ یا خودمختار ممالک کے اندر سے بڑے پیمانہ پر ظالمانہ عمل کی صورت میں کسی وقت طاقت استعمال کرنے کی اجازت دی جاسکے گی' یہ حقیقت کچھ کم غیرمعمولی نہیں تھی کہ انھیں اتفاق رائے کے ساتھ دہشت گردی کی تعریف مہیا کرنی تھی۔ پینل کے ارکان نے نشان دہی کی کہ عالمی قانون میں پہلے ہی حکومتوں کی طرف سے شہریوں پر بڑی مقدار میں طاقت کے استعمال کے خلاف اقدام موجود ہیں اور غیرملکی تسلط حقیقت میں کوئی ایسا جواز نہیں جو شہریوں کو نشانہ بنانے اور مارنے کو جائز قرار دے سکے۔ اس سفارش کی خامی یہ تھی کہ یہ غیرملکی قبضہ اور تسلط کے خلاف جائز مسلح مزاحمت کے خلاف جاتی تھی بالکل اسی طرح جیسے جنگ کی صورت میں بھی غیرفوجی شہریوں کو مارنا ممنوع ہے پھر بھی بڑی تعداد میں اس سے شہری مارے جاتے ہیں جنھیں بعد میں ناگزیر متوازی نقصان (Unavoidable Collatoral Damage) قرار دے دیا جاتا ہے' اسی طرح تسلط اور ظلم کے خلاف بغاوت کی صورت میں بھی فوج اور پولیس کی انتظامیہ اور تحرک کو نشانہ بنانے میں بھی شہریوں کا دانستہ طور پر زد میں آجانا ناگزیر ہے اور اسے بھی

جائز متوازی نقصان سمجھا جانا چاہیے' رپورٹ میں جوہری پھیلاؤ کا انسداد بھی مہیا کیا گیا ہے اور بہتر حیاتیاتی تحفظ کا بھی اور ساتھ ہی اقوام متحدہ کو خود انسداد بھی مہیا کیا گیا ہے اور نسبتاً زیادہ کارگر بنایا گیا ہے۔ سب سے اہم تبدیلی جس کی سفارش کی گئی تھی وہ سیکیورٹی کونسل کے ارکان کی تعداد ۱۵ سے بڑھا کر ۲۴ کرنے کی تھی یا تو ۱۶ ایسے مستقل ارکان جن کے پاس ویٹو کا اختیار نہ ہو اور ۳ مزید غیر مستقل ارکان پھر نشستوں کی ایک ایسی نئی تشکیل جو علاقائی طور پر تقسیم ہو اور ہر چار سالوں کے بعد ان کی تجدید ہوتی رہے۔ اس عالمی ادارہ کے اختیارات کی بحالی اور اثر پذیری کی تقویت کے لیے اس کی کفالت کی ذمہ داری ارکان کے درمیان زیادہ مساوات کی بنیاد پر تقسیم ہونی چاہیے تاکہ امریکہ کے معاشی تسلط سے جان چھڑائی جاسکے' اسی طرح اس کا صدر مقام نیویارک سے جنیوا منتقل کرنے اور میثاق میں اس امر کو شامل کرنے کی سفارش کی گئی تھی کہ جنرل اسمبلی کو سیکرٹری جنرل کوفی عنان کی سفارشات کے برخلاف اس ناکام کوشش میں یہ اختیار ہونا چاہیے کہ سیکیورٹی کونسل کے کسی مستقل رکن کی طرف سے کیے گئے ویٹو کو دو تہائی اکثریت سے رد کر سکے۔ ۲۰۰۵ء کے عالمی مذاکرات میں ان سے کسی بھی سفارش پر اتفاق رائے نہ ہو سکا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ اس پر ڈٹا رہا کہ امن اور تحفظ کے قیام کے لیے سیکیورٹی کونسل کی بنیادی حیثیت پر قبضہ کرے اور زور دیتا رہا کہ ممالک کو انفرادی طور پر تنہا اور اگر ضروری ہو تو پیش بند فوجی کارروائی کا حق حاصل ہونا چاہیے تاکہ کسی بھی ملک پر امکانی یا حقیقی حملہ کا توڑ ہو سکے۔

اس سے پہلے جنرل اسمبلی کے ۵۹ ویں اجلاس کے اخیر میں جناب کوفی عنان نے عراق میں جنگ کے غیر قانونی ہونے کے بارے حتمی بیان دیا اور ابوغرائب کے قیدیوں سے توہین آمیز بدسلوکی اور ہزاروں عراقی شہریوں کی ہلاکت کی مذمت کی۔ اس نے امریکہ کو فلوجہ پر پوری طاقت سے حملہ سے بھی منع کیا۔ ریاستہائے متحدہ نے کوفی عنان کے بیانات پر شدید ردعمل کا اظہار کیا اور ان کو اقوام متحدہ سے نکال باہر کرنے کی

کوششیں بھی ہوئیں۔

ایک دوسری اعلیٰ شخصیت عالمی ایٹمی ایجنسی کے سربراہ محمد البرادی بھی امریکہ کا نشانہ بنے تا کہ ان کو عراق اور ایران سے نرمی برتنے کے جرم میں ایجنسی سے نکالا جا سکے۔ اس طرح ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اقوام متحدہ سے جنگ کا اعلان کر دیا لیکن کچھ ہی دنوں بعد البرادی کے لیے نوبل انعام کا اعلان امریکہ کے لیے دھتکار ثابت ہوا۔

باب : ۲

جنگ عراق کا نظریاتی رقبہ

ریاستہائے متحدہ نے عراقیوں سے جس چیز کا وعدہ کیا تھا وہ تھی آزادی جبکہ جو کچھ اس نے دیا وہ تھی لاقانونیت۔ فلاڈیلفیا میں ۳۱ مارچ ۲۰۰۳ء کو تقریر کرتے ہوئے صدر امریکہ نے جو حلفیہ وعدہ ان لوگوں سے کیا تھا وہ تھا ''غذا، دوائیں اور بہتر زندگی۔'' جبکہ جو انھوں نے عطا کیا ہے وہ پانی اور بجلی کے نظام کا مکمل انہدام، بدبودار کچرا' شرمناک نظام صفائی اور سب سے بڑھ کر ان کے تاریخی اور ثقافتی ورثہ کی ناقابل تلافی تباہی۔

ریاستہائے متحدہ کو عراقیوں سے گرم جوش استقبال کی امید تھی لیکن انھیں شدید مزاحمت اور لامتناہی بغاوت کا سامنا ہے۔

جب وادیٔ دجلہ و فرات کی عظیم تہذیبوں کے بقیہ آثار راکھ بن چکے تھے جب حمورابی جس کے اصول قوانین کہ جواب تک تاریخ کی کتابوں کا سرمایہ تھے ڈاکوؤں اور لٹیروں کے ہجوم اپنے پاؤں تلے روند رہے تھے' اپنی قبر میں بے چین تھا۔ امریکی وزیر دفاع رمزفیلڈ ایک مصنوعی کیفیت میں ان ڈاکوؤں اور شہریوں کی تعریف کر رہے تھے کہ وہ اپنے آزاد ہونے کا ثبوت دے رہے تھے' آزاد ہیں جرائم کرنے کے لیے' غلطیاں کرنے کے لیے اور غلط کام کرنے کے لیے۔ اس طرح ان لٹیروں کی تعریفیں کرکے رمزفیلڈ دراصل امریکی فلسفۂ آزادی کی روحانی تشریح کر رہے تھے۔ یعنی ''جرائم اور غلط کام کرنے کی آزادی''۔ کیا کوئی پوچھ سکتا ہے کہ کیا ایسی آزادی کے تعاقب میں

لاس اینجلس کے سیاہ فاموں نے بدترین فساد برپا کر کے ہزاروں سفید فاموں کو شہید کر دیا تھا؟ یا کیا یہی وجہ ہے کہ ریاستہائے متحدہ کی خواہش ہے کہ اس کے باشندے عالمی عدالت جرائم کی دسترس سے باہر رہیں؟

امریکی اٹارنی جنرل ایش کرافٹ کا دعویٰ ہے کہ امریکی آزادی کسی قانون یا آئین کا تحفہ نہیں بلکہ بلاواسطہ خدا کا عطیہ ہے۔ خدا ان کے ساتھ ہے اس لیے ان کا کوئی بھی عمل درست ہونے کے علاوہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں کہ بنیادی عقائد کے مبلغ عیسائیوں کی معیت میں پھولے ہوئے صدر بش غرہ دکھاتے ہیں کہ حضرت مسیح ان کے لیے مثال ہیں اور انھوں نے افغانستان اور عراق پر حملہ خدا کی آشیرباد سے کیا ہے۔

اس وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو عراق میں امریکی مہم صرف تیل کے ... کے لیے نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر امریکی طرز زندگی کی ترویج کے لیے (جسے پوری انسانیت کے لیے بہترین طرز زندگی کے اونچے درجہ پر رکھا جاتا ہے) ایک صلیبی جنگ تھی اس لیے اس کے راستہ سے سب سے بڑی رکاوٹ یعنی پھر سے ابھرتے ہوئے اسلام کو دور کرنا ضروری سمجھا گیا چاہے اس کے لیے فوجی کارروائی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔

بنیاد پرست تبلیغ کے زیر اثر بش انتظامیہ کے اراکین پادری فرینک گراہم کو دعوتیں دیتے رہے ہیں جو اپنے اسلام مخالف اظہار غضب کے لیے مشہور ہیں۔ مثلاً اسلام ایک شرارتی اور بدمعاش مذہب ہے۔ یہ بات اس نے پینٹاگون میں گڈ فرائڈے کے اجتماع میں امریکی مسلمانوں کے تمام تر احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے کہی۔ مسلمانوں کے مذہب اور احساس کی اس توہین کو کافی نہ سمجھ کر صدر بش نے Daniel Pipes کو جو ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف شعلے اور زہر اگلتے رہے ہیں اہم سیاسی اور ثقافتی عہدہ پر فائز کر دیا اور اس تعیناتی کے خلاف امریکی مسلمانوں کے احتجاج کو دو کوڑی کا بھی نہ سمجھا۔ یہ وہی فرینک گراہم (یا شاید ان کے والد) ہیں جنھوں نے قصر ابیض

میں صدر بش کی تقریب حلف برداری میں دعائیہ رسومات کی ادائیگی کی تھی۔ جم لوب نے اپنے مضمون (ڈان، ۱۹ اپریل ۲۰۰۴ء) میں انکشاف کیا ہے کہ وولفوٹز نے عراق پر حملہ کی شام کہا تھا کہ ہمیں اسلام میں اصلاح کی ضرورت ہے اور پھر بڑے ہی یقین سے فرمایا: ''اور میرا خیال ہے کہ یہی ہماری حقیقی امید ہے''، اسی سے عراق کی جنگ کا چھپا ہوا نظریاتی تناظر واضح ہوجاتا ہے۔ اسی طرح بش انتظامیہ اسلام پر نظریاتی حملے کرتی رہی ہے۔

افغانستان اور عراق پر حملے ہو چکے ہیں اور قبضہ کیا جاچکا ہے جس نے امریکی موجودگی کے خلاف مزاحمت کو ابھارا۔ ریاستہائے متحدہ ایران اور شام کے خلاف فوجی کارروائی اور دوسری پیش بند کارروائیوں کے لیے بہانہ کی تلاش میں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ سعودی عرب کے خلاف بھی' اگر اسے عراق میں کامیابی ہوگئی۔

امریکہ اور اسلامی ممالک کا نظریاتی موازنہ ۱۴ مارچ ۲۰۰۳ء کے بوسٹن گلوب نے بہت اچھی طرح واضح کیا ہے' صدام حسین کا بزور تختہ الٹنے پر بے حد خود اعتماد انتظامیہ کے کئی قریبی اب کھلم کھلا پورے علاقے میں تبدیلیوں کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ اس کے لیے ایران میں اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کی ہمت افزائی اور شام پر دباؤ کہ شدت پسند اسلامیوں اور فلسطینی گروہوں کی مدد بند کرے شامل ہے۔ ساتھ ہی دوررس نتائج کی حامل سماجی انجینئری کے منصوبے مثلاً مصر میں تعلیمی اصلاحات کے ذریعے نصاب کی کتابوں کو اسلامی اثرات سے پاک کرنا اور اسرائیل کا ایک بہتر عکس ابھارنا۔ منصوبہ کے مبلغوں کا کہنا ہے کہ ''یہ حکمت عملی اسلامی دانشوروں کو قریب لاکر معاشی بہتری کے ذریعے شدت پسند اسلام کو روک کر امریکی تحفظ میں اضافہ کرے گی۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ کوئی سوال نہیں کہ بش انتظامیہ حکومت کی تبدیلی دیکھنا چاہے گی''۔ یہ Kenneth Pollock کا فرمانِ دلنشیں ہے جو CIA کے سابق ماہر اور اب واشنگٹن کے بروکلین انسٹیٹیوٹ کے فیلو ہیں۔ اپنے فائدوں پر تبدیلی کی خاطر دباؤ ڈالنے کے لیے امریکی انتظامیہ کی ایرانیوں کے ساتھ سودے بازی جاری رہے گی۔

۱۴ مارچ ۲۰۰۳ء کی کانگریس کی سماعت میں کولن پاول نے اس بیان کو دہرایا: ''ہم ایرانی جوانوں کو ایک پیغام دینے کے بارے میں سوچ رہے ہیں کہ ریاستہائے متحدہ ان کی کوششوں میں ان کی مدد کرے گا۔ بش انتظامیہ کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے جن کو نائب صدر ڈک چینی کا قرب حاصل ہے حال ہی میں اظہار خیال کیا ہے کہ انتظامیہ ۱۹۷۹ء کے اسلامی انقلاب کے رد کے طریقے ڈھونڈ رہی ہے' ایک دفعہ ہم عراق کو آزاد کر کے وہاں جمہوریت قائم کر دیں تو یہ بات یقیناً نوجوان ایرانیوں کو تبدیلی کے لیے متحرک کرے گی۔ اسرائیلی اخبار Harzets نے عقابی رجحان کے حامل نائب وزیر خارجہ John Bolton کا ایک بیان فروری ۲۰۰۳ء کو نقل کیا کہ عراق کی جنگ کے بعد ایران سے نمٹ لیا جائے گا امریکی کانگریس نے جو شام کی محتسبی کی قرارداد منظور کی تھی اس کے مطابق شام کو کئی مطالبات پورے کرنے تھے مثلاً اسلامی شدت پسندوں کی مدد روکنا' لبنان سے اپنی بقیہ فوجیں واپس بلانا ورنہ امریکہ اس پر مختلف حدود نافذ کرے گا اور دوسرے تعزیری اقدام اٹھائے گا۔ اس کے بعد امریکہ کی طرف سے تعزیراتی حدود نافذ ہو چکی ہیں۔ نمائندہ عوران نے ایک تبصرہ کیا اور بعد میں اس بات پر معذرت کی ''اگر جنگ کے لیے صیہونیوں کا اس قدر اصرار نہ ہوتا تو ہم یہ کام نہ کر رہے ہوتے''۔

اسی تاریخ کو بوسٹن گلوب کی رپورٹ ہے کہ مشرق وسطیٰ میں تبدیلیوں کے لیے بش انتظامیہ کس قدر دباؤ ڈالے گی اس کا انحصار اس امر پر ہوگا کہ اسے عراق میں کس درجہ کامیابی حاصل ہوتی ہے' اگر جنگ تیزی سے لڑی گئی اور تعمیر نو آسانی سے ہو گئی تو انتظامیہ کے عقاب مزید دھمکیاں دینے کے لیے مزید دلیر ہو جائیں گے اور ایران، شام یہاں تک کہ سعودی عرب جیسے دوستوں پر حملہ کے لیے دباؤ بڑھ جائے گا۔ بش انتظامیہ کو ڈر ہے کہ اگر اسلامیوں نے مصر میں جو عرب دنیا کی سب سے زیادہ آبادی والی قوم ہے مزید قوت پکڑ لی تو وہ ریاستہائے متحدہ کے دشمن ہو جائیں گے۔ دانشوروں سے خطاب کرتے ہوئے بش نے تسلیم کیا کہ صدام حسین کی حکومت کا اختتام دہشت گردوں

کو دولتمند پشت پناہی سے محروم کردے گا جو خودکش بمباروں کی تربیت کا خرچ اٹھاتے اوران کے خاندانوں کو انعام دیتے ہیں' ساتھ ہی دوسرے علاقوں کو واضح پیغام پہنچے گا کہ دہشت گردی برداشت نہیں کی جائے گی۔

۲۹/اپریل ۲۰۰۲ء کے نیویارک ٹائمز نے ایک مضمون میں نشان دہی کی کہ ۹/۱۱ کے دہشت گرد حملوں کے بعد صدر بش نے مسلسل زور دیا کہ اسلام امن کا مذہب ہے اور مسلمانوں کے خلاف تعصّبات سے خبردار کیا لیکن انھوں نے پھر بھی ایک ایسے متنازعہ شخص Daniel Pipes کی تقرری کی جو بہت سے امریکی مسلمانوں کو کچھ اس نوع کے بیانات سے ناراض کر چکے تھے کہ مسجدیں دہشت گرد پیدا کرتی ہیں اور حکومت اور فوج میں جو مسلمان ہیں ان پر توجہ دینی چاہیے۔ بش نے بنیاد پرست عیسائی قائدین کو گلے لگایا ہوا ہے جو اسلام کو برائی کہتے ہیں اور جنھوں نے نئے روایت پرست دانشوروں کے لیے خارجہ پالیسی کا ایجنڈ مہیا کیا جو اسلامی بنیاد پرستی کو امریکی قومی تحفظ کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے پروفیسر Esposito نے کہا ہے عیسائی دائیں بازو والے اور نئے روایت پرست صدر بش کا حلقۂ انتخاب ہیں۔

عراق کے ثقافتی ورثہ کی بڑے پیمانہ پر لوٹ اور تباہی دنیا کی عظیم ترین تہذیبوں بشمول اسلامی تہذیب کے اس گہوارے کی تباہی بھی تھی جس نے وہ عظیم سائنسدان پیدا کیے جنھوں نے جدید سائنس کو اتنا کچھ عطا کیا۔ بغداد جو کبھی علوم کا مرکز تھا اور جہاں یورپ اور دوسرے دوردراز علاقوں سے طالب علم آیا کرتے تھے اس ابتلا میں مبتلا ہوگیا جس پر لندن کے School of Oriental Studies کے مشرق وسطیٰ کی سیاست کے پروفیسر Charles Tipps نے کہا یہ عراق کے لیے ایک بھیانک چیز ہے۔

ایک مسئلہ تاریخ میں مقام اور شناخت کی پہچان ہے' اگر ایسے مقالے کردیے جائیں تو تاریخ کی شکل بدل سکتی ہے جو بہت ہی خطرناک ہوگا۔ عراق کی شناخت اور تاریخ میں اس کے مقام کو سب سے بڑا دھچکا عراق کی مرکزی کتب گاہ دارالحکمہ کی مکمل اور ناقابل مرمت تباہی ہے۔

جب ویت نام نے کمبوڈیا پر حملہ کر کے Pol pot جیسے ظالم کا جنوری ۱۹۷۹ء میں تختہ الٹا تو قدیم کھمیری مخطوطوں کی کوئی لوٹ نہیں مچی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اتحادیوں نے اٹلی میں فلورنس کے اندر لڑائی سے بچنے کے لیے اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کی۔ Langdon warner جو ہارورڈ کا ماہر آثار قدیمہ ہے اس وجہ سے جاپان کا ہیرو ہے کہ اس نے ہوائی کو اس بات پر قائل کیا کہ Nara اور Kyoto کو بچائیں۔ عراقی جنگ سے پہلے انسانی امداد اور تعمیر نو کے دفتر نے پینٹاگون کو ۱۴ ایسی جگہوں کی فہرست بھیجی تھی جن کی حفاظت ضروری تھی۔ فہرست میں دوسرے نمبر پر قومی عجائب گھر تھا۔ پھر بھی اس کو نہ صرف لوٹا گیا تھا بلکہ تباہ کر دیا گیا۔ یہ قدیم ثقافتی ورثہ کا خزانہ تھا۔ دجلہ فرات کے کناروں سے ابھرنے والی تہذیب نے دنیا کی پہلی لکھائی، پہلا کیلنڈر پہلا کتب خانہ، پہلا شہر، اور دنیا کی پہلی جمہوریت پیدا کی تھی۔ بابل کا بادشاہ حمورابی وہ پہلا شخص تھا جس نے شہریوں کی معاشرتی حکومت کے رہنما اصول مرتب کیے۔ یہ وہ اصول تھے جن میں غلاموں حتیٰ کہ جانوروں کے بھی حقوق تھے۔

اس عظیم تہذیب کی باقیات کی تباہی سے چشم پوشی کر کے حقیقت میں امریکی فوج تہذیب، جمہوریت اور انسانی حقوق کے مخزن کی تباہی کا مرکزی کردار ادا کر رہی تھی۔ رمزفیلڈ نے دوبارہ سوچ کر ان تباہیوں کا الزام صدام کے رہا کیے ہوئے جرائم پیشہ افراد پر لگایا۔ اگر ایسا تھا تو امریکی فوج کو ان کے خلاف سخت کارروائی کرنی چاہیے تھی۔ خاص طور سے جبکہ امریکی فوج نے موصل، فلوجہ، تکریت اور دوسری جگہوں پر ان لوگوں کو وحشیانہ طور پر گولی مارنے سے دریغ نہیں کیا تھا جو امریکی تسلط کے خلاف مظاہرہ کر رہے تھے۔

اس بات پر یقین کرنا مشکل ہے کہ لوٹ مار کرنے والے صدام جیسے قاہر کے خلاف اپنا غصہ نکال رہے تھے۔ جبکہ کمبوڈیا کے لوگ جن کو پول پوٹ نے کہیں زیادہ دبا رکھا تھا اور لاکھوں افراد کو مار ڈالا تھا، اس قسم کی لوٹ میں مبتلا نہیں ہوئے تھے۔ پول پوٹ اس قدر عفریت تھا کہ اس کے نزدیک صدام طفل مکتب نظر آتا ہے۔

جیسا کہ رابرٹ فسک نے اشارہ کیا ہے اس جارحیت کو امریکی فوج نے عراقی عوام کی مکمل تذلیل کر کے اس حد تک بے ہمت کر دینے کی خاطر ہوا دی تھی تا کہ وہ اس قابل نہ رہیں کہ مزاحمت کر سکیں۔ امریکی اعلیٰ کمان کو پتہ تھا کہ عراقیوں نے تمام تر داخلی انتشار کے باوجود ۱۹۲۰ء میں برطانوی فوج کو مار بھگایا تھا اور انھیں عراق پر قبضہ کی بھاری قیمت چکانی پڑی تھی۔

یہ الوہی منصوبہ اور ارادہ ہی ہے کہ تمام دنیاوی وجوہ کے برعکس عراقی قوم جھک جانے اور ناتوانی کے اظہار کے بجائے انسانی تاریخ کی سب سے بڑی فوجی قوت کے خلاف مزاحمت کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ہے اور انھیں سخت نقصان پہنچا رہی ہے۔ بجائے اس کے کہ عراقی عوام جھک جاتے اور ہمت چھوڑ دیتے یہ امریکی فوجی تھے جو ہمت ہارے اور اپنے سیکرٹری دفاع کو عراقی مخمصہ پیدا کرنے پر کوسنا شروع کر دیا۔ اپنی ای میلوں (emails) میں انھوں نے اپنے آپ کو فراموش شدہ اور بے وفائی کے شکار سپاہی قرار دیا۔ انھوں نے جنگی نامہ نگاروں کے سامنے کھلم کھلا اپنے غصہ کا اظہار کیا' غیر مطمئن امریکی فوج کی بے حوصلگی اس قدر سنگین مسئلہ بن گیا کہ علاقائی کمانڈر جنرل ابی زید کو انھیں فوجی تنظیم اور طرز عمل کے خلاف عمل کرنے پر انتباہ جاری کرنا پڑا۔ صرف یہی نہیں بلکہ امریکی کٹھ پتلیوں کے سوا پوری اسلامی دنیا نے عراق میں امریکہ کی فوجی غلط کاریوں کو اسلام اور اسلامی دنیا پر حملہ قرار دیا اور متحد ہو گئی۔ اسلامیوں نے گویا ساری دنیا میں اپنے فرقہ وارانہ اختلافات کو الگ رکھ دیا یہاں تک کہ امریکی غلط کاری کے خلاف چٹان کی طرح کھڑے ہو گئے۔

۱۶ مارچ ۲۰۰۳ء کے ''بوسٹن گلوب'' نے رپورٹ شائع کی کہ معتدل رویے کے حامل مذہبی رہنما جنھوں نے اسامہ کی مذمت کی تھی اب اپنے حامیوں سے کہہ رہے ہیں کہ عراق پر امریکی حملہ کی صورت میں اٹھ کھڑے ہوں جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اب تک کی معتدل دھارے کی اسلامی قوتوں کے مقاصد اب ان کے ساتھ مشترک ہیں جنھیں انتہا پسند کہا جاتا تھا۔ قاہرہ کی مسجد الازھر نے جو ہزار سالوں سے اسلامی دینی تعلیم

کا مرکز اور ساری دنیا میں کروڑوں سنی مسلمانوں کے لیے دینی ہدایات کا مرکز ہے ، ریاستہائے متحدہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ الازھر اسلامی ریسرچ اکیڈمی کے ایک فتوے کے مطابق اگر کسی مسلم ملک کے خلاف کوئی دشمن جارحیت کا ارتکاب کرے تو جہاد ہر مسلمان پر فرض ہو جاتا ہے۔ اردن میں اسلامی حزب عمل نے جو ملک کی سب سے بڑی معتدل دھارے کی مسلم جماعت ہے مسلمانوں سے کہا ہے کہ امریکی جارحیت کے خلاف مزاحمت میں عراق کا ساتھ دیں۔ حزب کے رہنما حسین منظور نے کہا کہ صرف پرامن طریقوں سے کام نہیں چلے گا بلکہ ہر ایک کو مزاحمت کی مدد کے لیے ہاتھ بٹانا چاہیے جس طرح بھی ان کے لیے ممکن ہو۔ اس قسم کے بیانات میانہ روی اور عدم تشدد سے ہٹ کر انتہا پسندی کی طرف جھکاؤ کے مظہر ہیں۔ اسلامی دنیا کی جانب امریکہ کے جارحانہ انداز کے جواب میں تمام مسلمان آبادی امریکہ مخالف ہوتی جا رہی ہے اور عراقی جنگ سے پہلے اور اس کے دوران ساری دنیا میں قاہرہ سے کراچی اور جکارتہ تک بڑے بڑے احتجاجی اجتماعات میں حصہ لیتی رہی ہے۔

جون اپسٹو (John Episto) کا کہنا ہے کہ الازھر کے علماء اس عوامی رائے کی نمائندگی کرتے ہیں جو جنوبی افریقہ سے مشرقی ایشیا تک مسلم دنیا کی تمام سیاسی اور سماجی لہروں میں سے گزر رہی ہے۔ وہ مزید کہتا ہے: ''مسلم دنیا کے درمیانی دھارے میں شامل بہت سے لوگوں کے لیے جو ۱۱/۹ کے ذمہ داروں کو انصاف کے کٹہرے تک لانے کے حامی تھے افغانستان میں جنگ کو پھیلانا، اسرائیل میں بحران کا تسلسل، امریکہ اور یورپ میں مسلمان اقلیت کی سماجی آزادیوں کا خاتمہ اور ان کے خلاف یک طرفہ سلوک نے امریکہ مخالف جذبات کو بھڑکایا جو انتہا پسندوں کے لیے بھرتی کا مرکز بن گئی۔

فرانس کے صدر جیک شیراک نے کہا کہ عراق کے ساتھ جنگ میں پہلی فتح ان کی ہوگی جو تہذیبوں، ثقافتوں، اور مذاہب کا ٹکراؤ چاہتے ہیں۔ اخوان المسلمون نے جو مصر کی سب سے بڑی اور قدیم ترین جماعت ہے اور سالوں پہلے تشدد ترک کر چکی ہے اواخر فروری ۲۰۰۳ء میں قاہرہ میں ایک عظیم الشان امریکہ مخالف ریلی منظم کی جس میں

اندازاً ایک لاکھ بیس ہزار لوگ شہر کے اسٹیڈیم میں نعرے لگا رہے تھے کہ: ''خدا کی نصرت قریب ہے، امریکہ مردہ باد اور عراق زندہ باد۔'' انڈونیشیا میں ایک لاکھ سے زیادہ لوگ جمع ہوئے۔ پاکستان میں لاکھوں لوگوں نے بڑے شہروں میں جلوس نکالے۔ مشرق وسطیٰ میں ریاستہائے متحدہ کی بے انصاف اور تشدد کی حامل یک طرفہ پالیسیوں نے مسلم دنیا کے بے شمار فرقوں کو جمع کر کے ایک قسم کی امت بنا دیا ہے۔ اسی طرح ریاستہائے متحدہ وہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جس میں بن لادن ناکام ہو گیا تھا۔

''مسلمان یہ کیوں سمجھنے لگے ہیں کہ یہ جنگ پوری مسلم دنیا کے خلاف ہے''؟ طہٰ الوانی سوال کرتا ہے جو لیز برگ ورجینا کے Graudeable School of Islamic Social Sciences کا صدر ہے ۱۱ ستمبر سے امریکی ضرورت سے زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ مسلم دنیا میں انھیں جو ہمدردی حاصل تھی وہ کھو چکے ہیں۔ رجعت پسند دانشوروں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے صدر بش نے (بوسٹن گلوب ۲۷ فروری ۲۰۰۳) عراق کی جنگ سے متعلق اپنا عقلی جواز اور قانونی وجوب پیش کیا مثلاً اسرائیل اور فلسطین کے درمیان قیام امن۔ لیکن امن کس کی شرائط پر اور کس انجام کے لیے؟ صدر بش کا حقیقی مطمح نظر مشرق وسطیٰ سے آگے تک جانا نظر آتا ہے۔ انھوں نے مشرق وسطیٰ میں قیام امن کا جرمنی اور جاپان میں جمہوریت کی ترویج سے مقابلہ کیا۔ جو بات جناب صدر بش اس تقابل میں بھول گئے وہ یہ تھی کہ جرمنی اور جاپان دونوں کو دوسری جنگ عظیم میں فیصلہ کن شکست ہو چکی تھی اور وہ یا تو بکھر چکے تھے یا ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کر چکے تھے جس کے تحت ریاستہائے متحدہ کی فوجیں اب بھی ان دونوں ملکوں میں تعینات ہیں اور وہاں بعد از جنگ قابض فوجوں کے خلاف کوئی مزاحمت نہیں ابھری ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ فاتح نے جاپانی بادشاہ کی حیثیت کو قائم رکھا جو جاپانیوں کے لیے دیوتا کی حیثیت رکھتے تھے۔ جرمنی میں جمہوریت کی تاریخ پرانی تھی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران بھی ہٹلر کو قتل کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ لیکن عراق کے معاملہ میں امریکی موجودگی کے خلاف مزاحمت جاری ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے حماس اور اسلامی

جہاد ایک ریاست کے قیام کی کوشش میں مصروف ہیں۔ امریکی موجودگی کے خلاف جاری مزاحمت میں عراقیوں کی بہت بڑی اکثریت شیعہ اور سنی دونوں نے ایک اسلامی ریاست کے قیام کا تہیہ کرلیا ہے جو جرمنی اور جاپان میں امریکی طرز جمہوریت کی انگوری شراب سے بہت مختلف ہے۔صدر بش جمہوریت پیدا کر کے رکنا نہیں چاہتے ہیں بلکہ آگے بڑھ کر عالمی تہذیب کے تحفظ کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔لیکن ایسی کوئی چیز ہے نہیں جسے عالمی تہذیب کہا جائے۔ دنیا میں اس وقت مختلف النوع تہذیبیں ہیں ہنٹنگٹن نے نہ صرف ایک عالمی تہذیب کے وجود کی نفی کی ہے بلکہ پوری دنیا پر ایک تہذیب مسلط کرنے کے خطرات پر زور دیا ہے۔تہذیبوں کا مسئلہ ایک تہذیب مسلط کرنے کی کوشش کے نتیجہ میں بھڑک کر بڑا جھگڑا بن سکتا ہے۔ عالمی سطح پر اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا کمیشن بھی مختلف ملکوں کے اپنی تہذیبوں پر قائم رہنے کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔

اس لیے صدر بش کا عالمی تہذیب مسلط کرنے پر اصرار عالمی تہذیب کے پردہ میں قبضہ اور تسلط قائم کرنے کا شاخسانہ معلوم ہوتا ہے۔صدر بش کہتے ہیں تحفظ میں امریکی دلچسپی اور آزادی پر امریکی یقین ایک ہی سمت لے جاتے ہیں ...... ''ایک آزاد اور پُر امن عراق۔'' خود ریاستہائے متحدہ میں لوگوں کو تحفظ اور آزادی کے درمیان کش مکش کا تجربہ ہونے لگا ہے اور نتیجتاً پیٹریاٹ اول (Patriat I) کے خلاف بے چینی بڑھ رہی ہے۔اس بدنام زمانہ قانون کے خلاف سو سے زیادہ علاقائی حکومتوں اور دو امریکی ریاستوں نے قراردادیں منظور کی ہیں جس نے امریکی شہریوں کی آزادی اور تخلیہ کو سخت مجروح کیا۔

''آزاد اور پُر امن عراق'' کو پیش نظر رکھ کر صدر بش اس عراق کے بارے میں کیا کہیں گے جو امریکی تسلط کے خلاف مسلح جدوجہد کر رہا ہے جس نے عراق میں متقابض امن کو الٹا کھڑا کر دیا ہے۔ جو فضول آزادی کی طرف لازمی قدم ہے مزید برآں صدر بش کو اُن غلط باتوں کی آزادی یاد دلانا ضروری ہے جس کا اعلان ان کے سیکرٹری دفاع نے کیا ہے کہ آزاد لوگ جرائم کے ارتکاب کے لیے آزاد ہیں۔ اور اسی

لیے امریکی قبضہ کے دوران عراق میں ساری لوٹ مار کو امریکہ میں عراق کی نئی حاصل کردہ آزادی کا ظہور قرار دیا گیا، اگرچہ ذرا گندی قسم کی۔

جب امریکہ کا فلسفہ آزادی اس قسم کا ہے تو عراق میں آزادی اور امن ساتھ ساتھ کیسے چل سکتے ہیں۔ نہ صرف عراقی بلکہ دنیا کی کوئی بھی قوم ایسی آزادی کی خریدار نہیں ہو سکتی جو آزادی کا راستہ روک دے۔ کویت میں شیعہ امام مسجد صالح جنوار نے کہا:

''عراقی سب سے زیادہ غیر قانونی اور پُر گناہ جنگ کے نتائج بھگت رہے ہیں۔ امریکی عراقیوں کے لیے آزادی نہیں چاہتے۔ ریاستہائے متحدہ کٹھ پتلی حکومت قائم کرنا اور مسلمانوں کو اس حد تک دبانا چاہتی ہے کہ ہم Voice of America بن جائیں۔

لبنانی شیعہ قائد شیخ محمد حسین نے بغداد، بصرہ، ناصریہ اور نجف میں امریکی قتل عام کی مذمت کی۔ امریکہ، برطانیہ اور ان کے اتحادیوں کی جنگ نے امریکہ کے غرور کا بدصورت چہرہ بے نقاب کر دیا ہے۔ شیخ نے کہا کہ یہ تہذیب کے خلاف جرم ہے۔ قاہرہ میں جامعہ الازھر میں عبادت کرنے والوں سے سید طنطاوی نے کہا کہ عراقیوں کے خلاف جارحیت ناانصافی ہے اور اس کی مزاحمت ضروری ہے اور انھوں نے عالمی برادری سے کہا کہ عراقی عوام کے دفاع کے لیے اٹھیں۔ اس طرح تہذیب کے متعلق تصورات اور اس تک پہنچنے کے ذرائع آپس میں ٹکراتے ہیں اس صدر بش کے مطابق جو چیز عالمی تہذیب کا تحفظ ہے وہ لبنان کے شیعہ قائد محمد حسین کے نزدیک تہذیب کے خلاف جرم ہے۔

افغانستان اور عراق پر یکے بعد دیگرے حملے کر کے اور ان پر قبضہ کر کے امریکہ نے اسلامی احساساتِ اخوت و اتحاد کو مہمیز کیا ہے اور امریکہ کے خلاف اسلامی تحاریک کو سخت گیر کر دیا ہے۔

عراقی جنگ کی ابتدا کے نو دنوں بعد جب بوسٹن گلوب نے ۲۹ مارچ کو رپورٹ شائع کی تو پوری اسلامی دنیا میں عراق کے حق میں اور امریکہ کے خلاف آگ بھڑک اُٹھی۔

اسرائیل ٹینکوں کی گڑگڑاہٹوں کے درمیان ایک احتجاج کرنے والے نے نعرہ

لگایا ''مرگ بر امریکہ'' اور ''عراق زندہ باد'' ۔مصری مظاہرین نے عراق سے کہا کہ امریکی برطانوی مسلح افواج کے خلاف جہاد کریں' شمالی لبنان کے شہر ٹریپولی اور فلسطینی شہر غزہ میں تیس ہزار مظاہرین سڑکوں پر نکل آئے ۔جبکہ ہزاروں افراد بحرین میں باہر آئے جو امریکی بحری بیڑے کا میزبان ہے۔مصر میں جو ریاستہائے متحدہ امریکہ سے امداد حاصل کرنے والوں میں دوسرے نمبر پر ہے تمام لوگوں نے جنگ کے خلاف غم وغصہ کا اظہار کیا تھا۔''اپنے خون سے اپنی روح کی گہرائیوں سے'' تاریخی الازہر کے سامنے جلوس کا نعرہ تھا۔ انھوں نے ان قائدین کی مذمت کی جو امریکہ کا ساتھ دے رہے تھے۔ مکہ کی مرکزی مسجد سے امام صالح بن محمود نے ایک ٹیلی وژن نشریہ میں مسلمانوں سے عراقی بھائیوں کی مدد کی درخواست کی ۔

شیعہ سنی تقسیم جواب تک مسلمانوں کے اتحاد اور یک جہتی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اور مسلمانوں کے مخالفوں کے ہاتھ میں استحصال کا آلہ رہی ہے۔اب تیزی سے ماضی کی چیز بنتی جا رہی ہے۔ امریکی قبضہ کے فوراً بعد نیویارک ٹائمز کے مطابق شیعہ علی سیستانی کی قیادت میں کربلا میں جمع ہوئے اور عراق کو امریکی تسلط سے آزاد کرانے کی قسم کھائی تا کہ اسلامی سلطنت قائم کرسکیں۔

۲۰ اپریل ۲۰۰۳ء کے نیویارک ٹائمز نے رپورٹ دی کہ شیعہ اور سنی علماء ایک جمعہ کو مسجد امام ابو حنیفہ میں جمع ہوئے اور ایک آواز ہو کر امریکہ سے مطالبہ کیا کہ عراق سے چلا جائے اور اسلامی ریاست کے قیام کا مصمم ارادہ ظاہر کیا۔ مذہبی و سیاسی کاموں سے الگ ہٹ کر انھوں نے جنگ سے تباہ علاقوں میں امدادی کاموں کا نظام بھی بنایا۔ عظیم الشان مسجد ابوحنیفہ میں جو راسخ العقیدہ شیعہ اور سنی مسلمانوں سے بھری ہوئی تھی امام نے مشترکہ طور پر قابضین سے کہا کہ ''باہر نکل جاؤ اس سے پہلے کہ ہم تمھیں لات مار کر نکال دیں''۔

۲۰ مئی ۲۰۰۳ء کے نیویارک ٹائمز نے رپورٹ شائع کی کہ امریکی موجودگی کے خلاف شیعوں کے احتجاجی مظاہرے سخت ترین تھے۔ ایک سنی مسجد سے دس ہزار

مظاہرین نے شہر کے شمال میں خادمیہ کی شیعہ خانقاہ تک جلوس نکالا۔ ان کے پلے کارڈوں پر لکھے نعرے تھے: ''نہیں نہیں امریکہ نہیں''۔ وہ نعرہ لگا رہے تھے ہم ملک نہیں فروخت کریں گے۔ ایک دفعہ پھر منگل ۷ مئی ۲۰۰۴ کو سنی اور شیعہ مسلمانوں نے مسجد ابوحنیفہ میں اکٹھے نماز پڑھی اور اعلان کیا کہ ''اسلام ایک ہے'' اور یوں متحدہ طور پر امریکی تسلط کے خلاف جدوجہد کرنے کا عہد کیا۔

عراق میں شیعہ سنی اتحاد کے بارے میں دہر جمائل کا مقالہ Inter Press News Services نے (ڈان ۴ مئی ۲۰۰۴ء) کو جاری کیا تھا جس میں شیعوں اور سنیوں میں بڑھتے ہوئے اتحاد اور یک جہتی کی نشان دہی کی تھی جس کے نتیجہ میں امریکی موجودگی کے خلاف متحدہ جدوجہد نے جنم لیا جب دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اسلام کی فتح اور شان کے لیے ہر قربانی دینے کا عہد کیا۔ ان کا نعرہ یہی ہے: ''اسلام ایک ہے۔''

Daily Independent کے رابرٹ فسک (ڈان ۱۴ جولائی) نے ایک نمایاں شیعہ قائد شیخ جواد مہدی الخلاصی سے گفتگو کے بعد جو عراقی اسلامی کانفرنس کے صدر نشین اور شیعہ سنی دونوں کی نمائندگی کرتے ہیں، ان میں اپنے دادا جیسی (جنھوں نے برطانوی قبضہ کے خلاف ۱۹۲۰ء میں جنگ کی تھی) انقلابی آگ اور ارادہ ہے، لکھا ہے:

''میں شیخ جواد ہوں، عراق کی اب کیا بات ہے'' وہ عراقی اسلامی کانفرنس کے صدر ہیں جو شیعہ اور سنی دانشوروں کو یکجا کرتا ہے اور جو عراقی آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں بالکل اسی طرح جیسے میرے دادا نے اسی (۸۰) سال کی عمر میں کیا تھا۔ جواد نے جواب دیا۔ شیعہ الگ نہیں ہوں گے اور وہ سنیوں سے خود کو جدا نہیں کریں گے۔ اب عراق کے سب باشندوں کو اپنے حقوق ملیں گے تو انھیں بھی ملیں گے۔ ہمیں اس کا حق حاصل ہے کہ مختلف طریقوں سے تسلط کی مزاحمت کریں، ہم سیاسی طور پر کر رہے ہیں، امریکیوں کو خانہ جنگی چاہیے لیکن عراقی خانہ جنگی میں مبتلا ہونے سے انکار کر دیں گے۔

رابرٹ فسک نے ایک اور انٹرویو (۲۲ جولائی ڈان) آیت اللہ احمد حسینی

البغدادی سے تقریباً دس دن بعد کیا۔ البغدادی نے جو صدام حسین کے جلال سے بچنے کے لیے دس سال دمشق میں جلاوطن رہے اور انھیں کسی طرح بھی صدام حکومت کے لیے معذرت خواہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ ابھرتی ہوئی برادری اور شیعوں سنیوں کے درمیان مفاہمت کو مزید نمایاں کیا ہے۔ ''پریس عراق کی جنگ پر صیہونی امریکی پردہ ڈال رہا ہے''۔ مزید وہ کہتے ہیں کہ یہاں صرف ایک مثلث ہے جہاں سنی تسلط کے خلاف لڑ رہے ہیں لیکن مہدی فوج کی انتفاضہ سے پہلے ہی کربلا، حلاء اور دیوانیہ جو شیعہ شہر ہیں ان پر حملے ہوئے۔ یہ حقیقت اخباری ایجنسیوں کے جھوٹ کو بے نقاب کردیتی ہے۔۔ مہدی فوج کی زیرِ قیادت لڑائی سنی بھائیوں کے ساتھ جذباتی لگاؤ کی نشانی تھی اب CIA اور MI-6 اور ان کے غیر ملکی جاسوسی ادارے کہہ رہے ہیں کہ اگر امریکی چلے گئے تو خانہ جنگی ہوگی۔ بغدادی جواب دیتے ہیں کوئی خانہ جنگی نہیں ہوگی کیونکہ عراقی عربی بنیاد اور مذہب کے ذریعہ جڑے ہوئے ہیں' اس لیے جب یہ دھمکی کارگر نہ ہوئی تو ان اداروں نے زرقاوی کا کردار بنالیا۔ پھر کسی مسجد میں دھماکہ ہوجاتا یا حسینیہ (شیعہ عبادت گاہ) میں ایک شیعہ عالم مارا جاتا' جب مقامی پریس قابضوں سے ملا ہوا پریس/ دعویٰ جماعت اور شیلابی کی قومی کانفرنس کی طرح کہتا ہے کہ اگر امریکن چلے گئے تو ایسی ہی خانہ جنگی ہوگی''۔

شیعوں اور سنیوں کے درمیان مشترکہ اسلامی قدر پر زور دیتے ہوئے بغدادی نے یاد دلایا۔ ''شیعہ اماموں کے سلسلہ کی تقلید کرتے ہیں اور وہ سُنیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ اگر سلطان سنی بھی ہو اور آمر و جابر بھی، ہم اس کی تابعداری کریں گے اور ہم بت پرستوں کی فرماں برداری نہیں کریں گے۔ ہمارے اماموں نے ریاست میں نفسی طریقوں کی مخالفت کی وہ خلافت جو امام علی اور حسین کے خلاف تھی اور اموی ریاست کی طرفداری تھی' اور فرقہ پرست عثمانیوں سے ۱۹۲۰ء میں شیعہ اور سنی آپس میں لڑے جس پر برطانوی حیران رہ گئے۔ جبکہ آج سنیوں اور شیعوں کے درمیان عملی رشتہ ہے اور وہ تسلط کے خلاف مزاحمت کرتے رہیں گے۔

مقالہ میں کہا گیا ہے: ''سنیوں اور شیعوں کے درمیان تقسیم کے بارے میں سوال کے جواب میں امام ادہمی نے کہا کہ جو ہمارے ساتھ ہو رہا ہے اس میں شیعہ، سنی، عرب یا کرد کا کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم سب پر حملہ ہوا ہے' اس مسجد کے لوگوں کے احساسات وہی ہیں جو تمام عراقیوں کے ہیں' عراقی خون قیمتی ہے اور بہانے کے لیے نہیں ہے لیکن آزادی اگر پُر امن طریقے سے نہ ملے تو پھر خون بہانا پڑتا ہے''۔ یہی جذبات شیخ عبدالہادی اور الدراجی کے ہیں جو جنگجو شیعہ عالم مقتدیٰ الصدر کے نائب ہیں۔ جمعہ کو جب عراق کے شیعہ سنی مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے شیخ الدراجی نے مسجد ابوحنیفہ میں ایک سخت خطبہ دیا۔ ''ہم یہ بتانے آئے ہیں کہ بدی کی طاقتیں شیعہ سنی اتحاد کو کبھی توڑ نہیں سکیں گی۔ آپ کا دشمن سنیوں اور شیعوں کے درمیان انتشار کے بیج بونے آیا ہے لیکن ناکام رہا کیونکہ اسلام ایک ہے' نماز کے سب شرکاء نے ان جذبات کا ساتھ دیا۔

''میں نے اپریل میں فلوجہ والوں کے لیے اپنا خون دیا ہے۔ اور یہی سب کچھ میں' نجف کے لوگوں کے لیے بھی کروں گا۔ ہم سب عراقی ہیں۔ جب کربلا میں جنگ جاری تھی تو بغداد کی ایک اور سنی مسجد ''ندا الاسلام'' کے امام نے کہا کہ امریکہ کی حرکات شیعوں اور سنیوں کو متحد کر رہی ہیں۔

اگلے دن ۱۲ مئی ۲۰۰۴ء کو ڈان کی خبر ہے کہ فلوجہ کے سنیوں نے تمام رکاوٹیں توڑ کر نجف اور کربلا کے متاثرین کے لیے سات ٹرک کھانے کا سامان پہنچایا۔

ممتاز کالم نگار حسن عسکری نے ۱۰/اکتوبر ۲۰۰۳ء کے ڈان میں اپنے مضمون میں بتایا کہ ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو شیعہ عراقیوں کا ایک گروہ ایک مسجد میں تھا جسے امریکیوں نے ہیلی کاپٹروں کی مدد سے نکالنے کی کوشش کی۔ ایک ہفتہ بعد ایک امریکی ہیلی کاپٹر نے کربلا کی ایک مسجد میں پُر اثر اور شعلہ بیاں شیعہ قائد مقتدیٰ الصدر کے حامیوں کو گرفتار کیا۔ یہ تمام واقعات قابض طاقتوں کے اس پروپیگنڈے کی نفی کرتے ہیں کہ صرف سنی مثلث کے سنی مسلمان ہی جاری مزاحمت میں حصہ لے رہے ہیں۔

ایجنسی کی خبروں کے مطابق (ڈان، ۲۹/اکتوبر ۲۰۰۳ء) ایک پولیس اسٹیشن کے

نزدیک ایک پک اپ ٹرک دھماکے سے اڑ گیا، بصرہ میں سڑک کے کنارے دھماکہ ہوا، کرکوک میں ایک فوجی قافلہ پر راکٹ حملہ ہوا۔ بغداد کے ہوٹل کے نزدیک ایک باغ میں میزائیل پھٹا۔ یہ سب ایک ہی دن ہوا' یہ سب اس سنی مثلث سے باہر ہے جسے صدام کی بقیات کا قلعہ کہا جاتا ہے۔ بصرہ شیعوں کا گڑھ ہے' کرکوک تسلط کے بعد سے کرد اکثریت کا علاقہ ہے اور بغداد میں شیعہ سنی سب رہتے ہیں۔ اس لیے واضح بات ہے کہ مزاحمت سنی مثلث سے ماورا ہے۔ شعلہ بیاں شیعہ قائد مقتدیٰ الصدر نے نجف، کوفہ، کربلا، بصرہ اور دیگر جگہوں میں مزاحمت کی قیادت کی۔ بیچ بیچ میں جنگ بندیاں ہوئیں لیکن زیادہ دیر تک قائم نہ رہیں۔

ایران کے صدر خاتمی اگرچہ اصلاح پسندوں کے قائد ہیں جو اسلامیوں کے مخالف تھے نے کہا امریکہ سے ہمارے مسئلہ کی جڑیں گہری ہیں' میرا خیال ہے کہ اصل مسئلہ امریکہ ہی کا پیدا کردہ ہے۔ انھوں نے فوجیں نکالنے کا مطالبہ کیا کیونکہ یہ تسلط عراقی لوگوں کی توہین ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ امریکہ نے شدت پسندی اور حقیقت پسند رجحانات کو بڑھاوا دیا ہے۔

اسی طرح یہ بھی واضح ہے کہ مسلمان سنی ہوں یا شیعہ' پرانے خیالات کے ہوں یا نئے' سب ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مجرمانہ منصوبوں کے خلاف متحد ہیں۔ ۱۴ اپریل ۲۰۰۳ کو بوسٹن گلوب نے لکھا کہ عراقی جو اُردن میں پناہ گزیں تھے صدام سے اپنی نفرت کو ایک طرف رکھ کر عراقی بھائیوں کے شانہ بشانہ امریکی حملہ آوروں سے لڑنے کے لیے واپس آ گئے۔ قصارہ نے کہا: ''اب میرا خواب شہادت ہے اپنے وطن کے لیے اور اپنے ایمان کے لیے''۔ وہ ۱۲ اور متوقع جہادیوں کے ساتھ اردن کے تحفظ کو چھوڑ کر جنگ سے تباہ ہو جانے والے ملک عراق واپس آ گیا ہے۔ تمام مشرق وسطی سے ہزاروں عراقی تارکین وطن نے اپنی ملازمتیں اور نسبتاً محفوظ زندگی چھوڑ کر حسین اور اسلام کے لیے ہتھیار اٹھانے کی خاطر تکلیف دہ سفر کیے۔

اردن کے ایک فوجی کرنل کے مطابق پانچ ہزار دوسو (۵۲۰۰) سے زیادہ لوگ

دو ہفتہ کے دوران عراق گئے۔ عراقی سفارت کار اور دوسرے افسران تیزی سے رضا کار بھرتی کر رہے ہیں۔ واپس آنے والوں کے تند جذبات نے گوریلا جنگ کے دائرہ کار کو بڑھا دیا۔ عمان میں متعین ایک مغربی سفارت کار نے کہا کہ کوئی ایک بھی پناہ گیر عراق سے اردن' شام یا ترکی میں داخل نہیں ہوا۔

عراقی جنگ کے خلاف مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی مزاحمت اپنی تمام بربریت کے ساتھ ۲۱/ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو اس وقت نظر آئی جب ایک امریکی فوجی نے جو بغداد کی وزارت تیل کے دروازے پر تعینات تھا ایک خاتون کا بیگ جس میں قرآن پاک کا نسخہ تھا چھین کر کلام پاک نکال کر زمین پر پھینک دیا۔

AFP کی رپورٹ کے مطابق یہ واقعہ یوں ہے:

درجنوں عراقی ملازمین اس وقت مشتعل ہو گئے جب منگل ۲۱ اکتوبر کو ایک فوجی نے قرآن کا ایک نسخہ زمین پر پھینک دیا۔ بے حرمتی کا یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب ایک نقاب پوش عراقی خاتون نے فوجی کو کتے کے سونگھنے کے لیے اپنا بیگ دینے سے انکار کیا کیونکہ اس میں کلام پاک کا نسخہ تھا۔

مشتعل ہجوم غصہ میں چلا رہا تھا ہم ہر صبح مظاہرہ کریں گے جب تک فوجی وزرات کے دروازہ سے ہٹ نہیں جاتے۔ امریکی فوجیوں نے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کی۔

دو ماہ پہلے برطانوی فوج کو گھروں کی تلاشی کا ''آہنی ہاتھ'' والا انداز ترک کرنا پڑا۔ کیونکہ سونگھنے والے کتوں کے استعمال سے مشتعل ہو کر عراقی ہجوم نے چھ برطانوی فوجیوں کو مار ڈالا۔

بغداد میں امریکی اعلیٰ کمان نے برطانوی فوجیوں کے تجربہ سے کچھ سیکھنے کے بجائے اپنی اکڑ میں تلاشی کے لیے کتوں کا استعمال جاری رکھا۔

عام طور پر کتوں کو ایسی چیز سونگھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو دیکھی' سنی اور محسوس نہ کی جا سکیں اور جنھیں کتے ہی سونگھ سکیں کیونکہ ان کی قوت شامہ غیر معمولی طور پر

تیز ہوتی ہے۔

موجودہ معاملہ میں خاتون کے بیگ کی تمام چیزیں دیکھنے کے لیے کھلی تھیں اور قرآن پاک بھی دیکھا جاسکتا تھا' اگر ضروری تھا تو ایک ایک صفحہ کر کے۔اس کے علاوہ کسی خاتون کی یا اس کے سامان کی تلاشی کے لیے کسی خاتون کو مقرر ہونا چاہیے جیسا کہ امریکہ کے ہر ہوائی اڈہ پر ہوتا ہے جب کہ AFP کے بیان سے ظاہر ہے اس خاتون نے عام انسانی تلاشی پر اعتراض نہیں کیا تھا' اس کا اعتراض قرآن پاک پر مشتمل بیگ کو کتے کے سونگھنے پر تھا۔

اس سے بھی زیادہ قابل مذمت یہ بات ہے کہ اتنے سال (مارچ ۲۰۰۶ء) گزر جانے کے باوجود بغداد کی اعلیٰ فوجی کمان یا قطر میں مرکزی کمان یا واشنگٹن میں پینٹا گون نے معذرت تو کجا کوئی قابل ذکر صفائی تک پیش نہیں کی۔

جہاں تک یہ سوال ہے کہ اس فوج نے زمین پر کیا پھینکا تھا قرآن پاک سمیت یا اس کے بغیر بیگ یا صرف کلام پاک کا نسخہ۔AFP کے بیان میں صاف کہا گیا ہے کہ فوجی نے قرآن پاک ہی پھینکا تھا اس لیے فوجی کے لیے کسی قسم کے شک کا فائدہ موجود نہیں ہے کہ جب اس نے بیگ پھینکا تو اسے پتہ نہیں تھا کہ اس میں قرآن پاک ہے۔کیا اس بات کو یہ کہہ کر جھٹک دیا جاسکتا ہے کہ یہ ایک سنکی کا عمل تھا۔

۱۱/ستمبر کے بعد سے قرآن پاک کے خلاف ایک مربوط پروپیگنڈا جاری ہے۔ایک امریکی کالم نگار نے رسمی بیان (on record) میں کہا ہے کہ: ''قرآن جرائم کا منبع ہے'' تمام انٹرنیٹ سائٹ جو مغرب سے شروع ہوتے ہیں قرآن کا مذاق اڑاتے ہیں اس وجہ سے یہ بات ظاہر ہے کہ بے حرمتی کا یہ واقعہ ایک تنہا سانحہ نہیں بلکہ امریکی ذہنوں پر اس قرآن مخالف پروپیگنڈے کی یلغار کا نتیجہ ہے جو دو سالوں سے بھی زیادہ عرصہ سے جاری ہے۔

اِس طرح یہ نظریاتی وسعت اُبھری ہے بلاشبہ کہیں کہیں رجعت کے ساتھ اور یہی عراقی جنگ کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔اس نے اسلامی اتحاد اور یک جہتی کے

ساتھ شوقِ شہادت کی آگ بھڑکا دی ہے۔ عراق میں صرف عراقی نہیں بلکہ مختلف اسلامی ملکوں کے مسلمان قابض فوجوں سے انتہائی مشکل حالات میں عراقی بھائیوں کے شانہ بشانہ لڑ رہے ہیں۔ یہی افغانستان میں بھی ہو رہا ہے۔ مسلم اُمہ اسلامی برادری کے زور اور الوہی مدد اور رہنمائی پر ناقابل شکست ایمان سے لیس آگے بڑھ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عراق میں موجودہ شیعہ سنی تناؤ عراقی تاریخ کا الٹ اور گزر جانے والی چیز ہے۔

جنگِ عراق کی ارضی حکمت عملی کی وسعتیں

عراق کے خلاف ریاستہائے متحدہ امریکہ کے جارحانہ اور غلبہ پر مبنی ارادوں کو سمجھنے کے لیے صدر نکسن کے ایک بیان کی طرف جانا ہوگا۔ کس کا کس چیز پر اختیار ہے یہ سوال خلیج فارس سے متعلق ہے اور پوری دنیا پر کون اختیار رکھتا ہے اس کی کلید مشرق وسطیٰ ہے لیکن خلیج اور مشرق وسطیٰ پر اختیار کے لیے صرف حربی ذرائع نہیں بلکہ نظریاتی ذرائع بھی ضروری ہیں۔ سابق سامراج نے مہذب بنانے کے نام پر دوسری قوموں پر حکومت کا حق جتایا تھا۔ امریکی سامراج جمہوریت لانے کے بہانے دوسری قوموں پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔

عراق پر حملہ کے لیے امریکہ کا پہلے سے ارادہ جو ظاہری طور پر کثیر تباہی کے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے خلاف اور حکومت کی تبدیلی کے لیے تھا اقوام متحدہ کے میثاق کی شق نمبر ۵۱ کے تحت جائز نہیں ہوسکتا تھا جب کہ ساتویں سالانہ رپورٹ ۱۹۵۲ء میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے اس کو ناقابل قبول قرار دیا۔ کیونکہ اقوام متحدہ کے میثاق میں نظریات کے خلاف فوجی طاقت کے استعمال کی اجازت نہیں دی جاسکتی نہ ہی سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے۔ CIA کے سابق ڈائریکٹر جنرل ایڈمرل اسٹین فلڈ نے بوسٹن گلوب جولائی ۲۰۰۲ء میں تبصرہ کرتے ہوئے نشان دہی کی کہ امریکہ کا سترہ سو سے دو ہزار تک کی تعداد میں جوہری ہتھیار رکھنے پر اصرار، اگرچہ روس مزید کم کرنے پر تیار ہے۔ جبکہ کسی اور کے پاس اس تعداد کے قریب کی تعداد میں بھی ہتھیار نہیں ہیں۔

اور پھر مزید یہ اصرار کہ وہ پانچ ہزار ہتھیار تقریباً تیار حالت میں رکھے گا اور اسی وقت یہ دعویٰ کہ اس کا نظریہ پیش بندی' اس کے جوہری اور روایتی حملوں پر بھی نافذ ہوتا ہے خود بہ آواز بلند امریکہ کے جارحانہ اور غلبہ حاصل کرنے کے ارادوں کے بارے میں بتا رہا ہے' وہ مزید کہتا ہے کہ امریکہ قانونی اور اخلاقی طور پر عراق کے خلاف اس قدر سخت قدم نہیں اٹھا سکتا۔

ڈیوڈ کیلی کی سربراہی میں چودہ سو ماہرین پر مشتمل امریکہ کے تعینات کردہ انسپکٹر کثیر تباہی کا کوئی ہتھیار برآمد نہ کر سکے' ایک مقالہ میں واشنگٹن پوسٹ (۱۴ اکتوبر ۲۰۰۳ء) نے تصدیق کی کہ نہ تو کبھی عراق کے پاس کثیر تباہی کے ہتھیار تھے نہ ہی عراق کی سابق حکومت کے پاس جوہری ہتھیار بنانے کے لیے کوئی راہ عمل تھی۔ اس مقالہ میں مزید کہا گیا ہے کہ ہتھیاروں کی تفتیش کرنے والوں کی امریکہ' آسٹریا اور آسٹریلیا میں گفتگو سے ثابت ہوا کہ عراق کے پاس کبھی بھی کثیر تباہی کے ہتھیار نہیں تھے۔

جارج مونی بیوٹ (George Monibiot) نے ۱۶ راگست ۲۰۰۲ء کے گارڈین میں ''استعمال کی منطق'' کے زیر عنوان اپنے مقالہ میں امریکہ کے عراق پر حملہ کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور اس کے حق میں پیش کی گئی ہر دلیل کو ایک ایک کر کے مسترد کر دیا ہے۔

''جناب بش''! مونی بیوٹ کہتا ہے اس وجہ سے کسی قوم پر جنگ مسلط کرنے کی خواہش کہ اس نے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کی ہے نہ صرف ناممکن بات ہے بلکہ لغو ہے کیونکہ ریاستہائے متحدہ کی حکومت نے جتنے بین الاقوامی معاہدوں کو پھاڑ کر پھینکا ہے اور اقوام متحدہ کے جتنے اصولوں سے اغماض برتا ہے ان کی تعداد بقیہ ساری دنیا کے بیس سالوں میں کیے ہوئے ایسے اقدام سے زیادہ ہے' اس نے کیمیائی انسپکٹروں کو اپنی تجربہ گاہوں میں مکمل رسائی نہیں دی' اس نے ایک دفعہ پھر CIA کو دوسرے ممالک کے سربراہوں کو قتل کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس نے بیلسٹک میزائل کے خلاف معاہدے کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اس نے عالمی عدالت برائے جرائم کو درخور اعتنا

نہیں سمجھا' موسمیاتی تبدیلیوں کے لیے نظم پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور تشدد کے خلاف اقوام متحدہ کے اصولوں کو غیر متحرک کرنے کی کوشش کی تا کہ اپنے گوانتا ناموبے کے قید خانوں کو غیر ملکی مبصروں کی پہنچ سے دور رکھ سکے۔ بغیر سیکیورٹی کونسل سے اختیار حاصل کیے اس کی عراق پر حملہ کی تیاری صدام حسین کی طرف سے اقوام متحدہ کے ہتھیار انسپکٹروں سے مکمل تعاون نہ کرنے سے کہیں شدید قسم کی خلاف ورزی تھی جو اس نے عالمی قانون کے خلاف کی۔

ہفتہ (۳ راگست ۲۰۰۲ء) کو جان بولٹن، وہ افسر جس کی ذمہ داری اسلحہ پر حدود قائم رکھنا ہے نے کہا ہماری پالیسی ۔۔۔کا اصرار ہے کہ عراق میں حکومت تبدیل کی جائے اور انسپکٹر جائیں یا نہ جائیں یہ پالیسی تبدیل نہیں کی جائے گی۔ عراق پر حملہ کے لیے ریاستہائے متحدہ میدان تبدیل کرتا رہے۔ اس وقت تک یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ عراق پر حملہ کا فیصلہ پہلے ہوا اور جواز کا فیصلہ بعد میں۔ مونی بیوٹ کہتا ہے: ''امریکی حکومت کے پاس جنگ شروع کرنے کے لیے کئی فوری داخلی وجوہات تھیں، مثلاً یہ تاثر ڈالنے کے لیے کہ دہشت کے خلاف علم بردار جنگ ہر کہیں جاری ہے۔ آنے والے انتخابات میں ووٹوں کا حصول' مالی بدعنوانیاں جن میں صدر اور نائب صدر دونوں ماخوذ تھے''۔

بوسٹن گلوب کے اسٹاف رپورٹر، رابرٹ شیلزنگر کے مطابق انتظامیہ کو غیر ملکی اتحادیوں اور کئی سیاستدانوں اور ملکی پالیسی سازوں کی طرف سے کھلی تنقید کا سامنا تھا ٹیکساس کے ریپبلکن جن میں کانگریس کے اکثریتی قائد ڈک آرمے شامل تھے صدر بش سے الگ ہو گئے اور وہ شکایت کر رہے تھے کہ ریاستہائے متحدہ کو بلا اشتعال عراق پر حملہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

Senate Arms Services Committee کے ڈیموکریٹ صدر کارل لیویا بھی آرمے اور دوسروں کے ساتھ شریک ہو گئے جو عراق پر حملہ کی مخالفت کر رہے تھے۔ انھوں نے ABC کے Meet The Press پروگرام میں کہا کہ صدام حسین

امریکہ کے لیے کوئی بڑا خطرہ نہ تھا' صدر بش کے عراق پر حملہ کے منصوبہ کو دنیا میں کہیں
بھی زیادہ پذیرائی نہیں ملی اور اس پر سخت تنقید ہو رہی تھی باوجود اس کے کہ بش نے کہا تھا
کہ جو ان کے ساتھ نہیں ہے وہ دہشت گردوں کا ساتھی ہے۔

پولاک نے کہا (Foreign affairs July-Aug 2003) کہ عراق کے
معاملہ میں پیش بند حملہ قابل غور اور آخر کار قابل عمل اس لیے ہوا کہ ریاستہائے متحدہ
ایک ملک پر بغیر بھاری تحریک کے حملہ اور قبضہ کر سکتا تھا لیکن اس کے لیے ایران پر حملہ
کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ اس کی آبادی تین گنا، زمین کا رقبہ چار گنا' ارضی جغرافیہ کہیں مشکل
ہے۔ فوجی حملہ امریکی کو کہیں بڑی دلدل میں پھنسا دیتا جس سے نکلنا ناممکن ہوتا' اس
سے بھی اہم بات یہ ہے کہ امریکہ اصلاح پسندوں اور اسلامیوں کے درمیان بڑھتی ہوئی
خلیج کو دیکھ رہا تھا' ایران پر امریکی حملہ کی صورت میں اصلاح پسندوں کی حیثیت کمزور ہو
جاتی جو کہ ہوئی، بلکہ وہ جیسا کہ بعد میں ہوئے مشکوک ہو جاتے۔ اس وقت امریکہ
شدت پسند اسلامیوں کے خلاف داخلی بغاوت کروانے کی پالیسی سے مطمئن تھا..... جو
علماء کے زوال اور اسلامی انقلاب کے ڈھے جانے پر منتج ہو۔ کیونکہ امریکی فضیلت کو
سب سے بڑا چیلنج صرف مشرق وسطیٰ میں نہیں بلکہ پوری اسلامی دنیا کی طرف سے
ہے۔ عراق اپنی جائے وقوع کے لحاظ سے مشرق وسطیٰ سے جُڑا ہوا ہے اور ساتھ ہی وسط
ایشیا، مشرقی افغانستان جنوبی ایشیاء سے قریب ہونے کی وجہ سے امریکہ کے لیے خلیج
فارس تک رسائی کی کلید کی حیثیت رکھتا ہے' اگر اس کے لیے وہ راستہ جو اسے اب تک
سعودی عرب کی طرف سے حاصل ہے ناقابل رسائی ہو جائے۔ اس سہولت کا جاری
رہنا سعودی عرب میں موجود شدت پسندوں کی مشتعل حالت کی وجہ سے مشکل نظر آتا
ہے۔ دنیا کے دوسرے کلیدی علاقوں میں بھی اثر قائم رکھنے کی صلاحیت میں کمی ہوگی۔

بہترین امریکی مفاد میں یہ بھی ضروری ہے کہ عراق میں سیاسی اور معاشی تقسیم
امریکہ کے حق میں ہے۔ اس مخمصہ کی وجہ سے مثلاً اب عراق جو ایران کے خلاف توازن
پیدا کرنے اور اسے محدود رکھنے کے قابل ہو' آخر کار کویت اور سعودی عرب پر حاوی

ہونے کے قابل بھی ہو گا۔ جہاں تک ایران کا تعلق ہے امریکی خفیہ معلومات او
IAEA کے بھی قریب ترین اندازے کے مطابق اس کا جوہری پروگرام تیزی سے چل
رہا ہے اور اگر باہر سے اور اندر سے روکا نہ گیا یا وہ خود مادہ کی ترقی روکنے اور IAEA ک
خصوصی جانچ کے لیے راضی نہ ہو گیا' جیسا کہ بعد میں ایران نے کہا تو پانچ سالوں کے
اندر ایک یا زیادہ ہتھیار تباہ کر سکتا ہے' اس لیے سوال اٹھتا ہے کہ امریکہ نے ایران کے
بجائے عراق پر کیوں حملہ کیا؟ وجوہات ڈھونڈنے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں
مندرجہ بالا وجوہات کے ساتھ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ کسی مخالف ریاست کو اس علاق
میں اختیار حاصل کرنے نہ دیا جائے' نہ اس کے وسائل پر اور خود اختیار استعمال کر کے
وسیع طاقت اکٹھی کر کے مغربی دنیا کو بلیک میل کیا جائے۔ سعودی عرب میں اسلا
شدت پسندں کے میانہ رو لوگوں اور شاہی خاندان کے خلاف زرو پکڑنے اور موجو
بادشاہت کا تختہ الٹ کر امریکہ مخالف اسلامی ریاست قائم کرنے کے خطرہ کی موجودگ
میں امریکہ متبادل فوجی حکمت عملی پر کام کر رہا تھا۔ مثلاً یا تو سعودی عرب پر حملہ کر د
اس کے تیل اور دیگر وسائل پر قابض ہو جائے اور ایک امریکہ حامی حکومت قائم کرے
اپنے مفادات اور دلچسپیاں ہٹا لے جائے۔ سعودی عرب سے دور عراق کی طرف جس
کے پاس دنیا کے تیل کا دوسرا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور صدام حکومت کا امریکہ کے
ایک ہلکے سے حملہ سے گر جانا ممکن ہے جس کے بعد عراقی عوام جارح امریکی افواج ک
خوش آمدید کہیں گے اور ایک امریکہ حمایتی حکومت کے زیر نگرانی امریکی مفادات کے
لیے کام کرتے رہیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ عراقی جنگ کے بعد ان اندازوں میں
سے زیادہ تر غلط نکلے لیکن امریکہ کے لیے عراقی تعطل سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں اسے ہ
صورت عراق میں امریکہ کا حمایتی نظام بنانا ہے کسی قیمت پر بھی۔

اس وجہ سے عراق کی جغرافیائی سیاسی اہمیت کے پیش نظر اس کے مفاد کے لیے
اہم ترین کام یہ ہے کہ عراق میں قدم جما کر خلیج میں ایک مستحکم فوجی موجودگی قائم رکھے۔
Foreign Affairs کے مارچ اپریل ۲۰۰۳ء کے شمارہ کے مطابق دنیا میں تیل ک

پیداوار کا اندازاً ۲۵فی صد خلیج فارس سے آتا ہے جبکہ سعودی عرب اکیلا ۱۵فی صد پیدا کرتا ہے امریکہ کا غیر ملکی تیل پر انحصار ۲۰۱۰ء تک ستر فی صد تک بڑھ جائے گا اور مزید بڑھتا ہی رہے گا' خلیج فارس کے پاس دنیا میں تیل ذخیرہ کا دوتہائی حصہ موجود ہے اورمزید برآں اس کے تیل کو نکالنے کا عمل مضحکہ خیز حدتک کم خرچ ہے۔ سعودی عرب سے ایک بیرل تیل کی قیمت روس کے مقابلہ میں پانچواں یا دسواں حصہ ہوتی ہے۔ سعودی عرب فقط دنیا کا سب سے بڑا تیل پیدا کرنے والا اور دنیا میں تیل کے سب سے بڑے ذخیرہ کا مالک ہی نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر سعودی عرب کے پاس دنیا بھر میں فالتو پیداواری اہلیت کا بیشتر حصہ موجود ہے جس کو وہ پیداوار گھٹا بڑھا کہ قیمتوں کو مستحکم اور قابو میں رکھنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

اس لیے یہ حقیقت کہ امریکہ اپنا زیادہ تر تیل خلیج فارس سے حاصل نہیں کرتا (امریکہ اپنی ضروریات کا صرف بیس فی صد تیل خلیج سے درآمد کرتا ہے) کسی صورت سعودی عرب کی پیداوار کی اہمیت کو کم نہیں کرسکتی جو اگر ختم یا بے حد کم ہو جائے تو قیمتیں آسمان پر پہنچ کر امریکی معیشت کو تباہ کر دیں گی۔

تیل کی پیداوار اور اس کی موجودہ صورت حال میں امریکہ کو اس بات کی بے حد فکر تھی کہ خلیج فارس سے تیل کی رسد قائم رہے' The Foreign Affairs (جولائی اگست ۲۰۰۳ء) نے اپنے ایک مقالہ میں دنیا میں تیل کے ذرائع اور اس امریکہ تیل کی پیداوار' تقسیم اور قیمتوں کے طریق کار سے متعلق امریکی مفادات کی حفاظت کس طرح ہوسکتی ہے ایک سروے شائع کیا ہے۔

۱۹۶۸ء میں جب برطانیہ نے سویز کے مشرق سے اپنی حفاظتی ذمہ داری سے ہاتھ اٹھایا تو خلیج فارس کے حکمت عملی کے لحاظ سے اہم ترین علاقہ میں امن وتحفظ کا بوجھ ریاستہائے متحدہ کو منتقل ہوگیا۔ امریکہ نے یہ بوجھ مختلف طریقوں سے اٹھایا' ابتدا میں اس نے ''جڑواں ستونوں'' سعودی عرب اور ایران کی امریکی خارجہ پالیسی کے لیے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں دھرے کی کیل (Lynch pin) والی اہمیت دیے رکھی' ایران میں

اسلامی انقلاب کے بعد علاقہ کی بدلی ہوئی سیاسی اور نظریاتی تبدیلیوں کے جواب میں ریاستہائے متحدہ نے اپنی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کرتے ہوئے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ایران کی جگہ عراق کو دے دی۔ علاقہ کی صورت حال ایک دفعہ پھر بدلی جب عراق نے کویت پر حملہ کر کے قبضہ کرلیا اور امریکہ کے لیے لازمی ہوگیا کہ عراق اور ایران دونوں کو محدود کرنے کے لیے پابند کرے۔ یہ ۱۹۹۰ء کی دہائی تھی۔

اس علاقہ میں ریاستہائے متحدہ کا ارضی سیاسی مفاد یہ تھا کہ تیل کی فراواں اور نسبتاً سستی رسد کا سلسلہ جاری رہے جس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ پچھلے پچاس سالوں میں عالمگیر معیشت تیل کی سستی' فراواں اور مسلسل رسد کی بنیاد پر قائم تھی۔ اور اگر یہ رسد کی وجہ سے منتشر ہوتی تو پوری عالمگیر معیشت ڈھے جاتی۔

امریکہ کے محکمہ توانائی نے جنوری ۲۰۰۳ء کے شروع میں اعلان کیا کہ ۲۰۰۵ء تک امریکہ کی تیل کی درآمدات ملکی ضرورتوں کا ۷۰ فی صد ہو جائیں گی جو دو سال پہلے تک ۵۵ فی صد تھیں۔ World Watch Institute کے مائیکل رینر (Michael Rener) نے مزید تاریک اور گھناؤنی تصویر کشی کی کہ امریکہ کے تیل کے ذخائر تیزی سے خالی ہورہے ہیں اور کئی دوسرے غیر اوپیک تیل کے میدان اب خشک ہونے لگے ہیں۔ تقریباً ۷۰ فی صد ثابت شدہ تیل کے وسائل مشرق وسطیٰ میں ہیں۔ موجودہ پیداواری رفتار کے ساتھ امریکہ کے تیل کے ذخیرے کتنے سال چل سکیں گے اس کے بارے میں جرمی رفکن کے امریکہ میں ہائیڈروجن کی معیشت کے اندازہ کے مطابق یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ٦٦ (چھیاسٹھ) فی صد سے زیادہ نکالے جانے کے قابل تیل استعمال ہو چکا ہے اور بقیہ خیال ہے کہ دس مزید سال چل سکے گا! دوسرے ملکوں کے لیے ممکنہ تناسب یوں ہے: کینیڈا ۱:۸، ایران ۱:۵۳ سعودی عرب ۱:۵۵، متحدہ عرب امارات ۱:۷۵ کویت ۱:۱۱٦ لیکن عراق میں یہ تناسب ۱:۵۲٦ ہے۔

۱۹۹۷ء میں کلنٹن انتظامیہ کے دوران رمزفیلڈ' ڈک چینی اور چند دوسرے دائیں بازو والوں نے جو تیل کے کاروبار میں سب سے زیادہ ملوث تھے نئی امریکی صدی

کا منصوبہ تیار کیا۔ ایک گروپ نے عراق میں حکومت کی تبدیلی کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۹۸ء میں صدر کلنٹن کے نام ایک خط میں انھوں نے صدام حسین کو اقتدار سے ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ اس وقت کے ایوان نمائندگان کے اسپیکر نیوٹ گینگرچ کے نام ایک خط میں انھوں نے لکھا ہمیں اس علاقہ میں مضبوط امریکی موجودگی قائم کرنی چاہیے اور طاقت کے استعمال کے لیے تیار رہنا چاہیے (رابرٹ فسک، انڈیپنڈنٹ ۱۸ جنوری ۲۰۰۳ء)

عراق میں تیل کا ثابت شدہ ذخیرہ ۱۱۲ ملین بیرل ہے جس کے نئے ذخائر کے پیداوار شروع کرنے کے بعد یہ مقدار ۲۲۰ ملین ڈالر تک پہنچ جانے کی امید ہے۔ فی الحال ملک کے دریافت شدہ تیل کے میدانوں میں سے صرف پندرہ فی صد پیداوار مہیا کر رہے ہیں۔ اس لیے عراق نے ۲۰۰۱ء میں نئے میدانوں کی ترقی کا بڑا پروگرام شروع کیا۔ عراقی حکومت نے تیل کی صنعت کے لیے نئے فاضل پرزے اور سامان خریدنے کے لیے اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری شروع کی لیکن اقوام متحدہ کی زیر نگرانی خریدے ہوئے سامان میں سے ۲/۵ بیکار پڑا تھا۔ کیونکہ یا تو عراق کے پاس ضروری پرزے نہیں تھے یا وہ رُوس، فرانس اور برطانیہ کی تیل کی صنعت کی ترقی کے لیے ادائیگی نہ کر سکا تھا۔ یہ بات دیکھنا ضروری تھا کہ اندازاً ۳۶ ملین بیرل کے ذخیرے کا ٹھیکہ فرانس اور روس کو جبکہ صرف ۳:۰ بلین کا ٹھیکہ برطانیہ کو ملا تھا۔ تعجب نہیں اگر فرانس اور روس عراق میں سیکیورٹی کونسل کی طرف سے اختیار کے بغیر کارروائی کے مخالف تھے جبکہ برطانیہ عراق میں فوجی کارروائی کے لیے ریاستہائے متحدہ کا ساتھ دے رہا تھا، ان ٹھیکوں کا کیا ہوتا تھا جن پر صدام حکومت دستخط کر چکی تھی، اب جبکہ امریکی قبضہ کی حکومت ہے ہیلی برٹن، بیکٹل، امریکہ کی عظیم الشان کمپنیاں ٹھیکوں کے لیے زور لگا رہی ہیں۔

George Monibiot نے گارڈین نیوز سروس (ڈان ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۳ء میں شائع شدہ اپنے مضمون میں تیل کی عالمگیر قلت سے توانائی کے بحران کے ساتھ، توانائی کے متبادل ذرائع بنانے کے اخراجات میں کمی پر توجہ دی ہے جس سے عالمگیر کساد بازاری پیدا ہو سکتی ہے۔

اس مضمون کی خاص باتیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۹۶۰ء میں نئے ذرائع کی دریافت عروج پر پہنچ گئی۔ پٹرولیم کے ماہر ارضیات کولن کومب بیک کا اندازہ ہے کہ عالمی کشید ۲۰۱۰ء سے پہلے سب سے زیادہ ہوگی۔ آج ہم ۶ ۷ ملین بیرل جلاتے ہیں ۲۰۲۰ء تک ہم ۱۱۲ ملین بیرل روزانہ استعمال کر رہے ہوں گے جس کے بعد مانگ مزید بڑھے گی اگر رسد بڑھتی ہے اور مانگ بڑھ جاتی ہے تو بہت جلد ایک ایسے معاشی بحران کا سامنا کر رہے ہوں گے جس کی نظیر ترقی یافتہ صنعتی معیشتوں میں ڈھونڈی نہیں جاسکتی۔ رسد کی کمی اور مانگ بڑھنے کی وجہ سے قیمتیں آسمان تک پہنچ جائیں گی۔ جیسے جیسے قیمتیں بڑھیں گی وہ تمام ادارے جو خام تیل پر مکمل انحصار کرتے ہیں خاص طور پر نقل وحمل اور زراعت سکڑنے پر مجبور ہوں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہماری زندگیاں تیل کی معیشت سے جڑی ہوئی ہیں۔ ہمارے پھیلے ہوئے مضافات گاڑیوں کے بغیر ناقابل رسائی ہو جائیں گے۔ تیل کی مہنگائی' غذائی اشیا کی مہنگائی ہے اور اس کا نتیجہ بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے بھوک ہوگا۔ تیل کی قیمتوں اور بیروزگاری کے درمیان ربط ان مسئلوں کو ہوا دے گا۔ امریکہ یں کساد بازاری کے پچھلے پانچ ادوار کا سرا اسرائیل کی مہنگائی سے ہی ملتا ہے۔

تیل کو Tar sand اور Oil shale (قیر) سے کشید کیا جاسکتا ہے لیکن زیادہ تر صورتوں میں اس عمل میں جتنی توانائی پیدا ہوتی ہے اتنی ہی استعمال ہو جاتی ہے جبکہ ساتھ ساتھ زہریلے فضلہ کے پہاڑ اور جھلیں پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ قدرتی گیس بہتر متبادل ہے لیکن تیل سے گیس کے تحرک کی تبدیلی کے لیے ایک مہنگا نیا ایندھن کا نظام لازمی ہوگا۔ گیس کے موجودہ رفتار سے استعمال سے دنیا کے پاس تقریباً ۵۰ سال کے لیے تیل ہے لیکن اگر تیل کی جگہ گیس لے لے گی تو بہت جلدی ختم ہو جائے گی۔ گاڑیاں ہائیڈروجن کی طاقت سے چلنے والے ایندھن کے خلیوں سے چلائی جاسکتی ہیں جو پانی کی Electrolysis سے بنتا ہے۔ لیکن جو بجلی ہائیڈروجن پیدا کرتی ہے الگ سے پیدا کرنی پڑے گی' تمام کاروں کے ٹینک بھرنے کے لیے امریکہ کو قدرتی Grid کی

صلاحیت سے چار گنا زیادہ صلاحیت کی ضرورت ہوگی۔ کوئلہ جلانا گندگی پھیلاتا ہے اور جوہری توانائی مہنگی اور مہلک ہے۔

گاڑیوں کو ہوا یا شمسی توانائی سے چلانے کے لیے جتنے خرچ کی ضرورت ہوگی اتنا کسی تہذیب نے کبھی نہیں کیا ہے۔ نئے معاملات سے پتہ چلتا ہے کہ ٹپکنے والا بائیڈروجن اوزون (Ozone) کی تہہ کو نقصان پہنچا کر عالمی درجہ حرارت میں اضافہ کرنے کا باعث ہوگا۔

فصلوں کو ڈیزل یا مینتھول میں تبدیل کرنا قابل عمل ہے لیکن اس کا مطلب ایندھن کے لیے اراضی کا استعمال ہے جو اَب غذائی اشیاء اگاتی ہے۔ سرسری حساب کے مطابق برطانیہ کی تمام گاڑیوں Rapeseed کے تیل پر چلانے کے لیے جو زرعی اراضی کا رقبہ چاہیے ہوگا وہ انگلستان کے رقبہ کے برابر ہوگا۔ ایک ممکن حل۔ برطانوی اور آسٹریلوی حکومتیں زیرزمین کوئلہ کو گیس میں تبدیل کرنے کے تجربے کر رہی ہیں' اس کا مطلب ہے کہ کوئی ٹریلین ٹن کاربن مہیا ہو جائے گا جس کے ممکنہ نتیجہ کے طور پر عالمگیر درجہ حرارت میں اضافہ کے باعث روئے زمین پر زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم مصیبت میں مبتلا ہیں۔ یا تو ہم ہر طرح کے قدرتی ایندھن پر ہاتھ ڈالیں جس سے کرۂ ارض جل کر خاکستر ہو جائے گا اور تہذیب تباہ ہو جائے گی۔ یا ایندھن ختم ہو جائے گا اور ساتھ ہی تہذیب بھی۔ اس طرح مغربی صنعتی تہذیب کو توانائی کے بحران سے شدید قسم کا خطرہ ہے' ہاں اگر یہ اپنی معیشت کی تشکیل نو کریں اور طرز زندگی بھی بدلیں کیونکہ یہ بحران غلط کار سامراجی مہمات اور اعلیٰ ٹیکنالوجی کی جادوگری سے حل ہونے والا نہیں' یہ بحران نہ صرف صنعتی تہذیب کو خطرہ میں ڈال دے گا بلکہ انسانی ترقی کو بھی' اگر ہم نے اپنے مطمح نظر میں انقلابی تبدیلیاں نہ کیں اور طرز زندگی کو تبدیل نہ کیا۔

ریاستہائے متحدہ نے عراق پر حملہ کر دیا جس کے پاس وسیع تباہی کے ہتھیار نہ تھے لیکن کوریا پر حملہ نہ کیا جو اعلان کر کے جوہری پروگرام پر عمل کر رہا تھا کیونکہ عراق کے

پاس اس کی ضرورت کا تیل تھا۔ تیل کے عہد کے خاتمہ اورحرارت میں عالمگیر اضافہ سے نمٹنے کا واحد عقلی طریقہ اپنے شہروں، زراعت اور زندگی کو پھر سے ترتیب دینا ہے ورنہ تیل کی جنگ آخر کار نظریاتی بنیادوں پر لڑنی پڑے گی۔

آخر مشرق وسطیٰ کے تیل پیدا کرنے والے تمام ملکوں میں سے امریکی تسلط کے لیے عراق ہی کو کیوں نشانہ بنایا گیا؟ اس سوال کا جواب عراق کے محل وقوع اور تیل کے بڑے ذخائر میں ہے۔

نیویارک ٹائمز میں اپریل ۲۰۰۳ء کی رپورٹ کہ امریکہ کم از کم چار اڈے لمبے عرصہ کے لیے قائم کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے اور اس بات کی سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ کی طرف سے تردید کہ عراق میں اڈے قائم کرنے کا کوئی منصوبہ زیر غور نہیں ہے، کے بعد یورپ اور ایشیا میں امریکی افواج کی دوبارہ تعیناتی کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ جدید ترین اخباری بیانات کے مطابق عراق میں چودہ (۱۴) فوجی اڈے بے حد سرعت کے ساتھ زیر تعمیر ہیں۔

جم لوب نے (ڈان ۳۰/ نومبر ۲۰۰۴ء) امریکہ کی بدلتی ہوئی فوجی حکمت عملی نمایاں کرتے ہوئے اسے ایک ایسا امر مسلمہ قرار دیا ہے کہ ان تبدیلیوں سے فوجوں کی سریع حربی صلاحیتوں میں اضافہ ہوگا اور وہ تیزی سے زیادہ تباہ کن اور پیش بند حملے بھی اس تمام غیر مستحکم علاقہ میں کر سکیں گے جو خلیج گنی سے خلیج فارس اور وسط ایشیا کے اندر تک ہے اور وہ تمام اہم مقامات جو روس اور ایشیا کو روکنے کے لیے اہم ہیں۔ قفقاز سے مشرقی ایشیا اور مغربی بحرالکاہل تک۔ ایک دوسرے مضمون میں (ڈان، ۲۰ مئی ۲۰۰۴ء جم لوب نے عراق کی جنگ شروع کرنے کی تزویری ضرورتوں اور فوجی اڈے قائم کرنے کی ضرورتوں کو نمایاں کیا ہے۔ مثلاً مشرق وسطیٰ میں طاقت کے توازن کو فیصلہ کن طور پر اسرائیل کے حق میں جھکانا تاکہ وہ امن کے لیے اپنی شرائط فلسطین' شام اور تمام ایسے دوسروں پر مسلط کر سکے جو امریکہ کے علاقائی تسلط کے خلاف یا اسرائیل کے قانونی جواز اور علاقوں پر دعووں کے خلاف مزاحمت کرتے رہے ہیں' نمایاں کیا ہے۔ امریکہ

کسی بھی ممکنہ مقابل قوت کو یہ بھی بتانا چاہتا ہے کہ وہ خلیج فارس میں ان کی توانائی کی رسد کو درہم برہم کرنے کے لیے فوجی مداخلت کر سکتا ہے اور کرے گا تا کہ انھیں یاد رہے کہ امریکہ کی دوستی ان کے لیے لازمی ہے۔ یہ تزویری مقاصد عراق کو فوجی طور پر زیر نگیں لا کر نہیں بلکہ اسے اگر جمہوری مسلمان ملک نہیں تو کم از کم مغرب کا حامی بنا کر پورے ہو سکتے ہیں۔ اس طرح عراق میں مستقل اڈوں کا قیام ایک بڑے عالمگیر سلسلہ کا حصہ بخوبی بن سکتا ہے جس میں دوسرے پہلے سے موجود فوجی انتظامات شامل ہیں جو مشرقی اور وسطی ایشیاء عرب اور قفقاز سے ہوتے ہوئے بحیرہ روم سے گزر کر مغربی افریقہ تک تمام اسلامی دنیا کو ریاستہائے متحدہ کے شکنجے میں جکڑ دیں۔ America Enterprise Institute کے ایک فوجی ماہر Donnelly نے جن کا پینٹاگون کے منصوبہ سازوں سے قریبی تعلق ہے رجعت پسند جریدہ Weekly Standard میں ایک مضمون لکھا جس میں رمزفیلڈ کی اس بات پر کھنچائی کی کہ انھوں نے اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ عراق کے اڈے واشنگٹن کے فوجی انداز میں تبدیلی کے عین مطابق ہیں۔ عراقی ہوائی اڈے تمام علاقوں میں فوجوں کی نقل و حمل کے لیے موزوں ترین ہیں۔ فتح عراق تاریخ میں کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوگا۔ John Friedman نے لکھا یہ مشرق وسطیٰ میں ایک نئی سامراجی طاقت کے تعارف کی نمائندگی اور اس کی بنیاد پر علاقہ کی ارضی سیاسیات کی نئی تعریف کرے گی۔ عراق میں اڈوں کی تعمیر رجعت پسندوں کی پرانی دلیل کے مطابق ہے جو وہ مشرق وسطیٰ کا نیا چہرہ بنانے کے لیے عراق پر حملہ کے حق میں دیتے ہیں تا کہ واشنگٹن کے عالمگیر فوجی انداز کو تبدیل اور وسیع کیا جائے۔ جو تزویری (Strategic) وسائل پر اس کے تسلط کی کلید ہے صرف تیل تک رسائی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اس لیے کہ مشرق وسطیٰ کا نیا چہرہ بنانے کے لیے امریکی عزم اس علاقہ میں امریکہ کا بنیادی مقصد رہا ہے جو اسی صورت میں ممکن ہے جب امریکہ اس قابل ہو کہ اسلام کی تشکیل نو اور تعریف نو کر سکے جو امریکی اقدار اور مفادات کے مماثل ہوں۔ اسلام پر اب نظریاتی حملہ مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کے تعارف کے پردہ میں کیا جارہا

ہے۔

عراق میں بعد از جنگ لوٹ مار اور غارت گری

عراق جو امریکی حملہ سے پہلے تہذیب کا گہوارہ تھا امریکی فوجیں داخل ہوتے ہی لوٹ مار اور تشدد کی دیگ میں کیسے تبدیل ہو گیا' یہ وہ سوال ہے جو جواب کا مطالبہ کر رہا ہے' اگر پہلے سے یہ یقین دہانی نہ ہوتی کہ امریکی فوجیں مداخلت نہیں کریں گی تو لٹیروں کو ہرگز یہ ہمت نہ ہوتی کہ یہ انتہائی نقصان دہ مہم قابضوں کی عین ناک کے نیچے جاری رکھتے۔

امریکی سیکرٹری خارجہ نے امریکی فوجوں کے دفاع کی خاطر لوٹ اور غارت گری کا الزام ان سینکڑوں اور ہزاروں مجرموں پر لگایا جن کو مبینہ طور پر صدام حسین نے جنگ سے فوراً پہلے رہا کیا تھا اور غارت گری کرنے کے لیے رقوم ادا کی تھیں۔

یہ دفاع مضحکہ خیزی کے سوا کچھ نہیں۔ جیسا کہ رابرٹ فسک نے ایک انٹرویو میں بجا طور پر نشان دہی کی کہ اگر یہ بات ہوتی تو وہ جرائم پیشہ صدام کا تختہ الٹائے جانے کے بعد پیسے جیب میں رکھ کر خوشی خوشی بیٹھ جاتے۔ مزید برآں اگر صدام نے ان لیٹروں کو تعینات کیا تھا تو امریکی افواج کے لیے زیادہ ضروری تھا کہ سخت کارروائی کر کے انھیں مثال عبرت بنا دیتیں۔

بہرحال جب دوحہ میں مرکزی فوجی کمان سے لوٹ اور غارت گری کی حقیقتوں کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے فوراً اس کی ذمہ داریوں کو جھٹک دیا کیونکہ اس کے مطابق یہ امریکی فوج کی ذمہ داری نہیں تھی کہ عراق میں پولیس کا کام کرے۔ مرکزی کمان نے جو دلیل دی اس کی کوئی بنیاد نہیں کیونکہ امریکی افواج نے کئی جگہ نہتے شہریوں پر جو امریکی تسلط کی موجودگی کے خلاف احتجاج کر رہے تھے بے رحمی سے کارروائی کی اور درجنوں اور بیسیوں کو گولی مار دی اور ان کے گھروں تک ان کا پیچھا کیا اور خواتین کی بے حرمتی کی۔

جنیوا کنونشن کے مطابق قابض طاقت کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ علاقہ میں امن وامان قائم رکھے۔صدر بش نے شاید قابض قوت کی حیثیت سے ذمہ داریوں سے دامن چھڑانے کے لیے یکم مئی کو جنگی کارروائی کے خاتمہ کا دن قرار دے دیا۔لیکن ۱/۹ اپریل سے پہلی مئی تک کو کیا کہیں گے جب بغداد کا سقوط ہو چکا تھا اور فتح کے نشان کے طور پر صدام کا مجسمہ گرایا گیا تھا۔ جب عراقی فوجوں کا اختیار اور کمان بالکل ختم ہو چکی تھی۔ اور دونوں فوجوں کے درمیان تمام باقاعدہ لڑائیاں اختتام پذیر ہو چکی تھیں۔ پورا عراق سقوط بغداد کے چند دنوں بعد مکمل فوجی اختیار میں تھا اور امریکی فوج نے پورے ملک پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔ امریکی فوج بغیر کسی شبہ کے عراق پر پُوری طرح قابض تھی۔ اور جنیوا کنونشن کے مطابق تمام ذمہ داریاں قابض حاکم قوت کی تھیں یعنی امریکی اتحاد کی۔

مندرجہ ذیل واقعات اس بات کی گواہی خود دیتے ہیں کہ ساری لوٹ مار اور غارت گری سے نہ صرف چشم پوشی کی گئی بلکہ ہمت افزائی اور آسانیاں بھی مہیا کی گئیں۔

دوسری خلیجی جنگ سے پہلے پہلی خلیجی جنگ کے دوران بھی محدود پیمانہ پر ایسی لوٹ مار ہوئی تھی۔ اور اگرچہ Reconstruction of Human Sectors (ORAH) نے پینٹا گون کو شہر میں سولہ (16) اہم مقامات کی فہرست بھیج دی تھی جس میں قومی عجائب گھر (میوزیم) دوسرے نمبر پر تھا۔ پھر بھی عجائب خانہ نہ صرف لوٹا گیا بلکہ توڑ پھوڑ بھی کی گئی۔ اس غارت گری پر ۱۶ اپریل ۲۰۰۳ء کے نیویارک ٹائمز نے ایک تحریر میں رپورٹ دی۔ کسی قسم کے تحفظ کی غیر موجودگی میں لٹیروں نے عجائب گھر کو اور ۲۸ گیلریوں میں رکھے ہوئے سامان اور تجوریوں کو سخت نقصان پہنچایا جس میں تقریباً پچیس ہزار بے بدل صناعی کے نمونوں کی لوٹ مار اور میوزیم کے ریکارڈ کو آگ لگانا شامل ہے۔

اس انتہا کی لوٹ کی مثال کے لیے صدیوں پہلے ۱۲۵۸ء میں منگولوں کے بغداد پر حملہ تک جانا پڑے گا۔ برطانوی دانشوروں نے بہت پہلے دسمبر ۲۰۰۲ء میں وزیراعظم

ٹونی بلیئر کو عراق میں عجائب گھر کو لوٹ مار اور توڑ پھوڑ سے بچانے کی فوری ضرورت کے بارے میں لکھا تھا۔ دانشوروں کو ۱۹۹۱ء کی جنگ خلیج کے بعد کی مثال کی وجہ سے پریشانی تھی جب حکومت کے تیرہ (۱۳) مقامی عجائب گھر تہہ و بالا ہو گئے تھے اور ان کے خزانے فنون کے عالمی بازار میں فروخت کر دیے گئے تھے۔

BBC کے جوناتھن ڈفی نے ناصریہ سے لکھا جیسے ہی صدام کی فوج جنوبی شہر ناصریہ سے بھاگی اور امریکی فوجیں داخل ہوئیں لٹیروں نے ناصریہ کے اعلیٰ تعلیم کے کالج کو لوٹ کر خالی کر دیا۔ لوٹ کے بعد صرف ڈھانچہ باقی رہ گیا۔ تجربہ گاہیں اور جماعتوں کے کمرے اپنے وجود کا جلا ہوا سایہ رہ گئے تھے۔ جوناتھن کے مطابق جب کالج کی انتظامیہ نے پہرہ دینے والے امریکی فوجیوں سے مدد مانگی تو نہ صرف انھوں نے انکار کر دیا بلکہ کچھ عینی گواہوں نے الزام لگایا کہ فوجیوں نے احاطہ میں گھسنے کے لیے لٹیروں کی ہمت افزائی کی۔ جب ایک علاقائی صحت کے لیکچرار ڈاکٹر مجید نے جو اس وقت وہیں تھے ایک امریکی چیک پوسٹ سے مدد مانگی جو سائنس کالج کے سربراہ تھے تو انھوں نے کہا کہ وہ مدد نہیں کر سکتے ان کا کام صرف چیک پوسٹ پر ہے۔ اس عرصہ میں مجید صاحب نے ایک مقامی فائر اسٹیشن کے پاس تعینات امریکیوں سے کہا وہ پانچ گاڑیوں میں آئے لیکن لٹیروں کو بھگانے سے انکار کر دیا اور اس کے بجائے کالج کی جنوبی دیوار پر کئی راونڈ فائر کر دیے۔ ''یہ حملہ لٹیروں کے لیے ہری جھنڈی تھا۔ انھیں بتا دیا گیا کہ ہم تمھیں روکنے کے لیے کچھ نہیں کریں گے۔

ایک بے روزگار لیکچرار رسول عبدالحسین نے کہا میں نے ایک امریکی کو ہاتھ کے مسلسل اشاروں سے ہجوم کو اندر جانے کا اشارہ کرتے دیکھا اور ہجوم تالیاں بجانے لگا۔ امریکی نے ہاتھ ہلا کر ''بائی بائی'' کا اشارہ کیا اور لٹیرے تالیاں بجانے لگے۔ انھوں نے لوٹنا شروع کر دیا اور جب ایک آدمی ایر کنڈیشنر لے کر نکلا تو امریکی نے اس سے کہا "Good, Very good" ۔ BBC کے پروگرام News Online Cent Com میں ریاستہائے متحدہ کی مرکزی کمان دوحہ نے واقعہ کی ذمہ داری لینے سے انکار

کر دیا۔ اس نے کہا اتحادی فوجیں پولیس نہیں ہیں ان کو جامعات کے بچانے کے احکامات نہیں ہیں۔

۱۱راپریل سے ۱۵ اپریل ۲۰۰۳ء کے روزنامہ Independent London میں رابرٹ فسک نے لکھا گویا کل کتابوں کو جلانا مقصود تھا۔ پہلے لٹیرے آئے پھر آگ لگانے والے۔ یہ بغداد کی تباہی کا آخری باب تھا۔ قومی کتب خانہ اور دستاویزات کا محافظ خانہ جو ایک بے بہا خزانہ تھا راکھ بنا دیا گیا اس کے بعد وزارت اوقاف کے قرآنی کتب خانہ کو آگ لگادی گئی۔

فسک نے لکھا: ''جب میں نے کھڑکی سے قرآنی کتب خانہ کو جلتے دیکھا تو بھاگ کر قابض مقتدرہ کے دفتر گیا۔ میں نے جگہ کا نقشہ دیا عربی اور انگریزی نام بتایا۔ میں نے کہا تین میل دور سے دھواں نظر آرہا ہے اور وہاں پہنچنے میں صرف ۵ منٹ لگیں گے۔ آدھے گھنٹہ بعد بھی وہاں کوئی امریکی نہ تھا اور شعلے ہوا میں دوسو فوٹ بلند تھے۔ اس کے بعد فسک کا سب سے تیکھا مشاہدہ یہ تھا کہ ہفتہ کو آثار قدیمہ کے عجائب خانہ میں پرانی چیزیں (Antiques) تباہ کر کے قومی دستاویزات اور قرآنی کتب خانہ جلا کر عراق کی ثقافتی پہچان مٹائی جارہی تھی، کیوں؟ یہ آگ کس نے لگائی؟ کس پاگل مقصد کے لیے یہ ورثہ تباہ کیا جا رہا تھا؟ تقریباً ہزار سال سے بغداد عرب دنیا کا ثقافتی دارالخلافہ تھا جہاں مشرق وسطیٰ کی سب سے زیادہ تعلیم یافتہ آبادی تھی' تیرھویں صدی میں چنگیز خان کے پوتے نے اس شہر کو جلایا تھا اور کہا جاتا ہے کہ دریائے فرات کتابوں کی سیاہی سے کالا ہو گیا تھا۔ کل ہزاروں پرانی کتابوں کی سیاہ راکھ سے عراق کا آسمان بھر گیا۔ فسک کے اٹھائے ہوئے سوالوں کے جواب ملنا ضروری ہیں۔ ساتھ ہی انسانی تہذیب کی بقا کے لیے ذمہ داروں کو عبرت ناک سزا دینا بھی لازمی ہے۔ آیئے پہلے یہ دیکھیں کہ اس کی ذمہ دار فوجی اعلیٰ کمان تھی یا نہیں۔

۱۲رمئی ۲۰۰۳ء کو نیویارک ٹائمز کی رپورٹ ہے کہ لیفٹیننٹ جنرل David D.Mekeirnan نے جو اتحادی بری افواج کے کماندار تھے' اپریل کے اواخر میں ایک

حکم نامہ جاری کیا جس کے مطابق ان کی افواج ملک عراق کی مختار کل تھیں۔

۱۱رمئی کو جنرل ٹومی فرینک نے جو عراق میں امریکی افواج کے کماندار تھے، ایک ریڈیو پیغام میں اعلان کیا:

''جناب حسین کی بعث پارٹی تحلیل کردی گئی ہے اور فوجی افسروں نے کہا ہے کہ خود مقرر کردہ بغداد کے میئر کو دو ہفتہ امریکی حراست میں رکھنے کے بعد رہا کر دیا گیا ہے۔ صدام حکومت کے ختم ہونے کے بعد محمد حسن زبیدہ نے اپنے بغداد کے میئر ہونے کا اعلان کر کے شہر کے انتظام و انصرام کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جو ان کے تحت کام کرتی۔ انھیں ۲۷ اپریل کو امریکی فوجیوں نے گرفتار کر لیا تھا۔

مندرجہ بالا اخباری اطلاعات تصدیق کرتی ہیں کہ اپریل میں ہی امریکی افواج نے عراق پر قبضہ کر کے اپنا اختیار اعلیٰ قائم کر لیا تھا' اس لیے صدر بش کا اعلان کہ مرکزی جنگ یکم مئی کو ختم ہوئی عراق میں اعلیٰ کماندار کے بیان کو کہ اس کی فوج ملک کی مقتدر اعلیٰ ہے ہوا میں اڑا دیتا ہے اس لیے یہ ثابت ہے کہ یکم مئی سے پہلے ہی جنیوا کنونشن کے مطابق امریکا عراق میں قابض طاقت بن چکا تھا۔ اس لیے جنیوا کنونشن کے مطابق مقبوضہ علاقوں میں امن و امان کا قیام امریکہ کی زیر قیادت فوج کی ذمہ داری تھی۔ اسی طرح عراق میں اختیار اور کمان کے افسر اعلیٰ جنرل فرینک کا ریڈیو پیغام کہ بعث پارٹی تحلیل کی جا چکی ہے اور بغداد کے خود تعینات میئر جنھیں گرفتار کر لیا گیا تھا ۲۷ اپریل کو رہا کیے جا چکے ہیں بھی دوحہ میں فوجی ترجمان کے بیان کو کہ فوج کی ذمہ داری پولیس کا کام کرنا نہیں جھوٹ بنا دیتا ہے۔ خود ساختہ میئر کو گرفتار کرنا اور پھر رہا کرنا خالصتاً پولیس کا کام تھا۔ رابرٹ فسک کے مطابق جہاں ۳۵ وزارتوں کو جلا کر راکھ کر دیا وہاں وزارت داخلہ اور تیل کی وزارت کی سخت حفاظت کی گئی۔ اپریل ۲۰۰۳ء میں عراق پر قبضہ کے بعد سے امریکی فوج بار بار رات کے کرفیو کا نفاذ کرتی رہی جو پولیس کا کام تھا مزید جنرل فرینک کا بیان کہ بعث پارٹی تحلیل کر دی گئی ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ امریکی فوج نے عراق کا اقتدار سنبھال کر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

اس لیے امریکی فوج کو جس نے ۹ا اپریل سے عراق پر قبضہ کر رکھا تھا امن وتحفظ کے قیام کی ذمہ داری سے بری نہیں قرار دیا جاسکتا۔ بعد میں جنرل ابی زید کے الفاظ میں گوریلا قسم کی مسلح مزاحمت کے پھوٹ پڑنے سے بہرحال جنیوا کنونشن کے مطابق قانونی ذمہ داری پر کوئی فرق نہیں پڑتا جو قابض قوت پر عائد ہوتی ہے جبکہ امریکی افواج ۹ا اپریل سے عراق پر قابض تھیں۔

عراق میں معاملات اس قدر بے مہار تھے کہ کوئی لٹیرا جگہ چن کر اسے تاراج کر سکتا تھا' لٹیرے اس قدر آزاد تھے کہ انھیں دماغی اسپتال کو لوٹ کر برباد کرنے میں کوئی جھجک نہ ہوئی جہاں ذہنی مریض عراقیوں کا علاج ہوتا تھا جہاں سے اتنی بڑی تعداد میں ذہنی مریض جن میں قاتلانہ رجحان رکھنے والے بھی شامل تھے بھاگ گئے خدا جانے کہاں؟ اس لیے کہ ایک شدید افراتفری پیدا ہوچکی تھی۔

۱۳ مئی ۲۰۰۳ء کے نیویارک ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق سال کے شروع میں جو چودہ سو (۱۴۰۰) سے زیادہ عراقی یہاں داخل تھے ان میں سے صرف تین سو باقی رہے۔ عراقی نفسیاتی عملہ کی شکایت تھی کہ جب لٹیرے سارے بستر، بیسن، چولہے، ایرکنڈیشنر، فرنیچر یا دوسری قیمتی چیزیں لے جارہے تھے تو مرین سپاہی کھڑے دیکھتے رہے' ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ ایک مرین افسر نے اس سے کہا کہ وہ وہاں پر آزاد کرانے کے لیے جانے کے لیے تھا' کیا کہنے ہیں ''امریکی مارکہ آزادی'' کے' اللہ ہم سب کو امریکی انداز کی آزادی سے محفوظ رکھے۔

ناروے کے ڈاکٹر Rosset جنھوں نے شروع سے اس منصوبہ کی دیکھ بھال کی تھی مرین فوجوں کے جانے کے بعد تین ہفتوں تک روزانہ ریاستہائے متحدہ کے فوجی کمانداروں سے درخواست کرتے رہے کہ حفاظت کے لیے فوجی بھیجیں۔ لٹیرے ابھی بھی گھوم رہے تھے اور قریب واقع ایک شیعہ ادارہ جو قریبی مسجد میں قائم تھا تحفظ مہیا کرنے کے لیے یہاں منتقل ہوگیا۔ لیکن لوٹ جاری رہی۔ صلیب احمر نے دروازے اور کھڑکیاں دوبارہ نصب کرنے کے لیے لوگ بھجوائے اور ۱۹ اپریل تک ساری عمارتیں

پھر سے بند ہوگئیں لیکن ۱۹ اپریل کو لوٹ پھر شروع ہوگئی۔

اس دوران داخلی دفتر کے سامنے روزانہ ایک اداس منظر برپا ہوتا' وہاں تین معالجوں کی ملاقات مایوس عراقیوں سے ہوئی جو اپنے ان ذہنی طور پر غیر متوازن رشتہ داروں کی دیکھ بھال کے لیے مدد کے طلبگار تھے جو ہسپتال سے بھاگ کر گھر پہنچ گئے تھے۔

اگر عراقی سمجھتے ہیں کہ وہ صدام کے دور میں بہتر تھے تو وہ کچھ زیادہ غلط نہیں ہیں۔

۲۸ مئی ۲۰۰۳ء کے نیویارک ٹائمز نے رپورٹ شائع کی کہ نہ صرف عجائب گھر' کتب خانے' اسپتال اور دوسری سہولتیں لوٹی گئیں بلکہ آثار قدیمہ کے قطعات زمین بھی لوٹے گئے جو بہت ہی ظالمانہ اور مجرمانہ حرکات تھیں۔ کم از کم ایک درجن قطعات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لٹیروں کے محاصرہ میں تھے جہاں سے انھوں نے دو ہفتوں میں اتنی قیمتی چیزیں نکال لیں جو ماہرین دو عشروں سے نہیں نکال پائے تھے۔ اس سے احساس ہوتا ہے کہ کس پیمانہ پر اور کتنے دنوں تک لوٹ مار جاری رہی اور یہ قومی اثاثے کس حد تک غیر محفوظ لٹیروں کے رحم و کرم پر پڑے تھے۔ شاید وحشی منگولوں نے بھی عجائب خانوں اور آثار قدیمہ کے قطعات کو بخش دیا تھا۔ اس نیویارک ٹائمز نے مزید لکھا یہ لوٹ چھوٹے پیمانہ پر سالوں سے جاری تھی لیکن امریکی فوجوں کے صدام حسین کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد کے ہفتوں میں تو گویا چوری اور بربادی کا طوفان اُمڈ پڑا۔
مسلسل لوٹ کھسوٹ کی مندرجہ بالا داستان سے پتہ چلتا ہے کہ اتنے بڑے پیمانہ پر لوٹ صدام حسین کے زوال کے بعد ہی ہوئی' اس طرح یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر لٹیرے صدام کی کمزور فوج کے سامنے لوٹ مار کی ہمت نہیں کر سکتے تھے تو انسانی تاریخ کی سب سے بڑی طاقتور ترین فوج کی موجودگی میں کیسے ان کو ہمت پڑی سوائے اس کے کہ لٹیروں اور امریکی فوج کی اعلیٰ کمان کے درمیان کوئی خفیہ معاہدہ تھا۔

یہ بحث کی جاتی ہے کہ لوٹ کتنی بھی زیادہ ہو بہرحال عراقیوں نے خود کی تھی

امریکی اور برطانوی فوجوں نے نہیں !افسوس اس دلیل میں زیادہ جان نہیں ہے۔ بغداد ایرپورٹ کی لوٹ میں امریکی فوجی براہ راست شامل تھے؛ اس کے علاوہ عراق کے لوگوں کو بھی اکثر لوٹا جا رہا تھا۔ ہفتہ وار ٹائم نے ۱۴ جولائی ۲۰۰۳ء کے شمارہ میں بغداد سے سائمن رابنسن کا مقالہ شایع کیا تھا جس میں اس نے امریکی فوجیوں کی لوٹ مار کی نشان دہی کی تھی جو انھوں نے عراق ایرپورٹ پر اس وقت کی جب یہ ۳/ اپریل کی اتحادی فوجوں کے قبضہ میں آیا۔ مقالہ میں لکھا ہے:

''امریکی افسروں کے مطابق جہاں تک بغداد کے مضافات میں ایرپورٹ کا سوال ہے وہاں بہرحال چوریاں اور تباہ کاریاں فاتح امریکی فوجیوں ہی نے کیں۔ ایرپورٹ ۳/اپریل کو تیسری انفنٹری بٹالین کے فوجیوں کے قبضہ میں آیا تھا۔ ہوائی اڈہ کے ملازمین کہتے ہیں کہ وہ لوگ اگلے دو ہفتوں تک ہوائی اڈہ کے مرکزی ٹرمینل میں سوتے رہے تھے اور ڈیوٹی فری دکانوں سے جو چاہتے اٹھاتے جس میں شراب، کیٹیں، خوشبویات، سگریٹ اور قیمتی گھڑیاں شامل ہیں۔ اتحادی فوجیوں نے ہوائی اڈہ میں توڑ پھوڑ بھی کی۔ امریکی ذرائع نے بتایا کہ ٹرمینل کی کھڑکیاں توڑ دی گئیں اور کوئی دروازہ سلامت نہ رہا۔ ایئرپورٹ کے عراقی ملازمین نے بتایا کہ کچھ نقصان تو عراقی جلا وطنوں نے کیا تھا مگر وہ بھی امریکی کمان اور اختیار میں ہی تھے۔ ایرپورٹ کو سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ عراق ایرویز کے دس جیٹ طیاروں میں سے اوائل مئی میں کی گئی امریکی انسپکشن میں پتہ چلا کہ صرف پانچ کارآمد رہ گئے ہیں۔ گزرنے والے ہفتوں میں امریکی سپاہیوں نے آرام دہ کرسیاں اور یادگاروں کی خاطر جہازوں سے آرائشیں نوچ لیں۔ کرسیوں کے گدے پھاڑ ڈالے، کاک پٹوں کا سامان توڑ دیا اور ہر ونڈ شیلڈ نکال دی۔ اب شاید ہی یہ ممکن ہو کہ یہ جہاز دوبارہ پرواز کرسکیں۔'' ویلش نے بتایا جو سابق فوجی اور ہوائی کمپنی پوٹ (Pott) اور وھٹنی (Whitney) میں Quality Control Liason officer کے طور پر کام کرتا ہے کہ نقصانات کا امریکی اندازہ چند ملین سے لے کر سو ۱۰۰ ملین ڈالر تک ہے۔ ملازمین کا کہنا ہے کہ ایرکنڈیشنر اور دوسرا

سامان تواتر سے چوری ہوتا رہا۔

جہاں تک بدمعاشی کا سوال ہے امریکی سپاہیوں کی لوٹ مار بعض حالات میں عراقی جرائم پیشہ افراد کی بدمعاشیوں سے کہیں زیادہ تھی۔ امریکی فوج جو عراق کو آزاد کرانے اور تعمیر نو کے لیے آئی تھی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ حقیقت کہ وہ سپاہی عراق میں امریکی اعلیٰ کمان کے بلاواسطہ اختیار اور کمان میں تھے۔

لیکن فوجی کمانداربجائے سخت تادیبی اقدام کرنے کے معاملہ کو یہ کہہ کر ہلکا بناتے ہیں کہ ''فوجی ہر جگہ ایسا کرتے ہی ہیں''۔

فوجیوں کے ایسے گھٹیا نظم اور گری ہوئی اقدار کے ساتھ ریاستہائے متحدہ ٹیکنالوجی کی جادوگری کا کوئی کمال نہ دکھا سکی اور افغانستان اور عراق میں اعلیٰ مقاصد رکھنے والے اور یکسو مزاحمت کاروں کو شکست نہ دے سکی۔

امریکی فوجیوں کی لوٹ مار صرف بغداد ایرپورٹ پر نہیں بلکہ سارے عراق میں ہوتی رہی ہے۔

۱۳/اگست ۲۰۰۳ء کے نیویارک ٹائمز نے لکھا ہے کہ بہت سے عراقی شکایت کرتے ہیں کہ امریکی یہاں اس لیے آئے ہیں کہ ان سے رقوم، زیورات اور گاڑیاں لوٹ سکیں لیکن نیویارک ٹائمز کے Shailak Deawn کے مطابق امریکی افسران امریکی فوجیوں کے خلاف واضح الزامات کا کوئی نوٹس نہیں لیتے اور کسی قسم کی تادیبی کارروائی نہیں کرتے۔ Deawn کہتا ہے کہ کسی دن بھی عراقی فوجی اڈوں کے دروازوں یا شہری معاملات کے دفتروں میں گذارشات کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک بوڑھی عورت شکایت کر رہی تھی کہ بغداد کی سڑک پر اس کے بیٹے سے اس کی ساری جمع پونجی لوٹ لی گئی، ایک جوان آدمی نے کہا کہ اس نے ایک سیٹیلائٹ فون ایک فوجی کو ایک کال کے لیے عاریتاً دیا تھا جو اسے واپس نہ ملا۔ ایک سگریٹ کے تاجر نے کہا کہ وہ اپنی گاڑی جو ضبط کر لی گئی تھی واپس لینے کے لیے چیک پوائنٹ پر گیا تو گاڑی اور چیک پوائنٹ دونوں غائب تھے۔ روسیلا رانا ضان نی ایلوا اپنے ملین دیناروں کی تلاش میں پانچویں

بار گاؤں سے بغداد آئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ امریکیوں نے یہ رقم اس کے بیٹے مہدی سے لی تھی جو ایک سبزی فروش تھا اور جس کے پاس ایک گواہ بھی تھا کہ ایک فوجی ترجمان نے ایک دستاویز پر دستخط کیے تھے جس میں لکھا تھا کہ اپریل میں حملہ کے دوران فوجیوں نے خاندان کی جمع پونجی جو دو سو ڈالروں کے برابر دینار تھے اور ایک پرانا چاکلیٹ کا ڈبہ جس میں خاندانی گھر کے کاغذات اور راشن کارڈ تھے اس سے لے لیا تھا۔ سپاہیوں نے کوئی رسید نہیں دی۔ Elizabeth Holgkin نے جو امریکی انسٹیٹیوٹ کی نمائندہ تھی اور مہدی کی مدد کر رہی تھی بتایا کہ میں نے کئی شکایتیں سنی ہیں لوگ کہتے ہیں انھوں نے تیس ہزار (۳۰،۰۰۰) ڈالر لے لیے، ہمیں کوئی امید نہیں کہ اب کبھی یہ رقم دیکھ سکیں گے۔ شہری معاملات کے دفتر میں جس کا کام شکایتیں سننا اور اپنے محدود اختیار میں اس کی تفتیش کرنا ہے خود صورت حال اتنی خراب ہے کہ ان کے ایک کارندہ نے مہدی صاحب کی جیب سے پچاس ڈالر اڑا لیے۔ خاندانی چیزوں کے حصول کے لیے مہدی صاحب چار دفعہ ایرپورٹ گئے، ایک دفعہ صلیب احمر والوں کے پاس تین دفعہ شہری امداد کے مرکز اور تین دفعہ Second Brigade of 82 Airborne Battalion کے ہیڈکوارٹر۔

تو یہ ہے عراق میں اعلیٰ امریکی کمان کی بدحال اخلاقی دیانت اور کارکردگی کی افسوس ناک کہانی جہاں عام عراقی شہریوں کو دھوکے سے یا زبردستی رقوم، زیورات، دستاویزات اور گاڑیوں سے محروم کیا جا رہا تھا اور متاثرین کو جو ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے کوئی مدد نہ مل رہی تھی اور اعلیٰ افسران بے شمار شکایتوں کی سنجیدہ تحقیقات کے بجائے لیت و لعل سے کام لے رہے تھے۔

کہا جاتا ہے وحشی منگول سپاہی بھی اس قسم کی غیر اخلاقی حرکتوں کے مجاز نہ ہوتے تھے۔ ایک سپاہی جھوٹ بولنے پر موت کی سزا کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔

اس لیے یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس قسم کی لوٹ مار بعد از جنگ منصوبہ بندی کی خامی کا نتیجہ تھی جس میں اس قسم کی صورت حال کا پہلے سے اندازہ نہیں لگایا گیا تھا۔ اس

لیے کوئی انتظام بھی نہ تھا یا جانی بوجھی حکمت عملی تھی جو عراقیوں کو سزا دینے کے لیے تیار کی گئی تھی جنھوں نے امریکی فوج کا نجات دہندوں کی حیثیت سے استقبال کرنے کے بجائے جیسا کہ پینٹاگون اور قصر ابیض کو امید تھی سخت قسم کی مزاحمت شروع کر دی تھی۔

یہ بات کہ لوٹ مار عراقیوں کو فوری طور پر زیرنگیں کرنے کے لیے جان بوجھ کر فوجی حکمت عملی کے طور پر ہو رہی تھی اس چپقلش سے ظاہر ہے جو قابض حکومت کے ناظم اعلیٰ پال بریمر اور جنرل Buford Blaunt کے حمایت یافتہ اعلیٰ فوجی کماندار جنرل Mekiernan کے درمیان چل رہی تھی۔ پال بریمر نے نیویارک ٹائمز کے مطابق (۱۵ مئی ۲۰۰۳ء) ۱۳ مئی کو ایک میٹنگ کی تھی جس میں انھوں نے فوج پر زور دیا تھا کہ لٹیروں کے خلاف سخت اقدامات کریں یہاں تک کہ گولی بھی مار دیں۔ جنرل Mekiernan نے اس بہانہ سے ایسی فوجی مداخلت کرنے پر اعتراض کیا کہ اس طرح شیعہ آبادی ناراض ہو جائے گی۔ یہ ایک جھوٹا مذہبی بہانہ تھا کیونکہ شیعہ آبادی خود لوٹ کے خلاف اداروں کی حفاظت کر رہی تھی اور کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا تھا کہ امریکی سپاہی ان جگہوں کی حفاظت کریں۔ علاوہ ازیں جنرل Mekiernan نے دلیل دی کہ امریکی فوجی فائرنگ اور نئے نصب شدہ ارضی بموں کی زد میں آ رہے ہیں۔ اور امریکی فوجیوں کی حفاظت لٹیروں سے نمٹنے سے زیادہ ضروری ہے۔ اسی جنرل نے دوسرے دن ۱۴ مئی کو ایک اخباری کانفرنس میں یقین دلایا کہ اس مسئلہ سے نمٹنے کے لیے سڑکوں پر زیادہ فوجیں بھیجی جائیں گی۔ کیسا دہرا معاہدہ ہے۔

لٹیروں کو گولی مارنے سے متعلق میجر جنرل بیوفورڈ بلانٹ نے اور بھی سخت انداز اختیار کیا کیونکہ ان کے مطابق امریکی فوجیوں کو اس وقت تک گولی مارنے کا اختیار نہیں دیا گیا تھا جب تک خود ان کی جان کو خطرہ نہ ہو پھر انھوں نے بریمر پر واضح کیا کہ وہ پسند کرے یا نہ کرے ہم لٹیروں کو گولی نہیں ماریں گے۔ غالباً یہ حکمت عملی اس لیے تھی کہ ان جرائم پیشہ افراد کو خوش کر کے بعد میں ان کو مزاحمت کاروں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے اور اگر ضرورت ہو تو انھیں مزاحمت کاروں سے

لڑایا جائے۔

اس کھلی وحشیانہ لوٹ اور غارت گری کے ساتھ ساتھ جس کا ذکر اوپر ہوا ہے عراق میں ایک خاموش اور نفیس لوٹ کھسوٹ اور غارت گری بھی خود پینٹا گون کی حفاظت اور سرکردگی میں جاری تھی۔

جن اداروں کو سب سے زیادہ فوائد پہنچے وہ وہی تھے جن کے مشیر اور افسران پینٹا گون کے دفاع اور منصوبہ بندی کے بورڈ میں تھے جن کے ارکان کا انتخاب ڈگلس فیتھ نے کیا تھا جس بات سے بہت سے مفادات کے ٹکراؤ کے سوالات پیدا ہوئے وہ یہ تھی کہ فیتھ کے سابق ساتھی Zell نے احمد شیلابی کے بھتیجے کے ساتھ بغداد میں دلچسپی لینے والے اداروں کو تعمیر نو کے ٹھیکے دلانے کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔

۲۰۰۴ء میں عوامی دیانت داری کے مرکز کے ایک نئے مطالعہ کے مطابق پچھلے دو سالوں میں ستر (۷۰) سے زیادہ امریکی اداروں اور افراد نے عراق اور افغانستان میں ۸ بلین ڈالروں کے ٹھیکے حاصل کیے۔ ان اداروں نے جارج ڈبلیو بش کی صدارتی مہم میں پانچ لاکھ ڈالروں سے کچھ زیادہ ہی چندہ دیا تھا جو کسی بھی سیاستدان کو پچھلے درجن بھر سالوں میں ملنے والے چندہ سے زیادہ تھا۔ ہیلی برٹن کے ذیلی ادارہ (kellog Brown Root) (KBR) جس کی صدارت نائب صدر بننے تک ڈک چینی کے پاس تھی مرکزی ٹھیکوں میں سے 2.3 ملین ڈالر کے ٹھیکے ملے۔ Bechtel Group ایک اور سرکاری ٹھیکے دار جس کی پہنچ اوپر تک تھی کو 1.3 بلین ڈالروں کے ٹھیکے ملے۔ اس تعمیراتی خزانے میں سے بہت سے چھوٹے مگر تعلقات والے اداروں کو بھی وافر حصے ملے۔ ان میں سے ساٹھ فی صد سے زیادہ ادارے ایسے تھے جن کے بورڈ کے ارکان ریپبلکن یا ڈیموکریٹ تنظیمی بورڈ میں کام کرتے تھے یا دونوں جماعتوں کے کانگریس ارکان کے ساتھ اعلیٰ فوجی سطح پر تعلقات کے حامل تھے۔ امریکی فوج کے Corps of Engineers نے ہیلی برٹن کے ذیلی ادارہ Kellog Brown Roots کو کئی بلین ڈالر کا ایک ٹھیکہ دیا جو کئی ٹھیکوں پر مشتمل اور لامحدود مقدار اور لامحدود

ادائیگی کے نام سے اور فوجی تاریخ میں اپنی قسم کا سب سے بڑا ٹھیکہ تھا۔ اطلاعات کے ناقص ذرائع کی وجہ سے عراق اور افغانستان میں تعمیر نو کے لیے دیے گئے ٹھیکوں کی مجموعی مالیت اس سے کہیں زیادہ ہو سکتی ہے جتنا عام طور پر لوگوں کے علم میں ہے۔

پینٹا گون کی طرف سے منظورانِ نظر ہیلی بریٹن اور دوسروں پر سب سے زیادہ جانبدارانہ عنایات پر گارڈین (لندن) نے ایک تحریر میں روشنی ڈالی ہے۔

مئی ۲۰۰۳ء میں سیکیورٹی کونسل نے ایک قرارداد کے ذریعے عراقی تیل کی دولت کے استعمال کی نگرانی کے لیے ایک بورڈ قائم کیا تھا جس نے CPA کو اختیار دیا تھا کہ تیل کی آمدنی صرف تیل کے کارخانوں کی مرمت، تعمیرات، ناگزیر درآمدات اور فوج کی درخواست پر وقتاً فوقتاً قیام اس طرح کے کاموں میں صرف کی جائے۔ جب شروع ہی میں بورڈ کی ہدایت پر KPMG نے حسابات کی جانچ پڑتال چاہی تو قابض امریکی مقتدرہ کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا ہوا۔ پہلے تو سخت دفاعی حصار میں گھری ہوئی عمارت میں عملہ کی رسائی ہی بمشکل ہوئی۔ پھر حساب کتاب کرتے ہوئے تیل کی پیداوار اور فروخت کے حساب میں سنگین نقائص دیکھ کر محتسبین حیران رہ گئے۔ جو صوابدیدی رقوم فوج کو امن وامان کے لیے دی گئی تھیں ان میں مکمل بے ترتیبی تھی اور ان کے خرچ کے حساب میں اتنی کم شفافیت تھی کہ بدعنوانی اور دھوکہ کا رستہ بالکل کھلا تھا۔ جب نگران بورڈ نے ان رقوم کی تفصیل طلب کی جو تیل کی آمدنی سے ہیلی بریٹن کو دی گئی تھیں تو پینٹا گون نے صاف انکار کر دیا۔ ۱.۴ ملین امریکی ڈالروں کے جو تین ٹھیکے ہیلی بریٹن اور دوسروں کو دیے گئے تھے اور جن کے لیے کوئی ٹینڈر طلب نہیں کیے گئے تھے نگران بورڈ کو تیل کی آمدنی کے استعمال کے سلسلہ میں تحقیقات کا حکم دینا پڑا۔

گارڈین نیوز سروس کے مطابق Henry Waxman نے جو ایوان نمائندگان میں حکومت کی ریفارم کمیٹی Congress Supreme Investigative panel میں اعلیٰ ڈیموکریٹ نمائندہ ہیں، امریکہ کی طرف سے عراق میں ترقیاتی رقوم کے انتہائی غلط استعمال اور بدسلیقگی کے متعلق چونکا دینے والے انکشافات کیے ہیں، ان میں سے

نمایاں غلط استعمال مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) اختیارات کی منتقلی سے چند لمحوں پہلے بش انتظامیہ نے بلینوں ڈالر DFI سے نامعلوم اخراجات کے لیے نکال لیے مثلاً ایک بلین امریکی ڈالر CPA کے آخری مہینہ میں غیر متعینہ حفاظتی مقاصد کے لیے DFI سے نکالے گئے۔

(۲) CPA کے صدر نشین پال بریمر نے عراقی تیل کی رقوم میں سے ۴.۶ بلین ڈالر کے اخراجات کی منظوری اختیارات کی منتقلی کے بعد دی جوئی حکومت کے اختیارات پر پیش بندی تھی۔

(۳) نائب صدر ڈک چینی کی سابق کمپنی ٹیکساس کی ہیلی برٹن کو ۱.۵ بلین ڈالروں کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے لیے بین الاقوامی مشیر اورنگران بورڈ کی تمام تر درخواستوں کے باوجود قصرابیض کی ناکامی۔

(۴) اپریل ۲۰۰۴ء میں IAMB کے صدر جنرل Perry Hallwaschs نے بریمر کو خط لکھ کر ہیلی برٹن کو بغیر کسی مقابلہ تین ٹھیکے دینے پر تشویش کا اظہار کیا۔ اب IAMB پوری CPA کے کردار کا پورا جائزہ لے رہی ہے اور اس کا فیصلہ کرے گی کہ پوری تحقیقات کی ضرورت ہے یا نہیں۔

(۵) اس دوران کانگریس کے نگران General Account Office کے افسروں نے نشان دہی کی کہ جہاں CPA تیل کی آمدنی خرچ کرنے میں تیز تھی وہیں امریکہ کی مشترکہ رقوم خرچ کرنا نہیں چاہتی تھی۔

(۶) امریکہ کے ۲۰ ملین ڈالر کے DFI کی تقریباً تمام رقم ۲۹ جون ۲۰۰۴ء تک بانٹ دی گئی۔ لیکن امریکہ کی طرف سے جو 18.4 ملین کا وعدہ تعمیر نو کے لیے کیا گیا تھا اس میں سے صرف ۲فی صد رقم خرچ ہوئی۔ قصرابیض کے اعداد وشمار کے مطابق ایک نئے عراق کی تعمیر کے بارے میں لاف وگزاف کے باوجود امریکہ کی اپنی رقم میں سے ایک پیسہ بھی تعمیر، صحت، صفائی اور پانی کے منصوبوں پر ۲۰۰۴ء کے آخری مہینہ تک خرچ نہیں ہوا تھا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ فوج

Corps of Engineer کے جون ۲۰۰۴ء کے بیان کے مطابق ہیلی برٹن کو عراقی تیل کی رقوم میں سے سب سے زیادہ رقم مہیا کی گئی۔

Centre of Public Integrity کے مطابق ۱۹۹۸ء سے تیل و گیس کی رقوم میں سے سب سے زیادہ ادائیگی بش کو ملی ہے' ان کا کل میزان ۱،۲۷۴،۵۷۹ (بارہ لاکھ چوہتر ہزار پانچ سو اناسی) امریکی ڈالر ہے' اس طرح CPA نے IAMB کو مکمل طور سے الگ رکھ کر عراق کے تیل کی آمدنی کا غلط استعمال اور فضول خرچی کی۔ Asian Newage Delhi میں (ڈان ۳۰ جولائی ۲۰۰۴ء) J.R.Pegg نے اپنے مقالہ میں تبصرہ کیا ہے کہ جمہوریہ کی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی صنعتی ادارہ کی انتظامیہ کے لوگ قصر ابیض، صدر اور نائب صدر اور دوسری اعلیٰ انتظامی حیثیتوں میں بیٹھے ہوں۔ Centre of public Integrity کے انتظامی ڈائریکٹر Charles Lewis نے کہا بش' نائب صدر ڈک چینی، کنڈولیزا رائس اور سیکرٹری تجارت Donald Evans سمیت بش انتظامیہ کے چالیس سے زیادہ ارکان بلا واسطہ تیل اور گیس کی صنعت کے لیے کام کرتے رہے ہیں۔

Catherine Stapp نے ڈان (پہلی اگست) کو ایک تحریر میں بیان کیا کہ واشنگٹن میں قائم ایک عوامی دیانت کے سنٹر کی تحقیق کے مطابق ڈیڑھ سو سے زیادہ امریکی اداروں کو افغانستان اور ایران میں کام کے لیے 48.7 بلین ڈالر مالیت کے ٹھیکے دیئے جا چکے ہیں۔

کانگریس اور محاسب KPMG نے نائب صدر ڈک چینی کے قریب ترین فوجی خدمات کے ادارے ہیلی برٹن کے خلاف کویت سے تیل کی درآمد پر ۱۶۷ ملین ڈالروں کا زیادہ خرچ دکھانے اور فوجیوں اور نقل و حمل کے ٹھیکوں میں 5.6 بلین ڈالر کی بدعنوانیوں کے بارے میں تحقیقات کی ہیں۔ بروکنگ انسٹیٹیوٹ کے اسکالر Peter Singer جو فوجی نجکاری کے ماہر ہیں نے کہا ''یہ سب یہی ہے کہ جنھیں آپ نہیں جانتے تو یہ بہترین قیمت کے لیے اعلیٰ ترین کام دکھاتے ہیں۔ بیکٹل جس نے ۲۴۰ ملین ڈالر

کا معاہدہ عراق میں پانی اور صفائی کے نظام کی تعمیر نو کے لیے جیتا ان اداروں میں سے ایک تھا جنھوں نے بولی لگانے کے خفیہ عمل میں حصہ لیا تھا۔ واشنگٹن کے Responsive Policies کے سنٹر کے مطابق اس کمپنی نے پچھلے تین سالوں میں زیادہ تر ریپبلکن لوگوں کو ۳.۱ ملین ڈالر دیے ہیں۔

کیا کوئی دریافت کرسکتا ہے کہ کتنے ''لامحدود مقدار اور لامحدود ادائیگی'' کے ٹھیکے ریاستہائے متحدہ میں عظیم الشان فوجی اور شہری کاموں کے لیے دیے گئے ہیں اور ان کی قیمت کیا تھی۔ کیا ایسا نہیں تھا کہ پہلی خلیجی جنگ کے بعد صدام نے مقامی ٹھیکیداروں کی مدد سے تعمیر کے بے پناہ کام کروائے تھے؟ ان ٹھیکیداروں کو تعمیر نو میں حصہ لینے کیوں نہیں دیا گیا؟ یہاں تک کہ وہ تمام جلاوطن عراقی جن کی مدد عراق پر امریکی قبضہ کے لیے اہم ترین تھی، ان نفع بخش ٹھیکوں میں نظر انداز کردیئے گئے اس حقیقت کے پیش نظر کہ عراق کی تعمیر نو کے تمام اخراجات بالآخر عراق کی تیل کی آمدنی سے ہی منہا ہوں گے۔ اس قسم کے بے حساب ٹھیکے اس ملک کے وسائل پر ڈاکہ اور لوٹ نہیں تھے تو اور کیا تھے؟

سان فرانسسکو میں عالمگیریت کے بین لاقوامی فورم کے پروجیکٹ ڈائریکٹر Tonia Jubaz کا کہنا ہے کہ جبکہ عراق کا خون بہہ رہا ہے اور امریکی فوجی مہم افراتفری میں ہے امریکی ادارہ اور ریپبلکن پارٹی برتی ہوئی دولت خوشی خوشی جمع کرتے پھر رہے ہیں۔

Financial Times کے مطابق عراق میں تعمیر کے لیے ۱۸ بلین ڈالر کے سب سے بڑے ٹھیکے حاصل کرنے والے ہیلی برٹین کی آمدنی میں ۸۰ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ ۲۰۰۳ء کے پورے سال کے مقابلہ میں ۲۰۰۴ء کی صرف پہلی سہ ماہی میں ان حسابات سے عراق کے آسمان سے باتیں کرتے منافع کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہیلی برٹین کے بعد سان فرانسسکو کا بیکٹل گروپ ہے جسے تقریباً ۳ بلین ڈالر کے عراق تعمیر نو کے ٹھیکے ملے۔ یہ کمپنی جسے امریکہ میں مندی کا سامنا تھا ۲۰۰۳ء سے آمدنی میں ۱۸۵ فی صد کا تیز رو اضافہ رجسٹر کرچکی ہے۔ Sam Ramon

California میں قائم Chevron Texaco کو تیل بیچنے کا ٹھیکہ ملا تھا اور اس کا منافع ۲۰۰۴ء کے منافع سے ۳ بلین ڈالر زیادہ ہے۔ Lockheed Martin کا منافع بغیر عراق میں کوئی خطرہ مول لیے تین گنا سے زیادہ بڑھ گیا اور ان سارے بے پناہ منافعوں کی نہ تو کوئی تحقیق ہوئی نہ انھیں عراق کی کمزور معیشت میں یا تعمیر نو میں لگایا جانا ہے بلکہ ایک ایک پیسہ ریاستہائے متحدہ بھیجا جاسکتا ہے کیونکہ پال بریمر نے تجارت کے سارے قواعد ایسے ہی بنائے ہیں۔ ان احکامات نے جنوری ۲۰۰۵ء کے بعد آنے والی حکومت کے لیے بھی ان قواعد کو بدلنا مشکل ترین بنا دیا ہے۔ عماد موکے نے اپنی تحریر میں جو Inter Press Services نے جاری کی ہے اس بات کو مزید اجاگر کیا ہے کہ کس طرح امریکہ نے عراق کے تیل کے وسائل میں اپنی جڑیں گہری کی ہیں۔ عراقی عبوری حکومت سے دور رس تجارتی تبدیلیاں کروائی گئیں جس میں ایک طرف تو مقامی سماجی رعایتوں میں کمی اور دوسری طرف امریکی کمپنیوں کی تیل کی آمدنی تک پوری رسائی اور ساتھ ہی پچھلی حکومت کے کیے ہوئے فرانس اور روس کے ساتھ معاہدوں پر نظر ثانی شامل ہیں۔ اس طرح منتخب عراقی حکومت کو امریکہ کے زیر اختیار عبوری حکومت کی بنائی ہوئی صورت حال ہی کو مقدر کا لکھا سمجھنا پڑے گا۔

اس طرح یہ نکتہ ثابت ہو جاتا ہے کہ عراق میں انتقال اقتدار محض دکھاوا رہا ہے اور امریکی تسلط نے امریکی اداروں کو عراق کی قومی معیشت کے قلب میں گہرا اتار دیا ہے اور ملک میں جاری ۱۴ فوجی اڈوں کی تعمیر کے ساتھ نظر یہی آتا ہے کہ عراقیوں کی خودمختاری کی تمام ظاہری باتوں کے ساتھ ریاستہائے متحدہ عراق میں ایک کٹھ پتلی حکومت بنا کر اپنے آپ کو مستحکم کرنے اور اس کے ذریعے حکم چلانے کے لیے تیار ہے۔

تعجب نہیں کہ جنگ کے پیدا کردہ منافع کا ایک بڑا حصہ ریپبلکن پارٹی کے خزانوں میں جا رہا ہے' Responsive Policies کے غیر جانبدار سنٹر کے مطابق ان میں سے ہر کارپوریشن صنعت کے قائدین میں سے ہے اور ۲۰۰۳ء، ۲۰۰۴ء کے انتخابات کے چندوں کے چکر میں زیادہ تر چندے ریپبلکن کو گئے۔ ہیلی بریٹن نے اپنے

Chevron ۔ ۹۴۹/-، ۱۶۵ ڈالروں کا پچاسی فی صد ریپبلکن پارٹی کو چندہ دیا۔ Texaco نے اپنے -/۳۱، ۳۶۷ ڈالروں کا تراسی فی صد جبکہ Lockheed نے -/۱۳۲، ۳۹۷ ڈالر دیے جو دوسرے تینوں کے مجموعی چندہ سے زیادہ تھے۔ اس نے انسٹھ فی صد ریپبلکن کو دیے اور بیکٹل نے -/۸۴۷، ۱۹۹ کا ترپن فی صد ریپبلکن کو دیا۔ بریمر کے حکم نمبر انتالیس نے عراق کے دوسو سے زیادہ حکومتی اداروں کی نجکاری کا حکم دے دیا تھا۔ بیکٹل کے ٹھیکہ میں عراق کے پانی اور صفائی کے نظام کی تعمیر نو شامل تھی۔ یہ کارپوریشن دنیا میں دس پانی کے بڑے اداروں میں سے ایک ہے جس کے مفادات پوری دنیا میں دوسو سے زیادہ پانی کی صفائی کے کارخانوں میں ہیں۔ اب ان مشترک اداروں نے اس قدر منافع کے ساتھ اب تک عراق میں سہولتوں کے نظام کی تعمیر میں کیا کام کیے ہیں؟ پینے کا پانی زیادہ تر کسی صفائی کے بغیر پمپ کر دیا جاتا ہے اور گندگی براہ راست سڑکوں پر یا دریاؤں اور ان کے کناروں پر بہتی رہتی ہے۔ زیادہ تر دیہی علاقے نہ تو پانی اور صفائی کے مرکزی نظام سے منسلک ہیں نہ پینے کے پانی کی سہولت میسر ہے اور ناقص صفائی کی وجہ سے صحت کے مسائل سے دوچار رہتے ہیں۔ کچھ ہی دن قبل دریافت کرنے پر ۴۴ فی صد عراقیوں نے کہا کہ امریکی فوجیں کوئی کوشش ہی نہیں کر رہی ہیں اور ۴۱ فی صد نے کہا کہ "بہت کم"۔

جہاں تک یہ سوال ہے کہ امریکی فوجیوں کی لوٹ مار کا اعلیٰ کمان نے کیوں کوئی اثر نہ لیا تو اگرچہ یہ بات حیران کن ہے لیکن بڑی حد تک درست وجہ یہی ہے کہ عراق کے میدان جنگ میں امریکی کارروائی ہوتی تو وہ پھٹ پڑتے اور بغاوت کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔

۱۷ فروری ۲۰۰۵ء کو Inter Press Services کے جاری کردہ Humberto Marquez کے مضمون میں یہ نشان دہی کی گئی ہے کہ عراقی وسائل کی تمام لوٹ مار اور ڈاکوں سے بڑھ کر قدیم تاریخی شہر بابل کے کھنڈرات پر امریکی اڈہ کی تعمیر تاریخ میں اس ثقافتی غنڈہ گردی کی مثال کے طور پر بیان کی جائے گی جو kellog

Brown and Root نے کی۔ اس بیان کی بنیاد ایک مطالعہ پر ہے جو جنگ اور غیر ملکی تسلط کے نتیجہ میں اب تک عراق میں ہونے والی ثقافتی تباہی کے بارے میں تھا۔ اس تحقیق کا نتیجہ حواس گم کر دینے والے اعداد و شمار پر مشتمل ہے۔ املین کتابیں، ۱۰ ملین دستاویزات اور چالیس ہزار فن پارے تباہ ہو گئے۔ امریکی اور پولش سپاہی آج تک ان خزانوں میں سے چوری کر رہے ہیں اور سرحد پار فروخت کر رہے ہیں جہاں فن کے تاجر سمیری تختیوں کے باون ہزار ڈالر تک ادا کرتے ہیں۔ ناصریہ میں مئی ۲۰۰۴ء کو مقتدیٰ الصدر کی ملیشیا سے جنگ میں چالیس ہزار مذہبی دستاویزات جل گئیں۔

لیکن یہ فوجی حکمت عملی الٹ پڑگئی اور وسیع البنیاد مزاحمت شروع ہو گئی جو ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی ہی چلی گئی۔

عراق کا ویت نام بن جانا

عراق میں جنگ کو قانونی درجہ حاصل کرنے کے لیے جھوٹی اور املا کرائی ہوئی عراق میں کثیر تباہی کے ہتھیاروں کی موجوگی کی رپورٹ کے ذریعے کانگریس سے حاصل کردہ عوامی حمایت صدر نکسن کے اس قدم سے قریب تر ہے جب انھوں نے کانگریس اور عوام کو یہ دھوکہ دیا تھا کہ خلیج ٹونکن میں امریکی بحریہ کے دو جہازوں پر ویت نامی کشتیوں نے حملہ کیا تھا جس حادثہ کے بارے میں اسی وقت پتہ چل چکا تھا کہ یہ حادثہ Sonar Data کی غلط تشریح کی وجہ سے ہوا تھا اور بحریہ کے ان جہازوں میں سے ایک جاسوسی کے مشن پر تھا۔

جس طرح بش انتظامیہ نے سیکیورٹی کونسل سے اختیار حاصل کرنے سے گریز کے لیے یہ بہانہ بنایا کہ قرارداد نمبر ۱۴۴۱ سے عراق پر حملہ کرنے کے لیے مطلوبہ اختیار حاصل ہو گیا تھا اسی طرح صدر جانسن نے بھی نہ صرف سیکیورٹی کونسل سے گریز کیا تھا بلکہ ویت نام کے خلاف اعلان جنگ کے لیے کانگریس سے بھی مشورہ نہیں کیا تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ کانگریس کی پرانی قرارداد جس میں جارحیت کے خلاف اقدام کا اختیار دیا گیا

تھا ویت نام پر حملہ کرنے کے لیے کافی تھی جس طرح آج کی امریکی کانگریس فریاد کر رہی ہے کہ عراق کے خلاف حملہ کرنے کی قرارداد منظور کرانے کے لیے غلط بیانی سے کام لیا گیا۔ سینیٹر فل برائٹ اور دوسرے کانگریسی ارکان اس وقت شکایت کر رہے تھے کہ انھیں دھوکہ دے کر ایسی قرارداد منظور کرائی گئی جو مزید جارحیت کے خلاف صدر کو ضروری اقدام اٹھانے کا اختیار دیتی تھی۔ انتظامیہ کی طرف سے کانگریس سے مزید جارحیت کے خلاف تمام ضروری اقدامات کرنے کا اختیار مانگتے ہوئے سیکرٹری دفاع میک نمارے نے یہ معلومات چھپالی تھیں کہ اس بات کی تصدیق ہو چکی تھی کہ بحریہ کے جہاز پر حملہ نہیں ہوا اور یہ اطلاع Sonar Data پڑھنے میں غلطی کی وجہ سے جاری ہوئی تھی۔

صدر بش نے عراق سے جنگ شروع کرنے میں جلد بازی یوں کی کہ انھوں نے صدام اور اس کے حامیوں کی طاقت کو اور عراقیوں کی گوریلا جنگ کرنے کی صلاحیت کو کم سمجھا اور امریکی فوجی طاقت کی گوریلا جنگ اور عام بغاوت کو کچلنے کی صلاحیت کو اصل سے بہت زیادہ جانا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نائب صدر ڈک چینی نے یہ بڑھک ماری تھی کہ ''امریکی فوج کا نجات دہندوں کی حیثیت سے استقبال ہوگا'' اور سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ نے یہ غرہ دکھایا تھا کہ عراق میں پہلی گولی کے داغے جانے کے ساتھ ہی صدام حکومت گر جائے گی۔

اسی طرح صدر جانسن نے بھی NLF اور شمالی ویت نام کو کمزور سمجھا تھا۔ ان کو اطمینان دلایا گیا تھا کہ ایک یا دو سالوں میں ہی امریکی فوج کے ہاتھوں بے تحاشا نقصان اٹھا کر شمالی ویت نام اور ویت کانگ ڈھے جائیں گے۔

امریکی فوج نے عراق میں پانی اور بجلی کی تقسیم کے نظام کو بالکل تباہ کر دیا اور جان بوجھ کر چشم پوشی کے ذریعے ڈاکوں اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔

اسی طرح ویت نام کی جنگ میں امریکی فوج نے بے تحاشا بمباری کر کے کئی گاؤں صفحہ ہستی سے مٹا دیئے' مائی لائی کا تماشا دکھایا' جنگلوں اور فصلوں کی تباہی کے لیے

بڑے پیمانہ پر زہریلا مادہ استعمال کیا۔

بش انتظامیہ نے عراقی جنگ میں جانی اور مالی نقصان کے امکانات کے بارے میں قوم کو اعتماد میں لینے کی زحمت کبھی نہ کی' انھیں یہ یقین تھا کہ قوم عراقی جنگ کی حمایت میں اس قدر جذباتی ہو چکی ہے کہ وہ بخوشی ہر قسم کی قربانی دے گی۔

اسی طرح صدر جانسن نے بھی بے پناہ امریکی فوجی طاقت کی وجہ سے ویت نام کی جنگ میں ممکنہ مالی اور افرادی نقصان کا اندازہ غلط لگایا' بہرحال جیسے جیسے جنگ طول پکڑتی گئی اور جانی و مالی نقصان آسمان کو چھونے لگا ہر طرف بے چینی پھیلنے لگی اور عوامی مظاہرے شروع ہو گئے جن کا نتیجہ شرمناک پسپائی کی شکل میں ظاہر ہوا' چونکہ بش انتظامیہ ویت نام کے دیے ہوئے سبق کو بھول گئی اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر وہی جنگِ ویت نام والی تباہی امریکہ کا مقدر ہے۔ عراق جنگ کے ایک سال میں جنگ ویت نام کے پہلے تین سالوں سے زیادہ امریکی سپاہی مارے جا چکے ہیں۔

امریکی محکمہ دفاع کے اعداد و شمار کے متعلق رائٹر کے تجزیہ نے بتایا کہ جنگ ویت نام میں جو فوج کے کہنے کے مطابق ۱۱ دسمبر ۱۹۶۱ء کو شروع ہوئی تھی ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک ۳۹۲ ہلاکتیں ہوئی تھیں جبکہ امریکی افواج کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تک پہنچ چکی تھی اس طرح عراق میں فوجوں کی تعداد کی مناسبت سے اموات کی تعداد نسبتاً کم وقت میں ویت نام سے زیادہ ہو چکی ہے۔

ریاستہائے متحدہ کا پچھلے دنوں عراق کے کچھ حصوں میں بھاری ترین بمباری کا ہار الینا جس سے بے تحاشہ تباہی ہوگئی ویت نام میں بے تحاشا بمباری کی یاد دلاتا ہے جس میں بھی بے مقصد تباہی برپا کی گئی تھی۔

نہ صرف یہ کہ صدر بش نے ویت نام کے تجربات کو پر کاہ کے برابر اہمیت نہیں دی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عراق کے خلاف جنگ شروع کرنے کے لیے جواز مہیا کرنے میں صدر جانسن سے کہیں آگے بڑھ گئے۔ صدر جانسن اور ان کی انتظامیہ نے امریکی خفیہ اداروں کو کبھی ویت نام میں جنگ کی وجوہ تیار کرنے کو نہیں کہا تھا لیکن بش انتظامیہ نے

کثیر تباہی کے ہتھیاروں کے سلسلہ میں ثبوتوں کے اختراع کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا یہاں تک کہ مختلف ایجنسیوں کو خفیہ اطلاعات کی فراہمی کے لیے حکم دے دیا۔

صدر کلنٹن کے سابق مشیر سڈنی بلومنتھال نے ایک تحریر میں (ڈان ۳ نومبر ۲۰۰۳ء) کو اندر کی کہانی سنائی:''جنگ کی شروعات سے پہلے دو دفعہ نائب صدر ڈک چینی اپنا گاڑیوں کا جلوس لینگلے ورجینیا میں خفیہ معلومات کے بش مرکز میں لے گئے جہاں انھوں نے CIA کے تجزیہ کار کو مجبور کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنا کام ہماری ہدایات کے مطابق کریں۔ پینٹاگون میں رمزفیلڈ نے CIA کے متوازی ایک خصوصی منصوبہ کا دفتر بنایا جو جدید رخصت پسند وولفوٹز کی زیر ہدایت خفیہ اطلاعات میں سے اپنی پسند کا پہلو بالا ہی بالا قصر ابیض پہنچا دے۔ پچھلے سال وولفوٹز نے CIA کو رپورٹ تیار کرنے کا حکم دیا جس میں بتایا جائے کہ بلکس (BLIX) کے دل میں ماضی میں عراق کے لیے نرم گوشہ رہا ہے گویا ان کے کام شروع کرنے سے پہلے ان کی اہمیت ختم کر دی جائے۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ایک سابق افسر نے واشنگٹن پوسٹ میں بتایا جب CIA نے اپنا تجزیہ ان کی ہدایات کے خلاف دیا تو وولفوٹز کا غصہ پھٹ پڑا۔ اس کے بعد سابق اسسٹنٹ سیکرٹری خارجہ جیمز روبن کے مطابق بلکس قصر ابیض میں ڈک چینی سے ملے۔ نائب صدر سے پوچھا گیا کہ اگر WMD سے متعلق ان کی کوششیں بش کی مرضی کے مطابق نہ ہوئیں تو کیا ہوگا؟ ہم بلا جھجک آپ کو جھوٹا قرار دیں گے۔ پہلے سے ہی عراق میں اپنے راستہ کا انتخاب کر چکے ہونے کی وجہ سے بش انتظامیہ نے اپنی ضرورت کے لیے فوری خطرہ بنانے کے لیے جھوٹے ثبوت گھڑنے کا انتظام کیا۔

ایسی خارجہ پالیسی پر ہنری کسنجر جیسے ماہر نے Dawn/Tribune Media Services Int. کے لیے اپنی ایک تحریر میں انتظامیہ کی عراقی پالیسی کو درست قرار دیا ہے اس بنیاد پر کہ عراق ایک خاص مسئلہ ہے اس لیے یہاں اصولوں کی بات نہیں ہو سکتی۔ وہ لکھتا ہے:''لیکن جنگ کی بنیاد کے بارے میں بحثوں کو موجودہ مسئلہ نہیں بنانا

چاہیے موجودہ صورت میں ایک مشترکہ مقصد خاص طور پر روایتی اتحادیوں اور ایک نئے اتحادی روس کے ساتھ ہی حقیقت ہے۔" جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے محاورہ کی اس سے بہتر کیا تشریح ہوسکتی ہے؟

مارچ ۲۰۰۲ء میں اخبارنویسوں سے ملاقات میں ثالث Tim Reassert نے نائب صدر ڈک چینی سے پوچھا اگر آپ کا تجزیہ درست نہ ہوا ور ہمارا نجات دہندہ کی حیثیت سے استقبال نہ ہوا بلکہ فاتح سمجھے گئے اور عراقیوں نے مزاحمت شروع کر دی خصوصاً بغداد میں تو کیا آپ کے خیال میں امریکی ایک لمبی خون ریز جنگ کے لیے تیار ہیں جس میں امریکی مارے جائیں گے۔ ڈک چینی نے جواب دیا۔ میرا خیال نہیں کہ ایسا ہوگا کیونکہ مجھے واقعی یہ یقین ہے کہ نجات دہندہ کی طرح ہی ہمارا استقبال ہوگا۔ نائب صدر نے مزید کہا کہ انھیں اس کا پتہ ہے کیونکہ میں اور بش کئی لوگوں اور گروہوں سے ملے ہیں' ایسے لوگ جنھوں نے باہر سے اپنی زندگیاں عراق میں تبدیلی کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔ عراق کے لوگوں کے بارے میں ہمیں جو معلومات ملی ہیں اُن کے مطابق اس کے بارے میں تو کوئی سوال ہی نہیں کہ عراقی صدام سے نجات چاہتے ہیں اور جب ہم ایسا کرنے آئیں گے تو وہ ہمیں نجات دہندہ ہی سمجھ کر خوش آمدید کہیں گے۔ اور ذرا مزاحمت شروع ہونے کے ہفتوں بعد صدر بش کو دیکھیں کہ کس طرح وہ اپنا آہنی دستانہ پھینک کر اپنے مخالفوں کو پوری طاقت سے سامنے آنے کے لیے للکارتے ہیں۔ صدر نے اعلان کیا: "ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم کسی بھی مزاحمتی صورت حال سے نمٹ سکیں۔

عراقیوں کی طرف سے ایسی شدید مزاحمت کے ذریعے ریاستہائے متحدہ کی امیدوں کو خاک میں ملتے دیکھ کر ڈک چینی ششدر رہ گئے ہوں گے ایک ایسی مزاحمت جو بڑھ کر مکمل گوریلا جنگ اور پھر بغاوت بن گئی جو اس قدر امریکی فوجیوں کی زندگی کا خراج لے رہی ہے۔ ڈک چینی نے اپنے آپ کو اس کا قائل کر لیا تھا کہ عراقی صدام حسین سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جنگ کے بعد عراقی اجتماعی نعرے لگا

رہے ہیں: ''اپنے خون اور اپنی روح سے ہم تمھارے لیے قربانی دیں گے صدام' انھوں نے اس کی سالگرہ جوش وخروش سے منائی' کئی جگہوں پر انھوں نے اس کے گرے ہوئے مجسموں کی مرمت کر کے انھیں دوبارہ نصب کیا۔ عراق میں اپنی کمین گاہ سے صدام حسین اپنے حامیوں کو امریکہ کے خلاف جہاد جاری رکھنے کی ہدایت دیتے تھے اور جس پر لوگ عمل کرتے تھے بلاشبہ عراق میں ان کے مخالفین بھی تھے۔

صدر بش نے مزاحمت کاروں کو پوری طاقت دکھانے کو کہا تھا لیکن جب انھوں نے ایسا کیا تو بش کو اپنے بڑے بول سے نیچے آنا پڑا اور ساری اکڑ سے محروم ہو کر وہ اسی اقوام متحدہ سے امریکہ کو مصیبت سے نکالنے کی درخواست کر رہے تھے جسے وہ ''بے محل'' قرار دے چکے تھے۔

فرانس کے صدر شیراک جن کے پاس عراق کی اعلیٰ خفیہ معلومات تھیں، بش کو تنبیہ کر چکے تھے کہ عراق سے جنگ تباہی لائے گی لیکن اس وقت بش کے دونوں کان جدید رجعت پسندوں کی طرف تھے۔

جنگ سے پہلے CIA کے ڈائریکٹر Tenet نے اپنی ذمہ داریوں سے بڑھ کر کھلی تنبیہ کی تھی کہ عراق کے متعلق دعوے حقیقت کے مطابق نہیں ہیں۔ فوج کے Chief of Staff جنرل Erik k, Shinaski نے Senate Committee کو مارچ ۲۰۰۳ء میں ہی بتا دیا تھا کہ بعد از جنگ عراق پر قبضہ کے لیے کئی لاکھ سپاہیوں کی ضرورت ہوگی جس کو بش' چینی اور وولفوٹز نے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔

صدر بش اور ان کی انتظامیہ کوئی بھی عقل کی بات سننے کو تیار نہ تھے کیونکہ فتح کی شراب کے نشہ نے انھیں ہر مشورہ اور نصیحت سے بے نیاز کر دیا تھا۔

۹ / اپریل کو سقوط بغداد کے بعد سے کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا جب امریکی فوجوں کے خلاف احتجاجی جلوس نہیں نکلتے اور ان پر حملے نہیں ہوتے تھے' بہرحال فلوجہ کا شہر مزاحمت کا گڑھ بن کر ابھرا۔

''یکم مئی ۲۰۰۳ء کو نیویارک ٹائمز کی رپورٹ'' آج امریکی سپاہیوں نے کم از کم

دو مظاہرین کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ جب مشتعل عراقی امریکی سپاہیوں کے ہاتھوں پندرہ افسران کی ہلاکت کے خلاف (دو دن پہلے مظاہرہ میں حصہ لے رہے تھے) نعرے لگا رہے تھے اور پتھر پھینک رہے تھے۔ فلوجہ کے جنرل اسپتال کے ذرائع نے بتایا کہ تین افراد ہلاک ہوئے ہیں جبکہ لوگوں کا کہنا ہے کہ چوتھا بھی ہلاک ہوا تھا لیکن اسے اسپتال نہیں لے جایا گیا تھا۔

جہاں تک پیر کے دن گولیاں چلانے کا واقعہ ہے کئی عراقی کہتے ہیں کہ مجمع پر امن اور نہتا تھا۔ ۳۵ سالہ فلاح ابراہیم کا سوال ہے: ''کیا یہی بش کی آزادی اور نجات دہندگی ہے؟'' یہ سوال اس نے اس وقت کیا جب بہت سے سوگوار دو ہلاک شدگان کا جنازہ قبرستان لے جا رہے تھے جن میں سے ایک عراقی کی نعش پرچم میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہمیں بش کی کوئی ضرورت نہیں، ہم نجات پانا نہیں چاہتے، عراقی اپنی آزادی خود حاصل کرلیں گے۔ امریکی سپاہیوں کے گولی مارنے کی وجہ سے عوام میں غصہ بھڑک گیا ہے، پیر کی سہ پہر کو جلوس شروع ہوا جب کئی سو مظاہرین رہائشی علاقہ میں ایک اسکول کی طرف گئے جہاں امریکی فوجیوں نے ایک اسکول میں اپنا اڈہ بنایا ہوا تھا۔ فوجی حکام نے کہا کہ ایک قریبی چھت پر سے اور مجمع میں سے کسی نے اسکول میں فوجیوں پر فائرنگ شروع کردی اور فوجیوں نے جوابی فائرنگ کی جس سے پندرہ افراد ہلاک ہوئے جن کے بارے میں اسپتال کے ذرائع نے بتایا کہ آج کا مظاہرہ زیادہ منظم تھا۔ تقریباً ایک ہزار افراد جن میں اِس علاقہ کے مذہبی قائدین بھی شامل تھے اس احاطہ کے پاس جمع ہوئے جو فوج کے 82 Airborne Division کا مرکزی دفتر تھا، کچھ مظاہرین نشان اٹھائے ہوئے تھے جن پر لکھا تھا: ''ہمارا فخر اسلام ہے۔'' جناب حامدی نے بتایا وہ قابض طاقت ہیں وہ ہم پر تسلط چاہتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ہم مزاحمت کریں۔

اسی اخبار کے مطابق لندن میں قائم ایک عربی اخبار نے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک خط شائع کیا جس پر صدام حسین کے دستخط تھے اور عراقیوں کو امریکی افواج کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تلقین کی گئی تھی۔ عراقیوں سے کہا گیا تھا کہ کافروں، جرائم پیشہ

قاتلوں اور خفیہ طور پر مسلط ہونے والوں کے خلاف بغاوت کریں اور تنبیہ کی گئی تھی کہ ''جو لوگ حملہ آوروں کے ساتھ ساز باز کریں ان کو سزا دی جائے گی'' اور پیش گوئی کی کہ فتح کا دن جلد آئے گا۔ مدیر عبدالباری اطواری نے کہا کہ ان کو یقین ہے کہ صدام زندہ ہے اور لڑنے کے لیے مستعد۔ وہ ابھی تک کہہ رہا تھا'' میں زندہ ہوں اور متحرک' میں ختم نہیں ہوا''۔ جناب اطواری نے کہا کہ انھوں نے پہلے بھی صدام کے دستخط دیکھے ہیں اور انھیں یقین ہے کہ یہ دستخط ''یقینی طور پر اسی کے ہیں۔'' خط میں عراقی فوج کے سقوط کو غداری کہا گیا تھا اور لکھنے والے نے قسم کھائی تھی کہ وہ تمام لوٹا ہوا قدیم ورثہ واپس حاصل کر کے رہے گا۔ اس خط کے بعد الجزیرہ پر اس کی کئی تقاریر نشر ہوئیں جن میں لوگوں سے جہاد جاری رکھنے کو کہا گیا تھا۔

۱۵ر نومبر ۲۰۰۳ء کو دبئی میں قائم ٹی وی نے صدام کی آخری تقریر سنائی جس میں کہا گیا تھا کہ جن لوگوں کو قابضین تعینات کرتے ہیں اور وہ انھیں کی (قابضین کی) حیثیت میں ہوتے ہیں اور غیر ملکی فوجوں سے پہلے ان سے لڑنا ضروری ہوتا ہے۔

امریکی موجودگی کے خلاف یہ عوامی مظاہرے اس بات کا واضح اور اعلانیہ ثبوت تھے کہ نہتے عراقی شہری بھی اس قدر نڈر' باہمت اور بے باک کہ دنیا کی سب سے بڑی فوج کے خلاف کسی قیمت پر بھی اور تمام حالات میں لڑنے کے لیے پوری طرح مستعد ہیں' یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ان پر اسلام کا گہرا اثر ہے اور یہ شوق شہادت سے بھرے ہوئے ہیں۔ صدام کے خط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ چھپا ہوا ہونے کے باوجود صورت حال اس کے اختیار میں ہے اور ماضی میں اس کا کردار جیسا بھی رہا ہو وہ اتنا بہادر تھا کہ امریکی فوج کی موجودگی کے خلاف گوریلا جنگ کی سربراہی کے لیے کھڑا تھا اور ممکنہ طور پر اس کے لیے غیر ملکی اسلامیوں کا ساتھ بھی اسے منظور تھا۔ جب دسمبر ۲۰۰۳ء میں وہ گرفتار ہوا تو اس کے بریف کیس سے ایک خط ملا تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی پارٹی کے ارکان نے اسلامیوں سے زیادہ قریب آنے سے منع کیا تھا۔

۲۷ر مئی کے نیویارک ٹائمز 49 نے بیان کیا کہ اگر چہ بریمر کے پاس عراقی

لوگوں کے لیے بڑی خوش خبریاں ہیں مثلاً خام تیل کی برآمد پر پابندیوں کا خاتمہ جس سے ملکی معاشی حالت پر بہت ہی خوش گوار اثر پڑتا لیکن بغداد کے لوگوں نے ان خوش خبریوں کو جھٹک دیا اور امریکی موجودگی کے خلاف مزاحمت سے توجہ ہٹانے سے انکار کر دیا اور اسی سہ پہر ایک نامعلوم حملہ آور نے بین الاقوامی ایر پورٹ کے راستہ میں ایک قافلہ پر بم پھینک کر چار امریکی فوجیوں کو زخمی کر دیا' بعد میں ریاستہائے متحدہ کی مرکزی کمان نے بیان جاری کیا کہ ایک سپاہی ہلاک ہوا جبکہ تین زخمی ہوئے تھے۔

۳۰ مئی ۲۰۰۳ء کو نیویارک ٹائمز نے بتایا کہ اس ہفتہ فوجی قافلوں پر حملوں میں پانچ امریکیوں کی ہلاکت کے بعد ۲۹ مئی کو ایک چھٹا امریکی بھی ہلاک ہوا تھا جب کویت سے رسد کے مرکزی راستہ پر ایک فوجی قافلہ پر حملہ ہوا'' ''ایک فوجی افسر نے بتایا۔''

امریکی موجودگی کے خلاف لوگوں کی نفرت ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھ رہی تھی' امریکیوں کو سڑک پر کھڑا دیکھنا لوگوں کو مشتعل کر دیتا تھا۔ حت نامی گاؤں کے ایک بڑھئی قواصی یوسف نے جو چار بچوں کا باپ ہے کہا'' ہم ان کا ہتھیاروں کے ساتھ اس قسم کے لباس میں کھڑا ہونا پسند نہیں کر سکتے''۔ ایک عام بڑھئی کا یہ بیان نفرت کی لہر اور عراق میں پھیلتے ہوئے اشتعال کی نمائندگی کرتا ہے۔

۳۱ مئی کے نیویارک ٹائمز نے بتایا امریکی تسلط کو عراق میں جس چیلنج کا سامنا ہے وہ ایک دم سے پھٹ پڑا جب اس ہفتہ عراق سے ۹۰ میل شمال مغرب میں ایک شہر کی ریگستانی سڑک پر منگل کے دن کیپٹن واٹسن کے فوجی قافلہ پر راکٹ کے ذریعے دستی بم پھینکا گیا تیسری Armed Cavelary Regiment کے سپاہیوں نے جوابی طور پر مقامی پولیس والوں کے ذریعے حِت کے ایک قریبی علاقہ میں گھر گھر کی تلاشی لی۔ شہریوں نے بتایا کہ فوجی دروازے توڑ کر اور دیواریں پھاند کر گھروں میں گھسے جب کہ ایک جنگی ہیلی کاپٹر اوپر پرواز کرتا رہا' یہ اطلاعات شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئیں کہ امریکی فوجی گھروں میں گھس گئے ہیں کہ جہاں خواتین پوری طرح اپنے آپ کو ڈھانپ بھی نہ سکیں۔ ''ہم مسلمان ہیں اور ہم لوگوں کو گھروں میں گھسنے اور عورتوں کی

تلاشی لینے کی اجازت نہیں دیتے''، ایک مشتعل شہری نے کہا۔ بدھ کو امریکی سپاہی پولیس اسٹیشن واپس آئے تو ایک مجمع جمع ہو گیا اور سنگ باری کی۔ دو سپاہی زخمی ہوئے اور کمک فوراً پہنچی۔ شہری امریکیوں کا برتاؤ قبول نہیں کر سکتے، ایک بزرگ نے کہا۔ مجمع بڑھنے لگا اور زخمیوں کو نکالنے کے لیے سپاہی بندوقیں تان کر کھڑے ہو گئے' جب فوجی چلے گئے تو مجمع گھنٹوں ہنگامہ کرتا رہا' میونسپل عمارت اور پولیس اسٹیشن کو جلا دیا گیا کیونکہ لوگوں کے خیال میں پولیس نے سازباز کی تھی' یہی وہ موقع تھا جب اس ہفتہ چھ امریکی فوجی ہلاک اور درجن بھر زخمی ہوئے تھے۔

یہ یاد رکھیں کہ یہ ساری جنگ جو امریکی سپاہیوں اور نہتے عراقی شہریوں کے درمیان ہوئی ریگستان میں ریت کے ایک ذرہ کی حیثیت رکھتی ہے' یہ کیسی ننھی سی اور غیر اہم جگہ ہوگی لیکن یہاں بھی امریکی فوجیوں کے خلاف غصہ اور نفرت گھر کر چکا ہے۔ یہ غصہ اور نفرت اس قدر گہرے تھے کہ جن لوگوں نے امریکی فوجیوں کی مدد کی حالانکہ وہ عراقی شہری تھے لیکن ان پر بھی شدید حملہ کر کے انھیں ایک عبرت ناک مثال بنا دیا گیا۔ یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ مسلمان اپنی اقدار سے ہٹ نہیں سکتے خصوصاً عورتوں کی عزت وآبرو اس لیے لازمی ہے کہ امریکیوں کی طرف سے نئی قسم کی ثقافتی اور سیاسی اقدار لانے کی کوشش کی شدید مزاحمت کی جائے۔ امریکی جمہوریت یہ ہے کہ خواتین اپنی زندگی میں آزاد ہوں اور مردوں کے ساتھ نہانے کے تالابوں اور سمندر کے ساحلوں پر مختصر بیکینی یا نیکر پہن کر نہائیں۔ یہ سب کچھ عورتوں کی آزادی اور انسانی حقوق کے نام پر عراق میں پھیلانا ناممکن ہے' یہ تہذیبوں کا ٹکراؤ نظر آتا ہے جو کسی بڑے آتش فشاں میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

۲ رجون ۲۰۰۳ء کے نیویارک ٹائمز میں یہ کہانی چھپی کہ مسلح لوگوں نے پہلی جون کو رائفلوں اور راکٹوں سے دستی بم پھینک کر ایک فوجی قافلہ پر حملہ کیا۔ مسجد امام ابوحنیفہ کے سامنے جو گولیاں چلیں ان میں ایک امریکی فوجی زخمی اور ایک عراقی شہری ہلاک ہو گیا۔ ایک خاتون بنک مینیجر شہزاد نے چلا کر کہا: یہ شروعات ہے تم ہمارے دشمن ہو تم

ہتھیار ڈھونڈنے عراق میں گھسے تھے کہاں ہیں وہ ہتھیار؟ کچھ لوگوں نے حملوں پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا ہے وہ صدام کی واپسی چاہتے ہیں۔

لیکن مجمع میں کچھ لوگ صدام کے جانے پر خوش بھی تھے' یہ حملے اس وقت ہوئے جب امریکی فوج کافی تعداد میں فوجی بغداد کے مغرب کی طرف بھیجنا چاہتی تھی تاکہ مزاحمت کے اڈوں کو ختم کرسکیں۔ ان حملوں سے پتہ چلتا ہے کہ اتحادی تسلط کے خلاف خود بغداد میں مزاحمت کس قدر تند اور مسلسل تھی۔

یہاں ایک پڑھی لکھی بینک مینیجر عراقی خاتون بھی امریکی فوجیوں کو اپنا دشمن سمجھتی ہے اور دلی نفرت کرتی ہے' جمہوریت ہو یا نہ ہو' ترقی ہو یا نہ ہو امریکی سپاہی عراقیوں کے دل میں جگہ نہیں بنا سکتے۔ عراقی عوام تسلط سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کرچکے ہیں اور جاری مزاحمت رک نہیں سکتی۔ جب عراقیوں نے پیش کی جانے والی گاجریں لینے سے انکار کر دیا تو ریاستہائے متحدہ نے گھبراہٹ میں شدید ترین بمباری کا راستہ اپنا لیا اور بے پناہ تباہی برپا کی۔

اسی تاریخ کو نیویارک ٹائمز میں امریکی سپاہیوں پر حملوں کی ایک اور کہانی تھی۔ ایک امریکی فوجی افسر نے جو مسجد کے وقوعہ کے قریب تھا بتایا کہ حملہ ۵ بجے شام کے قریب ہوا جب نامعلوم حملہ آوروں نے ایک لائبریری سے مسجد تک پہرہ داروں پر حملہ کر دیا۔ مسجد ابوحنیفہ عراقی سنی مسلمانوں کے لیے بہت متبرک جگہ ہے اور شہریوں کو اس بات پر غصہ تھا کہ اتحادی فوجی اس کے دروازے کے سامنے مورچہ بنا کر بیٹھے ہیں۔ گولیاں چلنے کے بعد "یزیر" نامی ایک نوجوان نے "یہ ہماری سڑک ہے" "اللہ سب سے بڑا ہے" کے نعرہ پر لوگوں کو بلایا' درجنوں فوجیوں نے مظاہرین پر بندوقیں تان لیں اور انھیں مسجد کے دروازے سے پیچھے ہٹایا جبکہ دوسرے فوجی اس عمارت کی تلاشی لے رہے تھے جہاں سے گولیاں چلائی گئی تھی۔ دوسرے عراقی امریکیوں کو گالیاں دے رہے تھے۔ بصرہ کے ایک آدمی نے کہا صدام کے وقت میں زندگی اچھی تھی ہمیں غذا اور تحفظ حاصل تھا' ہم سب کو صدام چاہیے۔

فوجی کمان کے لیے ایک اور چیلنج سپاہیوں کا گرتا ہوا اخلاق ہے جو خاص طور پر تیسری انفنٹری بٹالین میں زیادہ ہی گر گیا ہے کیونکہ ان کی تعیناتی کا وقت بڑھا دیا گیا ہے۔

CNN نے ۲۶ جون ۲۰۰۳ء کو اپنی خبروں میں رپورٹ نشر کی کہ ۲ امریکی سپاہی ہلاک، ۶ زخمی، ۱۲ اغواء امریکہ کے بہترین تربیت یافتہ فوجی اپنی چوکی سے اغوا ہو گئے۔ یہ بات ان کی حالت اور لڑنے کی صلاحیت کے بارے میں بہت کچھ بتا رہی ہے۔

مزاحمت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ زیادہ منظم اور ماہرانہ ہوتی جارہی ہے جس کا مطلب ہے کہ مزید لوگ اس میں شامل ہورہے ہیں اور مزید وسائل اور مہارت اسے حاصل ہورہی ہے۔ فوجیوں کو ان کی چوکی سے اغوا کرنے کے لیے خفیہ معلومات تنظیم، ہتھیاروں، تحرک' اطلاعات چھپنے اور چھپانے کی فوجی صلاحیتوں کی ضرورت ہے جو صدام کے بچے کھچے حامی پرجوش عوامی امداد ملک کے اندر اور باہر سے ملے بغیر نہیں حاصل کر سکتے تھے۔

۲ر جولائی ۲۰۰۳ء کو CNN نے ایک نشریہ میں رپورٹ دی کہ پہلی جولائی کو ایک امریکی فوجی ایرپورٹ پر زخمی ہو گیا۔ CNN نے ۳ جولائی کو ایک نشریہ میں کہا کہ بغداد میں فوجی گاڑیوں پر حملہ ہوا اور ۷ امریکی فوجی ہلاک اور ۱۰ زخمی ہو گئے۔

جنرل ٹامی فرینکس نے House Armed Services Committee کو پہلی جولائی کو بتایا میرا خیال ہے کہ ہم مستقبل میں عراق میں ملوث ہوں گے چاہے یہ سلسلہ دو سال یا چار سال تک چلے مجھے نہیں معلوم۔

سیکرٹری خارجہ کولن پاول نے CNN کے لیے بیان ریکارڈ کروایا: مجھے افسوس ہے کہ ہم اب تک فوجی کھو رہے ہیں اور جوان مرد اور خواتین زخمی ہورہے ہیں۔ صدر بش نے صبر کرنے کو کہا یہ کہتے ہوئے کہ ریاستہائے متحدہ کو عراق میں سخت رہنا ہوگا تمام تر مزاحمت اور حملوں کے باوجود۔ جنرل فرینکس نے کہا حملے روزانہ دس سے پچیس کی رفتار سے ہورہے ہیں۔ واشنگٹن میں ایوان نمائندگان کے معترضین کی طرف سے

انتظامیہ سے عراق سے جنگ کے وجوب کے بارے میں سوالات کیے جا رہے ہیں۔

عراق میں مزاحمت مقدار' ہلاکت اور رفتار، ہر طرح سے بڑھ رہی ہے نہ صرف امریکی سپاہی بلکہ ہر سطح پر عراقی بھی قابضین کا ساتھ دینے کے لیے نشانہ بن رہے ہیں۔

۲۹ اگست ۲۰۰۳ء کے نیویارک ٹائمز میں ایک شیعہ قائد پر مہلک حملہ کی سب سے بڑی خبر چھپی جو اسلامی انقلاب کونسل کی سربراہی کر رہے تھے اور جو ابھی کچھ دن پہلے ہی ایران میں جلاوطنی سے واپس آئے تھے' یہ آیت اللہ بکر الحکیم تھے جو جمعہ کی نماز پڑھا کر نجف اشرف کی متبرک ترین شیعہ مسجد سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھنے والے ہی تھے کہ بم سے حملہ ہوا اور ان کے ساتھ ایک سو معتقدین بھی مارے گئے۔ ان کو قابض قوتوں کا ساتھ دینے کی بنا پر نشانہ بنایا گیا۔ مفادات کے حامل لوگوں نے اسے فرقہ وارانہ رنگ دے کر شیعوں اور سنیوں کے درمیان خلیج پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن مکمل طور پر ناکام رہے اور دونوں فرقے مشترکہ طور پر مزاحمت کرتے رہے پہلے کی طرح امریکی موجودگی کے مخالف یکسو رہے اور رفتار بڑھتی رہی' ایک ہفتہ پہلے آیت اللہ محمد سعید البکر کے گھر کے سامنے بم پھٹا جو آیت اللہ بکر کے رشتہ دار ہیں، اس حملے میں تین محافظ اور دس دوسرے لوگ ہلاک ہوئے۔

مزید دو فوجی زخمی ہوئے جب ان کی ''ہم وی'' (Humvee) پر راکٹ پھینکے گئے دستی بم اور ہلکی فائرنگ کے ذریعے حملہ ہوا۔ عراق کے تشدد میں دوسری جگہ دو حملوں میں ایک امریکی ہلاک اور کم از کم پانچ دوسرے زخمی ہوئے جب کہ ۲۹ مئی ۲۰۰۳ء کو نیویارک ٹائمز نے لکھا:

وسط اگست ۲۰۰۳ء تک اوسطاً روزانہ ایک امریکی فوجی ہلاک اور دو سے تین زخمی ہوئے' روزانہ ہلاکتوں کی تعداد بڑھ کر دو سے تین ہو گئی' بغاوت شروع ہونے کے بعد ۳۱ مارچ اور ۱۹ اپریل ۲۰۰۴ء کے درمیان ایک سو دس (۱۱۰) اتحادی فوجی مارے گئے اور حملوں کی تعداد روزانہ پچاس تک پہنچ گئی۔ وسط اگست ۲۰۰۳ء میں مزاحمت کاروں نے ٹرک بم کے ذریعے اقوام متحدہ کے مرکز پر حملہ کر کے ۲۳ کارکنوں کو ہلاک اور پچاس

سے زیادہ لوگوں کو زخمی کر دیا' چند ہی دنوں بعد ۲۰ ستمبر کو عراقی گورننگ کونسل کی خاتون رکن کو ایک حملہ آور نے شدید زخمی کر دیا جو بعد میں ہلاک ہو گئی' ۲۲ ستمبر ۲۰۰۳ء کو ایک خود کش حملہ آور نے اقوام متحدہ کے مرکزی دفتر پر حملہ کیا جس میں ایک محافظ کو ہلاک اور ۱۹ دوسروں کو زخمی کر دیا' یہ حملہ پہلے حملہ سے ایک ماہ بعد ہوا جب ۲۳ افراد مارے گئے تھے اور اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے زیادہ تر کارکنوں کو واپس بلا لیا تھا۔

لیکن ان تمام حملوں سے پہلے مزاحمت کاروں نے متنبہ کر دیا تھا کہ اقوام متحدہ سمیت کوئی بھی قابضین کا ساتھ نہ دے جیسا کہ ڈان میں ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو شائع ہوا اس کے بعد عراق میں گوریلا حملے زیادہ ہلاکت خیز ہو گئے۔

۱۲ اکتوبر کو جب ایک دن میں تین فوجی ہلاک ہوئے اور تو اعلیٰ امریکی جنرل نے [illegible] دشمن نے ترقی کی ہے' یہ مزید مہلک، مزید مشکل اور مزید پیچیدہ اور بعض اوقات [illegible] پرعزم ہو گئے ہیں۔ عراق میں امریکی فوجیوں کے ارضی کمانڈر ریکارڈو سانچیز نے [illegible] کہا کہ ہمیں تعجب نہیں ہونا چاہیے اگر ایک دن صبح اٹھنے پر ہمیں پتہ چلے کہ ایک بڑی [illegible] یادہشت گرد حملہ ہو گیا ہے۔ مئی سے ۲ نومبر ۲۰۰۳ تک کم از کم ایک سو بیس (۱۲۰) امریکی فوجی کام کے دوران مارے گئے۔

پیر یکم اکتوبر کو چوتھی رسالہ بٹالین کا ایک سپاہی راکٹ حملہ میں اور ایک خاتون سپاہی بم حملہ میں تکریت کے قریب اور بغداد میں ایک سپاہی منصورہ کے علاقہ میں پہرہ دیتے ہوئے گولی سے مارا گیا۔ جمعرات کو فلوجہ کی طرف تشدد جاری رہا۔ امریکی گولی سے ایک عراقی مرد ہلاک ہوا، ایک خاتون اور ایک چھ سالہ بچی امریکی پہرہ داروں پر حملہ کے بعد زخمی ہوئے۔ دو پولیس افسر بھی زخمی ہوئے۔ ۵ اکتوبر کو ڈان کی رپورٹ ہے کہ ایک سپاہی گوریلا حملہ میں ہلاک ہوا اور دو امریکی فوجی ایک مظاہرہ میں [illegible] شہریوں کے ہاتھوں بغداد اور بصرہ اور حلہ میں ہوئے۔

ڈان ۵ اکتوبر ۲۰۰۳ء کے مطابق بغداد میں ایک فوجی مارا گیا۔ امریکی فوج نے منگل کو کہا کہ دارالخلافہ میں ایک موٹر بم سے عراقی وزارت خارجہ کی گاڑی بال بال [illegible]

حال ہی میں مزید خوں ریزی کی اطلاعات ملیں جب عراقی گورننگ کونسل نے مستقبل کے عراقی دستور کے بارے میں تجاویز دیں۔ واشنگٹن کوتوقع تھی کہ ملک میں مغربی طرز کی جمہوریت آئے گی۔ دوفوجی 82 Airborne Battalion کے اور مارے گئے اوردوزخمی ہوئے۔ ۶/ اکتوبر کو ایک سپاہی Third Armed Cavalry Regiment کا ہلاک ہوااور ایک زخمی۔

۱۰/ اکتوبر ۲۰۰۳ء کے ڈان میں اسپینی سفارت کار' ایک فوجی اور کم ازکم دس عراقیوں کی ہلاکت کی کہانی شائع ہوئی ہے یہ سب جمعرات کو دومختلف حملوں میں ہوا۔ Antonio Bernet جو اسپینی سفارتخانہ میں ہوائی فوج کے سارجنٹ تھے ان کے گھر سے تین حملہ آوروں نے ان کا پیچھا کیااورانھیں ننگے پاؤں اورزیر جامہ میں ملبوس حالت میں گولی ماردی۔

ایک اوردستی بم حملہ میں بدھ کے دن تیل کے مرکز کرکوک میں گوریلوں نے ایک پولیس والے کوہلاک اور دوکوزخمی کر دیا۔فوج نے بیان کیا۔ اسی اخبار میں ۱۳ اکتوبر کو رپورٹ شائع ہوئی کہ ایک خودکش کار نے بغداد ہوٹل پر حملہ کیا جس میں کم ازکم چھ عراقی ہلاک ہوئے جو بہت ہی قلعہ بند تھا اورعام طور پر CIA کے ارکان کے استعمال میں رہتا تھا۔ایک عراقی پولیس والے نے بتایا کہ کم ازکم ۱۰ افراد ہلاک ہوئے ۔۱۳ اکتوبر کو پاکستان ٹیلی وژن کے نشریہ میں بتایا گیا کہ دوفوجی ایک بم حملہ میں ہلاک ہوئے' گورننگ کونسل کے ارکان اوروزیروں پر بھی حملے ہوئے۔

روزانہ حملوں کی مندرجہ بالا روداد سے یہ عیاں ہے کہ عراق میں مزاحمت زوروں پر ہےاورتسلط کے پہلے دن سے اب تک کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی۔

معلوم ہوتاہے کہ مزاحمت کاروں کوقابض فوج کی خفیہ اطلاعات تک رسائی حاصل ہے۔ پال وولفوٹز جوعراقی جنگ کے معمار اور نائب سیکرٹری دفاع ہیں ان کی اواخر اکتوبر ۲۰۰۳ء میں عراق آمد اور رہائش کا مقام سخت خفیہ معلومات تھیں۔ان کے قلعہ بند ہوٹل پر ۲۶ اکتوبر (ڈان ۲۷ اکتوبر) کوحملہ ہوا جب وہ میٹنگ میں خطاب کر

رہے تھے اگرچہ انھوں نے بہادری کا اظہار کیا لیکن رپورٹ ہے کہ وہ بغیر داڑھی مونڈے آئے تھے اور ان کی آواز کانپ رہی تھی' ایک ہی دن بعد گوریلوں نے دلیرانہ حملوں کا ایک سلسلہ جاری کر دیا' عراقی دارالخلافہ میں ۴۳ افراد ہلاک اور ۲۱۶ خودکش کار بم دھماکہ میں زخمی ہوئے جو صلیب احمر کے دفتر اور چالیس پولیس تھانوں پر ہوئے اور جن کی وجہ سے پورا شہر تھرا گیا۔

صلیب احمر کی عمارت میں عملہ کے ۴۵ اراکین غیر ملکی تھے۔ ایک بریگیڈیر جنرل نے کہا کہ یہ حملے غیر ملکیوں نے کیے ہیں جو عراق میں کام کر رہے ہیں لیکن اسی وقت امریکی فوج کی Fourth Infantry Battalion کے کمانڈر میجر جنرل Raymond نے اپنے تجزیہ میں کہا کہ ایک بہت ہی مختصر تعداد ان مزاحمت کاروں میں غیر ملکیوں کی ہے۔ اگلے دن صدر بش نے تحفظاتی ٹیم کی میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ بغداد میں بموں کے حملے ان کو پالیسی بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتے' ہم اپنے راستہ پر قائم رہیں گے۔ صدر نے اعلان کیا کہ انھوں نے حملہ آوروں کو پکڑنے اور انصاف کے کٹہرے تک پہنچانے کی بھی قسم کھائی ہے۔

ایک پک اپ ٹرک ایک پولیس تھانہ کے قریب پھٹا اور ۲ افراد ہلاک ہوئے اگلے دن ۲۹ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو سڑک کے کنارے نصب بم دھماکہ میں ایک امریکی ابراہامس ٹینک پہلی دفعہ ناکارہ ہوا' عملہ کے دو افسران ہلاک اور زخمی ہوئے تھے کچھ ہی دن پہلے گوریلوں نے ایک Black Hawk ہیلی کاپٹر مار گرایا اور چھ فوجی جو اس میں سوار تھے ہلاک ہوئے۔ جنوری ۲۰۰۴ء دس دنوں میں مزید تین امریکی ہیلی کاپٹر گرائے گئے اور تقریباً ایک درجن امریکی سپاہیوں کی ہلاکت ہوئی۔

ہر گزرنے والے دن کے ساتھ گوریلا فوجی اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔ پہلے وہ امریکی قافلوں پر صرف راکٹ سے دستی بم پھینک کر حملہ کر سکتے تھے یا سڑک کے کنارے بم نصب کر کے ہموی تباہ کرتے تھے اور امریکی قافلے ٹینکوں اور ہیلی کاپٹروں کے حصار میں سفر کرتے تھے لیکن جب مزاحمت کاروں نے ہیلی کاپٹر

گرانے اور ٹینکوں کو بے کار کرنے کی صلاحیت حاصل کر لی تو قابض فوجوں کو نقصان اٹھانا پڑا اور ان کی مزاحمت کاروں سے لڑنے کی صلاحیت بہت محدود ہو گئی۔ یکم مئی ۲۰۰۳ء کے بعد سے تقریباً چھٹی دفعہ اتحاد نے بیان دیا ہے کہ امریکہ مخالف فوجوں نے ہیلی کاپٹر پر حملہ کیا لیکن ۲ نومبر ۲۰۰۳ء کو شینوک ہیلی کاپٹر کا گرایا جانا اس قسم کی پہلی تباہی تھی جس میں ہلاکتیں ہوئیں۔ اس کے بعد ۷ نومبر کو ایک Black Hawk گرایا گیا اور سارے چھ فوجی جو سوار تھے ہلاک ہو گئے اس کے بعد اس دن بغداد میں بم پھٹنے کی واردات میں ایک امریکی سپاہی ہلاک ہوا جن میں سے چار اسی جگہ قافلہ پر حملہ میں زخمی ہوئے جہاں ہیلی کاپٹر گرا تھا' فلوجہ میں سڑک کے کنارے نصب بم پھٹنے سے دو غیر فوجی ٹھیکیدار جو امریکی Corps of Engineers کے لیے کام کر رہے تھے ہلاک ہوئے اور ایک زخمی ہوا' اسی طرح مزاحمت بڑھتی گئی اور نئی سمتوں میں پھیلتی رہی۔

پال بریمر نے کہا کہ اسے یقین نہیں کہ اس حملہ کی پشت پر صدام حسین تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر صدام گرفتار ہو گیا جیسا کہ بعد میں ہوا پھر بھی مزاحمت جاری رہے گی۔ بریمر نے شام کے خلاف الزام اتوار کے دن دہرایا کہ اسلامی جہادی جنھیں انتشار زیادہ تر تشدد کا ذمہ دار کہتا ہے' زیادہ تر عراق کی مغربی سرحدوں سے آتے ہیں۔ بریمر کے دونوں بیانات بتاتے ہیں کہ جاری مزاحمت کی تنظیم اور اختیارات اب اسلامی جنگجوؤں کے ہاتھ میں چلے گئے ہیں' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ویت نام والا معاملہ جہاں شمالی ویت نام سے لڑاکے جنوب میں داخل ہو گئے تھے پوری شدت سے دہرایا جانے والا تھا۔ ہر دن کے ساتھ مزاحمت برف کے گولے کی طرح بڑھتی جا رہی ہے۔ ستمبر میں ۱۶ امریکی سپاہی ہلاک ہوئے' اکتوبر میں ۳۳ اور ۱۸ ہلاکتیں نومبر ۲۰۰۳ء کے پہلے دو دنوں میں۔ اوپر سے امریکی ہلاکتیں شمالی عراق میں موصل کے علاقہ میں ہونا جواب تک امریکہ کے خلائی حملوں سے نسبتاً محفوظ رہا تھا اس پروپیگنڈے کو غلط ثابت کرتا ہے کہ مزاحمت صرف سنی مثلث میں ہو رہی ہے۔

عوامی رجحان پر CIA کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ عراق میں سیاسی صورت

حال کس طرح قابو سے باہر ہوگئی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا: اگرچہ جارج بش کی انتظامیہ بغداد سے آنے والی بری خبروں میں متواتر اضافہ کے سامنے بہادری کا مظاہرہ کررہی ہے لیکن صاف پتہ چل رہا ہے کہ وہ پریشان بلکہ گھبرائے ہوئے ہیں کہ اب کیا کریں؟ ناصریہ کے نیم فوجی مرکز پر حملہ میں ۱۵ اطالوی نیم فوجیوں کی ۱۰ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہلاکت کی خبر بش انتظامیہ کو ہلا دینے والی تھی کیونکہ ناصریہ اب تک پرامن تھا اور سب سے بڑھ کر یہاں شیعہ آبادی زیادہ تھی' اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ امریکی قیادت میں عراق پر تسلط کے خلاف مزاحمت بڑھ کر قابو سے باہر ہوچکی ہے۔ یہ ایک مشکل صورت حال ہے۔ اتحادی عبوری اقتدار کے سربراہ بریمر نے ۱۳ نومبر ۲۰۰۳ء کو قصر ابیض سے باہر آتے ہوئے اخبار نویسوں کو بتایا۔

CIA کی رپورٹ میں مزید اجاگر کیا گیا کہ عراقیوں میں غیر ملکی تسلط پر مایوسی اور تلخی بڑھ رہی تھی اور اب زیادہ تعداد میں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ غاصب حکومت کو شکست دی جا سکتی ہے اور وہ مزاحمت کاروں کی مدد کررہے ہیں۔ رپورٹ نے امریکی عقابوں میں پریشانی کا بھی انکشاف کیا جنھوں نے سمجھ داری کے مشوروں کے خلاف بش کو عراق کے مسئلہ کے بارے میں غلط راستہ پر لگایا۔ ان میں نائب صدر ڈک چینی اور پینٹاگون کی غیر فوجی قیادت شامل ہے۔ CIA کی رپورٹ میں دلیل دی گئی کہ عراق میں امریکی اداروں کے بارے میں عوامی شکوک بہت زیادہ تھے۔

اس تجزیہ کی بغداد میں GALLOP رائے شماری سے بھی تصدیق ہوتی ہے جس نے بتایا کہ بریمر کی چنی ہوئی عراقی کونسل کو سرے سے کوئی عوامی حمایت حاصل نہیں ہے۔ اس رپورٹ نے ایک ڈراؤنے رجحان پر روشنی ڈالی یعنی متسلط مقتدرہ اور شیعہ آبادی کے درمیان اختلاف بغداد میں بھی اور جنوبی علاقوں میں بھی پایا جاتا ہے جو بڑھ کر کھلی لڑائی میں تبدیل ہوسکتا ہے۔ یہ ایک ایسی ناگہانی صورتحال ہے جو پچھلے مارچ میں حملوں کے بعد سے واشنگٹن کے لیے بھیانک امکان رہی ہے۔ اور یہ امکان اس وقت حقیقت بن گیا جب مقتدیٰ نے بغاوت کا اعلان کردیا جس کی وجہ سے جنوبی اور

وسطی عراق میں تصادم کے شعلے بھڑک اٹھے اور اتحادی فوجیوں کی بھاری ہلاکتیں ہوئیں۔

فوجی محاذ پر ستمبر۔اکتوبر۲۰۰۳ء تک روزانہ حملوں کی تعداد تیس (۳۰) تک بڑھ گئی جو تین ماہ پہلے کے مقابلے میں دگنے سے زیادہ تھا۔امریکی کمانڈار جنرل رکارڈو سانچیز کے مطابق صرف پچھلے دو ہفتوں میں چالیس (۴۰) سے زیادہ امریکی فوجی مارے گئے۔ سانچیز نے یہ بھی کہا کہ مزاحمت کاروں کے نشانوں اور حکمت عملی میں بہتری علاقائی اور قومی سطح پر بہتر اشتراک اور منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔اس طرح مزاحمت کار ہرسمت میں بڑھ رہے تھے' حکمت عملی تدابیر اور تنظیم میں۔امریکی فوج کا فیصلہ کہ سختی سے کام لیں جو تکریت کے قریب بے تحاشا بمباری کی صورت میں عمل میں آیا الٹا پڑ گیا' بغداد میں دو درجن دھماکے سنے گئے جبکہ امریکہ گوریلوں کے ٹھکانوں پر حملے کر رہا تھا۔

سیاسی محاذ بھی اتنا ہی تاریک اور پرشور نظر آ رہا تھا۔انتظامیہ حالات کو معمول پر لانا اور ملک میں جمہوری عمل جلد لانا چاہتی تھی جبکہ بریمر عراقی گورننگ کونسل کے چوبیس (۲۴) ارکان پر اعتماد کھو چکے تھے جن میں پینٹاگون کے من پسند احمد شیلابی بھی تھے نتیجتاً قصر ابیض نے پہلا منصوبہ ترک کر کے اس کے بجائے افغانستان کی طرز پر عبوری حکومت قائم کرنے پر غور شروع کیا جو آئین بنانے کے عمل کی نگرانی کرے۔لیکن افغانستان میں اتحاد کے پاس پورے کے پورے شمالی اتحاد کی حمایت اور کرزئی کی شخصیت موجود تھی جو عبوری حکومت کی قیادت کرتے۔جبکہ عراق میں ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تھی۔اور کرزئی حکومت بھی کوئی کامیابی کی داستان نہیں جبکہ اس کا اختیار کابل سے آگے کہیں نہیں ہے۔

ریاستہائے متحدہ نے اپنے اتحادی برطانیہ کے ساتھ واپسی کی دوشاخہ پالیسی کا اعلان کیا۔تسلط کا اگلے سال کے اواخر تک ختم کرنا لیکن اپنی فوج کو ۲۰۰۶ء تک علاقہ میں مقیم رکھنا۔یہ ایک امریکہ نواز حکومت قائم کرنے کے برابر تھا جسے افواج کی پشت

پناہی حاصل ہو۔ یہی ہے جس کی مزاحمت اس قدر پُر قوت ہے اور جب تک ایسی حکومت عراق میں چلے گی مزاحمت جاری رہے گی پوری شدت اور غضب ناکی کے ساتھ۔ ریاستہائے متحدہ کے لیے کوئی باعزت واپسی کی راہ نہیں ہے۔ عراق کی دلدل امریکہ کے ویت نام کے تجربہ سے کہیں زیادہ پرفریب ثابت ہوگی۔

اس وقت تک گوریلے جارحانہ انداز اختیار کر چکے تھے اور اعلیٰ فوجی نشانوں اور اپنی پسند کے نشانوں پر حملہ کرنے کی صلاحیت کی نمائش کر رہے تھے۔ ان کے نشانوں میں تیل اور گیس کی پائپ لائنیں بھی شامل ہیں۔ ڈان ۲ نومبر کے مطابق انھوں نے حملہ کر کے ایک گیس پائپ لائن اڑادی جو بغداد سے دوسو پچیس (۲۲۵) کلومیٹر شمال میں تھی۔ الحجاج کے علاقہ میں کرکوک سے تاجی کی طرف جانے والی تیل کی پائپ لائن پر دھماکہ ہوا اور آگ لگ گئی۔ ۱۷ نومبر کو پائپ لائن پر ایک اور بم دھماکہ ہوا۔ گوریلوں نے شمالی عراق میں دو اور امریکی فوجیوں کو ہلاک کیا۔ ۱۲ نومبر کو ناصریہ میں ایک ایسا ہی مہلک خودکش حملہ ہوا اور شیعہ اکثریت کے علاقہ میں ۱۷ اطالوی اور ۸ عراقی مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے' صرف تین دن بعد ۱۵ نومبر کو انھوں نے دو ہیلی کاپٹر مار گرائے جن پر بارہ (۱۲) افراد سوار تھے۔ یہ صدر بش کے اس اعلان کا جواب تھا کہ وہ عراق سے جلدی واپس نہیں جائیں گے کیونکہ عراق میں تشدد ہو رہا ہے اور ایسا کرنا ان کے اپنے ملک کے لیے خطرناک ہوگا' ہمارا مصمم ارادہ یہاں رہنے اور لڑنے کا ہے۔ یہ عہد بالکل ویسا ہی ہے جیسا صدر جانسن ویت نام میں ہر شکست پر کیا کرتے تھے۔ انھوں نے فوجی کمک مانگنے کا سلسلہ جاری رکھا اور ویت نام پر بمباری کرتے رہے۔ جتنا وہ جنگ کو شدید تر کرتے رہے اتنا ہی زیادہ الجھتے رہے یہاں تک کہ امریکہ میں جنگ مخالف تحریک نے اس حد تک شدت اختیار کر لی کہ امریکہ کو شرمناک واپسی پر مجبور ہونا پڑا۔

تین ہیلی کاپٹروں کے یکے بعد دیگرے گرائے جاتے ہی تین دنوں کے اندر صدر بش کو اپنا تھوکا چاٹنا پڑا کہ وہ امریکی فوجوں کو واپس نہیں بلائیں گے۔ جب امریکی

تعینات کردہ عراقی گورننگ کونسل نے ۱۵ نومبر کو اعلان کیا کہ عبوری حکومت اگلے سال (۲۰۰۴ھ) جون تک اقتدار سنبھال لے گی ۔ایک دن بعد ۱۶ نومبر کو جیسا کہ Observer News Service نے بیان کیا جارج بش اور ٹونی بلیر نے اعلان کیا کہ اتحاد اگلے سال اختتام (۲۰۰۵ء) تک قبضہ ختم کردے گا جب کہ ۲۰۰۶ء تک فوجیں وہاں رکھے گا۔ یہ عراق سے کسی قسم کی واپسی کی طرف، پہلا اشارہ تھا، بغیر عراق میں امن یا جمہوریت کے ساتھ مشروط کیے ہوئے۔

جب صدر بش اپنی بہادری دکھا رہے تھے بغداد میں ان کے نائب نے عہد کیا کہ اقتدار عراقیوں کو منتقل کرنے میں جلدی کریں گے۔ بریمر نے بغداد میں اخباری کانفرنس میں کہا کہ امریکی قیادت میں اتحاد عراقی حکومت کو اقتدار جلد منتقل کرنے کے ذرائع اور طریقے وضع کرے گا۔ ایسا لگتا ہے کہ صدر بش اور عراق میں امریکی انتظامی مقتدرہ کے سربراہ دو مختلف آوازوں میں بول رہے ہیں۔ جب صدر بش مزاحمت کاروں کو دھمکا رہے تھے بریمر ان کو بہلانے کی کوشش کر رہے تھے جیسا کہ AFP نے رپورٹ کیا (ڈان، ۱۹ نومبر ۲۰۰۴ء) عراق کے عبوری انسانی حقوق کے وزیر عبدالباسط ترکی نے امریکہ کی زیر قیادت فوجوں پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا الزام لگایا۔ عراقی وزیر نے اتحادیوں کی غلط کاریوں سے نشانہ بننے والوں کے لیے معاوضہ بھی طلب کیا جیسا کہ اقوام متحدہ کی قرارداد ۱۴۸۳ میں کہا گیا تھا جس میں ناکامی پر وزیر نے عدالتی کارروائی کی دھمکی دی۔ اس طرح امریکی قابض انتظامیہ خود اپنے چنے ہوئے وزیر سے جھگڑے میں مبتلا ہو گئی۔ یہی نظر آیا کہ ریاستہائے متحدہ کے پاؤں کے نیچے سے ریت تیزی سے نکل رہی تھی۔ ریاستہائے متحدہ کے لیے بہتر یہی ہے کہ اچھے وقت میں واپس ہو جائے۔ صدر بش کے برطانیہ کے دورہ میں جہاں ٹونی بلیر کی حکومت ان کی سب سے بڑی حمایتی تھی، ایک لاکھ افراد نے جارحانہ مظاہرہ کر کے ان کا استقبال کیا۔ لندن کے میئر نے بش کو ''کرہ ارض میں حیات کے لیے سب سے بڑا خطرہ'' قرار دیا۔

بالکل اسی طرح جیسے ویت نام مخالف برف کا تودہ امریکہ پر سے گزرا تھا۔ عراق

سے فوجوں کی واپسی کے لیے تحریک اور شورش کی ریت کا طوفان جمع ہونا شروع ہو گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ نظر انداز کیے جانے والوں کی تاریخ کو ایک شدت کے ساتھ اپنے آپ کو دہرانے کی عادت ہوتی ہے۔ ویت نام عراق میں اپنے آپ کو پوری شدت سے دہرا رہا ہے۔

۲۰۰۲ء کے آخری چند مہینوں سے تشدد کے نمایاں واقعات نے متسلط مقتدرہ کی غیر ملکی سفارت کاروں، گورننگ کونسل کے ارکان، CIA کے ارکان اور دوسرے اعلیٰ امریکی افسروں کی حفاظت میں مکمل نااہلی کو واضح کر دیا۔ یہاں تک کہ عراقی جنگ کے معمار جناب وولفوٹز بھی نشانہ بنائے جانے سے بچ نہ سکے۔ اگرچہ شکار ہونے سے بال بال بچ گئے۔ ۱۸ر نومبر کے قریب عبوری قابض حکومت کے بے حد قلعہ بند مرکز پر بھی بغداد شہر میں نشانہ لگایا گیا۔

۷امئی ۲۰۰۴ء کی بغداد میں عراقی گورننگ کونسل کے سربراہ کا قتل قابض فوجوں کی اہم شخصیات تک کی حفاظت میں ناکامی کی ایک مثال ہے۔ اس سے پہلے مقتدر اعلیٰ بریمر اور علاقائی کماندار ابی زید بال بال بچ چکے تھے۔ اس طرح آزاد انتخابات کی غیر موجودگی میں عراقیوں نے امریکی قبضہ کے خلاف اپنا فیصلہ بندوق کی نال سے دیا ہے۔

عراقی جنگ پر اپنے سروے میں ایرک مارگولس نے (ڈان ۱۹ جنوری اور ۲۲؍ مارچ ۲۰۰۴ء) ہلاکتوں کا اندازہ دس ہزار تک لگایا ہے جس میں سے ایک ہزار پانچ سو بیس (۱۵۲۰) امریکی تھے اور جنگ کے کل اخراجات جن میں عراق کی تعمیر نو شامل ہے ۲۰۰۳-۴ء کے لیے دو سو بلین ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔ یہ رقم خالی خزانہ کو قرض لینی پڑے گی جو پہلے ہی چار سو بلین ڈالر کے خسارہ میں ہے جو کساد بازاری کی صورت میں ڈالر کی قدر مزید گرانے کا باعث ہوسکتا ہے۔ جنگ کا انسانی نقصان بھی بڑھ رہا ہے، مارچ ۲۰۰۴ء کے تیسرے ہفتے تک پانچ سو پچپن (۵۵۵) افراد مارے جا چکے تھے اور نو ہزار اموات لڑائی میں لگے ہوئے زخموں اور شدید بیماریوں کی وجہ سے ہوئیں۔ بیس ہزار

عراقی شہری اندازاً مارے جا چکے ہیں۔مزاحمت شدید تر ہوتی جا رہی ہے جس میں امریکیوں اوراُن کے اتحادیوں کی جانیں جارہی ہیں۔

صدام حسین کی گرفتاری اوراس سے پہلے ان کے دو بیٹوں کی گرفتاری اورامریکی فوجوں سے لڑائی میں ہلاکت سے مزاحمت کی شدت میں کوئی کمی نہ آئی بلکہ یہ مزید تیزی سے بڑھی اور گوریلوں کی قیادت متشدد اسلامیوں کے ہاتھ میں چلی گئی جومختلف ملکوں سے عراق پہنچ رہے تھے۔صدام کی باقیات اور بعث پارٹی میں خودکش حملہ میں ایک سو سنتالیس (۱۴۷) افراد ہلاک ہوئے جس سے امریکی تسلط کے لیے کام کرنے والوں کو سخت دھچکا لگا جن کی تعداد سات سو (۷۰۰) تھی۔شمالی عراق میں دو کُرد جماعتوں کے خلاف جوامریکہ کا ساتھ دے رہے تھے دو خودکش حملوں میں یکم فروری ۲۰۰۴ء کو سو (۱۰۰) سے زیادہ کردوں کی ہلاکت ہوئی۔مزاحمت کاروں نے ۱۰اور۱۱فروری کوتین حملے کیے جوعراقی پولیس کے بھرتی کے مراکز پر تھےاور کچھ دنوں بعد جنرل ابی زید کی آمد کے وقت فوجی احاطہ پرحملہ ہوا۔اس احاطہ پر ایک ہفتہ بعد پھر۲۳ فروری کوحملہ ہوا' جب ایک خودکش بمبار نے شمالی عراق کے کرد علاقہ میں ایک پولیس اسٹیشن سے اپنی کار ٹکرادی اور۱۳ افراد ہلاک اور اکیاون (۵۱) زخمی ہوئے۔۱۸ جنوری کو امریکی قیادت کے مرکز پرشدیدقسم کی خودکش بمباری سے ایک سوپچیس (۱۲۵)افراد ہلاک اور ایک سو تیس (۱۳۰)زخمی ہوئے۔دھماکہ اس وقت ہوا جب عملہ صدام حسین کے سابق محل میں داخل ہونے کے لیے قطار میں کھڑا تھا جہاں اتحادیوں نے اپنا مرکز قائم کیا ہوا تھا۔دو امریکی سپاہی ہلاک ہوئے تین سپاہی اور تین شہری ٹھیکیدار زخمیوں میں شامل تھے۔اس کے بعد سے خودکش حملے مزید بڑھ گئے اور ہر روز بیس سے تیس اتحادی سپاہی اور حمایتی مارے جارہے ہیں۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مزاحمت کار بے حد محفوظ اوراہم فوجی جگہوں پر بھی حملہ کرسکتے ہیں اور کرد علاقوں میں بھی امریکہ کی حامی کرد قیادت کوچیلنج کرسکتے ہیں جس کے پاس پچھتر ہزارافراد پر مشتمل اچھی طرح مسلح فوج ہے۔

۱۸ جنوری ۲۰۰۴ء کو AFP کی رپورٹ کے مطابق عراقی گوریلے بہتر سے بہتر ہتھیار امریکی طیاروں پر حملہ کے لیے استعمال کر رہے ہیں جب کہ اعلیٰ فوجی افسروں نے نیویارک ٹائمز کو ۱۸ جنوری کو بتایا کہ ایک خفیہ فوجی مطالعہ سے پتہ چلا کہ گوریلوں نے دستی بم اور ساتھ ہی حرارت کا پیچھا کرنے والے زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائیل فوجی ہیلی کاپٹروں پر حملہ کے لیے استعمال کیے۔ فوجی افسر خاص طور پر اس بات پر فکر مند تھے کہ کم از کم ایک موقع پر گوریلے نے SA-16 کندھے پر رکھ چلانے والا میزائیل استعمال کیا جس میں ایسا ترقی یافتہ رہنمائی کا نظام نصب تھا جس سے بچنا پائلٹ کے لیے مشکل تھا۔ ہر امریکی جہاز گرنے کے ساتھ دشمن کو نئی کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ ذرائع ابلاغ کے لیے یہ ایک بڑا موضوع بن گیا کہ آخر کون جیت رہا تھا۔ ۲۵ اکتوبر سے فروری ۲۰۰۴ء تک کئی فوجی ہیلی کاپٹر گرائے جا چکے تھے یا انھیں کریش لینڈ کرنا پڑا تھا۔ اور کل تین سو انچاس (۳۴۹) فوجی ہلاک ہوئے تھے مارچ اور اپریل ۲۰۰۴ء میں مزید ہیلی کاپٹر گرائے گئے اور ۲۰۰۵ء میں بھی ان کی تعداد خاصی تھی۔

۱۷ مارچ ۲۰۰۴ء کو ایک ہوٹل میں کار بم پھٹا جس میں اٹھائیس (۲۸) افراد ہلاک اور اکتالیس (۴۱) زخمی ہوئے۔ امریکی‘ برطانوی اور مصری اس ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ رائٹر نے ۴ اپریل کو اپنی رپورٹ میں کہا کہ مزاحمت کار اپنی جنگ آزادی کو سمندر پر بھی لے جا رہے ہیں۔ انھوں نے بصرہ میں سمندر کنارے تیل کے ٹرمینل پر تین کشتیوں سے حملہ کیا جس کے نتیجہ میں پورا ٹرمینل جہاں سے تیل برآمد ہوتا تھا بند ہو گیا۔ نئی عبوری حکومت کے اقتدار سنبھالنے کے بعد خودکش بمباریاں زیادہ سریع اور مہلک ہو گئی ہیں۔

بغاوت کا پھوٹ پڑنا

سال بھر جاری رہنے والی مزاحمت جو صدام کے پکڑے جانے کے باوجود جاری تھی اپریل ۲۰۰۴ء کے پہلے ہفتہ میں مکمل بغاوت بن کر پھوٹی جب نسبتاً کم عمر اور

پرجوش شیعہ افراد جو مقتدیٰ الصدر کے زیر قیادت تھے اور اب تک مزاحمت میں زیادہ پُرجوش نہیں تھے بالکل سر کے بل امریکی تسلط کے خلاف جنگ آزادی میں کود پڑے اب تک متسلط مقتدرہ اِس خود فریبی میں مبتلا تھی کہ مزاحمت چھوٹی سی سنی مثلث تک محدود ہے جو صدام کی باقیات کا گڑھ ہے۔

اس خود فریبی کے شکنجہ میں بریمر کی قابض حکومت نے مقتدیٰ کے زیر قیادت شیعوں کی طاقت اور ارادوں کی مضبوطی کا غلط اندازہ لگایا اور ان کے اخبار الحوضہ کو بند کرنے اور پھر ایک اہم نائب یعقوبی کو گرفتار کرنے کی حماقت کی۔ نتیجتاً مشتعل مظاہرے پھوٹ پڑے جو قابض حکومت کے خلاف بے حد متشدد رخ اختیار کر گئے۔

Chairman joint Chief of Staff جنرل مائرز نے ایک بیان میں جاری شورش کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کی اور اصرار کیا کہ شدت پسند شیعوں سے جنگیں ایسی نہیں جن کو حکومت کے خلاف عوامی بغاوت کہا جاسکے۔ ان کے بیان کے مطابق یہ صرف ایک گوریلا لڑائی تھی جس میں آبادی کا ایک بہت ہی مختصر سا حصہ ملوث تھا۔ یہاں یہ نشان دہی ضروری ہے کے گوریلا صرف ضرب لگا کر بھاگ جانے کا نام ہے اور اس میں باقاعدہ جم کر لڑائی نہیں ہوتی جب کہ جنرل نے بتایا کہ لڑائی ہو رہی تھی۔

ہزاروں شیعہ اور سنی فلوجہ میں امریکی بمباری کے شکار لوگوں کی غذا اور دوائیں پہنچانے جب فوجی چوکیوں سے لڑتے ہوئے گزر رہے تھے تو یہ گوریلا جنگ سے آگے کی چیز تھی۔ ایک امریکی فوجی افسر نے اعتراف کیا کہ امریکی فوجیں اس مشن کے ساتھ فلوجہ گئی تھیں کہ دشمنوں کو گرفتار کریں گی اور وہاں کے شہریوں سے مصافحہ کریں گی، لیکن فلوجہ میں انھیں پتہ چلا کہ ہر شخص ان کا دشمن ہے' یہ بات جنرل مائرز کی بات کو حتمی طور پر غلط قرار دیتی ہے۔

مقتدیٰ الصدر نے مسجد میں ایک بیان پڑھ کر حکومت کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا اور اپنے حامیوں سے کہا کہ مظاہروں سے آگے بڑھ کر اب دوسرے ذرائع استعمال

کریں۔

بغداد کے صدرسٹی اور کوفہ میں تشدد اور مار دھاڑ شروع ہوگئے۔ جس کے ساتھ ہی جنوبی عراق کے تقریباً ان تمام دوسرے شہروں میں ردعمل شروع ہوگیا۔ ہلاکتوں کی شرح مختلف تھی لیکن زیادہ تر نئی اطلاعات سے پتہ چلتا تھا کہ ۱۴ اپریل سے ۱۷ اپریل تک دوسو (۲۰۰) ہلاکتیں ہوئی تھیں جن میں ۱۵ امریکی فوجی رمادی میں ایک ہی واقعہ میں مارے گئے تھے۔ ۱۶ اپریل (ڈان ۱۷ اپریل) کی ایک خبر کے مطابق دارالخلافہ کے شمال میں مختلف جھڑپوں میں بیس (۲۰) قابض فوجی مارے گئے تھے۔

چار امریکی شہری ٹھیکیداروں کے قاتلوں کا پیچھا کرنے والے امریکی ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کو فلوجہ میں خونخوار مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ فلوجہ میں ایک مسجد پر بمباری کی گئی جس میں مبینہ طور پر عبادت میں مشغول چالیس (۴۰) عراقیوں کی ہلاکت ہوئی۔ جنرل کمٹ نے اعلان کیا کہ اگر مسجدوں کو فوجی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا تو امریکی فوجیں مسجدوں پر بمباری کرنے سے نہیں ہچکچائیں گی۔ فلوجہ میں اپریل کے پہلے ہفتہ میں امریکی فوج کی کارروائی میں چھ سو (۶۰۰) عام شہری ہلاک اور بارہ سو (۱۲۰۰) زخمی ہوئے جن میں سے نصف معمر افراد، عورتیں اور بچے تھے۔ جب کہ ستر (۷۰) امریکی فوجی ہلاک ہوئے تھے۔ جنوب میں ۱۵ عراقی ہلاک ہوئے اور ۱۲ اطالوی سپاہی زخمی ہوئے' ایک جنگ کے دوران جو مقتدیٰ الصدر کے حامیوں سے پلوں کا قبضہ چھڑانے کے لیے ہوئی تھی۔ عراق پر قبضہ سے ۵، اپریل تک چھ سو گیارہ (۶۱۱) امریکی فوجی مارے جا چکے تھے۔ ۸، اپریل کی اخباری رپورٹ (ڈان ۹، اپریل) نے بتایا کہ ایک خونی جنگ میں پینتالیس (۴۵) امریکی سپاہی اور سینکڑوں عراقی ہلاک ہوئے اور بڑی تعداد میں کورین اور جاپانی اغواء ہوئے۔ رائٹرز کی رپورٹ کے مطابق جو ۳۰، اپریل کی ہے صرف اپریل میں ایک سو ستائیس (۱۲۷) امریکی فوجی ہلاک ہوئے۔

عراق میں واشنگٹن کے فوجی کماندار جنرل رکارڈو سانچیز نے ایک اخباری

کانفرنس میں اعتراف کیا کہ مہدی افواج نجف اور قط کے وسط میں شہروں اور پولیس تھانوں اور پولیس کی عمارتوں پر قابض ہیں جبکہ امریکی قیادت میں فوجیں شہروں سے باہراڈوں میں ہی ہیں۔ عراقیوں کی طرف سے سخت جنگ مرین کمانداروں کو ویت نام کے بھیانک خواب دکھانے لگی۔ صدر بش کے امریکی ناقدین پہلے ہی ویت نام قسم کی دلدل کے خوف میں مبتلا تھے۔ بغداد کے جنوب میں پولش اور بلغارین فوجوں کا مقابلہ مقتدی کے حامیوں سے کربلا میں ہو رہا تھا اور اطلاع تھی کہ پینتیس (۳۵) امریکی اور اتحادی فوجی اور سینکڑوں عراقی اس ہفتہ (جو ۴ اپریل کو شروع ہوا تھا) عراق میں دوطرفہ لڑائی میں مارے گئے تھے۔ اب تک مزاحمت زیادہ تر بغداد کے آس پاس سنی مثلث ہی میں محدود رہی تھی۔ فلوجہ اور رمادی جیسے شہروں پر حملوں کے نتیجہ میں شیعہ بغاوت شیعہ سنی اتحاد کا اظہار تھی کہ وہ امریکی قابض فوجوں کے خلاف شانہ بہ شانہ کھڑے ہیں۔ ہزاروں سنی اور شیعہ مظاہرین بغداد کی مسجد اُمّ القریٰ کے سامنے جمع ہو کر فلوجہ' کربلا اور دوسرے متحارب علاقوں کے حق میں نعرے لگا رہے تھے اتحاد کا ایک فقید المثال مظاہرہ اس وقت ہوا جب شیعہ تشدد پسندوں نے وسطی اور جنوبی عراق میں قابضین کے خلاف کھڑے ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ مظاہرین کا نعرہ تھا شیعہ نہیں سنی نہیں صرف اسلامی اتحاد جوام القریٰ سے فلوجہ والوں کے لیے دوائیں اور غذائی سامان لے کر چلے تھے اور مقتدیٰ الصدر اور حماس کے روحانی پیشوا احمد یٰسین کی تصویریں اٹھائے ہوئے تھے۔ مسجد کے امام شیخ احمد عبدالغفور نے کہا ہم اپنے بھائیوں کے ساتھ اتحاد کا اظہار کرنا چاہتے ہیں جن پر جنگی جہازوں اور ٹینکوں سے بم برسائے جا رہے ہیں۔ یہ جہاد کی ایک قسم ہے' جن لوگوں پر قبضہ کیا جائے ان کو مزاحمت کا حق حاصل ہے۔ ہزاروں شیعہ فلوجہ کے سنی بھائیوں کے لیے خون کا عطیہ دینے کے لیے قطار در قطار کھڑے تھے۔

مقتدیٰ الصدر کے اسلامی دنیا کے آسمان پر رہنما سیارہ کی طرح طلوع نے اسلامی اتحاد اور بھائی چارہ کی علامت اور امریکی قبضہ کے خلاف ایک عظیم جہادی کی حیثیت نے بڑی حد تک السیستانی کی اہمیت اور کشش کو گہنا دیا۔ اب تک وہی ایسے شیعہ مذہبی

رہنما تھے جن کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ زیادہ تر شیعوں کی وفاداریاں انھی کے ساتھ ہیں۔ قابض مقتدرہ انھی کی متوقع یا موعودہ مدد پر انحصار کر رہی تھی۔

امریکی فوجی کمانداروں نے دھمکی دی تھی کہ اگر مقتدیٰ نے ان کی دی ہوئی تاریخ پر ہتھیار نہ ڈالے تو وہ یا تو انھیں قتل کر دیں گے یا نجف پر حملہ کریں گے۔ لیکن اس تاریخ کے گزرنے کے بعد بھی حملہ نہ ہوا یہاں تک کہ ۲۶/اپریل کو مقتدیٰ کوفہ کی مسجد میں عوام کے سامنے آئے اور اقوام متحدہ سے عراق کے لیے امن فوج بھیجنے کی اپیل کی اور امریکی فوج سے فوراً واپسی کے لیے کہا۔ سیستانی نے بھی جن کے بارے میں خیال تھا کہ قابضین کے ساتھ ہیں مقتدیٰ کا ساتھ دیا اور اتحادی فوجوں کو تنبیہ کی کہ کربلا اور نجف سے دور رہیں۔ مقتدیٰ نے مزید خبردار کیا کہ اگر کربلا یا نجف پر حملہ ہوا تو خودکش حملے شروع ہو جائیں گے۔ سنی مذہبی رہنماؤں نے مقتدیٰ کی تنبیہ کی طرز پر قابض مقتدرہ کو خبردار کیا کہ اگر فلوجہ پر حملہ ہوا تو پورا عراق فلوجہ بن جائے گا' اس سے بغاوت کے عمل میں شیعوں اور سنیوں کے قریبی اشتراک کا پتہ چلتا ہے۔ قابضین نے ڈوبتے ہوئے انسان کو تنکوں کا سہارا لینے کی طرح آخری حربہ کے طور پر بعث پارٹی والوں سے مصالحت کر لی جن کی ترکیبوں کے ذریعے صدام نے عراق پر اپنا ظلم و جبر مسلط کر رکھا تھا۔ قابض حکومت نے رائٹرز کے مطابق ۲۲، اپریل ۲۰۰۴ء کو گھبراہٹ میں صدام کے ایک سابق جنرل صالح سے رجوع کیا کہ وہ فلوجہ میں لامتناہی شورش کو ختم کرنے میں مدد کریں۔

اطلاعات کے مطابق جنرل اپنی بعثی وردی میں فلوجہ کی سڑکوں سے گزرے اور مجمع نے جو بعثی پرچم لہرا رہا تھا ان کا استقبال کیا۔ پرانے صدامیوں کی طرف اس شرمناک رجعت نے نہ صرف شیعوں بلکہ امریکی مرین فوجوں میں بھی اشتعال پیدا کیا۔ اس کو قابض حکومت کی طرف سے سخت مایوسی اور ناکامی کی حالت میں ہاتھ کھڑے کر دینے کے علاوہ کیا کہا جا سکتا تھا۔ احمد شیلابی تک نے جو پینٹاگون کے دوستوں سے بھی بڑھ کر دوست تھے اس کو ایسا عمل قرار دیا کہ جیسے دوسری جنگ عظیم کے

بعد نازیوں کی مدد طلب کی جا رہی ہو۔ چند دنوں بعد (۲۶ اپریل) گورننگ کونسل کے صدر نے فلوجہ اور نجف میں خونریزی اور جاری تشدد کا ذمہ دار اتحادی فوجوں کو ٹھہرایا۔ اب لگتا تھا کہ مقتدیٰ الصدر میں، جو نہ صرف عراقیوں بلکہ پوری اسلامی دنیا کی امیدوں کے نمائندہ تھے آیت اللہ خمینی کی ژرف بینی اور احمد یٰسین کی شعلہ نوائی دونوں موجود ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو حماس سے منسلک کیا جو خالصتاً سنی جہادی جماعت ہے اور ساتھ ہی حزب اللہ سے جو خالصتاً شیعہ جہادی جماعت ہے۔ اس لیے ان کی قیادت علاقائی اور فرقہ وارانہ ثقافتوں سے اوپر اٹھ کر اسلامی اتحاد اور استحکام کی تعمیر نو کی علامت بن گئی ہے۔ ہزاروں سنی اور شیعہ امریکی چیک پوسٹوں پر لڑتے بھڑتے فلوجہ کے گھرے ہوئے لوگوں کے لیے دوائیں اور غذا لے کر گئے جنھیں امریکی مرین فوجی کچلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اخبار الحوضہ کی بندش اور مقتدیٰ کے قریبی معتمد کی گرفتاری نے عراق کی اتحادی حکومت میں دراڑ ڈال دی یہاں تک کہ وزیر داخلہ نے استعفیٰ دے دیا اور وزیر مواصلات البانی نے اِس اقدام پر ناپسندیدگی اور تعجب کا اظہار کیا۔ کہا گیا ہے کہ چار وزیروں نے اتحادی کابینہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔

اتوار ۴ / اپریل ۲۰۰۴ء کو مظاہرین فردوس اسکوائر میں جمع ہو گئے۔ امریکی ٹینک مجمع کا نشانہ لیے ہوئے تھے کہ دو نوجوان عمارت کی چھت پر چڑھ گئے اور عراق کی نئی فوج کے ایک بورڈ کو چاقو سے چیر ڈالا۔ اسکوائر کے سامنے ایک بغیر چہرہ مجسمہ تھا اور اب امریکیوں نے صدام کے گرائے ہوئے اِس مجسمہ کو مقتدیٰ کی تصویروں سے بھر دیا تھا۔

ریاستہائے متحدہ کو دیرینہ امید تھی کہ شیعہ سنی ایک دوسرے کے مخالف ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگیں گے۔ مگر اِس میں باوجود کئی کوششوں کے اب تک کامیابی نہیں ہو پائی۔ باغیوں سے علی سیستانی کی پرسکون اور اطمینان بخش گفت وشنید کے ذریعے اختلافات ختم کرنے کی اپیل کو المقتدیٰ کے حامیوں نے ویسی ہی حقارت سے نظر انداز کر دیا جیسا کہ چاہیے تھا۔ اِس اپیل کا مطلب قابض حکومت کو

تسلیم کر لینا اور اسے جائز اور قانونی قرار دینا تھا۔ قابض امریکی مقتدرہ کی عراق میں لمبے عرصہ تک موجودگی بیانات کے مطابق السیستانی کی مدد اور تعاون کے وعدہ پر ہی منحصر تھی اور امید تھی کہ انتخابات کے بعد ان کے حامی ہی ملک میں سیاست اور حکومت پر حاوی رہیں گے۔ شاید سیستانی سے اس سمجھوتہ کی ہی ہمت افزائی تھی کہ وولفوٹز نے دھوم دھام سے اعلان کیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو عبوری حکومت کی دعوت پر امریکی فوجیں انتقال اقتدار کے بعد بھی یہیں رہیں گی۔ وہ خود مختار عراق کتنا خود مختار ہو سکتا تھا جس کی طرف سے مستقبل میں امریکی فوجوں کے لیے دعوت پہلے سے جانی بوجھی تھی۔ بغاوت پھوٹنے کے ایک دن بعد الصدر کی مہدی فوج نے کئی پولیس تھانوں، ایک اسپتال اور بصرہ کے گورنر ہاؤس پر قبضہ کر لیا تھا جو کئی دن قائم رہا۔ نو امریکی فوجی بغداد کے ایک محلّہ میں جو مقتدی کا گڑھ تھا لڑائی میں مارے گئے۔ نہ صرف یہ بلکہ چار بڑے شہروں میں مہدی فوج نے اتحادی فوجوں کو مار بھگایا اور اگلے دن اخباروں کے پہلے صفحات پر گورنر ہاؤس میں تلوار لہراتے ہوئے مقتدی کی تصاویر شائع ہوئیں جو ایک مجمع سے خطاب کر رہے تھے۔

اب یہ گوریلا جنگ نہیں رہی تھی بلکہ باقاعدہ جنگ میں ڈھل چکی تھی یعنی دو گروہوں کے درمیان کھلی لڑائی۔ مہدی فوج نے بصرہ میں تھانوں بلکہ اسپتال اور گورنر ہاؤس پر قبضہ کیا اور اس کے بعد کی رپورٹ کے مطابق انھوں نے نجف اور قط میں پولیس تھانوں کے علاوہ عوامی عمارتوں پر بھی قبضہ کیا اور امریکی فوجوں کو شہر سے باہر اپنے اڈوں تک محدود رہنے پر مجبور کیا۔ مہدی فوج نے ان پولیس تھانوں اور سب سے بڑھ کر نجف اور قط کے مرکزوں پر قبضہ کرنے میں شدید جنگ لڑی ہوگی نہ صرف پولیس والوں سے بلکہ محافظوں اور باقاعدہ فوجوں سے بھی جو اُن جگھوں پر موجود ہوں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہدی فوجی کس قدر تربیت یافتہ اور مسلح ہوں گے یا تو پولیس والے اور محافظین مقتدی مہدی فوج سے ہمدردی رکھتے تھے' یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جو اتحادی فوجیں نجف اور قط میں تعینات تھیں ان میں مایوسی اس حد تک تھی کہ وہ پر یقین

اور یکسو مہدی فوج سے مقابلہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ بعد کی اطلاعات ایسی بھی ہیں کہ چھ سو (۶۰۰) افراد پر مشتمل ایک نئی تشکیل شدہ بٹالین نے عراقی باغیوں سے لڑنے سے انکار کر دیا اور اسی طرح ایک اور نئی فوج کے ارکان تو مہدی فوج میں شامل ہو گئے یا الگ ہٹ گئے۔ ۲۶ ستمبر ۲۰۰۴ء کو پاکستان ٹی وی کے نشریہ میں بتایا گیا کہ نیشنل گارڈ کے ایک قائد کو اتحادی فوجوں نے گرفتار کیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قابض حکومت کی بنائی ہوئی فوجوں پر تسلط کر کے مقاصد کے لیے بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک سال کے طویل تعطل کے بعد مقتدیٰ کے وفاداروں کا ۲۳ اگست ۲۰۰۵ء کو پھر عراقی حکومت کی فوجوں سے ٹکراؤ ہوا جس میں بیس (۲۲) افراد ہلاک ہوئے اور کئی زخمی ہوئے۔

چار امریکی شہری ٹھیکیداروں کی لاشوں کی فلوجہ کی سڑکوں پر گھسیٹے جانے کی مذمت ضرور ہونی چاہیے کیونکہ یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے جو میدان جنگ میں بھی ایسے عمل کو سختی سے منع کرتا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس بھیانک منظر کی فلم بنائی گئی اور اس تمام وقت کوئی امریکی سپاہی یا امریکی تعینات کردہ سپاہی نظر نہیں آیا۔ مجمع نے لاشوں کو سڑک پر بغیر کسی مزاحمت کے گھسیٹا جس میں ان کا عراق میں امریکی مظالم کی وجہ سے سال بھر سے دبا ہوا غصہ کام کر رہا تھا۔ مزاحمت کے بڑھنے اور قابض فوجوں کا ایک کے بعد ایک نقصان اٹھانے کی وجہ سے بش انتظامیہ کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ متشدد سیکرٹری خارجہ اور پھر خود صدر بش کو کہنا پڑا کہ عراق میں امریکہ کو مشکل مسائل کا سامنا ہے۔ اس کے نتیجہ میں قابض مقتدرہ کو جھکنا پڑا اور بعث پارٹی والوں کی مدد چاہنی پڑی جنھیں وہ جرائم پیشہ اور عراقی عوام کی مصیبتوں کی وجہ کہتے تھے۔ امریکہ کے اتحادیوں نے اپنی فوجیں عراق سے واپس بلانے کے لیے مشورے شروع کر دیے۔ ان تازہ حالات نے طالبانی اور بارزانی کے زیر قیادت کردوں کو بھی پیغام دیا ہوگا کہ وہ قابض حکومت کے ساتھ ان کی مکمل حمایت کے بارے میں پھر سے سوچیں۔ اس نے کردستان میں انصار الاسلام کو بھی اتنا ہی سخت پیغام دیا ہوگا کہ وہ تشکیل نو کریں اور کشمیر میں مجاہدین کو امید بھرا پیغام دیا ہوگا۔ سب سے بڑھ کر اس نے پوری اسلامی دنیا میں

جہاد اور شہادت کے جذبہ کو حیاتِ نَو بخشی ہو گی اور اخیر میں یہ عمل اسلامی دنیا میں اتحاد اور بھائی چارہ کو ضرور بڑھاوا دے گا۔

اگر یہ عراق میں امریکہ کی شکست کا اعتراف نہیں تو اور کیا ہے؟ تعجب نہیں اگر بریمر نے خاموشی سے علاوی حکومت کو اقتدار منتقل کیا اور فوراً ہی ایرپورٹ لے جا کر امریکہ روانہ کر دیے گئے۔

پال وولفوٹز نے اعلان کیا تھا کہ اس عبوری حکومت کی دعوت پر جو ۳۰ جون کو اقتدار سنبھالے گی امریکی زیرِ قیادت افواج جون ۲۰۰۴ء کے بعد بھی عراق میں رہیں گی۔لیکن بہر حال بعد میں جب یہ یقین نہ رہا کہ عبوری حکومت مستقبل میں امریکی فوجوں کو دعوت دے گی تو ۲۷/اپریل ۲۰۰۴ء کو کولن پاول امریکہ کے پچھلے موقف سے پیچھے ہٹ گئے اور اصرار کیا کہ عبوری حکومت کو جو پہلی جولائی کو حکومت سنبھالے گی اپنے اختیار کا کچھ حصہ چھوڑنا پڑے گا اور امریکی زیرِ قیادت فوجوں کو کھلا ہاتھ دینا پڑے گا۔ ایسے کھلے اختیار کے ساتھ امریکی زیرِ قیادت فوجیں انتقال اقتدار کے بعد بھی عراق میں حکم چلاتی رہیں گی۔ یہ فوجیں بہرحال مقتدی کی فوجوں کے سامنے میدان چھوڑ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ پاول کو ۲۷/اپریل کے زور دار بیان سے پیچھے ہٹنا پڑا تھا اور اعتراف کرنا پڑا تھا کہ برطانیہ، اٹلی اور جاپان کے وزرائے خارجہ اپنی فوجیں واپس بلالیں گے اگر اس عبوری حکومت نے ان سے ایسا کرنے کو کہا جو ۳۰/جون کو اقتدار سنبھالے گی۔عراق میں امریکی منتظم پال بریمر نے بھی امریکی افواج کی واپسی کا عندیہ دیا جب انھوں نے کہا کہ ریاستہائے متحدہ وہاں ٹھیرنا نہیں چاہتا جہاں اسے خوش آمدید نہیں کہا جاتا۔کولن پاول اور بریمر کے بیانات صدر بش کی لاف وگزاف سے مختلف تھے کہ ریاستہائے متحدہ اپنے راستہ پر قائم رہے گا، لڑے گا اور جیتے گا۔

۱۵/مئی ۲۰۰۴ء کی AFP کی ایک رپورٹ میں صدر بش کی طرف سے پاول اور بریمر کے اس بیان کی تردید تھی کہ اگر عبوری حکومت نے کہا تو امریکی قابض فوجیں واپس بلالی جائیں گی۔ یہ امریکی انتظامیہ میں پھوٹ کا مظہر تھا۔صدر اور سیکرٹری دفاع

الگ الگ سمتوں میں کھنچ رہے تھے۔

۲۴ مئی ۲۰۰۴ء کو رائٹر نے واشنگٹن سے اپنی رپورٹ میں عراقی عبوری حکومت کی تشکیل کے بارے میں اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کو قرارداد کا پہلا متن جاری کیا اس میں کہا گیا تھا:

- ❶ اقوام متحدہ عراق میں ایک خود مختار حکومت کے قیام کی توثیق کرتی ہے جو ۳۰ جون تک حکومت سنبھال لے گی۔ اس حکومت کا انتخاب امریکی سفیر لخدر براہیمی امریکی افسروں کی مشاورت سے کریں گے۔
- ❷ اقوام متحدہ ایک قومی کانفرنس کے قیام میں مدد کرسکتا ہے جو ایک مشاورتی کونسل کا انتخاب کرے گی جس کے ذمہ نئی حکومت کو انتخابات کے انتظام میں مدد اور دوسرے کام ہوں گے۔
- ❸ ایک عبوری قومی ایوان کے لیے انتخابات پہلی جنوری ۲۰۰۵ء تک ہوں گے جو مستقل آئین بنائے گی۔
- ❹ قرارداد میں امریکی اختیار کی توثیق کی گئی کہ انھیں اختیار ہوگا کہ امن اور تحفظ کے لیے تمام اقدام اٹھائیں۔
- ❺ فوجوں کے اختیار پر نظرثانی کی جاسکتی ہے لیکن جب تک کونسل کے ارکان نہ چاہیں اسے ختم نہیں کیا جاسکتا۔
- ❻ امریکی فوجی کمان‘ عراقی فوجیں اور عراقی حکومت تعاون بڑھانے کے انتظامات کرسکتی ہیں۔
- ❼ تیل اور گیس کی آمدنی کا فنڈ جو اب قابضین کے پاس ہے عراقی حکومت کے حوالے کیا جائے۔ لیکن ایک بین الاقوامی مشاورتی بورڈ ایک سال کے لیے قیام کرسکتا ہے تاکہ سرمایہ کاروں اور مدد کرنے والوں کو اطمینان رہے کہ اخراجات بدمعاملگی سے پاک ہیں۔
- ❽ اس نے تمام اقوام سے کہا کہ کسی بھی گروپ یا فرد کے بارے میں اگر شک

ہو کہ یہ دہشت گردی میں ملوث ہیں تو ان کی آمدنی اور دوسرے وسائل پر قدغن لگائیں۔

◆ ۹ قرارداد ان قید خانوں کے بارے میں خاموش ہے جو غیر ملکی چلا رہے ہیں۔ اس سال کے اوائل میں جو عبوری آئین بنا تھا اس کے بارے میں بھی قرارداد خاموش ہے۔

ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو اقوام متحدہ نہیں بلکہ ریاستہائے متحدہ کو قرارداد کے اصلی متن میں ابھرتے ہوئے خودمختار عراق کا نظم ونسق چلانے کا حتمی اختیار دیا گیا ہے۔

پنسلوانیا میں فوج کے وار کالج میں اپنی تقریر میں (ڈان ۲۶ رمئی ۲۰۰۴ء) صدر بش نے عراق میں قیام امن اور انتقالِ اقتدار ۳۰ رجون تک مکمل کرنے کے سلسلہ میں اپنا پانچ اقدار پر مبنی منصوبہ بتایا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ عراق میں جب تک تحفظ اور استحکام قائم کرنے کا عمل جاری ہے امریکہ وہاں پر رہے گا۔اور یہ کہ جمہوریت کے لیے عراق میں سہولتوں کے نظام کی تعمیر نو مزید بین الاقوامی مدد اور آزاد قومی انتخابات کی طرف پیش قدمی ضروری ہے تاکہ عراقی عوام نئے قائدین کو سامنے لاسکیں۔ صدر بش نے فوجی وار کالج میں اپنی تقریر میں جس قدم بہ قدم منصوبہ کا اعلان کیا وہ اس قدر مشکل شرائط سے بھرپور ہے کہ امریکی افواج کے عراق سے رخصت ہونے کا اصل نکتہ مشتبہ اور مشکوک ہوجاتا ہے۔ قومی انتخابات کے لیے بھی اس قدر شرائط رکھی گئی ہیں کہ ان کا منعقد ہونا ہے مشکوک نظر آتا ہے۔

Global Policy Forum کے جم پال نے اصلی قرارداد میں کم از کم تین اہم نقائص کی نشان دہی کی ہے۔ یعنی کہ یہ عراق میں امریکہ کے زیر قیادت مشترکہ قبضہ کو قانونی جواز فراہم کرنے کے لیے تھا۔ یہ عراقی عبوری حکومت اور کثیر قومی قوتوں کے درمیان حصہ داری کے رشتہ کا مطالبہ کرتا تھا جو عراقیوں کی خودمختاری کو تقسیم کر دیتا اور جو ویسے نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ عالمی برادری سے عراق میں دہشت گردی کی کارروائیوں کی مذمت کروانا چاہتا تھا تاکہ عراق میں فوجی تسلط کے خلاف مزاحمت کو دہشت گردی قرار

دیا جاسکے۔

فرانسیسی وزیر نے بنیادی قرار داد کے متن سے مایوسی کا اظہار کیا۔ اس قرارداد نے عراق میں امریکہ کی منتخب کردہ قیادت کو بھی سخت مایوس کیا۔ عراقی کونسل کے سربراہ غازی علی یاور نے کھلے عام اسے عراقیوں کے لیے کسی بھی بھلائی سے خالی قرار دیا۔

کونسل کے ایک رکن محمد عثمان نے اخباری بیان میں کسی طرح کی بھی عراقی شرکت کی غیر موجودگی کی مذمت کی۔ انھوں نے اس بات کی بھی سخت مذمت کی کہ قرارداد میں امریکی، برطانوی اور دوسری غیر ملکی فوجوں کو قبضہ کے دوران کیے گئے جرائم کے لیے کسی قسم کی عدالتی کارروائی سے بریت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس طرح بریت کا اہتمام بین الاقوامی قانون اور خاص طور پر نیورایمبرگ مقدمہ میں قائم کیے گئے اصولوں اور مثالوں کی شدید خلاف ورزی تھا۔

۲/جون ۲۰۰۴ء کو ایک نظر ثانی شدہ قرارداد مشترکہ طور پر امریکہ اور برطانیہ نے پیش کی جس میں پہلی جنوری ۲۰۰۴ء تک فوجوں کی واپسی کے لیے ایک سرسری نظام الاوقات دیا گیا، ایسا جنوری ۲۰۰۵ء میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد ہونا تھا، صرف تین دن بعد ۵ جون کو ایک اور قرارداد امریکہ اور برطانیہ نے مشترکہ طور پر پیش کی جس میں عبوری حکومت کی خواہش اگر ہو تو فوج کے مزید قیام کا انتظام تھا اور جب یہ قرارداد ابھی سیکیورٹی کونسل میں زیر بحث تھی صدر بش نے عبوری حکومت کے فیصلہ کا پیشگی اندازہ کرکے اعلان کر دیا کہ امریکہ ۲۳/جون کے بعد بھی عبوری حکومت کی فرمائش پر عراق میں ٹھہرے گا۔ اس سے نظر آتا ہے کہ خودمختار عراق کو کس حد تک خودمختار ہونا تھا۔ فوجوں کے عراق میں قیام کے بارے میں یہ بدوضع، کبھی یہ، کبھی وہ والا متلون رجحان اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ بش انتظامیہ خود اپنے خلاف منقسم ہے اور صدر بش اب عراق پر اپنے موقف پر ثابت قدم اور سخت گیر نہیں رہے تھے۔ کولن پاول نے AFP اور رائٹرز کے جاری کردہ استنبول کے ٹیلیویژن انٹرویو میں ۲۷/جون ۲۰۰۴ء کو کہا یقیناً میں نے مزاحمت کاروں میں کمان، تنظیم اور اشتراک کی ایسی سطح دیکھی ہے جو مجھے کچھ ماہ پہلے کی

سطح سے بہت مختلف نظر آتی ہے۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ اب جنگ کے لیے عوامی حمایت کم ہو رہی ہے جس سے پچھلے ہفتوں میں ایک بے چینی پیدا ہوئی ہے جس کی وجہ وہ شدید مزاحمت ہے جس کا ہمیں سامنا ہے۔ المہدی مجاہدین اور امریکی فوج اور اتحادی مقتدرہ کے درمیان معاہدہ جو مئی ۲۰۰۴ء کو ہوا تھا زیادہ عرصہ برقرار نہ رہا کیونکہ دونوں فریقوں میں جھڑپوں کی خبریں آنے لگیں اور ۵/اگست ۲۰۰۴ء کو شدید لڑائی پھوٹ پڑی اور ایک میرین فوجی نجف میں اس لڑائی میں ہلاک ہوا جو کثیر ملکی قابضین اور المہدی مجاہدین کے درمیان ہوئی' ایسا جون میں جنگ بندی کے بعد پہلی دفعہ ہوا جبکہ پہلی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ مہدی مجاہدین نے ہیلی کاپٹر مار گرایا اور نجف' بصرہ اور بغداد میں طویل جھڑپیں ہوئیں۔ اس سے پتہ چلا کہ اس وقت تک مہدی مجاہدین نہ صرف بہتر طور پر منظم ہو چکے تھے بلکہ بہتر طور پر مسلح بھی تھے اور ایسی فوجی صلاحیت حاصل کر چکے تھے کہ ہیلی کاپٹر گرا سکیں۔ بعد میں علی سیستانی کی مداخلت پر دوبارہ جنگ بندی ہوئی جو زیادہ دن قائم نہ رہی اور ستمبر میں مقتدیٰ مہدی فوج اور اتحادی فوجیں ایک دفعہ پھر برسرپیکار ہوگئیں۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے اس کے بعد عراق پر امریکی جنگ کو ناجائز قرار دیا ہے جس کی وجہ سے مزاحمت کاروں کو ایک اعلیٰ اخلاقی جواز حاصل ہوا ہے۔

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے ۷/اگست ۲۰۰۴ء کو اعتراف کیا کہ عالمی ادارہ مستقبل قریب میں ایک بیش قدر ہدف رہے گا اور اسے اپنے کام محدود کرنے پڑیں گے۔ اس بیان نے اقوام متحدہ کے پردہ میں اور جمہوریت کے نام پر امریکہ کا سخت تسلط قائم رکھنے کا امریکی منصوبہ اوندھا کر دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سنی علماء کے ساتھ مقتدیٰ الصدر ہی نے عراق میں واحد قابل عمل حکومت عطا کی تھی۔ نیشنل جیوگرافک نے اپنے ۲۰۰۴ء کے عراق کے بارے میں شمارہ میں اپنے معمول کے مطابق اسلام پر حملہ کرتے ہوئے بڑی تلخی کے ساتھ نشان دہی کی کہ امام مقتدیٰ الصدر نے زکوۃ کے نظام کے ذریعے مفت اسپتال' اسکول اور بھلائی کا نظام عراق میں مسلمانوں کے لیے مہیا

کیا' اس نے یہ بھی تلخ لہجہ میں بتایا کہ امام مقتدیٰ الصدر نے عراق میں جرائم سے نمٹنے کے لیے عدالتیں بھی بنائیں۔ جو عام بھلائی کا نظام ابھرا وہ عراق کے مسائل اگر ختم نہ کر سکا تو انھیں کم کرنے کا باعث ضرور ہوگا۔ ڈاکٹر عادل شریف نے جو امام الباقر مرحوم کے حامی ہیں جولائی ۲۰۰۴ء میں بتایا کہ امام اور شرعی نظام نے نجف میں چار ملین زائرین کے معاملات بغیر کسی ایک ناخوشگوار حادثہ کے نمٹائے۔ لندن Independent نے لکھا کہ بصرہ اور جنوب میں صرف شیعہ علماء ہی تھے جنھوں نے اسپتالوں اور اسکولوں کی حفاظت کی۔ اس اخبار نے مزید بتایا کہ یہ صرف اسلامی یتیم خانے ہی تھے جو بچوں کو جنسی استحصال سے بچا کر تعلیم اور شادیوں کے انتظامات کر رہے تھے جبکہ مغربی غیر حکومتی ادارے شور مچا رہے تھے کہ یتیم خانے بچوں کو مغربی کھلونوں سے کھیلنے نہیں دیتے اور مغربی بننے سے روکتے ہیں۔ جب اسلامی نظام بہتر کارکردگی ثابت کر چکا ہے اور انسانیت کے مسائل حل کر سکتا ہے تو جمہوریت کی ضرورت کیا ہے؟ عراق نے ثابت کر دیا ہے کے مغربی مثالیہ (Ideals of the west) دراصل لوگوں کو اپنی اقدار اور مفادات کا غلام بنانے کی مجنونانہ کوشش کے لیے دھوئیں کا پردہ ہے۔

امریکی صدر کے مطابق جمہوریت ایک ایسی حکومت کا نام ہے جو عوام کی طرف سے عوام کے لیے اور عوام کی ہو۔ اس لیے تمام لوگوں کو خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں رہتے ہوں اپنی پسند کی حکومت منتخب کرنے کا حق ہونا چاہیے اور اگر مسلمان اپنے لیے اسلامی نظام حکومت جو قرآن پاک اور سنت پر ہو پسند کرتے ہیں تو انھیں ایسا کرنے سے روکنا ہرگز درست نہیں۔ فوکویاما نے جو جمہوریت کا بہت بڑا ترجمان ہے کہا کہ جمہوریت نے اپنی اقدار عیسائیت کے اس اصول سے اخذ کی ہیں کہ خدا کے نزدیک انسان برابر ہیں۔ ہفتہ وار اکانومسٹ نے تجویز کیا کہ انجیل کا حکم کہ اپنے پردیسی بھائی سے ویسی ہی محبت کرو جیسی اپنے آپ سے جمہوریت کا بنیادی اصول مہیا کرتا ہے۔ اگر جمہوریت عیسائیت پر مبنی طریقہ حکومت ہے تو مسلمانوں کو ایسا نظام حکومت اختیار کرنے سے کیوں روکا جائے جو اپنی اقدار اور نظریات اسلام سے کشید کرتا ہے۔ آخر کار اپنے

ضمیر اور فیصلہ کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ہی تو انسان کی سب سے بڑی آزادی ہے۔اگر عراقی جیسا کہ انھوں نے واضح کر دیا ہے کہ اسلامی نظام حکومت پسند کرتے ہیں تو انھیں اجازت ہونی چاہیے تھی کہ اقوام متحدہ کے زیر انتظام دستور ساز اسمبلی منتخب کریں جسے عراق کے لوگوں کے لیے آئین بنانے کا کام سونپا جائے۔

اگر ریاستہائے متحدہ کا منتہائے نظر صدام کے بعد حقیقتاً جمہوری عراق ہے تو اسے چاہیے کے یہاں فوراً آزاد انتخابات منعقد ہونے دے، جو اقوام متحدہ کے زیر نگرانی دستور ساز اسمبلی' عراق کا آئین بنانے کے لیے منتخب کرے اور اس منتخب ادارہ کو عبوری دور پر عراق کا اقتدار اس وقت تک کے لیے منتقل کر دے جب تک نئے آئین کے تحت حکومت نہیں بن جاتی۔ یورپی یونین کے پالیسی رہنما جاویر سولانا کا جو پندرہ یورپی حکومتوں کی نمائندگی کرتے ہیں اصرار ہے کہ یہی حتمی رائے ہے۔ انھوں نے کہا کہ سیاسی وسعت اور سرعت کے ساتھ انتقال اقتدار کے بغیر عراق میں کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا جب کہ گارڈین نیوز سروس نے بتایا کہ ان کے نزدیک سوال مزید فوج بھیجنے کا نہیں بلکہ سیاسی فیصلہ کرنے کا ہے۔

افغانستان کے معاملہ میں طالبان اور شمالی اتحاد دونوں ہی کی حکومتیں اسلامی حیثیت کی نامزد ہوئی تھیں لیکن امریکی سرپرستی میں قائم ہونے والی سابقہ کرزئی حکومت اسلامی نام اور کردار سے محروم تھی جبکہ اب نئے آئین کے تحت اسے دوبارہ اسلامی جمہوریہ افغانستان کا نام دیا گیا ہے۔ افغانوں کے ایک منظم اور پرشور گروہ نے اسلامی طریقہ حکومت کے لیے احتجاج جاری رکھا اور افغانوں کے ایک لاکھ سے زیادہ اہم افراد سے الیکشن کمیشن نے رائے لی تو انھوں نے اسلامی ریاست کے لیے اصرار کیا جس کے نتیجہ میں موجودہ آئین نے افغان زندگی میں اسلامی اقدار کی اہمیت کو تسلیم کیا اور اسلام کو افغانستان کا ریاستی مذہب قرار دیا۔ اسلامی اقدار حقیقت میں کس قدر رائج ہوں گی یہ وقت گزرنے پر ہی پتہ چلے گا۔

عراق کے معاملہ میں شیلابی کے زیر قیادت جلا وطنوں اور کردوں کے سوا

جو شدت سے مذہبیت کے مخالف ہیں، شیعہ اور سنی سب ہی عراق کو اسلامی ریاست بنانے کا مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ مقبول ترین شیعہ رہنما مقتدیٰ الصدر نے تو بیانات کے مطابق اسلامی حکومت اور اسلامی عدالتیں قائم بھی کرلی ہیں۔ جن سے لوگ بڑی تعداد میں اپنے فیصلے کروانے کے لیے رجوع کرنے لگے ہیں۔

اس لیے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ امریکہ کے لیے ممکن نہ ہوگا کہ مغربی طرز کی جمہوریت مسلط کرسکے جس میں اقتدار اعلیٰ اللہ سے نہیں بلکہ عوام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہی بنیادی فرق ہے جس کے لیے ہر قربانی دی جاسکتی ہے۔ عبوری آئین میں اسلام کو قانون کے ذرائع میں سے صرف ایک ذریعہ قرار دیا گیا ہے جو افغان آئین کی مثال تک نہیں پہنچتا جو اسلام کو افغانستان کا سرکاری مذہب قرار دیتا ہے اور اہتمام کرتا ہے کہ قرآن اور سنت کے خلاف کوئی قانون منظور نہیں کیا جائے گا۔

جمہوریت کے عظیم ترین قلعہ صدر بش کا برطانیہ کے دورہ میں ایک لاکھ افراد کے مشتعل احتجاج کے ذریعے استقبال کیا گیا۔ لندن کے میئر نے انھیں کرۂ ارض پر انسانی زندگی کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا۔ جناب بش مشرق وسطیٰ کو جو انسانی تہذیب، جمہوریت اور آزادی کے اصول کا گہوارہ رہا ہے نصیحتیں کرنے سے پہلے کرۂ ارض پر زندگی کو دھمکیاں دینا بند کریں''۔

عراق پر مسلط کی جانے والی جمہوریت کو کوئی کیا سمجھے جبکہ ایاد علاوی جو صدام کی بعث پارٹی کے سابق رکن تھے اور بعد میں صدام کا تختہ الٹنے کے لیے CIA سے ساز باز کرچکے تھے عبوری عراق حکومت کے وزیر اعظم مقرر ہوئے اور عہدہ سنبھال لیا؟؟؟

شبہ کیا جاتا ہے کہ عراقی عبوری حکومت کا انتخاب اقوام متحدہ کے نمائندہ لخذر براہیمی کے ہاتھ امریکہ کی مقرر کردہ عراقی گورننگ کونسل نے اچک لیا۔

تعجب نہیں کہ نئے تعینات وزیر وزیر اعظم کی گاڑیوں کے قافلہ پر بغداد میں گولیاں چلائی گئیں۔ اسی دن جب انھوں نے حلف اٹھایا۔ اسی طرح ایک یا دو دنوں بعد جب نئے تعینات صدر اور نائب صدر حلف اٹھا رہے تھے تو انتظامیہ کی عمارت کے احاطہ

میں راکٹ گرے اور نزدیکی کرد سیاسی پارٹی کے دفتر میں بارود سے بھری کار نے گھس کر دھماکہ کر دیا۔ اسی طرح بغداد کی سڑکوں نے بندوق کے دھماکوں کے ذریعے اپنا غصہ اور عبوری حکومت سے نفرت کا اظہار کیا۔

یہی وجہ ہے کہ صدر بش کی فوجی وار کالج کی تقریر بد دِلی اور مایوسی کے تاثرات پر ختم ہوئی۔ آنے والے دن مشکل ہیں اور آگے بڑھنے کا راستہ غیر منظم نظر آتا ہے۔

قومی تحفظ کی مشیر کونڈ ولیزا رائس نے بھی ایسا ہی انتباہ دیا جب یکم جون ۲۰۰۴ء کو انھوں نے کہا کہ نئی حکومت کو مزاحمت کاروں مثلاً القاعدہ کے زرقاوی کی طرف سے آگ کے بپتسمہ کا سامنا ہوسکتا ہے"۔ "زرقاوی جیسے لوگ نئی حکومت کا امتحان لیں گے۔ تشدد میں کئی اضافے ہوئے ہیں۔ حقیقت میں میرا خیال ہے کہ آپ کو اس کی امید ہوگی۔"

کونڈ ولیزا رائس کی پیش گوئی کے مطابق نئی عراقی حکومت کو زرقاوی جیسے جنگجوؤں سے جو امریکی افواج کی توجہ کا مرکز تھے آگ کے بپتسمہ کا سامنا کرنا پڑا۔ فلوجہ پر کنٹرول اور زرقاوی کی گرفتاری کو جاری مزاحمت کے لیے موت کا پروانہ سمجھا جا رہا تھا۔ اس لیے یہ عراق پر مسلط حکومت کی کامیابی کے لیے لٹمس ٹیسٹ بن گیا۔

آپریشن phanton Fury کے نام سے فلوجہ پر بڑا فوجی حملہ ۹ نومبر ۲۰۰۴ء کو کیا گیا جس میں بیس ہزار امریکی فوجیوں کے ساتھ تھوڑے بہت عراقی سپاہی شامل تھے ایسا صدر بش کے دوبارہ منتخب ہونے کے فوراً بعد کیا گیا۔ زمینی حملہ سے ہفتوں پہلے تین لاکھ کی آبادی کے اس شہر کو پانچ سو ایک ہزار پاؤنڈ کے Daisy cutters اور دوسرے بموں سے تہس نہس کر دیا گیا تھا۔ فلوجہ پر یہ حملہ سب سے زیادہ تباہ کن حملہ تھا جس میں دو ہزار سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے۔ امریکی فوجی کمانداروں نے فلوجہ پر حملہ میں ۱۹۶۰ء کے اواخر میں ویت نام کے شہر ہوئے (HUE) کی ظالمانہ اور خون ریز تسخیر کا اعادہ دیکھا۔ ایک مرین کماندار کینٹ نے دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) مرین فوجیوں کی روانگی کے وقت فخریہ کہا: "یہ دوسرا "ہوئے" شہر تیاری کے مرحلہ میں ہے۔" فلوجہ پر یہ

عظیم الشان بھرپور حملہ اس یقین کے تحت کیا گیا تھا کہ یہی شہر مزاحمت کا مرکز ہے اور یہ زرقاوی ہے جو شورش کے شعلوں کو بھڑکا رہا ہے۔ اس لیے یہی سمجھا رہا تھا کہ ایک دفعہ فلوجہ پر قبضہ ہو جائے اور زرقاوی گرفتار یا ہلاک ہو جائے تو عراق میں شورش خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اگرچہ امریکی فوجوں نے ظاہری طور پر فلوجہ کی جنگ جیت لی لیکن ہزاروں ہلاکتوں اور انسانوں اور سامان دونوں کو تباہ کرنے کے بعد انھوں نے صرف ایک ایسی جنگ کو بھڑکا دیا جس میں بہت سے شہر اور علاقے شامل ہو گئے جو اب تک نسبتاً پُر امن تھے اور فلوجہ کی تسخیر نے مزاحمت کاروں کو ہمت شکنی کے بجائے ان کے ارادہ کو اور بھی شعلہ دکھا دیا کہ لڑائی کو نام نہاد موت کی مثلث کے ہر گوشہ تک پھیلا دیں۔

قبل اس کے کہ فلوجہ نگوں ہوتا لڑائی موصل تک پھیل گئی اور مزاحمت کاروں نے کئی پولیس تھانوں پر قبضہ کر لیا اور موصل کی سڑکوں پر جم کر بیٹھ گئے جہاں امریکی افواج کو فلوجہ سے ہٹا کر لانا پڑا' تاکہ باغیوں سے لڑ سکیں اور اس طرح امریکی فوج ایک چومکھی جنگ میں مبتلا ہو گئی۔ ایک ایسی جنگ رہ رہ کر ہو رہی تھی اور اس طرح امریکی فوج اسامہ کے ہاتھ میں کھیلنے لگی جس نے کچھ دن پہلے ہی کہا تھا کہ وہ ریاستہائے متحدہ کو ایسی تھکا دینے والی جنگ میں پھنسانا چاہتا ہے کہ اس ملک کا معاشی اور فوجی دونوں محاذوں پر خون چوس لیا جائے' جبکہ فلوجہ میں مزاحمت ابھی تک جاری ہے' موصل باغیوں کا ایک دوسرا مرکز بن چکا ہے' جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکی فوجی بیرکوں کے اندر تک رسائی حاصل کر چکے ہیں۔ ATP نے ۲۱ر دسمبر کو Pierce Ceerier کی ایک تحریر جاری کی کہ فلوجہ کی سڑکوں پر ہونے والی وحشیانہ جنگ آگ کا بپتسمہ تھی' اس کے بعد باغیوں نے اپنے غصہ کا رخ الیکشن کمیشن کے افسروں اور دفتروں کی طرف موڑا۔ ۱۹ دسمبر ۲۰۰۴ء کی اخباری رپورٹ نجف اور کربلا میں بڑے دھماکوں کی کہانی سنا رہی تھی جس میں ۷۱ افراد ہلاک اور بہت سے زخمی ہوئے۔

عراق کو انتقالِ ''خود مختاری'' کا لغو دعویٰ

عراق کے نئے عبوری صدر غازی الیاور نے اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل سے

عراق پر قرارداد منظور کرنے کے بعد واشنگٹن جانے سے پہلے اعلان کیا: ''اس کا مطلب عراق کے لیے مکمل اقتدار ہے۔'' اس کا مطلب عراق کی تاریخ میں ایک بہت خوشگوار دور کی امید ہے۔ وسیع تباہی کے ہتھیاروں کے جھوٹ کی طرح مکمل خودمختاری بھی فریب ہی رہی۔ ۸؍جون ۲۰۰۴ء کو امریکہ برطانیہ کی پیش کردہ سیکیورٹی کونسل کی قرارداد کا تیسرا نظرثانی شدہ متن متفقہ طور پر منظور ہوا' کچھ لوگ اس قرارداد کی ایسی گرم جوش پذیرائی کررہے ہیں جیسے یہ ۳۰؍جون ۲۰۰۵ء کو عراق پر غیر ملکی قبضہ ختم کروادے گی اور ایسی عبوری حکومت مہیا کردے گی، جو متسلط فوجوں کا اختیار ختم کردے گی جسے بہرحال اواخر جنوری ۲۰۰۴ء تک ختم ہوجانا ہے۔ اس قرارداد کے مطابق ریاستہائے متحدہ نے وعدہ کیا کہ عراق میں اپنی فوجی کارروائیاں عراقی رہنماؤں کے تعاون اور اشتراک سے کرے گا۔ لیکن یہ اپنے وعدہ میں اس حد تک نہیں جاتا کہ اس کے فیصلوں پر کہاں خطرہ ہے اور کہاں کارروائی ہونی ہے۔ قرارداد میں اقوام متحدہ کے لیے بھی کوئی معنی خیز اور اہم کردار نہیں رکھا گیا سوائے وقفہ وقفہ سے اطلاعات وصول کرلینے کے نہ تو عبوری حکومت کے نفاذ عمل میں نہ کثیر القومی فوجوں کی کارروائیوں کے کنٹرول یا انتخابات کے انعقاد میں۔

اس قرارداد کو جس نے عبوری ''خودمختار'' حکومت کو خودمختاری عطا کی اور اس کی تشکیل کی اس پس منظر میں سمجھنا چاہیے کہ یہ عبوری حکومت کس طرح بنائی گئی یا اقوام متحدہ کے نمائندہ نے اس کے صدر اور وزیراعظم کے انتخاب میں کیا کردار ادا کیا۔ یہ عراق کے لوگوں کی خواہش اور امیدوں کی نمائندگی کرتی بھی ہے یا نہیں اور اس نے انتخاب میں کن باتوں کو مدنظر رکھا ہے۔ کیا یہ ریاستہائے متحدہ کے مکمل طور پر زیراثر نہیں ہوگی۔ یہ بات بعد میں بہت ہی نمایاں ہوگئی جب امریکی سفیر خلیل زاد مسلسل آئین سازی میں دخل دیتے رہے اور آخرکار صدر بش نے عبدالعزیز حاکم کو جو دعوی پارٹی کے نمبردو تھے۔ ٹیکساس میں اپنے مویشیوں کی چراگاہ سے فون کیا تاکہ تعطل ختم ہوسکے۔

قبل ازیں عبوری صدر اور وزیراعظم کا انتخاب قابض مقتدرہ کے سربراہ پال

بریمر نے کیا تھا جس پر اقوام متحدہ کے نمائندہ لخذر براہیمی نے امریکی مہر لگادی تھی حالانکہ اقوام متحدہ نے امریکہ کی درخواست پر انھیں یہ اختیار دیا تھا کہ امریکی افسروں کی مشاورت کے ساتھ یہ کام انجام دیں۔

Institute of Puplic Accuracy کے ڈائریکٹر نے بتایا کہ براہیمی نے بغداد میں امریکی وائسرائے بریمر کو ''بغداد کا آمر'' کہا۔ اس کے پاس رقم ہے' اس کے پاس دستخط ہے اور اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔ براہیمی نے اس بات کو نہیں چھپایا کہ ان کے اوپر امریکہ اور امریکہ کی بنائی ہوئی عراقی گورننگ کونسل دونوں کی طرف سے بہت دباؤ تھا اور دونوں اپنی پسند کے افراد کا چناؤ چاہتے تھے۔ نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر اقوام متحدہ کے ایک سابق اعلیٰ آفیسر نے Institute of Puplic Accuracy کو بتایا کہ یہ ایک المیہ تھا کہ اقوام متحدہ کو یہ سمجھنے میں بہت دیر لگی کہ اسے امریکہ کے ہاتھ میں ایک استحصالی اوزار میں تبدیل کردیا گیا ہے۔

قرارداد میں کثیر القومی فوج کا اختیار ختم کرنے کا اہتمام ہے جو عبوری حکومت کے کہنے پر 30/جون ۲۰۰۵ء کے بعد ہونا تھا اور جسے بہرحال اواخر جنوری ۲۰۰۶ء میں ہو جانا تھا۔ لیکن یہاں بھی چھپی ہوئی چال یہ تھی کہ آیا اس وقت تک جاری شورش ختم ہوجائے گی اور عراقی عبوری حکومت عراق میں امن وتحفظ قائم کرنے میں کامیاب ہوچکی ہوگی۔ وزیراعظم علاوی نے اپنے پالیسی بیانات میں جب قرارداد پر بحث ہورہی تھی یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ جب تک عبوری حکومت امن وتحفظ قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوجائے کثیر القومی افواج وہیں رہیں گی۔ ان کی طرف سے کثیر القومی افواج کے غیر معینہ مدت تک قیام کے وعدہ کے پیش نظر ۳۰/جون ۲۰۰۵ء کی حتمی تاریخ یا جنوری ۲۰۰۶ء کی حیثیت بس رسمی ہی رہ جاتی ہے۔ قرارداد کی منظوری سے پہلے ہی جنرل مائرز نے یہ بات واضح کردی تھی کہ فوجوں کی واپسی کے لیے کوئی تاریخ نہیں دی جائے گی۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر وولفوٹز نے اعلان کیا کہ امریکی فوجیں سالوں قیام کریں گی اور بوسنیا کی مثال دی جہاں امریکی فوجیں آٹھ سال مقیم رہی تھیں۔

قرارداد کا بنیادی متن ایسے گروہوں کے خلاف جو دہشت گرد حملے کر سکتے ہیں بین الاقوامی مدد طلب کرتا ہے۔ اسے قرارداد کے حتمی متن سے نکالا نہیں گیا ہے۔ اور یہ انتظام قابض مقتدرہ کو اختیار دے دے گا کہ ان تمام عناصر کو جو مزاحمت میں حصہ لے رہے ہیں یا تسلط کے بہ آواز بلند مخالف ہیں ۲۰۰۵ء کے انتخابات میں حصہ لینے سے روک دے اور اس طرح انتخابات کے نتائج پر ریاستہائے متحدہ کے سیاسی مفادات کے حق میں اثرانداز ہو سکے۔

ایسے ہی شبہات کے خلاف عراق میں اقوام متحدہ کے نمائندہ لخدر براہیمی نے سیکیورٹی کونسل کو خطاب کرتے ہوئے عبوری حکومت سے تقاضا کیا تھا کہ تسلط کے مخالفین کی حمایت حاصل کرنے کے لیے مہم شروع کریں انھوں نے اس بات کی ضرورت پر زور دیا کہ جو لوگ بلند آواز سے تسلط کے نقاد ہیں ان تک پہنچا جائے اور گفتگو کی جائے اور آخر میں عراقی حکومت سے تقاضا کیا کہ ان تمام لوگوں کو جو تسلط کے خلاف ہیں دہشت گرد اور تلخی زدہ قرار دینے کے لالچ سے بچ کر رہیں۔

براہیمی نے اس طرح احتیاط اور تحمل کا پیغام دیا اور متنبہ کیا کہ عراقی حکومت امن اور سکون کے قیام میں تسلط کے مخالف عناصر سے صلح کیے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی' احتیاط اور تحمل کا یہ پیغام اس رجائیت اور امید بھرے پیغام سے کس قدر مختلف ہے جو اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے اپنی تقریر میں دیا تھا جس میں رکن ممالک سے کہا گیا تھا کہ عراقی حکومت کی ہر ممکن مدد کریں۔

جہاں اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کی قرارداد پوری طاقت سے امریکہ کے عراق پر تسلط کو قانونی قرار دیتی ہے وہاں براہیمی کی تقریر اس کے خلاف جاری مزاحمت کو جائز قرار دیتی ہے۔

چونکہ عراقی عبوری حکومت کے صدر اور وزیراعظم بریمر کے ذاتی طور پر چنے ہوئے ہیں اور وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں معلوم ہے کہ ایک عرصہ تک CIA کا اہم اثاثہ رہے ہیں وہ امریکی مفادات اور خواہشات کے پابند ہیں اور یہ سوچ بھی دور از کار

ہے کہ وہ عراقیوں کی آرزوئیں پوری کرسکتے ہیں۔

عراق کی عبوری حکومت جسے ریاستہائے متحدہ نے تخلیق اور تعمیر کیا خودمختار قرار دے دی گئی غالباً اس مقصد کے لیے کہ اس کے قوانین اور فرمان کا جو پہلے ہی متسلط مقتدرہ عمل میں لاچکی ہوگی اور قانون قرار دے چکی ہوگی بعد میں آنے والی حکومتوں کو بھی پابند کردے۔

اس طرح عبوری حکومت کوئی بھی معاہدہ' سمجھوتہ اور پابندی امریکی حکم پر قبول کر سکتی ہے۔ ریاستہائے متحدہ کو لمبی مدت کے لیے فوجی اڈے دینے اور متسلط مقتدرہ کے دیے ہوئے تمام ٹھیکوں اور پابندیوں کی توثیق کرنے سے عبوری حکومت کو روکنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ قرارداد انہیں ایسا کرنے سے نہیں روکتی۔

۶/ جون ۲۰۰۴ء کی ایک اخباری رپورٹ نے بتایا کہ امریکی زیر قیادت اتحادی افواج نے ۵ جون کو اعلان کیا کہ وہ عراق کی خودمختاری کے بعد بھی اگر کسی عراقی کو تحفظ کے لیے خطرہ سمجھیں تو گرفتار کرسکتے ہیں۔ کسی بھی خودمختار ریاست کی تین اہم خصوصیات ہوتی ہیں (۱) اسے جابرانہ قوت حاصل ہوتی ہے (۲) صرف وہی ریاست میں امن وتحفظ کی ذمہ دار ہوتی ہے (۳) اسے فوجوں پر پورا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اب اس امکان کے ساتھ کہ کثیرالقومی افواج غیر معینہ مدت تک موجود ہوں اور عراقیوں کو گرفتار کرنے کا حق بھی استعمال کریں' انھیں اپنے قیدخانوں میں رکھیں' اپنی فوجی عدالتوں میں ان پر مقدمے چلائیں اور سب سے بڑھ کر عبوری حکومت چلانے والے وہ ہوں جو جانے پہچانے CIA کے اثاثے ہیں تو اِس صورت میں عراق کی خودمختاری کی دھوم دھام محض لغویت اور فریب بن کررہ جاتی ہے۔

روزنامہ Independent کے رابرٹ فسک یہ بتاتے ہوئے کہ عراق میں امریکی تسلط ۲۰۰۳ء میں کیسا رہا ہے' ۱۹۱۷ء میں برطانیہ کے عراق پر تسلط کی یاد دلاتا ہے۔ فسک کہتا ہے عراق کے لیے ۱۹۱۷ء کی جگہ ۲۰۰۳ء پڑھیے عراق کے لیے ۱۹۲۰ء کی جگہ ۲۰۰۴ء پڑھیے۔ جی ہاں ہم عراق کو مکمل خودمختاری دینے کی تیاری کررہے

ہیں۔ یہی جھوٹا دعویٰ برطانیہ نے ۹۰ سال پہلے کیا تھا۔ آیئے اور تاریخ کے آئینے کا سامنا کیجئے اور دیکھئے کہ آنے والے بارہ (۱۲) ہیبت ناک مہینوں میں امریکہ اور برطانیہ کیا کریں گے۔

نہ صرف عراق پر موجودہ امریکی قبضہ ۱۹۱۷ء، ۱۹۲۰ء کے برطانوی قبضہ سے اس قدر مماثل ہے، نہ صرف ویت نام میں امریکہ کی ناکام مہم عراق میں ناکام مہم کی صورت میں اپنے آپ کو دہرا رہی ہے بلکہ صدر یاور اور وزیراعظم علاوی کی غدار عبوری حکومت بھی فرانس میں مارشل Petain کے دور میں Vichy حکومت کو انتقال خودمختاری کی یادیں تازہ کردیتی ہے۔

بالکل Vichy حکومت کے Petain کی طرح جو فرانس کی نمائندگی نہیں کرتا تھا جو برابری، آزادی اور برادری کی سرزمین تھی۔...... شیلابی اور پشاشی عراق کے نمائندے نہیں تھے اور نہ ہی یاور، علاوی اور بعد میں طالبانی اور ابراہیم جعفری عراق کی نمائندگی کرتے ہیں جو انسانی تہذیب کا قلعہ رہا ہے۔ جس طرح فرانس مزاحمتی قائدین Jean Monulin اور چارلس ڈیگال کی شکل میں مجسم ہوگیا آج عراق مزاحمتی قائدین الزرقاوی اور مقتدیٰ الصدر میں مجسم ہے۔

ہٹلر کے تسلط کے خلاف فرانسیسی مزاحمت کے عراق میں امریکی قبضہ کے خلاف دہرائے جانے کا اختتامی ڈرامہ بھی زیادہ مختلف نہیں ہوگا۔ جس طرح آزادی کے بعد petain کو غدار کی حیثیت سے مذمت اور پھانسی کی سزا ہوئی اسی طرح عراقی غدار بھی عراق کی آزادی کے بعد اسی مقدر کا سامنا کریں گے۔

صدام کے مقدمہ کی لغویت

۲ رجولائی ۲۰۰۴ء کو بمقام بغداد اکیسویں صدی کا سب سے بڑا ڈرامہ اسٹیج کیا گیا۔ مقدمہ کی ۳۰ منٹ دورانیہ کی کارروائی پر ''ساختہ ریاستہائے متحدہ امریکہ'' کی مہر لگی ہوئی تھی۔ جہاں صدام حسین کو ہتھکڑی اور زنجیروں میں جکڑ کر اس نامعلوم مقام

سے لایا گیا جہاں وہ امریکی فوجوں کی قید میں تھے۔ انھیں ایک امریکی اڈہ میں کسی صورت مہیا کردہ عدالت کے سامنے پیش کیا گیا جس کے اوپر امریکی ہیلی کاپٹروں کا سایہ تھا۔

اگرچہ ظاہری طور پر ایک گمنام عراقی جج عدالت کی سربراہی کر رہا تھا لیکن اصل اختیار تو امریکی افسروں کا تھا۔ عدالت میں احتیاط سے منتخب کیے ہوئے سامعین اور جیسا کہ نیویارک ٹائمز نے کہا نئی عراقی حکومت کے افسروں پر تین امریکی رپورٹر اور تین امریکی افسر چھائے ہوئے تھے اور دو وُکلاء جج کو مشورہ دے رہے تھے اور ریاستہائے متحدہ کی بحریہ کا ایک ایڈمرل بطور ترجمان کام کر رہا تھا۔ اس لیے ذرائع ابلاغ کو کارروائی کا صرف امریکی زاویہ نظر ہی مل رہا تھا۔

یہ مقدمہ کس قدر لغو تھا یہ بات اس حقیقت میں نظر آ رہی تھی کہ صدام کے ساتھ ان کے بیٹوں کے مقرر کردہ بیس (۲۰) وکیلوں میں سے کوئی بھی نہیں تھا کیونکہ ان وکیلوں کو صدام تک رسائی ہی نہ دی گئی اُنھیں ان دستاویزات تک بھی رسائی حاصل نہیں تھی جن کی بنیاد پر استغاثہ کا مقدمہ قائم کیا گیا تھا' وہ عراقی خصوصی عدالت جس کے سامنے صدام کو زنجیروں میں جکڑ کر لایا گیا وہ امریکی اتحادی عبوری مقتدرہ اور کٹھ پتلی عراقی گورننگ کونسل نے قائم کی تھی۔ اس نام نہاد عدالت کا پورا خرچ واشنگٹن نے اٹھایا تھا اور اس کے کاموں کے ہر پہلو پر مشاورت کے لیے پچاس (۵۰) امریکی افسر تعینات تھے جن کی سربراہی FBI کر رہی تھی اور امریکی جسٹس ڈیپارٹمنٹ کے وکلائے استغاثہ الزامات گھڑنے میں مشغول تھے۔

امریکی انسانی حقوق کے ادارے نے عدالت کے جواز پر سوالات اٹھائے اور اس کے قوانین میں بہت سی تبدیلیوں کا مشورہ دیا تاکہ اسے بین الاقوامی قانون کے مطابق بنایا جا سکے۔ انسانی حقوق کے ادارہ نے جن بنیادی قانونی خلاف ورزیوں کی نشان دہی کی ان میں سے ایک یہ تھی کہ اس بات کا خیال نہیں رکھا گیا کہ عدالت کے منصفین خودمختار اور بالادست ہوں اور ضروری تجربہ کے حامل ہوں۔ اگر عدالتی

خودمختاری اور بالادستی کے اصولوں پر عمل کیا جاتا تو امریکہ کے تربیت یافتہ صالح شیلابی کو جو امریکی گُرگے احمد شیلابی کا بھتیجا ہے عدالت میں عہدہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔

یہ عجیب بات ہے کہ جن جنگی اور خلاف انسانیت جرائم کا الزام صدام حسین پر ہے ان میں امریکہ کے مکمل طور پر ملوث ہونے کو چھپانے کے لیے نہ تو WMD کا کہیں ذکر ہے نہ القاعدہ کی دہشت گردیوں کا اور جو واحد وجہ بتائی گئی تھی عراق پر حملہ کرنے کی اور جو چھ نکاتی فہرستِ الزامات صدام حسین کے خلاف پیش کی گئی اس میں زیادہ تر حلبجہ میں کردوں کو گیس کے ذریعے مارنا اور شیعوں کے قتل عام ہی کا ذکر ہے۔ الزامات بہت ہی احتیاط کے ساتھ چننے کے باوجود گھبراہٹ تھی کہ صدام کا مقدمہ الٹا پڑ سکتا ہے، اگر صدام کی تمام مجرمانہ مہمات میں جن میں نسل کشی اور انسانیت کے خلاف جرائم شامل ہیں امریکہ کے تعاون اور اشتراک کا پنڈورا صندوق کھل گیا۔

صدام عدالت کی پوچھ گچھ کے دوران کس قدر مطمئن اور پر اعتماد تھا اور اس کے جوابات کسی قدر فوری تیز اور سخت تھے۔ تعجب نہیں اگر عدالت میں اس کے غیر معمولی طور پر دلیرانہ اور باہمت انداز نے عراق کی سڑکوں کو اس قدر شعلہ فشاں کر دیا کہ فلوجہ اور دوسرے شہروں میں لوگوں کا نعرہ تھا ''اپنی زندگی اور خون سے ہم تمھارے ساتھ ہیں صدام''۔ ذرائع ابلاغ اس خبر سے بھرے ہوئے تھے' صدام نے پانسہ پلٹ دیا ہے صدام تیس (۳۰) منٹ کی پوچھ گچھ میں کیسے نظر آئے، اور کس طرح جج پر پانسہ پلٹنے میں کامیاب ہوئے اور اس سے کمال کی بات یہ ہے کہ کس طرح عدالت میں پیشی کے وقت انھوں نے اپنے آپ کو اسی طرح رکھا جیسے زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہونے کے باوجود وہی عراق کے حقیقی صدر تھے۔ اسی بات نے عراق میں جاری شورش کی آگ کو ہوا دی۔ اس کی ایک جھلک مندرجہ ذیل ہے:

جج: ''صدام حسین سے مخاطب ہو کر۔ برائے مہربانی آپ کا نام؟

صدام: ''صدام حسین۔ صدام حسین صدر جمہوریہ عراق (اسی نے آگ کو بھڑکا دیا)۔''

جج: ''آپ کی عمر؟''

صدام: ''میری عمر؟''

جج: ''وقائع نگار سے مخاطب ہو کر کہا: ''پیدائش ۱۹۳۷ء اور سابق صدر عراق کا عہدہ''۔صدام حسین دخل دیتے ہوئے۔اب بھی (صدر)

جج صدام سے: ''عراق میں آپ کی رہائش گاہ؟''

صدام: ''عراق کا ہر گھر میری رہائش گاہ ہے۔''

صدام: ''میرا ایک سوال ہے جناب؟''

جج: ''فرمائیں۔''

صدام: ''آپ کو مجھ سے اپنا تعارف کروانا چاہیے۔''

جج: ''صدام صاحب! میں عراق کی مرکزی عدالت کا تفتیشی منصف ہوں''۔

صدام: ''معاف کیجئے گا''؟

جج: ''میں عراق کی مرکزی عدالت کا تفتیشی منصف ہوں۔''

صدام: ''کیا ہم اس کی جزئیات پر بات کر سکتے ہیں؟''

جج: ''جی ہاں۔''

صدام: ''تفتیشی منصف ـــــ تفتیشی''۔

جج: ''عراق کی مرکزی عدالت کا۔''

صدام: ''یہ کس قانون کے تحت بنی تھی؟''

جج: ''یہ اتحادی مقتدرہ کے فیصلہ کے تحت بنائی گئی تھی۔''

صدام: ''اتحادی مقتدرہ؟''

جج: ''جی ہاں۔''

صدام: ''آپ ایک عراقی ہیں جو اپنے ملک پر قابض اقتدار کی نمائندگی کر رہا ہے؟''

جج: ''اس کا مطلب ہے کہ میں ایک عراقی ہوں جو عراق کی نمائندگی کر رہا ہے۔''

صدام: ''اور ایسا قانون کے نام پر ہے؟''

جج: ''اور انصاف کے نام پر''۔

صدام: ''کیا ہم ہم خیال ہیں؟''

جج: ''بالکل۔''

صدام: ''انصاف ذیلی چیز ہے۔ ہمارے لیے انصاف کی نمائندگی اس دائمی ورثہ سے ہوتی ہے جو قرآن مقدس سے اخذ کیا گیا ہے۔''

جج: ''درست۔''

صدام: ''اور رسول اللہ ﷺ کی شریعت سے کیا ایسا نہیں ہے؟''

جج: ''درست''!

صدام: ''آپ کی مہربانی ہوگی مجھے قانونی باتیں اچھی طرح سمجھ لینے دیجیے' مجھے علم ہے کہ ملزم کی منصف کے سامنے پیشی سے پہلے تفتیش ہونی چاہیے۔''

جج: ''یہ تفتیش ہی ہے''۔

صدام: ''تفتیش؟''

جج: ''جی' تفتیش۔''

صدام: ''میرا مطلب ہے مجھے امید ہے کہ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ بحیثیت منصف عوام کی نمائندگی کر رہے ہیں۔''

جج: ''اللہ کی مرضی سے۔''

صدام: ''یہ اس بارے میں نہیں ہے کہ آپ فیصلہ کس طرح کریں گے' میرے لیے یہ اہم نہیں ہے۔ آپ کے لیے یہ بات اہم ہے کہ آپ یاد رکھیں کہ آپ منصف ہیں۔''

جج: ''میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں منصف ہوں۔''

صدام: ''پھر آپ یہ خیال رکھیں کہ ان چیزوں کا ذکر نہ کریں جنھیں قابض طاقتیں کہا جائے جنھیں آپ کے لوگ حملہ آور طاقتیں سمجھتے ہیں۔''

جج: ''میں ایک منصف ہوں جو عوام کی نمائندگی کر رہا ہے۔''

صدام: ''ٹھیک ہے تو پھر اپنے فرائض اپنے عوام کے نام پر ادا کریں' آپ ایک عراقی

منصف ہیں۔"

جج: "صدام صاحب! اس غرض سے کہ ہم تفتیش کو آگے بڑھائیں۔ یہ آپ کا حق ہے کہ آپ جانیں کہ آپ پر کیا الزامات ہیں۔"

صدام: "اس سے پہلے جناب محض قانونی نقطہ نظر سے' میرا خیال ہے کہ آپ کو بتایا گیا ہوگا کہ میرے کچھ وکیل ہیں۔"

جج: "جی ہاں۔"

صدام: "کیا ایسا نہیں ہے؟"

جج: "جی ہاں۔"

صدام: "کیا یہاں آنے سے پہلے میرے لیے اپنے وکیلوں سے ملاقات ضروری نہیں۔ کس قدر تیکھے پن سے اور وثوق کے ساتھ انھوں نے جج سے اپنے سوالات اور استفسارات سے حسبِ مراد جواب حاصل کر لیے، اس کے اختیار کو للکار دیا' اس کو قابض طاقتوں کا ایجنٹ قرار دیا اور اسے قرآن پاک اور سنت کے اصولوں کا پابند کر دیا۔ اور اخیر میں کس طرح انھوں نے استغاثہ پر ہی پانسہ پلٹ دیا۔ انجام کار وہ کامران رہے اور عراقی عوام کی تعریف اور ہمدردی حاصل کر لی۔ ان سب باتوں نے ان امریکی رکھوالوں کے لیے پریشانی پیدا کی ہوگی جو ایک بڑی تعداد میں وہاں موجود تھے' تعجب نہیں اگر اگلی پیشی کی تاریخ امریکہ میں صدارتی انتخاب کے بعد کی مقرر کی گئی ہے۔ اور اب شفافیت بھی بہت کم ہو گئی ہے۔ peter symonds (ڈان، ۶ جولائی ۲۰۰۴ء) نے اس مقدمہ کو عراقیوں کے ملک پر امریکہ کی طرف سے مسلط کردہ ایک اور ذلت قرار دیا اور ماضی میں صدام کے تمام جبر اور بربریت کے باوجود ان کے لیے ایک بڑھتی ہوئی ہمدردی کی نشان دہی کی۔

یہ مقدمہ جس طرح آگے بڑھ رہا ہے خطرہ ہے کہ صدام کے قبیح معاملات کے ضمن میں ریاستہائے متحدہ کے قبیح کردار پر ایک سیاسی ساختہ حوالہ بن جائے گا۔ اوائل

جولائی میں بغداد کے ایک ریڈیو اسٹیشن کی رائے شماری کے مطابق صدام کی عدالت میں پیشی کے بعد ۴۵ فی صد فون کرنے والوں نے اس کے لیے موت کی سزا تجویز کی جبکہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ۴۱ فی صد لوگ اُن کی رہائی چاہتے تھے۔ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مقدمہ پوری طرح چلنے تک اور اگر صدام کی اہلیہ اور بیٹوں کے مقرر کردہ بیس (۲۰) وکلاء کو صفائی کی اجازت ملی......تو صدام امریکی قبضہ کے خلاف شاندار لڑائی کے صلہ میں مقدمہ سے قومی ہیرو بن کر اُبھرے۔ اور کسے پتہ ہے کہ صدام آخرکار تاریخ میں اپنے لیے اخلاقی اور نظریاتی طور پر نئی طاقت کے حامل کی حیثیت سے گوشہ بنالے۔ایک سال اور تین ماہ کے طویل تعطل کے بعد ۱۹/ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو عراق سے جاری کردہ ایک مراسلہ میں کہا گیا کہ صدام نے امریکی پشت پناہی کی حامل عدالت کے قانونی جواز کو للکار دیا ہے۔ جب اُسے اپنا پورا نام بتانے کو کہا گیا تو ۶۹ سالہ صدام نے جوابی حملہ کیا کہ تم مجھے جانتے ہو تم ایک عراقی ہو اور تمھیں پتہ ہے کہ میں کون ہوں میں اس نام نہاد عدالت کو جواب نہیں دوں گا۔اس نے الٹا جج کو ہی سوالوں پر دھرلیا۔ تم کون ہو تم کیا ہو؟ میں صدر عراق کی حیثیت سے تمام آئینی حقوق رکھتا ہوں۔ بعد میں جب صدام کو واپس لے جایا جارہا تھا تو انھوں نے دونوں محافظوں کو ان کے بازو نہ پکڑنے کا حکم دیا۔ انھوں نے ایک محافظ کے کندھے کو دھکا دیا جس کے بعد محافظوں نے صدام کو چھوئے بغیر چلنے دیا۔ان کے پاس قرآن پاک کا ایک نسخہ تھا۔مقدمہ وکیل صفائی کی درخواست پر ۲۸/ نومبر تک ملتوی کردیا گیا اس تاریخ پر پھر پیشی ہوئی اور صدام کا انداز ویسا ہی جارحانہ اور للکارنے والا تھا۔

عالمی انسانی حقوق کی تنظیمیں مطمئن نہیں ہیں کہ اب جو کارروائی ہوگی وہ انصاف کے عالمی معیار پر پوری اترے گی۔ جبکہ صدر بش کا اصرار ہے کہ مقدمہ مکمل طور پر عراقیوں کے اختیار میں ہے اور صدام کو عراقی انصاف کا سامنا ہے۔لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ بنیادی قانون جس کے تحت صدام پر مقدمہ چل رہا ہے امریکہ کے زیر اختیار عبوری اتحادی مقتدرہ کی زیر نگرانی لکھا گیا اور جس میں عبوری حکومت کے ۲۰۰۵ء کے

موسم بہار میں قیام کے بعد موہوم سی تبدیلی کی گئی ہے۔ مقدمہ کے متعلقین کے پس منظر میں کی جانے والی سازشوں پر نیویارک ٹائمز کا تبصرہ ہے :امریکی زیر قیادت جرائم کا رابطہ دفتر جس میں دوسرے اتحادی ملکوں کے وکلاء اور عالمگیر انصاف کے ماہرین خاص طور پر برطانیہ اور آسٹریلیا سے عدالت کی مشاورت کی اصل طاقت رہے ہیں اور اکثر گمنامی کے پردہ میں تمام معاملوں کے فیصلے کرتے رہے ہیں' الزامات اس طرح تراشے گئے ہیں کہ صدام کے جرائم میں امریکہ کا تعاون اور ملوث ہونا مقدمہ کے احاطہ سے باہر رہے۔ Ruhard Falk نے نشان دہی کی جو Princeton University پرنسٹن یونیورسٹی میں عالمی قانون کا ایک اعلیٰ ماہر ہے۔

اگر صدام پر مقدمہ آٹھ سالہ ایرانی جنگ میں کیے ہوئے جرائم پر چلتا تو شاید وہ امریکی ڈھانچوں سے بھری ہوئی الماری دنیا کے سامنے کھول دیتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امریکی اس خیال کو بالکل پسند نہیں کرتے کہ صدام پر کسی خودمختار عالمی عدالت میں مقدمہ چلے جیسا کہ یوگوسلاویہ کے ملازووچ کے مقدمہ میں ہوا۔ ۲۱/ اکتوبر ۲۰۰۵ء کی ایک اخباری اطلاع کے مطابق صدام کے ساتھی ملزموں میں سے ایک کے دفاعی وکیل کو اغوا کے بعد ہلاک کر دیا گیا۔ صدام کے وکیل صفائی نے اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل سے درخواست کی ہے کہ معاملہ میں دخل دیں اور مقدمہ کو بغداد سے جنیوا منتقل کروائیں۔ ایک ہفتہ بعد ایک اور صفائی کے وکیل کو قتل کر دیا گیا۔ بلاوجہ دخل اندازی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے صدام مقدمہ کے قائد جج نے استعفیٰ دے دیا۔

عراق بعد از انتخابات ...... چند خیالات

مزاحمت کاروں کی طرف سے دہشت گردی کے خطرات کے باوجود عراق میں انتخابات کے وقت پر یعنی ۳۰/ جنوری ۲۰۰۵ء کو منعقد ہونے اور لوگوں کے اتنی بڑی تعداد میں حصہ لینے کی بار بار تعریفی نمائش کی جارہی تھی۔ صدر بش کے الفاظ میں یہ سنسنی خیز کامیابی ہے۔ انھوں (عراقیوں) نے ساری دنیا کو سنا دیا ہے۔ ساری دنیا مشرق

وسطیٰ سے ان کی آواز سن رہی ہے اس لیے امریکی صدر کے لیے اس کا مطلب یہ تھا کہ عراقیوں نے مزاحمت کاروں کو مکمل طور پر مسترد کر دیا ہے۔ برطانوی وزیراعظم نے اسے دہشت گردی پر جمہوریت کی فتح قرار دیا۔

Charles Krauthammer واشنگٹن پوسٹ میں لکھتے ہوئے کیف انگیز خوشی میں پکار اٹھا۔ مشرق وسطیٰ کے انقلابی لمحہ کی ابتداء عراق پر حملہ، صدام کا تختہ الٹا جانے اور ۸ملین عراقیوں کے آزاد انتخابات میں ووٹ دینے کی تصویروں سے ہوئی۔ یہ پہچان flint liverette کے زیادہ سنجیدہ اور متوازن نظریہ کی نفی کے لیے تھا کہ مشرق وسطیٰ کے ملکوں مثلاً لبنان اور شام میں جمہوری تحریکوں کے نتیجہ میں اسلامی حکومتیں ابھر سکتی ہیں اور حزب اللہ جیسی اسلامی جماعتوں کی طاقت مستحکم ہو کر مزید بڑھ سکتی ہے۔

صدر بش، ٹونی اور چارلس کراتھیمر ۸ملین عراقی مسلمانوں کے ووٹ دینے کی بڑھا چڑھا کر دکھائی ہوئی تصویروں کی بنا پر مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کے مستقبل کے لیے بے پناہ خوش اُمیدی میں مبتلا ہو گئے۔ اس لیے بعد کے حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ انتخابات کے بعد عراق کے لیے کیا صورت حال مقدر ہے اور ماضی میں ویت نام ڈومینیکن جمہوریہ اور ال سلواڈور میں اسی طرح فوجوں کے سائے میں انتخابات نے کیسے حالات پیدا کیے تھے۔

جب دنیا عراقی انتخابات کے بارے میں جوش و خروش سے بھری ہوئی تھی ماضی کے ایسے ہی جوش و خروش کی یاد تازہ ہو رہی تھی جب ۱۹۴۷ء میں سوویت یونین نے پولینڈ میں انتخابات کروائے تھے اور اسی طرح بڑی تعداد میں لوگوں نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا تھا اور ان انتخابات کو ریاستہائے متحدہ نے پُرغرور انداز میں دھاندلی کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ اسی طرح ریاستہائے متحدہ نے نکاراگوا میں سندانیستا حکومت کے دوران ۱۹۸۴ء کے انتخابات میں رائے دہندگان کی بڑی تعداد کو مسترد کر دیا تھا۔ لیکن دیکھ لیں اس طرح اچانک ریاستہائے متحدہ نے ویت نام جمہوریہ ڈومینیکن ال سلواڈور اور عراق میں رائے دہندگان کی بڑی تعداد کے بارے میں اپنا فیصلہ الٹ دیا۔ کیونکہ یہ

سارے انتخابات بالواسطہ یا بلاواسطہ فوج کے سائے میں ہوئے تھے لیکن امریکی فوج کے سائے میں۔...... ابھی کچھ دن پہلے صدر بش نے اصرار کیا کہ جب تک لبنان سے شام کے چار ہزار (۴۰۰۰) فوجی واپس نہیں چلے جاتے وہاں آزاد اور شفاف انتخابات نہیں ہوسکتے۔ اگر یہی اصول ہے تو ایسا کس طرح ممکن ہے کہ عراق میں ڈیڑھ لاکھ (۱۵۰،۰۰۰) امریکی فوجیوں کی موجودگی میں ہونے والے انتخابات آزاد اور شفاف ہوئے ہوں۔

۱۱رستمبر ۱۹۶۷ء کو نیویارک ٹائمز نے جنوبی ویت نام کی کٹھ پتلی حکومت کے صدارتی انتخابات کے بارے میں جو جنگ ویت نام کے عروج کے وقت ہوئے تھے ایک ظریفانہ رپورٹ شائع کی تھی۔ ویت نام کی طرح عراق میں بھی اس سے جاری شورش میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ اگر کچھ ہوا تو یہ کہ اس کا زور اور ہلاکت خیزی مزید بڑھ گئی۔

عراقی انتخابات کے بعد سے شورش میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ ۲۸رفروری ۲۰۰۵ء کو AFP کے مطابق ۱۲۷۵ افراد حملہ کی زد میں آئے جن میں سے زیادہ تر پولیس اور فوجی محافظوں میں بھرتی کے لیے قطار میں کھڑے تھے۔ ان میں سے ۱۲۵ ہلاک اور ۱۵۰ زخمی ہوئے۔ اس کے بعد سے امریکی افواج اس قدر گھبراہٹ میں مبتلا ہیں کہ انھوں نے ایک اطالوی صحافی کو گولی ماردی جو اس وقت قید سے چھوٹا تھا اور اغوا کنندگان کے اچھے سلوک کی تعریف کی تھی جبکہ ایک دوسرے صحافی کو زخمی کردیا۔ اس لیے یہاں دہشت گرد دوسرے ہی ہیں یعنی امریکی فوجی۔ اس سانحہ نے اطالوی قوم کو جو پہلے ہی عراق پر امریکی حملہ میں اطالیہ کی حکومت کی امداد پر تلخ کام تھی مزید مشتعل کردیا۔ اطالوی وزیراعظم کو اپنے دور حکومت کے سب سے سخت وقع کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے احتجاج پر صدر بش کو مکمل تفتیش کا وعدہ کرنا پڑا۔ United Arab Alliance جو زیادہ تر شیعہ قائد اور اسلامی انقلاب کی سپریم کونسل، شیعہ دعویٰ جماعت اور اکادکا سنی امیدواروں نے انتخابات کی مہم کے دوران وعدہ کیا کہ امریکی فوجوں کو واپس کروائیں گے۔ نہ صرف شیعہ مذہبی گروہوں کے اتحاد بلکہ امریکہ کے زیردست عیاد علاوی کے

گروہ کی بھی ہمت نہ پڑی کہ ایسا ہی وعدہ کیے بغیر انتخابات کے میدان میں اتر سکے۔

متحدہ کرد گروہوں کو بھی جو امریکہ کہ اس قدر احسان مند ہیں امریکی افواج کی واپسی کا وعدہ کرنا پڑا۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ عراق میں امریکی موجودگی کے خلاف کس قدر نفرت اور غصہ ہے۔ ان تمام گروہوں نے رائے شماری میں حصہ لیا تو ان کا مقصد جمہوریت کم اور امریکی موجودگی کے خلاف اظہار زیادہ تھا۔

عراقی انتخابات میں امریکی سفیر نیگرو پونٹے نے اختیارات سے مکمل تجاوز کرتے ہوئے اپنے تمام مالی وسائل اور ذرائع ابلاغ کے ساتھ علاوی کی پشت پناہی کی' اگر ریاستہائے متحدہ کو حقیقی جمہوریت لانی تھی تو اسے اپنی تمام طاقت اور وسائل ایک ایسے گروہ کے لیے صرف کرنے چاہییں تھے جو سابق CIA کے افسر کے زیر قیادت تھا۔ علاوی کی جیت کے لیے امریکہ کی تمام تر کوششوں کے باوجود عراقی انتخابات نے منقسم نتائج دیے۔ ۷۷ نشستیں کردوں کو' ۱۴۰ نشستیں اتحاد کو اور ۴۴ کے قریب نشستیں امریکی حمایت یافتہ علاوی گروپ کو ملیں۔ عراقی صدر غازی یاور کو پانچ نشستوں پر اکتفاء کرنا پڑا۔ اس طرح کوئی بھی جماعت ۲/۳ کی حتمی اکثریت حاصل نہ کر سکی۔

اعلیٰ مقام آیت اللہ سیستانی کا دہرا کردار نظر آتا ہے۔ بنیاد پرست اسلامی اور ساتھ ہی عظیم جدت پسند۔ ایک طرف وہ اصرار کرتے ہیں کہ آئین اسلامی اصولوں پر مبنی ہونا چاہیے۔ اور اسلام کو قوم کا مذہب قرار دیا جانا چاہیے۔ پھر بھی انھوں نے یہ قانون جاری کیا کہ خواتین اپنے شوہروں کی مخالفت کے باوجود ووٹ دیں لیکن اسی وقت انھوں نے خواتین کو اپنے والد' بھائی اور شوہر کے علاوہ کسی سے بھی مصافحہ کرنے کو حرام قرار دیا۔ اگرچہ سیستانی نے قبضہ کی مذمت کی ہے لیکن قبضہ کے خلاف فتویٰ کبھی جاری نہیں کیا۔

انتخابات کے ایک ماہ بعد بھی (۸/ مارچ) ایسا کوئی واضح اشارہ نہیں تھا کہ تینوں بڑے گروہ مل کر آئین اور حکومت بنالیں گے سوائے اس خبر کے کہ اتحاد اور کرد ۱۶ مارچ

کو ایوان کا اجلاس بلانے پر راضی ہو گئے ہیں۔ چند دنوں بعد ایک اخباری رپورٹ نے بتایا کہ علاوی نے اتحاد کی طرف سے ان کی کارکردگی کے تناسب سے جو پیش کش کی ہے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا۔اس سے پتہ چلا کہ عراق میں معاملات امریکہ کے مطابق نہیں چل رہے۔ سیستانی گروہ نے وزیراعظم کے عہدہ کے لیے ابراہیم الجعفری کا نام تجویز کیا' صدر کے عہدہ کے لیے کردوں سے طالبانی کا نام پیش کیا' کردوں کی مدد کے لیے جن کے پاس ۷۷ نشستیں تھیں علاوی بہت محنت کرتے رہے تھے تاکہ پھر سے وزیراعظم بن سکیں۔ چونکہ حکومت بنانے یا آئین سازی کے لیے قومی اسمبلی میں ۲/۳ کی اکثریت ضروری تھی اس لیے کردوں کو بادشاہ گر کی حیثیت حاصل ہوگئی کیونکہ اتحاد کے پاس بھی ۱۴۰ نشستیں تھیں اور وہ کردوں کے تعاون کے بغیر حکومت یا آئین نہیں بنا سکتے تھے۔لیکن یہ تعاون حاصل ہونا مشکل نظر آتا ہے کیونکہ کرد پہلے سے لامذہب عراق کے حامل ہیں اور ان علاقوں پر دعویٰ کر چکے ہیں جنھیں عرب بنا لیا گیا اور کردوں کو وہاں سے کردستان کی طرف بے دخل کردیا گیا تھا۔جلال طالبانی کہہ چکے ہیں کہ ان کا حتمی مقصد آزاد کردستان ہے۔

اس لیے سیستانی کی پشت پناہی کے حامل اتحادی گروہ کے سامنے ایک عراقی حکومت اور آئین سازی کا کام کردوں کی حمایت کے بغیر کٹھن نظر آتا ہے۔اگر سیستانی نے اسلامی آئین یا کرکوک کے تیل کی واپسی کے معاملہ میں کردوں سے سمجھوتہ کرلیا ہوتا تو اس سے سیستانی کی قیادت کو سخت دھچکا لگتا اور مقتدیٰ الصدر کے سخت گیر حامی جو امریکی تسلط کے خلاف بغاوت کر رہے تھے عوامی حمایت اور طاقت واپس حاصل کرلیتے۔ انتخابات کے بعد مقتدیٰ الصدر کے ایک قابل بھروسہ ساتھی نے مسجد ابو حنیفہ میں ان کا (الصدر کا) اعلان پڑھ کر سنایا تھا کہ اگر اتحاد نے امریکہ کی واپسی کے لیے دباؤ نہ ڈالا تو وہ اپنی زبان بند نہیں رکھیں گے، اور یہ بھی کہ انھوں نے انتخابات میں حصہ نہیں لیا اس لیے کہ وہ امریکہ کے ہاتھوں مہرہ نہیں بننا چاہتے۔

دوسری طرف اگر کردوں نے اتحاد سے تعاون نہ کیا کیونکہ وہ اسلامی آئین اور کرکوک کی کردوں کو واپسی کے لیے سمجھوتہ نہیں کر رہے تھے تو ایک ایسا تعطل پیدا ہو جاتا جو عراق کو سیاسی اور آئینی بحران میں مبتلا کر دیتا۔ جبکہ پہلے ہی مقتدی الصدر کو آئین کے آخری مجوزہ متن میں کردوں کی انتہائی خودمختاری جو علیحدگی کے قریب نظر آتی تھی جیسی شق پر اتنا اشتعال تھا کہ انھوں نے ایک بہت بڑا مظاہرہ کیا تھا جس میں ایک لاکھ افراد نے آئین کے مجوزہ متن کی مخالفت میں حصہ لیا تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک ایک کر کے تمام گروہ اتحاد سمیت اپنے وعدوں اور منشور کے خلاف اس وعدہ سے پھر گئے ہیں کہ وہ امریکی فوج کو واپس بھجوائیں گے یہاں تک کہ اتحاد کے ابرہیم جعفری نے بھی بعد میں اعلان کر دیا کہ امریکیوں کی بہت جلدی واپس پر اصرار کرنا عقلمندی نہ ہو گی کیونکہ عراق ابھی تک شورش زدہ ہے کرد اور علاوی گروہ پہلے ہی امریکہ کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں۔ انھیں اپنی حیثیت قائم رکھنے کے لیے امریکہ کی موجودگی اور حمایت کی شدید ضرورت ہے۔ کہانی کا سب سے زیادہ المناک باب یہ ہے کہ مقتدیٰ نے بھی جو امریکی تسلط کے شدید ترین مخالف اور شیعہ سنی اتحاد اور یکجہتی کے علمبردار تھے افسوس! اپنے مشن سے دھوکہ کیا اور سیستانی کے حمایتی اتحاد میں شریک ہو گئے جبکہ عراق ابھی تک امریکہ کے زیر تسلط تھا۔

اس لیے عراق کی سیاسی صورت حال انتخابات کے بعد جو بھی رخ اختیار کرے بہر حال ریاستہائے متحدہ کو اپنے تمام فوجی اڈوں اور عراق کے معاشی وسائل کے استحصال سمیت وہاں موجود رہنا ہے۔ صدر بش اور سیکرٹری دفاع رمز فیلڈ دونوں ہی عراق سے واپسی کی کسی تاریخ کے اعلان کو مسترد کرتے رہے ہیں۔

کسے خبر ہے کہ مزاحمت کاروں نے سمجھی بوجھی چال کے طور پر عراقی انتخابات کا انعقاد ہونے دیا تا کہ وہ دکھا سکیں کہ عراق کے مسائل کے حل کے لیے انتخابات بے کار ہیں۔ جس کے بعد صرف مسلح جدوجہد کا راستہ باقی رہ جاتا ہے جیسا کہ Marceb

Jelin نے نشان دہی کی ہے کہ تسلط کا اختتام ہی جنگی کارروائیوں کا اختتام ہوگا۔

Atlantic Monthly میں جون ۲۰۰۵ء میں Robert Kaplan نے عراقی جنگ کے حتمی نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے مضمون کا اختتام اس پیش گوئی پر کیا ہے۔اگر عراق آخرکار جمہوری کامیابی بن بھی جائے تو ایسی کامیابی ہوگی جو ناکامی کے جبڑوں میں ہو اور فوجی یا سفارتی انتظامیہ میں سے کوئی بھی اسے دہرانا نہ چاہے گا خاص طور پر ایشیا میں جہاں گنجلک فوجی طالع آزمائی کے اثرات معاشی طور پر تباہ کن ہوں گے۔

اگست ۲۰۰۵ء میں نیویارک ٹائمز نے ایک مضمون میں عراقی جنگ کے طویل المیعاد اخراجات کا اندازہ لگاتے ہوئے لکھا ہے کہ اس جنگ کا خرچ ایک ٹریلین (Trilion) ڈالر سے زیادہ ہوگا۔آئین کمیٹی کی طرف سے دستور بنانے کی کوشش کے نااتفاقی پر ختم ہونے سے پہلے ہی اس اخبار نے پیش گوئی کی تھی اگر عراقی سیاستدان آخرکار اپنے ملک کے لیے ایک دستور پر متفق ہو بھی جائیں تو دنیا کا کوئی بے انتہا خوش فہم ترین انسان ہی اس پر یقین کرے گا کہ یہ دستور عراق کو پرامن، مستحکم، وفاقی جمہوریہ میں تبدیل کردے گا۔ جیسا کہ واشنگٹن میں لطیفہ مشہور ہے، ''جنگ ختم ہوگئی اور ایرانی جیت گئے''۔

سنی اور مقتدیٰ الصدر کے زیر قیادت شیعہ متفقہ طور پر عراق کے متحدہ ڈھانچہ کو تباہ کرنے کے مخالف ہیں۔ یہ صرف امریکی پروردہ کرد ہیں جو حتمی خودمختاری کا انعام حاصل کرچکے ہیں جس میں علیحدگی کے بیج موجود ہیں۔ اس لیے عراق کی تحلیل صرف اس بات میں ہے کہ امریکہ کردوں سے کہہ دے کہ وہ الگ ہو جائیں' بہرحال اخیرتک لمبی بحثا بحثی کے بعد کسی طرح اسلام کو قانون کے بنیادی ذریعہ کے طور پر شامل کیا گیا۔

اس طرح علاقے کے سارے ملک یعنی عراق، ایران، افغانستان اور پاکستان اب مسلمان ملکوں پر مبنی ایک علاقہ تشکیل دیں گے۔ اس لیے ریاستہائے متحدہ امریکہ کے لیے اب اور بھی ضروری ہوگیا ہے کہ اس اسلامی علاقہ میں اس کے پروردہ حاکم بنیں اور

اسلام کی نئی تعریف امریکی اقدار کی مناسبت سے کی جائے۔

بدقسمتی سے ہزاروں عراقی شیعوں پر جو ۳۱ راگست ۲۰۰۵ء کو ایک مذہبی اجتماع میں آتشیں ہتھیاروں سے حملہ ہوا اور بعد میں اس افواہ کی وجہ سے کہ مجمع میں کوئی خودکش بمبار موجود ہے بھگدڑ مچ گئی جس میں تقریباً ایک ہزار افراد ہلاک ہوئے کہا گیا کہ کسی ایسی جماعت نے جو القاعدہ سے متعلق ہے ذمہ داری قبول کی ہے۔ رائٹرز کے ایک مضمون میں کہا گیا ہے کہ ۱۲ رنومبر ۲۰۰۵ء کو الظواہری نے الزرقاوی کے نام ایک طویل مکتوب میں جو امریکہ نے اچک لیا تھا، انھیں شیعوں کے قتل اور مغویوں کے سرقلم کرنے پر تادیب کی ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ القاعدہ کی قیادت فرقہ واریت اور بربریت سے بہت دُور ہے۔

عراق کی موجودہ صورت حال میں جبکہ تمام سنی اور شیعوں کا ایک بڑا حصہ متفق طور پر آئین کی مخالفت اور عراق کے مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان تعاون اور مفاہمت کے پل تعمیر کرنا چاہتے ہیں اس بات پر کوئی احمق ہی یقین کرے گا کہ القاعدہ سے منسلک کوئی جماعت شیعہ برادری پر مذہبی درگاہ میں حملہ کرے گی۔ ایران نے جس نے اس قتل عام کی شدید مخالفت کی درست طور پر اشارہ کیا کہ کوئی پُراسرار ہاتھ اس میں ملوث معلوم ہوتا ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھرتے ہوئے شیعہ سنی اتحاد سے جن لوگوں کی دلچسپیاں متاثر ہورہی ہیں انھوں نے یہ انتہائی قدم اٹھایا ہے۔ ۲ ستمبر کو اداریہ میں ڈان نے لکھا کہ القاعدہ فرقہ وار جماعت نہیں ہے نہ ہی زرقاوی کو کبھی فرقہ واریت کا حامی پایا گیا ہے۔ ۲ ستمبر کو ایک اخباری رپورٹ سامنے آئی کہ مسجد کے سنی رکھوالوں نے درجنوں زخمی اور بھگدڑ میں بچ جانے والے شیعہ برادری والوں کو پناہ دی اور رشتہ داروں کے لیے پہچاننے کی سہولت کے لیے ہلاک شدگان کے شناختی کارڈوں کی نمائش کا اہتمام کیا۔

۱۵ راکتوبر ۲۰۰۵ء کو امریکی زیر قیادت جمہوریت لانے کا عمل ایک ریفرنڈم میں

اختتام پذیر ہوا جس میں حال میں دستور ساز کمیٹی کے بنائے ہوئے اور عراقی ایوان نمائندگان کے منظور کردہ آئین کو "ہاں" یا "نہیں" سے قبول یا مسترد کرنا تھا' اگر اٹھارہ میں سے تین صوبے دوتہائی منفی کردوں کو اکثریت سے مسترد کردیتے تو آئین مسترد ہوجاتا۔ بہرحال صرف دوصوبے اتنے منفی ووٹ مہیا کرسکے۔ اس لیے ریفرنڈم میں آئین منظور ہوگیا۔

امریکی سفیر زلمے خلیل زاد دستور سازی کے عمل میں مرکزی کردار تھے، اس حد تک کہ انھوں نے دستور ساز کمیشن کو باز و مروڑ کر مجبور کیا کہ آئین سے وہ شق نکال دیں جس میں کہا گیا تھا کہ ایوان نمائندگان کے دوتہائی ارکان کی توثیق کے بغیر امریکی فوجی اڈے عراق میں قائم نہیں رہیں گے۔ مزید برآں دستور میں اسلام کے بنیادی ذریعۂ قانون ہونے کی شق اخیر میں ان کی منظوری کے بعد ہی شامل کی جاسکتی تھی۔ صوبوں کے لیے خودمختاری کی منظور شدہ حدوفاقیت سے بہت آگے ہے۔

لیکن اسلام کے ساتھ دہرا معیار اس حقیقت سے واضح ہے کہ اگرچہ آئین کی شق نمبر۲ میں اسلام کو سرکاری مذہب اور قانون سازی کی بنیاد قرار دیا گیا ہے لیکن ایک دوسرے انتظام کے ذریعے اسلام کی افضلیت کو ختم کردیا گیا ہے جس کے تحت بنیادی اسلامی اصولوں کی تعریف' جمہوری عمل لوگوں کی بدلتی ہوئی خواہش کے مطابق کرے گا۔

اقوام متحدہ کی ایک خفیہ مطالعاتی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ عراقی آئین کی بناوٹ ٹوٹ بٹوٹ کا نسخہ ہے۔ برسلز میں ایک فکری گروہ (Think Tank) نے کہا ہے کہ اگر عراق میں ایسی حکومت نہ بنی جو شیعوں سنیوں اور کردوں کی مشترکہ رائے پر مبنی ہوتو ملک خانہ جنگی میں مبتلا ہوجائے گا۔

تعجب نہیں کہ ریفرنڈم کے اس نتیجہ کے باوجود شورش بڑھتی جارہی ہے۔ وزیر دفاع کونڈولیزا رائس نے ریفرنڈم کے نتیجہ کا انتظار کیے بغیر آئین کی منظوری پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ لیکن سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی کے سامنے گواہی دیتے ہوئے

اعتراف کیا کہ ابھی بھی عراقی جنگجو طویل عرصہ تک حملے کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔اس طرح امریکی ساختہ عراقی جمہوریت جاری بغاوت کو ختم کرنے کے بجائے خود ملک کے اتحاد اور خودمختاری کے لیے خطرہ ہے بالکل اسی طرح جیسے افغانستان کی جمہوریت جاری شورش کو ختم نہ کر سکی۔ریاستہائے متحدہ کا مشرق وسطیٰ میں جمہوریت لانے کا منصوبہ مطلوبہ نتائج کے حصول میں مکمل طور پر ناکام ہو گیا بلکہ اس نے بالکل ہی الٹ نتائج دیے ہیں۔

باب : ۳

افغانستان
سامراجی طاقتوں کا قبرستان

افغانستان میں امریکی ''فتح'' کتنی فتح مند ہے

افغانستان میں کرزئی حکومت اب تک کابل سے چند میل باہر اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ جنگجو سردار ابھی تک اپنے اپنے لشکر رکھتے ہیں۔ اور اپنے علاقوں میں ٹیکس لیتے ہیں۔ اتحادی فوجیں اکثر گولیوں کی زد میں آتی ہیں۔ ۲۷؍ جون ۲۰۰۴ء کو طالبان نے ۱۶؍افغان افسروں کو گولی ماردی تھی جو رائے دہندگان کا اندراج کرنے میں مصروف تھے۔ اس سے ایک دن پہلے انھوں نے دو امریکی مرین فوجیوں کو ہلاک کردیا تھا۔ افغانستان میں شورش عراق میں عبوری حکومت کے قیام کے بعد تیز ہوگئی ہے۔ ۵؍مئی ۲۰۰۵ء کو طالبان نے گھات لگا کر نو افغان فوجیوں کو ہلاک اور تین کو زخمی کردیا۔ اس کے بعد وہاں طالبان کے مسلح مزاحمت میں تیزی آگئی ہے۔ ۷؍ مئی ۲۰۰۵ء کو انھوں نے کابل ہوٹل پر حملہ کیا اور دو افغان سپاہیوں کو ہلاک اور کئی اور کو زخمی کردیا۔ ۱۶؍جنوری ۲۰۰۶ء کو ڈان کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ قندھار اور اسپن بولدک میں خودکش حملوں میں ۲۶؍افراد ہلاک اور بہت سے زخمی ہوئے۔

۳۰؍اگست ۲۰۰۴ء تک طالبان نے کار بم دھماکہ کرکے کابل میں ایک محافظ ادارہ کے ۱۲؍افراد کو ہلاک کیا جن میں ۳؍امریکی شہری شامل تھے، حالانکہ کابل کی حفاظت غیر

ملکی فوجیں کر رہی ہیں۔ ۱۱رمئی ۲۰۰۵ء کو گوانتاناموں میں قرآن پاک کی بے حرمتی کے خلاف مظاہرہ کے دوسرے دن مجمع ہنگامہ کرتے ہوئے جو نعرے لگا رہا تھا اس میں ''مرگ بر امریکہ'' بھی شامل تھا۔ مجمع نے امریکی پرچم اور صدر بش کے پتلے بھی جلائے' یہ امریکہ مخالف مظاہرہ صرف طالبان نے نہیں کیا تھا بلکہ انھوں نے بھی کیا جن کے بارے میں امریکہ کا دعویٰ ہے کہ اس نے اُنھیں طالبان کے ظلم سے نجات دلائی ہے۔ ۱۳راکتوبر ۲۰۰۵ء تک طالبان امریکی وزیر خارجہ کونڈولیزا رائس کی کابل آمد کے موقع پر کابل پر حملے کرتے رہے تھے۔

۱۳رنومبر ۲۰۰۵ء کو رائٹرز کے مراسلہ میں بتایا گیا کہ طالبان کے ترجمان قاضی یوسف نے دعویٰ کیا ہے کہ طالبان جنگجوؤں نے ۱۵رامریکی سپاہیوں کو صوبہ زابل میں ایک جھڑپ میں ہلاک کر دیا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے ۳رافغان پولیس والوں کو اغوا کر لیا۔ اس طرح یہ شورش تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔

سطور ذیل میں ایک سرسری نظر طالبان دور کے افغانستان پر اور اب امریکی سرپرستی میں کرزئی حکومت میں افغانستان پر ڈالی جاتی ہے۔

رائٹرز نے اپنی رپورٹ (ڈان ۲۰رجون ۲۰۰۵ء) میں اس بات کو نمایاں کیا ہے کہ کس طرح ہیروئن کی پیداوار پر جو حملہ طالبان نے کیا تھا وہ جدید دور میں سب سے زیادہ موثر مانع منشیات پالیسی تھی اور کس طرح طالبان کے بعد ہیروئن کی پیداوار دوبارہ تیزی سے بڑھی۔ جرمیات کے ماہر Grahan Farrow کے ایک مطالعہ میں پتہ چلا کہ ۲۰۰۱ء میں طالبان کی سختی کے بعد پوست کی کاشت عالمی طور پر ایک تہائی رہ گئی تھی۔ طالبان کے زیر اختیار علاقوں میں اس کی پیداوار ۹۹ فی صد کم ہو چکی تھی۔ اور ایسا طالبان کی طرف سے سخت سزاؤں کی وجہ سے ہوا جیسا کہ ماہر جرمیات کو پتہ چلا۔ جہاں تک اس کا سوال ہے کہ یہ سزائیں وحشیانہ تھیں تو محقق Graham Farrow کو کسی قسم کی بلا واسطہ معلومات جن کی توثیق ہو سکتی تھی دوران تحقیق نہیں ملیں۔ جیسے ہی طالبان نکالے گئے کسانوں نے انتقامی زور سے پوست کی کاشت شروع کر دی اور ایک دفعہ پھر

افغانستان ہیروئن کا سب سے بڑا برآمد کنندہ بن گیا۔ نومبر ۲۰۰۳ء میں امریکہ کے اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ ۲۰۰۳ء میں افغانستان میں پوست کی کاشت طالبان کے سقوط کے ایک سال پہلے کے مقابلہ میں ۳۶ گنا زیادہ تھی۔ طالبان کی سخت کارروائی کے ساتھ مذہبی پہلو شامل تھا جس کی وجہ سے پوست کی کاشت کے خلاف مہم کو اعلیٰ اخلاقی مقام حاصل تھا۔ علاقائی قائدین کو ذمہ دار قرار دیا گیا تھا کہ سختی سے عمل کروائیں اور اگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے تو سزا کے مستحق ہوں گے' سب سے بڑھ کر طالبان قیادت کا افیون کی کاشت میں کوئی مفاد نہ تھا۔ کیونکہ وہ سادگی' کفایت شعاری اور ایمان داری میں بہت کٹر تھے۔

AFP کی ایک اور رپورٹ (ڈان ۲۰/جنوری) میں افغانستان سے تاجکستان کے راستہ مغربی ممالک کی ہیروئن کی اسمگلنگ پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے جو پورے زور شور سے جاری ہے اور جس میں کمی کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ طالبان کے بعد افغان شمالی صوبوں میں پوست کی کاشت کا رقبہ بڑھاتے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی ہیروئن بنانے کے کارخانوں کی صلاحیتیں بھی جیسا کہ خوشنود رخم بایف نے کہا ہے جو کہ منشیات کی ایجنسی کے افسر اطلاعات ہیں۔ اندازہ ہے کہ افغانستان کے کام کرنے والوں میں سے ۲۳ فی صد پوست کی کاشت سے منسلک ہیں اور اس کی ناجائز تجارت سے سالانہ ایک بلین ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے۔ اقوام متحدہ کا اندازہ ہے کہ رواں سال میں چار ہزار ٹن افیون پیدا ہوگی۔ جس سے چار سو ٹن ہیروئن کشید کی جائے گی۔ منشیات کے تاجروں کی تنظیم ملک میں پوست کی کاشت جاری رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے اور اس کے لیے مختلف سرکاری حلقوں اور مقامی مافیا والوں کے ذریعے خوف، رشوت، دھمکی تمام حربے استعمال کر رہے ہیں۔ خوشنود نے بتایا کہ یہ سب کچھ امریکہ کی زیر سرپرستی کرزئی حکومت کی مکمل ناکامی کا ثبوت ہے اور موجودہ بحرانی صورت حال کی شدت طالبان کی واپسی کا مطالبہ کر رہی ہے۔

افغانستان کے خلاف فوجی کارروائیوں کے لیے اپنے اعلان کردہ مقاصد میں مثلاً

اسامہ اور ملا عمر کی گرفتاری اور ان کے نظام کی مکمل تباہی کا ہدف حاصل کرنے میں امریکہ کس قدر فتح یاب رہا ہے یا کامیاب ہوا بھی ہے یا نہیں اس پر Ramesh Patnesar نے ہفتہ وار ٹائم میں یکم جولائی ۲۰۰۲ء کو خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے۔ جنوبی اور مشرقی افغانستان کے بڑے علاقے ابھی تک طالبان اور القاعدہ کی ہمدرد ملیشیا کے زیر اثر ہیں۔ ملا عمر کے بارے میں یقین ہے کہ قندھار کے قریب پہاڑوں میں پناہ گزین ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ مئی میں اس نے لندن میں جاری عرب اخبار کو انٹرویو دیا جس میں اس نے امریکہ کو شکست دینے کا عہد کیا اور دعویٰ کیا کہ بن لادن زندہ ہے۔ یہ امریکی خفیہ معلومات کے اداروں کے لیے ''ایک بھیانک خواب کا منظر ہے۔'' بن لادن کو پکڑنے میں ناکامی نے پینٹاگون اور CIA کے درمیان کشیدگی بڑھادی ہے بن لادن جیسے یکسو دہشت گردوں کو شکست دینے کے لیے نہ صرف فوجی اسلحہ کی طاقت ضروری ہے بلکہ صبر، رہنمائی اور خوش قسمتی بھی۔

CNN کے مطابق سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ نے مرکزی کمان کی ناکامی اور القاعدہ اور طالبان قیادت کی گرفتاری میں خفیہ اداروں کی ناکامی سے پریشان ہوکر افغانستان میں فوجی کارروائیوں کی کمان مرکزی کمان سے واپس لے کر جنرل فرینک کی خصوصی افواج کو منتقل کردی تھی یا کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ القاعدہ اور طالبان قیادت کے خلاف خفیہ کارروائیاں کریں جس میں انھیں قتل کرنا بھی شامل تھا۔ واشنگٹن میں اسامہ کی گرفتاری میں ناکامی پر بڑھتی ہوئی کشیدگی بتاتی ہے کہ واشنگٹن کو افغانستان میں حتمی شکست کا بڑھتا ہوا امکان موت بن کر ڈرا رہا ہے۔

۲۴ر جولائی ۲۰۰۲ء کے ڈان کراچی نے بتایا کہ ہرات میں قبیلوں کی لڑائی میں ہرات کے گورنر اسمٰعیل خان کی سازباز سے چودہ پشتون اور تاجک ہلاک ہوئے' کہا جاتا ہے کہ طالبان کے جانے کے بعد سے پشتون اس بات پر مشتعل تھے کہ قبیلوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم میں انھیں ان کا قانونی حصہ نہیں دیا جا رہا ہے۔ ۲۶ر جولائی ۲۰۰۲ء کے بوسٹن گلوب میں ایک اخباری رپورٹ ہے کہ پشتونوں نے کرزئی کو الٹی میٹم

دیا ہے کہ اگر ہرات کے تاجک گورنر کو نہ ہٹایا گیا تو وہ کرزئی حکومت کے خلاف بغاوت کریں گے۔

افغان نائب صدر کے قتل کے بعد ان کے دس ذاتی محافظ گرفتار کر لیے گئے تھے، جن پر قتل میں ملوث ہونے کا شبہ تھا۔ اس بات سے حقیقت کھل جاتی ہے کہ افغان حفاظتی فوجوں کی وفاداریاں کس قدر مشکوک اور افغان صدر، نائب صدر اور وزراء کس قدر آسان نشانے ہیں۔ ہفتہ وار ٹائم اور ۲۳/جولائی کے بوسٹن گلوب نے بتایا کہ اس واقعہ کے فوراً بعد صدر کرزئی نے تمام افغان محافظوں کو ہٹا کر تقریباً ۱۲۰/امریکی فوجیوں کو اپنی ذاتی حفاظت کے لیے متعین کیا ہے۔

۳۰/جولائی ۲۰۰۲ء کے بوسٹن گلوب نے رپورٹ دی کہ ۲۹ جولائی کو بارود سے بھری ایک گاڑی کے ذریعے افغان قومی قائدین کو ہلاک کرنے کا منصوبہ ناکام بنادیا گیا۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ افغانستان میں حکومت اور امریکی موجودگی کے خلاف خودکش حملہ کی کوشش ہوئی جو مسلح مزاحمت کی ایک زیادہ ہلاکت خیز شکل تھی۔ امریکی سیکرٹری نے کہا کہ انھیں بم دھماکہ کے منصوبہ کے متعلق خبر نہیں لیکن انھیں اس پر تعجب نہیں ہے۔ طالبان، القاعدہ اور افغان دھڑے سب ہی کے پاس افغان حکومت پر حملہ کا جواز ہوسکتا ہے۔ انھوں نے اختتام میں یہ بھی کہا کہ ہمیں توقع رکھنی چاہیے کہ مسلح لڑائیاں ہوتی رہیں گی۔ یہ پہلی دفعہ ہوا کہ رمزفیلڈ نے اعتراف کیا کہ القاعدہ اور طالبان کے علاوہ بھی ایسے دھڑے ہیں جو امریکہ ساختہ افغان حکومت کے خلاف مزاحمت کررہے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کس طرح مختلف افغان دھڑے امریکی فوجوں کی اتنی بڑی تعداد کی موجودگی کے باوجود ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں۔

بعد میں دس پاکستانی فوجیوں کو جن میں ایک کیپٹن اور ایک میجر شامل ہیں گولی مارے جانے کے واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تلاش کی کارروائی فوج کی ایک کمپنی کی سطح پر ہورہی تھی اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کے شمالی مغربی سرحدی صوبہ میں طالبان اور القاعدہ کو عوامی حمایت حاصل ہے۔ امریکہ مخالف اور طالبان کی حامی جماعتوں کی

۲۰۰۲ء کے انتخابات میں غیر معمولی کامیابی نے ایسا ثابت کر دیا ہے اور وہ اپنے بل بوتے پر اپنے صوبہ میں حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ صوبہ سرحد کے نئے وزیر اعلیٰ نے اعلان کر دیا ہے کہ ملک دہشت گردی کے خلاف اپنی حفاظت خود کر سکتا ہے اور اسے امریکہ کی مدد کی ضرورت نہیں ہے اور اصرار کیا کہ امریکی پاکستان سے اپنے اڈے واپس لے جائیں۔ امریکی فوجوں کے خلاف قبائلی علاقوں میں جو شدید اور وسیع بنیاد ناراضگی موجود ہے، اب اُبل کر اُن کے خلاف تشدد کا رنگ اختیار کر رہی ہے۔ ۲۱ر جولائی ۲۰۰۲ء کو نیویارک ٹائمز نے رپورٹ شائع کی کہ امریکہ کی غیر ذمہ داریوں کی وجہ سے چار سو (۴۰۰) افغان شہری ہلاک ہوئے۔ اس کے علاوہ فوجی نشانوں پر بمباری میں طاقت کے غیر ضروری استعمال کی وجہ سے کثیر تعداد میں شہری ہلاک ہوئے۔

نیو ہمپشائر یونیورسٹی کے پروفیسر Mare W.Harold نے افغانستان میں امریکی بمباری سے یکم اکتوبر سے یکم دسمبر ۲۰۰۱ء تک ہلاک ہونے والوں پر ایک دستاویز میں شہری ہلاکتوں کی تعداد تین ہزار سات سو بیالیس ۳۷۴۲ بتائی ہے کیونکہ بنیادی طور پر امریکہ کے نزدیک افغان شہریوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جولائی ۲۰۰۲ء کو ایک شادی کے اجتماع پر امریکہ کی بے تکان بمباری کے نتیجہ میں چون (۵۴) دیہاتی ہلاک اور بہت سے زخمی ہوئے تھے جس کی وجہ سے غیر ملکی فوجوں کے خلاف افغانوں کے دلوں میں پلنے والی نفرت اور غصہ کی آگ کو مزید ایندھن فراہم ہوا۔

۲۶ر جولائی ۲۰۰۲ء کے ہفتہ وار India Abroad میں ایک مقالہ میں شیام بھاٹیہ یہ بات سامنے لائے ہیں کہ افغان حکومت اور امریکیوں سے منحرف ہو کر جنرل مالک نے جو طالبان مخالف کارروائیوں میں شریک تھا انکشاف کیا کہ اس کے آدمیوں نے صرف کارکارک کے گاؤں میں ایک سو بیس (۱۲۰) لاشیں نکالیں جو ان پانچ گاؤں میں سے ایک تھا جن پر بمباری کی گئی تھی۔ اور یہ بھی کہ اس کو خاموش رہنے کے لیے ڈھائی ہزار (۲۵۰۰) ڈالر کی پیش کش کی گئی تھی۔ اس نے مزید کہا ''افغان جنگجوؤں نے ان امریکیوں پر پستول تان لیے جو ان گریہ کناں مردوں اور خواتین کو ہتھکڑیاں لگا رہے

تھے جو حملہ میں بچ گئے تھے۔ اقوام متحدہ کے حقیقت کی تفتیش کرنے والے ایک مشن کی رپورٹ نے اس سانحہ کے بارے میں امریکی اطلاعات کو مشکوک قرار دیا جس کے مطابق ہلاک شدگان کی طرف سے مبینہ خطرہ پر شک کا اظہار کیا ہے جس کی سب سے زیادہ تباہی اس بنیاد پر ہوئی کہ کارکارک میں طالبان کے قائدین چھپے ہوئے ہیں۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ نے یہ بھی بتایا کہ افغان اتحادیوں نے چار متاثرہ گاؤں میں سے تین کا دورہ کیا اور الشافہ کے علاقہ کی مکمل صفائی کی۔ روزنامہ ٹائمز نے کہا کہ اس کا مطلب بچوں کے ٹکڑوں، گولیوں اور خون جیسے ثبوتوں کو ہٹانا تھا۔ یہی ہے وہ طریقہ جس کے ذریعے امریکی فوجوں نے افغانستان میں اپنی موجودگی کے خلاف گہری نفرت اور غصہ کے بھیانک جبڑوں میں خود اپنے آپ کو جکڑ ڈالا ہے۔

صدر کرزئی اور ان کی کابینہ کے وزراء اب تک شہری آبادی پر امریکی بمباری کو یہ کہہ کر جھٹکتے رہے ہیں کہ ایسا متحارب قبیلوں کی طرف سے آپس کی دشمنیوں کی بنا پر غلط اطلاعات فراہم کرنے کی وجہ سے ہوا۔ لیکن اب ایسا نہیں۔ شاید افغانیوں کی بڑھتی ہوئی ناراضگی اور رنجیدگی کم کرنے کے لیے جو امریکی افواج کے خلاف ہے۔ صدر کرزئی اور وزیر خارجہ عبداللہ نے اسے ضروری سمجھا کہ اس سانحہ پر غصہ اور ناپسندیدگی کا اظہار کریں۔ وہ غالباً پہلی دفعہ اس حد تک گئے کہ امریکی حکومت سے کہیں کہ مستقبل میں ایسے واقعات کا تدارک کریں۔ وزیر خارجہ نے تفتیش کے نتائج کا انتظار کیے بغیر واقعہ کی مذمت کی اور اسے کسی صورت جائز قرار نہیں دیا۔ انھوں نے کہا اس انتہا کا واقعہ جس میں اس قدر ہلاکتیں ایسے حالات میں ہوئیں کسی صورت قابل قبول نہیں۔ اس طرح ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان میں حالات نقطہ ابال تک پہنچ رہے ہیں۔ ۱۵ر جولائی ۲۰۰۲ء یا اس کے قریب ہی بوسٹن گلوب نے ادارتی تبصرہ میں امریکی حکومت کو امریکی طیاروں کی ہلاکت خیز بمباری پر سرزنش کی اور انتباہ کیا کہ "بے گناہ دیہاتیوں کو ہلاک کر کے اگر امریکہ چند کٹر طالبان کو پھنسا لے یا ان کے قائد ملا عمر کو پکڑ بھی لے تو اس کا نقصان فائدہ سے کہیں زیادہ ہوگا"۔ اس کے بعد اداریہ کا سب سے چبھتا ہوا تبصرہ شادی کے

مہمانوں پر امریکی گولیوں کی بوچھاڑ امریکہ کو بھی ایک اور حملہ آور گروہ کی شکل ہی دیتا ہے۔ رابرٹ فسک نے ۱۰رجون کو اخبار Independent میں پیش گوئی کی کہ دہشت گردی پر بش کی ٹائیٹینک جنگ آخر کار لہروں کے نیچے ہی ڈوبے گی۔

۲۸راور ۲۹راپریل ۲۰۰۲ء کے واشنگٹن پوسٹ نے اس حقیقت پر روشنی ڈالی کہ افغانوں کی ایک بڑی تعداد طالبان کی واپسی کی دعائیں کررہی ہے۔ اسی اخبار نے ۳۰ جون کو حالات کے ایک چشم کشا رخ کی خبر دی کہ حزب اللہ اور القاعدہ امریکہ کے خلاف حملہ کے لیے اتحاد کررہے ہیں۔

یہ دونوں صورتیں امریکہ اور اس کی پروردہ کرزئی حکومت کی افغانستان میں شکست کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ریاستہائے متحدہ افغانستان پر اپنی گرفت قائم نہیں کرسکے گا اور اس قابل نہیں ہوسکے گا کہ ترکمانستان سے گوادر تک تیل کی پائپ لائن افغانستان سے گزار سکے اور نہ ہی افغانستان میں امن وامان قائم ہوگا اور جنگ اور امریکہ کی احمقانہ مہم جوئی کے نتیجہ میں ہونے والی تباہی سے طالبان کا ققنس بھی برآمد ہوسکتا ہے۔ افغانستان میں امریکہ کی فتح ریت پر لکھی ہوئی وہ تحریر ہے جو چشم زدن میں مٹ سکتی ہے۔

۲۲رجون سے بوسٹن گلوب کا اختتامیہ ہے کہ افغانستان میں امریکی فوجوں کی حمایت جولائی کے حملہ نے ختم کردی ہے۔ گلوب نے بتایا: ''ہوائی حملہ کے بعد گل آغا شیرازی گورنر قندھار نے دو مواقع پر اعلان کیا کہ قندھار اور پانچ دوسرے جنوبی اور وسطی صوبوں میں کوئی کارروائی کرنے سے پہلے امریکی فوجوں کو افغانوں سے اجازت لینا ہوگی۔ یہ دھمکی آمیز اعلان ایسا لگتا ہے کہ امریکی فوجی کمان کے لیے خطرہ کی گھنٹی بجا گیا ہے۔ اتحادی فوجوں کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل مک نیل شیرازی سے پہلے ایک اور معاہدہ ہوا کہ آئندہ ہوائی حملوں سے پہلے افغان مقتدرہ سے مشورہ لیا جائے گا جیسا کہ ٹیکساس کے ایک خصوصی فوج کے سپاہی نے کہا طاقت کی نمائش ہی زندہ رہنے کا طریقہ ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ افغانستان میں حالات کس طرح حرارت پذیر ہونے لگے ہیں اور امریکی کس طرح بتدریج پیچھے ہٹنے لگے ہیں۔

صدر بش اگر یہ بات یاد رکھیں تو بہتر ہوگا کہ افغانستان میں شجاع کو اقتدار عطا کرنے کے بعد دو سال تک سب کچھ بظاہر ٹھیک ٹھاک تھا اور انگریز پولو کھیلنے اور شیمپین پینے کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اچانک ہی اکبر خان نے جو برطانیہ کا وفادار تھا چڑھائی کر دی اور تمام سپاہیوں کو ختم کر کے پوری برطانوی فوج کا اس طرح صفایا کیا کہ صرف ایک سپاہی کسی طرح بچ سکا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کی دھمکی دے رہی ہے اور اس دفعہ اُبلتے ہوئے انتقامی جوش کے ساتھ۔

رابرٹ فسک نے Independent (لندن) میں ۲۵ ستمبر کو اپنی چشم دید رپورٹ میں لکھا ہے کہ امریکی جارحیت کے خلاف دفاع میں جان دینے والے طالبان کی قبریں درگاہیں بن گئی ہیں۔ جہاں لوگ بڑی تعداد میں عقیدت کے اظہار کے لیے آتے ہیں۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ یہاں آ کر ان کی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ زائرین قبروں پر نمک چھڑکتے ہیں اور ذرا سی مٹی اٹھا کر زبان سے چاٹتے ہیں۔ فسک مزید کہتا ہے کہ ایسا لگتا تھا کہ دو سپاہی بھی ان قبروں پر آ کر ویسے ہی کیفیت میں ڈوب گئے جیسے زائرین تھے۔ ایک داڑھی منڈائے ہوئے نوجوان نے جس کے کندھے پر کلاشنکوف تھی اسے مسکراتے ہوئے بتایا: ''یہ درست ہے کہ ان قبروں پر آ کر بیمار اچھے ہو جاتے ہیں۔'' میں نے ایک بہرے کو سنتے دیکھا' ایک دفعہ ایک گونگا بولنے لگا۔ فسک بیان کے اختتام میں کہتا ہے امریکی خصوصی فوج کے جوان یہاں نہیں آتے ہیں ورنہ وہ ایسے نظارے دیکھ سکتے ہیں جو انھیں پریشان کر دیں۔

جس عزت اور احترام کا اظہار افغان ہلاک شدہ طالبان کے لیے کرتے ہیں واضح طور پر ان کی اخلاقی فتح کا ثبوت ہے اور جو افغانستان میں امریکی فوجوں سے لڑتے ہیں ان کے لیے اعلیٰ اخلاقی سطح فراہم کرتا ہے۔

طالبان اور القاعدہ کے حامی عناصر کی مسلح مزاحمت ایسا لگتا ہے کہ ختم ہونے کے

بجائے تیز ہورہی ہے۔ ۸/اگست ۲۰۰۲ء کے بوسٹن گلوب نے افغانستان کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا دارالخلافہ میں تحفظ کے بارے میں نئے شکوک نے سر اٹھایا' جب مسلح افراد نے ۷اگست کو افغان فوج کے ایک پہاڑی مورچہ پر حملہ کردیا اور تین گھنٹوں کی لڑائی میں ۱۶/افراد کابل کے جنوبی نواح میں مارے گئے۔ اگست ۲۰۰۲ء تک کابل میں یہ خوں ریزی طالبان پر امریکی زیر قیادت فتح کے بعد شدید ترین تھی۔

افغان نائب صدر کا قتل اور ان کے تمام دس محافظوں کی فوری گرفتاری' چند ماہ پہلے افغان وزیر کی سرعام پھانسی' کار بم کے حملہ کا منصوبہ پکڑا جانا' صدر کرزئی کا تمام افغان محافظوں کو ہٹا کر اپنے آپ کو ایک سوبیس (۱۲۰) امریکی فوجیوں کی حفاظت میں رکھنا خود بتا رہا ہے کہ سیاسی عدم استحکام کس حد تک عروج پر ہے اور افغان فوج کی ذمہ داری کس حد تک مشکوک ہو چکی ہے۔

۷/اگست ۲۰۰۲ء کو ایک جھڑپ میں ایک امریکی سپاہی زخمی ہوگیا' بارہ گوریلے اور تین افغان فوجی ہلاک ہوئے۔ ۱۰/اگست کے بوسٹن گلوب نے جلال آباد میں ایک شدید دھماکہ کی رپورٹ دی جس نے علاقہ کو ہلا دیا اور شہر کی بجلی کٹ گئی۔ بتایا گیا کہ ۲۵/افراد ہلاک اور نوے (۹۰) زخمی ہوئے۔ یہ اب تک افغان حکومت پر مخالفین کا سب سے بڑا حملہ تھا۔ رپورٹ اس امر پر خاموش ہے کہ مرنے اور زخمی ہونے والوں میں امریکی اور دوسرے غیر ملکی فوجیوں کی تعداد کیا تھی۔ اس نے رمزفیلڈ کے بڑے بول اور اکڑ کا بلبلہ تحلیل کردیا جو طالبان کے سقوط کے بعد امریکہ کی خطرناک اور مصمم ارادہ والے دشمن کے خلاف ''شاندار کامیابی'' کی بڑھک پر مبنی تھا۔

۱۴/اگست ۲۰۰۲ء کو شائع شدہ Independent کے ایک مقالہ میں جو افغانستان میں موجود سیاسی اور فوجی صورتحال کے بارے میں ہے رابرٹ فسک یہ کہتا ہے: افغان عوام امریکہ کی طرف سے موعودہ مدد کا کچھ دن انتظار کریں گے۔ میوند کے مقامی ضلعی افسر نے مجھ سے کہا کہ انھیں یہ ثابت کرنے کے لیے تھوڑا اور وقت دینا ہے۔ امریکیوں پر تقریباً ہر رات حملہ ہونے لگا ہے۔ قندھار میں گولیاں مارنے کے تین

واقعات ہوئے اور ایک امریکی فوجی کی گردن میں گولی لگی' ایر پورٹ کے نزدیک۔ اب
امریکی فوجی قندھار کے کسی کیفے میں کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ خوست کے صوبہ میں
امریکی فوجوں پر حملہ ہوا' جولائی کے اواخر میں پاکستانی سرحد کے قریب سے دو افغان
مددگار ہلاک اور پانچ امریکی فوجی زخمی ہوئے۔ یہ کوئی عام افسر نہیں بلکہ ان میں لاکھوں
ڈالر کی بین الاقوامی مدد کا منتظم مغربی تعاون کار بھی تھا۔ اسے بھی پتہ تھا اور اس کے عملہ کو
بھی کہ اپنے ملک میں امریکیوں کی مستقل موجودگی کی وجہ سے افغانوں کا غصہ کس قدر
بڑھ رہا تھا۔ جب تک واشنگٹن مقامی جنگجو سرداروں کو جن میں کرزئی کے مخالف بھی ہیں
نجی تنخواہیں دیتا رہے گا ایک قسم کی جنگ بندی رہے گی لیکن افغان امریکیوں کی
کارروائیوں میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور امریکی بمباریوں میں سینکڑوں بے گناہ
افغانوں کی ہلاکت ان کے غصہ کو بھڑکا رہی ہے۔ اس رپورٹ سے افغانوں میں شدید
اشتعال پیدا ہوا ہے کہ امریکیوں نے ہلاک شدگان میں سے افغان خواتین کی برہنہ
تصویریں لی ہیں۔ اس کے بعد سے گوریلا حملوں میں حکومت یا امریکہ کے دوست
منشیات کے تاجروں کی حمایتی افغان فوجوں کو نشانہ بنایا جانے لگا۔ نئے حملوں کا رخ
افغان اتحادیوں کی طرف تھا۔ یہاں تک کہ وادی پنج شیر کے گاؤں موتا میں جو احمد شاہ
مسعود کے مقبرہ کے قریب ہی ہے' مقامی مسلمان علماء امریکیوں کے خلاف خطبے دے
رہے تھے۔ پچھلے جمعہ جولائی ۲۰۰۲ء کو امام محمد سید نے عبادت گزاروں سے کہا کہ انھوں
نے خواب میں احمد شاہ مسعود کو اداس دیکھا وہ خوش نہیں تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ امریکی
ویسے ہی ہیں جیسے روسی اور ہمیں ان کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔

جنرل فرینک کی افغانستان آمد سے دو گھنٹے پہلے پچیس (۲۵) اگست ۲۰۰۲ء کو
مشرقی شہر اسد آباد کے قریب امریکی فوجیوں پر راکٹ حملہ ہوا اور امریکی کمان نے حملہ
آوروں کے مورچوں پر حملہ کے لیے ہوائی جہاز بھیجے۔ یہ بات کہ افغانستان کی حکومت کا
اقتدار کابل سے باہر موجود نہیں تھا اس بات سے ظاہر ہے جو جنرل نے اخباری
نمائندوں سے باگرام کے اڈہ پر کہی مثلاً یہ کہ کابل کے باہر بین الاقوامی امن فوج کی

تعیناتی کا ذکر ہو رہا ہے۔ اگرچہ اتحادی سارے ملک میں کارروائیاں کرنا نہیں چاہتے۔

۲۵/اگست کو اقوام متحدہ کے مہمان خانہ کے سامنے گندے پانی کی نکاسی کے گڑھے میں ایک بم پھٹا جس میں کم از کم دو افغان شہری زخمی ہوئے۔ ضلعی پولیس کے کمانڈر ضابطہ افغان گل نے کہا کہ اس کے ذمہ دار یا تو القاعدہ یا سابق وزیراعظم حکمت یار کے حامی تھے۔ اسی دوران قطر میں قائم اسلامی ویب سائٹ نے ۲۵/اگست کو ایک خط کی نقل حاصل کی جو مبینہ طور پر اسامہ نے چند ہفتہ پہلے لکھا تھا۔ خط میں کہا گیا ہے کہ ہم جلدی دیکھیں گے۔ ان شاء اللہ اکبر۔ ان کافر ملکوں کا زوال جن کی قیادت ظالم امریکہ کر رہا ہے جسے طاقت اور جنگ کے علاوہ کسی منطق کا پتہ نہیں (بوسٹن گلوب، ۲۶/اگست)

۱۶/اگست ۲۰۰۲ء کو بوسٹن گلوب کے ایک مقالہ میں رابرٹ برنس نے صاف صاف بتایا کہ کس طرح فوجی قیادت افغانستان میں اپنی فوجی مہم کی ناکامی پر مایوسی محسوس کر رہی ہے۔ جنرل ٹامی فرینکس جنھوں نے افغانستان میں فوجوں کی کمان کی تھی کہا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی کئی ملکوں میں طویل عرصہ تک کی وابستگیاں رہی ہیں مثلاً جنوبی کوریا جہاں دسیوں ہزار امریکی فوجیں نصف صدی سے مقیم ہیں۔ مجھے اس بات سے تعجب نہیں ہوتا کہ اگر کوئی کہے اف میرے خدا! فوج ایک عرصہ تک افغانستان میں رہے گی یقیناً ہم رہیں گے۔

رمزفیلڈ نے جو جنرل فرینکس کے ساتھ تھے ضروری سمجھا کہ فوراً استثنائی بیان دیں کہ جنرل کے بیان سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ القاعدہ یا طالبان کی تلاش میں اتنی دیر لگ جائے گی۔ امریکی فوج کا افغانستان میں قیام اس بات پر منحصر ہوگا کہ نئی حکومت کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں کتنی دیر لگے گی۔

۱۵/اگست کو سوا را GA میں ایک اجلاس عام میں Joint Chief of Staff کے سربراہ جنرل رچرڈ مائرز نے کہا کہ دہشت گردی کے خلاف عالمگیر جنگ سالوں جاری رہ سکتی ہے یہ سالہا سال چل سکتی ہے ہمیں صبر کرنا چاہیے۔ امریکہ میں تجربہ کار

یہودی فوجیوں کی کانفرنس میں انھوں نے کہا مجھے سست رفتاری پر الجھن ہوتی ہے لیکن یہ خیال ہے کہ دور دراز القاعدہ کے نظام کو تباہ کرنا ہمارا مقصد ہے اس سے پہلے کہ وہ امریکہ پر حملہ کر دیں۔

یہاں دو اہم جنرلوں کے بیانات اور رمزفیلڈ کا استثنائی بیان ایک دوسرے کے خلاف جاتے ہیں جس سے یہ بات جھلکتی ہے کہ ریاستہائے متحدہ کی فوجی اور سیاسی قیادت میں اختلافات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس سے یہ بھی نظر آتا ہے کہ کس طرح رائے عامہ افغانستان میں فوجی کارروائیوں میں تعطل پر بے چین ہو رہی ہے جو رمزفیلڈ کے الفاظ میں القاعدہ کی تباہی کے بغیر بلندی پر پہنچ گئی ہے۔ جنرل فرینکس کا کوریا میں امریکی فوجوں کے پچاس سالہ قیام کا افغانستان کے تناظر میں ذکر کرنا بے محل ہے کیونکہ جنگ کے نتیجہ میں کوریا اب بھی منقسم ہے، شمالی اور جنوبی کوریا کے درمیان ایک غیر مطمئن سا معاہدہ ہے اور اول الذکر کو ابھی تک آخر الذکر کی طرف سے خطرہ میں ہے۔ علاوہ ازیں امریکی فوج کوریا میں ایک معاہدہ کی شرائط اور پابندیوں کے مطابق مقیم ہے اور اس کی کارروائیاں اڈوں کے اندر ہی محدود ہیں۔ ان میں سے کوئی سے بھی حالات افغانستان میں نہیں ہیں۔ سب سے بڑھ کر جنرل فرینکس کا بیان اس امریکی ارادہ کی نقاب کشائی کرتا ہے کہ وہ جب تک چاہے گا اپنی فوجوں کو افغانستان میں رکھے گا اگرچہ آزاد خود مختار خود انحصار افغانستان چاہے یا نہ چاہے۔ جنرل کے لاشعور میں القاعدہ اور طالبان کی واپسی کا خوف جاگزیں ہے۔ جنرل فرینک نے پاکستان کو بھی دبے الفاظ میں دھمکی دی کہ ریاستہائے متحدہ چاہتا ہے کہ القاعدہ اور طالبان کے تعاقب میں اپنی سرگرمیاں پاکستان کے اندر تک بڑھائے۔ پاکستانی دفتر خارجہ نے اس پر ردعمل کا فوری اظہار کیا اور اس بات کی سخت تردید کی کہ القاعدہ یا طالبان پاکستان میں کام کر رہے تھے۔ جنرل فرینک کی پاکستان جیسے قریبی اتحادی کو دھمکی ان تمام اسلامی ممالک کے لیے چشم کشا ہونی چاہیے جو دہشت گردی کے خلاف اس کی مہم میں ریاستہائے متحدہ کا ساتھ دے رہے ہیں۔ امریکہ کی پاکستان کے ساتھ ممکنہ دغابازی دوسری جنگ عظیم میں

جرمنی کی اپنے اتحادی روس کے ساتھ دغابازی کی یاد دلاتی ہے۔

جیسا کہ جنرل مشرف نے نشان دہی کی ہے کہ افغانستان میں اتحادی فوجوں کی ناکامی اور افغان حکومت کا اقتدار کابل سے باہر نہ بڑھنے کی وجہ سے وہاں حالات القاعدہ اور طالبان کے مجتمع ہونے کے لیے بے حد موزوں ہیں۔

سب سے زیادہ تشویش ناک واقعہ جس نے افغانستان پر امریکی اختیار اور اقتدار کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ۵ ستمبر ۲۰۰۲ء کو صدر کرزئی پر دن دیہاڑے قاتلانہ حملہ تھا جس میں امریکی فوجوں کے سائے میں ہونے کے باوجود وہ بس بال بال بچے۔

رومیش پینٹیسر نے اپنے مضمون In The Line of Fire میں جو ۱۲ ستمبر ۲۰۰۲ء کو جریدہ ٹائم میں شائع ہوا ہے اس قاتلانہ کوشش پر پوری طرح روشنی ڈالی ہے اور اس کی اہمیت کو درست تناظر میں دیکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کرزئی پر حملے سے چند گھنٹے پہلے ۵ ستمبر ۲۰۰۲ء کو کابل شہر کے وسط میں ایک ٹیکسی میں نصب بم پھٹا اور بتیس (۳۲) افراد ہلاک جبکہ ڈیڑھ سو زخمی ہوئے۔ حکومتی تفتیش کاروں کا کہنا ہے کہ ایسی کوئی شہادت نہیں ملی کہ دونوں حملوں میں تعلق تھا لیکن بہت سے افغانوں کو شبہ ہے۔ پچھلے ہفتہ کابل کا دھماکہ جو بم حملوں کے سلسلہ میں قریب ترین تھا ان گرمیوں میں ہفتوں تک خفیہ اداروں کی تنبیہی اطلاعات کے بعد ہوا کہ ۱۱ ستمبر کی سالگرہ کے قریب دہشت گرد حملہ ہوسکتا ہے۔ اس واقعہ نے امریکی کمانداروں کے بڑے بول کے چیتھڑے اڑا دیے کہ بارہ ہزار (۱۲،۰۰۰) اتحادی افواج نے افغانستان میں القاعدہ اور طالبان کی تقریباً تمام بچی کھچی فوجوں کو چھان دیا ہے اور دشمن اب بمشکل چند سو کی تعداد میں ہوسکتا ہے۔ ملک اب بھی جنگجوؤں سے بھرا ہوا ہے جو کرزئی حکومت کی تباہی اور ان کے پشت پناہ مغربی فوجیوں پر حملوں پر تلے ہوئے ہیں۔ ایک اعلیٰ افغان افسر نے کہا حکومت کے مخالفوں نے زیادہ متشدد کھلے حملوں کے نئے دور کا آغاز کیا ہے۔ افغان محکمہ خفیہ اطلاعات کے عہدیدار کہتے ہیں: ”القاعدہ اور طالبان جنگجوؤں نے گلبدین حکمت یار کے وفادار گوریلوں سے تعلقات بنا لیے ہیں جو بے رحم سابق وزیراعظم تھے۔ خطرہ

ہے کہ حکمت یار نے جاری مسلح مزاحمت کو نئے عزم، نئی طاقت اور نیا تصور دیا ہے اور القاعدہ کی فوجوں کے لیے وہ سمت مہیا کرنا شروع کر دی ہے جو اسامہ کے زیر زمین جانے کی وجہ سے انھیں میسر نہیں رہی تھی۔

رائٹرز نے رپورٹ دی کہ ۹ ستمبر ۲۰۰۲ء کو خوست کی سڑکوں پر امریکی تنخواہ دار اور جنگجو سرداروں کی شدید لڑائی ہوئی جب ان کی فوجیں گورنر حکیم تانی وال کی فوجوں سے ٹکرائیں جو صدر کرزئی کے تعینات شدہ تھے۔ اس ایجنسی کے مطابق غیر ملکی فوجوں کی موجودگی کے خلاف مزاحمت اس رجعت پسند علاقہ میں بظاہر بہت بڑھ گئی ہے

رائٹرز نے مزید خبر باگرام کے اڈے سے دی کہ ۵ ستمبر ۲۰۰۲ء کو مشرقی افغانستان میں خصوصی افواج کے دو فوجی ایک تازہ حملہ میں زخمی ہوئے، جب ان کی چار پہیوں والی گاڑی کے نیچے سڑک پر نصب شدہ بم پھٹا۔ محکمہ خفیہ کے سربراہ عصمت گل نے کہا جب ایک رات میں شہر کے پرانے اور نئے ہوائی اڈوں پر جو سینکڑوں امریکی فوجوں کے اڈے تھے تقریباً دس راکٹ داغے گئے تو امریکی طیارے فوراً وہاں سے پرواز کر گئے۔

۱۴ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے نیویارک ٹائمز میں کارلوٹا گال نے ایک مضمون میں لکھا کہ شمالی افغانستان میں ۱۳ اکتوبر کو ایک دفعہ پھر لڑائی بھڑک اٹھی جس میں تین افراد ہلاک ہوئے اس دوسری جھڑپ میں جو ایک ہفتہ کے اندر ہوئی باوجودیکہ اقوام متحدہ جنگ بندی کی کوشش کر رہی تھی۔

شمال میں مزار شریف سے سومیل شمال میں دو دھڑوں کے مختلف گروہ کئی گاؤں پر قبضہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پچھلی جھڑپوں میں ازبک جنرل دوستم اور تاجک دشمن جنرل عطا محمد کے حامی ملوث تھے جو طالبان کے بعد قائم ہونے والی حکومت میں دوست اور شمال میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

پینٹا گون نے بہت بڑے پیمانہ پر مہم "Mountain Sweep" شروع کی۔ ۲۴ اگست ۲۰۰۳ء کو CIA کے سینکڑوں افسروں، خصوصی فوجی ٹیم کے سینکڑوں ارکان اور تقریباً ۸ ہزار امریکی فوجیوں نے کارروائی کی لیکن نہ تو بن لادن کو پکڑ سکے نہ ملا عمر کو۔

افغانستان میں امریکی سفیر سے ناکامی کی وجہ پوچھی گئی تو انھوں نے کہا کہ امریکی سمجھتے ہیں کہ سب کچھ ممکن ہے مگر حقیقی زندگی میں ایسا نہیں ہے۔

۱۱؍ستمبر ۲۰۰۲ء کو افغانستان میں غیر معمولی حفاظتی انتظامات کے باوجود خوست ہوائی اڈہ سے امریکی اڈے پر دو راکٹ اور ایک مارٹر داغے گئے۔

۱۲؍اکتوبر ۲۰۰۲ء بالی (انڈونیشیا) میں بم دھماکے ہوئے۔ دوسروں کے ساتھ تین امریکی ہلاک ہوئے۔ یہ حملہ غیر ملکیوں خصوصاً آسٹریلیا والوں کے خلاف تھا جو اس جگہ کو عورتوں سے ناجائز تعلقات کا اڈہ بنا رہے تھے۔ اس سے انڈونیشیا میں القاعدہ کا داخلہ واضح ہے۔

۱۵؍نومبر ۲۰۰۲ء کو بوسٹن گلوب کی رپورٹ ہے کہ دو ہوائی اڈوں پر ۱۵؍نومبر کو راکٹ داغے جانے کے بعد امریکی جیٹ لڑاکا طیاروں نے افغانستان میں مبینہ طور پر دو طالبان اور القاعدہ کے ٹھکانوں پر بمباری کی۔ پہلے حملہ میں جمعرات کی شام گردیز کے قریب امریکی فوجی اڈہ پر ۱۰۷، MII کے راکٹ داغے گئے تھے۔ راکٹ اڈے کے قریب گرے لیکن کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔ فوج نے A-10 لڑاکا جہاز بلائے جنھوں نے کئی بم گرائے اور گولیوں کے دو ہزار راؤنڈ چلائے۔ کئی گھنٹوں بعد کابل سے ایک سو دس (۱۱۰) میل جنوب مغرب میں امریکی اڈے لاورا پر حملہ ہوا۔ کم از کم ایک راکٹ احاطہ کے اندر پھٹا۔ مشرقی افغان شہر جلال آباد پر ۱۵ نومبر کو حملہ ہوا اور ہوائی اڈہ پر چار راکٹ گرے۔ پاکستان اور افغانستان کے شورش زدہ سرحدی علاقہ میں امریکی فوجوں اور دوسرے نشانوں پر معمولی نوعیت کے حملے معمول بن گئے ہیں۔ یہی علاقہ ہے جہاں امریکی فوجیں القاعدہ کے دہشت گردوں کی تلاش کر رہی ہیں۔

یہ بات اہم ہے کہ ۱۲؍نومبر ۲۰۰۲ء کو اسامہ کی طرف سے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو تنبیہ کے بعد کہ ''جس طرح تم ہلاک کرو گے مارے جاؤ گے۔ جس طرح تم بمباری کرو گے تم پر کی جائے گی''۔ افغانستان، کویت، بیروت، کینیا، پاکستان اور مقبوضہ کشمیر میں امریکی مفادات پر حملوں کا ایک سلسلہ جاری ہو گیا۔ کویت میں جہاں

ہزاروں امریکی فوجی مقیم ہیں' امریکی فوجوں کے تربیتی میدان پر حملہ ہوا اور ۲/نومبر کو ایک فرد ہلاک اور دو زخمی ہو گئے۔ چند دنوں بعد بیروت میں ایک نشانہ باز نے امریکی مشنری کے سر میں گولی ماردی۔

۲۱/نومبر ۲۰۰۲ء کو امریکی سفارتخانہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر واقع کابل کے مشرقی علاقہ پر راکٹ داغا گیا۔ ۲۵/نومبر کو ایک نشانہ باز نے امریکی فوجیوں کی ایک گاڑی پر راکٹ سے دستی بم پھینکا گیا۔ ۲/دسمبر ۲۰۰۲ء کے بوسٹن گلوب نے بتایا کہ یکم دسمبر کو خصوصی امریکی فوجوں کی حفاظت کے لیے جو مسلح افغانوں سے لڑ رہی تھیں B۵۲ بمباروں کو بلایا گیا۔ امریکی فوجی اس جھڑپ میں زخمی ہوئے۔ ۲۵ دسمبر ۲۰۰۲ء کو حکمت یار نے اعلان کیا کہ اس کی فوجوں نے طالبان اور القاعدہ کے ساتھ اتحاد کر لیا ہے اور جہاد شروع کیا جائے۔ بتایا گیا کہ اس کے حامیوں نے گاڑیاں خریدی ہیں جو بم حملوں کے لیے استعمال ہو سکتی ہیں۔ ۲۹/دسمبر کو ایک سانحہ ہوا۔ ایک پاکستانی سرحدی محافظ نے امریکی فوجی پر گولی چلائی' امریکی فوجوں نے جنگی طیاروں کے ذریعے پاکستانی سرحد کے اندر حملہ کیا جس پر احتجاج کا طوفان اٹھا۔ اپریل اور مئی ۲۰۰۶ء کو باجوڑ پر میزائیل حملے شامل ہیں۔

نہ صرف القاعدہ اور طالبان امریکی فوجوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہوئے ہیں بلکہ امریکہ کے تنخواہ دار اور حمایت یافتہ افغان جنگجو سردار مختلف صوبوں میں کرزئی حکومت کے مقرر کردہ گورنروں سے لڑ رہے ہیں۔ ان لڑائیوں کے دوران امریکہ خاموش تماشائی بنا رہتا ہے اور اگر جوابی عمل کرتا بھی ہے تو وہ بے اثر ہی رہتا ہے۔ شمالی افغانستان کے مختلف دھڑے اگرچہ کرزئی حکومت کے وفادار ہیں لیکن آپس کی لڑائی میں الجھے ہوئے ہیں۔ امریکہ کے خلاف بغاوت اب افغانستان تک محدود نہیں رہی بلکہ باہر تک پھیل گئی ہے۔ اسامہ اور اس کے حامی اب صرف القاعدہ اور طالبان کی ترجمانی نہیں کرتے بلکہ پوری اسلامی دنیا کے غیر مطمئن نوجوانوں کے ترجمان ہیں۔ ان کے اہداف کا پھیلاؤ امریکی محکمہ خفیہ اطلاعات کے لیے حیران کن ہے اور وہ نہ صرف اسامہ

اور عمر کو پکڑنے میں ناکام رہے ہیں بلکہ یہ امریکی فوجوں کو خبردار کرنے میں بھی بری طرح ناکام رہے ہیں کہ اگلا حملہ کب اور کہاں ہوسکتا ہے۔ القاعدہ یا طالبان کا کوئی حملہ نہ تو روکا جاسکا نہ پکڑا گیا نہ ہی حملہ آور پکڑے جاسکے۔ ریاستہائے متحدہ کے جوابی حملے القاعدہ یا طالبان کے خفیہ اڈوں تک نہ پہنچ سکے۔

Joint Chief of Staff کے سربراہ جنرل مائرز کو اعتراف کرنا پڑا کہ افغانستان میں دہشت گردی کی جنگ اپنی رفتار کھو رہی ہے۔ ہم ان کی تدبیروں کو اتنی جلدی نہیں سمجھ پاتے جتنی جلدی القاعدہ ہماری تدبیریں سمجھ لیتی ہے۔ اپنی رقوام کی ترسیل محفوظ کرنے کے لیے الیکٹرانک مواصلات میں تبدیلی کرنے میں وہ بہت ہی چست ثابت ہوئے ہیں۔ القاعدہ کی فوجیں مواصلات کے تحفظ کے لیے انتشار اور شکل کی تبدیلی پر عمل کر کے چھپانے کا طریقہ استعمال کرتی ہیں چنانچہ تعجب نہیں اگر ریاستہائے متحدہ کی فوجی اور سیاسی قیادت افغانستان میں اپنا جہاز ڈوبنے کے بھیانک خوف میں مبتلا ہوچکی ہے جو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں فیصلہ کن ثابت ہوسکتا ہے جس کے دوررس اثرات ہونے ہیں۔

کرزئی حکومت کے خلاف جس کا پشت پناہ امریکہ ہے بڑھتی ہوئی مسلم مزاحمت کے متعلق مندرجہ بالا تفصیلی بیان اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ مسلح مزاحمت بڑھ رہی ہے اور زیادہ منظّم اور مربوط ہو رہی ہے' اس سے بھی بڑھ کر دوسرے افغان اور غیر افغان عناصر اس میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔

ریاستہائے متحدہ پسپائیوں کے چکر میں پھنس گیا ہے۔ اسامہ نے پہل کے فوائد چھین لیے ہیں اور یہ وہی ہے جو حکم چلا رہا ہے اور امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف نظریاتی جنگ کا منظر نامہ تحریر کر رہا ہے حیرت ناک بات یہ ہے کہ چھٹ بھیے القاعدہ یا طالبان قیادت کہیں زیادہ جدت پذیر رہے ہیں اور امریکی قیادت کو جواب دینے کی صلاحیت اور جنگی تدبیروں کے اختراع میں پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ تم اسی طرح مارے جاؤ گے جیسے مارو گے تم پر اسی طرح بمباری ہوگی جیسے تم کرو گے۔ یہ وقت بدلہ

لینے کا ہے۔ اسامہ نے کسی نامعلوم مقام سے خبردار کیا جو ۱۲؍ نومبر ۲۰۰۲ء کو الجزیرہ ٹیلی ویژن نے نشر کیا تھا۔ یہ صرف بڑھک یا کھوکھلی دھمکی نہیں تھی بلکہ درست تنبیہ تھی جو دو چار ہی دنوں میں بھڑک کر گردیزا ور لوارہ کے ہوائی اڈوں (افغانستان) میں امریکی فوجوں پر حملہ اور کویت میں امریکی تربیتی فوجوں پر حملہ' امریکی مشنری کی بیروت میں ہلاکت، کینیا کے شہری ہوائی اڈہ پر اسرائیل کے جیٹ جہاز پر حملہ' یروشلم میں دو خودکش حملے اور کراچی میں میسے ڈونیا کے سفارتخانہ پر حملہ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

۹؍ (نومبر کو ڈان کراچی) میں Joint Chief of Staff کے سربراہ جنرل مائرز کا تاریخی بیان شائع ہوا جس میں کہا گیا ریاستہائے متحدہ دہشت گردی کی جنگ میں اپنی رفتار کھو رہی ہے اور انھوں نے درخواست کی کہ لڑائی کے بجائے تعمیر کے منصوبہ پر دھیان دیا جائے۔

ریاستہائے متحدہ کے اعلیٰ سیاسی تجزیہ نگار William Paffat نے ۲۱؍ نومبر کے بوسٹن گلوب میں اپنے تجزیہ میں کہا: ''مسلح افواج دہشت گردی کا مسئلہ حل نہیں کرسکیں اور عراق پر امریکی حملہ افغانستان میں دہشت گردی کا مسئلہ حل کرنے میں ناکامی سے توجہ ہٹانے کے لیے تھا۔''

۱۵؍ نومبر ۲۰۰۲ء کو بوسٹن گلوب میں ڈیموکریٹ سینیٹر Daschle کا بیان چھپا کہ القاعدہ کی قیادت کو پکڑنے میں امریکی ناکامی یہ سوال پیدا کرتی ہے کہ ہم دہشت گردی کے خلاف جنگ جیت رہے ہیں یا نہیں' وہ (القاعدہ) آج بھی اتنا بڑا خطرہ ہیں جتنے ڈیڑھ سال پہلے تھے تو ہم کس طرح کامیابی کا دعویٰ کرسکتے ہیں؟ رمزفیلڈ سے یہ سوال کیا گیا تو وہ بغلیں جھانکنے لگے۔ ریاستہائے متحدہ اربوں ڈالر کے اعلیٰ تکنیکی جاسوسی کے سازوسامان کے باوجود القاعدہ کی قیادت پر ہاتھ نہیں ڈال سکا۔ لاکھوں ڈالروں کے انعامات کا اعلان ہوا' ہزاروں فوجیوں پر مبنی تلاشی کی کارروائیاں اور قیدیوں سے گھنٹوں پوچھ گچھ ہوئی۔

John F.Burns نے ۳۰؍ ستمبر ۲۰۰۲ء کو نیویارک ٹائمز میں لکھا: ''اسامہ دنیا

کی مضبوط ترین فوج سے جس کے پاس سیارہ جاتی تکنیک کے فوائد ہیلی کاپٹروں اور جدید ترین ٹیکنالوجی کی جادوگری موجود تھی، بچ نکلنے کی وجہ سے مسلم دنیا خصوصاً غیر مطمئن نوجوانوں کے لیے پرکشش علامت بن چکا ہے۔ اسامہ زندہ ہے یا مردہ افغانستان میں امریکی کامیابی پر اپنا سایہ بڑھاتا جا رہا ہے اور اس کے بعد امریکی فوجوں کو نکل کر طالبان کو واپس لانا ہے۔

نیویارک ٹائمز نے اپنے اداریہ میں "Terror Calling Card In Bali" کے زیر عنوان کہا ہے کہ یہ تازہ ترین اور مہلک ترین حملہ تھا اور یہ دونوں اس بات کی شہادت ہیں کہ القاعدہ اور اس کے اتحادی افغانستان کی جنگ سے بچ نکلے ہیں اور نئے حملوں کے لیے پھر سے منظم ہو رہے ہیں۔

۲۵/ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو James Dad نے نیویارک ٹائمز میں خبردار کیا کہ امریکہ دہشت گرد حملوں کے کھلے خطرہ میں ہے۔ خصوصاً اس کی بندرگاہیں اور بجلی کی تنصیبات۔

۳۰/ نومبر ۲۰۰۲ء کے بوسٹن گلوب کے ایک مقالہ میں اسرائیلی جیٹ ہوائی جہاز پر میزائیل حملہ سے ہیبت زدہ ہو کر جونشانہ سے ذرا سا ہی چوکا تھا، تبسم زکریا لکھتا ہے: ''سست رفتار مسافر طیاروں کو جدید ترین ٹیکنالوجی کے بغیر اپنے ہتھیاروں سے بچانا ناممکن ہے، یہ ایک مثال ہے کہ کس طرح دہشت گردی کے لیے جذبوں کی ترقی کی رفتار ان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیتوں سے بہت تیز ہے۔''

CIA کے ڈائریکٹر George Tenet کی بوسٹن گلوب کی رپورٹ ۱۸/ اکتوبر ۲۰۰۲ کے مطابق القاعدہ منظم تھی اور ریاستہائے متحدہ کے لیے اب بھی اتنا ہی شدید خطرہ ہے جتنا ۱۱ ستمبر کے حملوں سے پہلے تھا۔

امریکی خفیہ اطلاعات کے بارے میں ایک مشترکہ سماعت میں انھوں (Tenet) نے مزید کہا کہ ''ہم آج اپنے آپ کو خطرناک ماحول میں پاتے ہیں وہ اتنا ہی برا ہے جتنا گزشتہ ۱۱/ ستمبر سے پہلے کی گرمیوں میں تھا۔ لگتا ہے کہ وہ پھر سے منظم ہو چکے ہیں، مربوط ہیں اور ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔ وہ حملے کرنا چاہتے ہیں آپ بالی میں دیکھ سکتے

ہیں، کویت میں دیکھ سکتے ہیں، وہ حملوں کی کئی کارروائیوں کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ ان کا پھر حملہ کرنے کا ارادہ ہے۔ القاعدہ کو اکھاڑ دینے اور چند بہت ہی اہم گرفتاریوں کے باوجود ریاستہائے متحدہ کو پتہ نہیں کہ القاعدہ کے قائدین کے ساتھ اسامہ بن لادن کہاں ہے''۔

۲۸ اکتوبر ۲۰۰۲ کو نیو یارک ٹائمز میں شائع شدہ ایک مضمون میں Raymond Bonner نے لکھا کہ اسامہ نے جو دہشت گردی کا جال پچھلے دس سالوں میں جنوب مشرقی ایشیا میں تعمیر کیا تھا، وہ زیادہ تر محفوظ ہے۔ کئی ملکوں میں خفیہ تنظیموں کے اہلکاروں نے گفتگو میں پچھلے ہفتوں میں بتایا ہے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اور زیادہ مہلک ہو گئے ہوں اور پچھلے سالوں کے مقابلہ میں امریکہ کے خلاف زیادہ شدت پسند بھی۔''

۱۲ مارچ ۲۰۰۲ء کو CIA کے ڈائریکٹر Tenet نے سینیٹ کی Arms Services Committee کے سامنے تصدیق کی کہ القاعدہ ابھی تک ہمارے ملک کے لیے شدید اور فوری خطرہ ہے حالانکہ ہم نے افغانستان میں اسے منتشر کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔

۱۲/ اکتوبر ۲۰۰۲ کے نیو یارک ٹائمز میں Craig S. Smith نے اپنے مضمون میں ایک ہوش ربا انکشاف کیا ہے: ''کویت کی وزارت مذہبی امور کے محکمہ اطلاعات کے سربراہ سے جب پوچھا گیا کہ کیا وہ ۱۱ ستمبر کے دہشت گرد حملہ کی حمایت کرتے ہیں؟ تو انھوں نے صاف الفاظ میں کہا اگر میں کہوں کہ مجھے اس حملہ سے خوشی نہیں ہوئی تو یہ جھوٹ ہوگا۔ اسی وقت میں نے امریکیوں کو چند لمحوں کے لیے اس مصیبت میں مبتلا دیکھا جس میں مسلمان عرصہ سے مبتلا ہیں۔ ۱۵ نومبر ۲۰۰۲ء کے بوسٹن گلوب نے اسامہ کی تنبیہ پر اداراتی تجزیہ میں لکھا ہے: ''یہ ایک جیسا ہے نہ صرف ریاستہائے متحدہ کے لیے بلکہ برطانیہ، فرانس، اٹلی، جرمنی، کینیڈا اور آسٹریلیا کے لیے بھی۔ بن لادن اور اس کے ساتھیوں کے پاس وہ وسائل نہیں ہیں جو بیسویں صدی میں ہونے والے قتل عام کے لیے جرمنی، سوویت یونین اور چین کی ریاستی طاقتوں کو حاصل تھیں لیکن بن لادن اور

اس کے مددگار غیر مطمئن جوانوں کو مسلم دنیا پر پھر سے قبضہ کے لیے اپنی مہم کی طرف راغب کرنے کے ماہر ہیں۔ بن لادن کی مبالغہ آمیز دھمکیوں سے جو اہم سبق حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس تنظیم کا مقابلہ صرف خفیہ اطلاعات اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ذریعے نہیں ہوسکتا بلکہ سیاسی طریقے بھی ضروری ہیں۔''

امریکہ کے سابق نائب صدر الگور کو اسامہ کی تنبیہ کا تجزیہ کرتے ہوئے اس میں القاعدہ کی طاقت اور عظمت کی واپسی نظر آتی ہے۔

صدر بش نے دو سال پہلے غرہ دکھایا تھا: ''اگر اسامہ زندہ بھی ہے تو وہ اپنے زیادہ تر انتظامات سے محروم ہے اور اب اپنے کسی دہشت گرد منصوبہ پر عمل نہیں کر سکے گا۔ اور دیکھ لیجیے کہ مسلح مزاحمت میں اضافہ اور خاص طور پر بالی اور ممباسہ میں حملوں کے بعد وہ اپنے فتح کے غرور سے نیچے آگئے اور انھیں اپنے پرغرور الفاظ واپس نگلنے پڑے جب انھوں نے اعتراف کیا کہ القاعدہ میں ترقی ہورہی ہے اور ابھی تک وہ ریاستہائے متحدہ کے لیے خطرہ ہے۔

سابق نائب صدر کا بیان اور صدر بش کا بیان ملا کر پڑھیں تو ایسا لگتا ہے کہ شہید طالبان کی قبروں کے کتبوں پر شاندار تحریریں ہیں جنھوں نے شہادت کو گلے لگا کر افغانستان میں امریکی فتح پر پڑا پردہ اڑا دیا ہے۔

امریکی فتح کس کام کی رہے گی اگر ''اعلان آزادی'' میں لکھے ہوئے اعلیٰ نظریات کی قربانی کے بعد حاصل ہوئی؟ کیا یہ آزادی باقی رہے گی؟ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے لیے سچ کی پہچان کا لمحہ!

افغانستان میں طالبان کے نکالے جانے کے تین سال بعد اور امریکی اور نیٹو افواج کی مسلسل موجودگی کے باوجود حالات بد سے بدتر ہی ہوتے جارہے ہیں۔

مُلّا عمر کی طرف سے بار بار مطالبہ کے باوجود ریاستہائے متحدہ ۱۱ ستمبر کی دہشت گردی میں اسامہ کے ملوث ہونے کا کوئی ثبوت فراہم نہ کرسکا تھا اور جو بھی شہادت پیش کی گئی اس میں کوئی جان نہ تھی۔ اب تین سالوں کا لمبا عرصہ گزر جانے کے بعد یہ

شہادتیں خود ہی پکار پکار کر اعلان کر رہی ہیں کہ دہشت گرد حملوں سے اسامہ کا کوئی تعلق نہ تھا۔

۲۰۰۴ء کے وسط میں ایرک مارگولس نے انکشاف کیا تھا کہ جرمن عدالتوں نے اب فیصلہ دے دیا ہے کہ ۹/۱۱ کا منصوبہ افغانستان میں نہیں بلکہ جرمنی کے شہر ہیمبرگ میں بنایا گیا تھا جس کا القاعدہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ القاعدہ کے قائدین نے ۹/۱۱ کی تعریف ضرور کی تھی لیکن منصوبہ بندی یا عمل درآمد سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ جن جگھوں کو قصر ابیض نے افغانستان میں دہشت گردوں کے تربیتی مراکز کا نام دیا وہ زیادہ تر حقیقت میں ان گروہوں کے مراکز تھے جو ازبکستان، قزاقستان اور تاجکستان، کو کمیونسٹ حکومتوں سے آزاد کرانے کے لیے لڑ رہے تھے یا چین کے زیر نگیں مشرقی ترکمانستان، ہندوستان کے مقبوضہ کشمیر اور جنوبی فلپائن کے لیے۔ان کے ارکان کا ۹/۱۱ سے کچھ بھی لینا دینا نہیں تھا۔ ۹/۱۱ سے فقط چار ماہ پہلے تک ریاستہائے متحدہ امریکہ ان مراکز کو لاکھوں ڈالر مہیا کرتا رہا تھا۔

۸ مارچ ۲۰۰۴ء کے ہفتہ وار ٹائم نے صدر کرزئی کی بے یارومددگار حالت کی منظر کشی کی ہے۔حامد کرزئی اکیلا ہے۔ ہمیشہ کی طرح کابل کے صدارتی محل کے اندر بلکہ بہت اندر اونچی پتھریلی دیواروں، غراتے ہوئے کتوں اور امریکی محافظوں کے نرغہ میں ملاقاتیوں کو برجیوں میں کھڑے تربیت یافتہ سنتریوں کی نظروں کے سامنے محرابی دروازوں میں داخل ہونے سے پہلے تین جگہ جسمانی تلاشی دینی پڑتی ہے۔''
تعجب نہیں اگران کا اقتدار کابل سے باہر نظر نہیں آتا جہاں امریکی سپاہی مسلسل پہرہ دیتے ہیں۔جن کی کفالت افیون کی تجارت سے ہوتی ہے اور وہ اپنے علاقوں میں خود ٹیکس عائد کرتے ہیں۔ اکثر وہ آپس میں یا صدر کرزئی کے متعین کردہ صوبائی گورنروں سے برسرپیکار رہتے ہیں۔

۲۱، مارچ کی اخباری رپورٹ (ڈان ۲۲ مارچ ۲۰۰۴ء) میں ذکر ہے کہ ہرات میں ایک وزیر کابینہ میر واعظ صادق کا قتل ہوا جو ہرات کے گورنر اسمٰعیل خان کا بیٹا تھا

جوصدر کرزئی کا مخالف ہے اس قتل کے بعد ہرات میں فرقہ وارانہ لڑائی میں سو افراد مارے گئے' سرکاری ٹیلیویژن نے ہرات کے گورنر اور محکمہ خفیہ اطلاعات کے افسر غلام صادق بختیار پر ناکام حملوں کی بھی خبر دی' یہ تو افغانستان میں لاقانونیت اور افراتفری کی حالت ہے۔اس کے بعد فریاب میں جنرل دوستم کی نجی فوج اور گورنر فریاب کی فوجوں میں خونریز لڑائی ہوئی۔ گورنر کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اپریل ۲۰۰۴ء کے دوسرے یا تیسرے ہفتہ میں طالبان نے کم از کم پانچ راکٹ داغے جن کا نشانہ مشرقی افغانستان میں امریکی اڈے تھے۔دوستم نے کرزئی سے مطالبہ کیا ہے کہ اگر وہ اپنے صدر ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو وزیر دفاع اور وزیر داخلہ جلالی کو رخصت کر دیں۔ یہ ایک مقامی جنگجو سردار کی طرف سے ملک کے صدر کو للکارنا نہیں تو اور کیا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان جنگجو سرداروں میں سے زیادہ تر امریکی پشت پناہی کے مزے لے رہے ہیں اور افغانستان میں جاری افراتفری اور لاقانونیت کے سہارے منظر عام پر واپس آنے کو تیار ہیں۔صدر کرزئی خود اعتراف کرتے ہیں اگر امریکی فوج واپس ہو جائے تو چھ ماہ میں القاعدہ واپس آجائے گی' صدر کرزئی کے اسی ڈر کو دور کرنے کے لیے امریکی وزیر خارجہ نے اپنے حالیہ دورہ میں تشفی کرائی کہ ''امریکہ افغانستان میں رہنے کے لیے آیا ہے''۔ ۸ مارچ ۲۰۰۴ء کے ہفتہ وار ٹائم نے انکشاف کیا کہ امریکی فوجی عہدیداروں کو یقین ہے کہ طالبان امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف حملہ کی تیاری کر رہے ہیں۔

Joint Chief of Staff کے سربراہ جنرل رچرڈ مائرز نے کہا موسم بہتر ہونے اور دشوار گزار پہاڑیوں میں نقل و حرکت بہتر ہونے کے بعد ہمیں تشدد میں اضافہ کی امید ہے۔اسی جریدہ کے مطابق اسپن بولدک میں امریکہ کے حمایتی کمانڈار عبدالرزاق نے کہا کہ اسے ''سرحدی شہروں مثلاً چمن میں قبائلی اتحادیوں سے خفیہ اطلاعات ملی ہیں کہ طالبان گوریلا اہم مہم کی تیاریاں کر رہے ہیں۔وہ آرہے ہیں صرف وقت گزرنے کی بات ہے۔''

جنگجو سرداروں سے نجات کے لیے کرزئی حکومت قومی فوج تیار کرنے کے لیے مشکل کام میں لگی ہوئی ہے لیکن اسے کوئی کامیابی نہیں ہو رہی۔ ۲۰۰۴ء میں جو پانچ ہزار سات سو (۵۷۰۰) فوجی بھرتی ہوئے ان میں بھگوڑوں کی تعداد ۲۲ فی صد رہی جیسا کہ نیٹو (NATO) افسروں نے بتایا۔ جو بھی فوج تیار ہوئی وہ کابل سے باہر جانے کی ہمت نہیں کر سکتی۔

کابل میں قائم افغان خود مختار انسانی حقوق کمیشن نے پچھلے سال درجنوں زبردستی کی شادیوں، کابل میں زمینوں پر قبضے اور قتل کے واقعات کی شہادت جمع کی جن کا ارتکاب ان افغان کمانداروں نے کیا جو کبھی نہ کبھی امریکی حمایت حاصل کر چکے تھے۔ فروری ۲۰۰۴ء میں ہلمند کے گورنر نے گاؤں کجاکی میں پانچ سو (۵۰۰) افراد کے مجمع کو طالبان فوجی کی لاش کی نمائش کی اجازت دی۔ یہ ایسی گھناؤنی حرکت تھی جو طالبان نے کبھی نہیں کی۔ اسلام لاشوں کی بے حرمتی کا سخت مخالف ہے چاہے وہ دشمن کی ہوں۔ امریکہ کی طرف سے افغانستان پر حملہ کا مقصد لوگوں کو طالبان کے جبر سے آزادی دلانا بتایا جاتا رہا ہے۔ یہ آزادی اس سے زیادہ تو کچھ بھی نہ لائی کہ کچھ خواتین نقاب ہٹا کر اور جین اور کوٹ پہن کر گھوم لیں اور مرد پتنگیں اڑا لیں جن پر طالبان دور میں پابندی تھی۔

۲۱ مارچ ۲۰۰۴ء کی رپورٹ میں رائٹرز نے کہا کہ وہ جنگ جس میں پانچ ہزار فوجی ملوث تھے امریکہ کے اتحادی پاکستان کی طرف سے قبائلی علاقہ میں سب سے بڑا فوجی اجتماع تھا جو علاقہ سے ان امریکہ مخالف عناصر کو نکالنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا جن پر الزام تھا کہ یہاں سے افغانستان کے اندر کارروائیاں کرتے ہیں یہ مہم بری طرح الٹ گئی کیونکہ متشددانہ حد تک خود مختار اور مذہبی قبائلیوں میں غصہ اس قدر بڑھ گیا کہ سات ہزار افراد فوجوں کی واپسی کا مطالبہ لے کر مظاہرہ کرنے نکل پڑے انھوں نے پشاور اور پاکستان کے دوسرے شہروں پر جوابی میزائل حملے بھی کیے۔ سرکاری بیان کے مطابق پاکستان کی فوج اور نیم فوجی اداروں کے چھیالیس افراد ہلاک اور چار زخمی ہوئے۔ وانا

کا اپریشن جنوری ۲۰۰۴ء میں دوبارہ شروع کیا گیا جس میں دونوں طرف کثیر جانی نقصان ہوا جبکہ اسامہ اور عمر کی کمین گاہ کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔

اسلام آباد میں رائٹرز نے مزید بیان کیا کہ ستر مسلمان علماء نے اواخر ۲۰۰۳ء میں وانا پر حملہ کو غیر اسلامی قرار دیا۔ اور یہ فتویٰ جاری کیا کہ حکومت کے جو فوجی ہلاک ہوئے وہ کفر کی حالت میں تھے اور ان کی نماز جنازہ جائز نہیں۔ اسی طرح حکومت پاکستان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ فوجی کارروائیاں روک کر قبائلی سرداروں سے پھر گفتگو کرے۔ افغانستان اور پاکستان دونوں میں ان مہمات کا مقصد بھی القاعدہ کے اعلیٰ عہدیداروں اور فوجیوں کی گرفتاری سے پورا نہ ہو سکا۔ اسامہ اور عمر ابھی تک قبائلی علاقوں میں پاکستان اور افغانستان میں امریکی کارروائیوں کے باوجود محفوظ ہیں۔ یہ حقیقت فوجی ہزیمت سے کم کوئی امر نہیں جو طالبان کی فاتحانہ واپسی کا راستہ بھی ہموار کر سکتی ہے۔ صدارتی اور پارلیمانی انتخابات جو افغانستان میں جون ۲۰۰۴ء میں ہونے تھے ستمبر تک ملتوی کرنے پڑے اور اس وقت تک صرف ۱۰ فی صد اہل رائے دہندگان کے نام لکھے جا سکے تھے۔ اگر انتخابی فہرستوں کا کام ایسی ہی چیونٹی کی رفتار سے ہوتا رہا تو اسے مزید ملتوی کرنا پڑے گا۔ بہرحال انتخاب اکتوبر ۲۰۰۴ء میں منعقد ہو گئے اور کرزئی دوبارہ منتخب ہو گئے۔ انتخابات میں یہ تاخیر بھی اس بات کی طرف ایک اِشارہ تھا کہ افغان امریکی فوجوں اور کرزئی حکومت کے ساتھ تعاون نہیں کر رہے ہیں۔ برلن میں چندہ دینے والوں کی انجمن نے افغان حکومت کے اگلے سات سالوں کے لیے تیس ملین ڈالروں کے مطالبہ کے جواب میں ۸ ملین ڈالروں کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن یہ وعدہ اسی وقت رُوبہ عمل آئے گا جب موجودہ امن وامان اور منشیات کی تجارت کی صورت حال قابو میں آجائے جواب تک کرزئی حکومت کے بس سے باہر کی بات رہی ہے۔

ستمبر ۲۰۰۴ء میں ہرات کے گورنر اسماعیل خان کی برطرفی کے بعد افغانستان کے مغربی شہر میں تشدد بھڑک اٹھا جس سے یہ بات پھر سامنے آگئی کہ طالبان کے سقوط کے تقریباً تین سال بعد بھی جبکہ صدارتی انتخابات میں صرف چار ہفتے باقی تھے افغانستان کی

حالت کس قدر متلون تھی۔ ۴ جون کو صدر بش نے اعلان کیا کہ افغانستان میں بڑی جنگی کارروائیاں ختم ہو چکی ہیں اور اب استحکام اور تعمیر نو کا دور شروع ہو چکا ہے۔ ۲۰۰۴ء۔ ۲۰۰۵ء کے بارہ مہینوں میں ان حملوں میں جن کا الزام واپس آنے والے طالبان اور ان کے القاعدہ حواریوں پر ہے ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ جنوب اور مشرق میں جھڑپیں روز کا معمول ہیں۔ عراق کی طرح غیر ملکی امدادی عملہ بار بار نشانہ بنا۔ اتوار ۱۱ ستمبر ۲۰۰۵ء کو میجر جنرل Eric Olson نے جو امریکی افواج کے Operational Commander تھے ہفتہ کے اختتام پر اعتراف کیا کہ ان کی فوجیں مزاحمت کاروں کو شکست دینے کے نزدیک بھی نہیں ہیں۔ چودہ ہزار (۱۴۰۰۰) فوجیوں پر مشتمل افغان قومی فوج جس میں بھگوڑے پن کا رجحان بہت ہے کوئی تاثر قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ تعجب نہیں کہ افغانستان میں صدارتی انتخابات کے دوران امن وامان قائم رکھنے کے لیے NATO کی مزید افواج بھیجنی پڑیں۔

دسمبر ۲۰۰۴ء میں طالبان نے جیل توڑنے کی کوشش میں پانچ جیل محافظوں کو ہلاک کر دیا اور جیل کے اسلحہ خانہ پر قبضہ کر لیا۔ ۲۰۰۵ء میں اگست تک طالبان نے حملوں میں پچاس امریکی فوجیوں کو ہلاک کیا۔ یہ دسمبر ۲۰۰۱ء میں افغانستان سے طالبان کے سقوط کے بعد سے آٹھ مہینوں میں امریکی ہلاکتوں کی کثیر ترین تعداد تھی۔ ۱۲ مارچ ۲۰۰۴ء کو سڑک کے کنارے نصب بم پھٹنے سے چار امریکی فوجی ہلاک ہوئے اور حکومت کے حامی ایک افغان قائد مجدّدی پر حملہ ہوا جو بال بال بچے۔

افغانستان ایک ناکام ریاست

موقر جریدہ نیشنل جیوگرافک نے ۲۰۰۲ء کے اپنے ایک شمارہ میں جنگ کے بعد کے افغانستان کی بے حد زوال پذیر حالت اور خود کابل میں بھی بنیادی سہولتوں کی بدحالی کی تصویر کشی کی ہے۔ گندگی پانی کے ذرائع میں ڈال دی جاتی ہے جس سے کنویں گندے ہو جاتے ہیں اور پانی کی کمی ہو جاتی ہے، صحت وصفائی کا برا حال ہے اور گندگی

کے ڈھیر جمع ہیں۔ یہ دستاویز اکتوبر کی جنگ کے ایک سال سے زیادہ عرصہ بعد تیار کی گئی تھی۔

۲۹ ستمبر ۲۰۰۲ء کے نیویارک ٹائمز میں رپورٹ شائع ہوئی کہ قندھار کے گورنر آغا گل جن کے ذمہ پناہ گزینوں کے بڑے مسئلہ سے نمٹنا تھا اقوام متحدہ کے غیر ہمدردانہ رویہ سے اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ اپنی قمیص احتجاج کے اظہار کے لیے پھاڑ ڈالی۔

افغانستان یتیم خانہ بھی بدحالی کی حالت میں ہے اگر چہ ان کے لیے غذا کا انتظام عالمگیر غذائی پروگرام کر دیتا ہے جبکہ افغان حکومت یتیم خانہ میں مقیم ان بیچاروں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کر سکی ہے۔ ۱۳ ر نومبر ۲۰۰۲ء کے بوسٹن گلوب نے کابل یونیورسٹی کے طلباء کی معاشی بدحالی اور محرومی کا حال یوں بتایا ہے کہ جب رمضان میں انھوں نے کھانے کے لیے قطار لگائی تو انھیں خالی ہاتھ واپس آنا پڑا کیونکہ کھانا نہیں تھا۔ طلباء احتجاج کے لیے سڑک پر آگئے اور ان پر گولی چلائی گئی اور چار طلباء ہلاک ہوئے، جس پر طلباء نے اپنے ساتھیوں کے قاتلوں کے لیے مردہ باد کے نعرے لگائے۔ تین سو طلباء بدحال گندے کمروں میں رہتے ہیں۔ طلباء نے شکایت کی ہمارے پاس نہ تو پانی ہے نہ بجلی۔

معاشی پریشانیوں اور محرومیوں کی اس حالت کے مقابلے میں بیان کیا جاتا ہے کہ دوستم جو کہ ایک جنگجو سردار ہے امریکہ کی پشت پناہی میں دولت اور آسائشوں میں کھیل رہا ہے۔ اس نے تیراکی کا ایک شاہانہ تالاب بنوایا ہے جس میں قدرتی چشمہ سے پانی آتا ہے اور زرنگار کھمبوں سے سجا ہوا ہے جس کا طالبان کے دور میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پوست کی کاشت کا جو سلسلہ طالبان نے ختم کر دیا تھا اب پوری انتقامی شدت کے ساتھ واپس آچکا ہے بلکہ ہر زمانہ سے زیادہ ہو رہا ہے اور غریب افغانوں کی روزی کا ذریعہ ہے۔ پوست کی کاشت دوبارہ جاری ہو جانے کی ایک وجہ کرزئی حکومت کی طرف سے کاشت کاروں کو کاشت نہ کرنے کی صورت میں موعودہ امدادی معاوضہ کی فراہمی میں ناکامی بھی ہے۔

ایک معقول اندازے کے مطابق افغانستان کی تعمیر نو کے لیے ستائیس بلین ڈالروں کی خبر درست تھی۔اس میں سے ۸ء۴بلین کا تین سال پہلے ٹوکیو میں چندہ دینے والوں کی کانفرنس میں وعدہ کیا گیا تھا اور ۲۰۰۲ء میں صرف ۱.۸ء بلین ہی جاری کیے گئے جس میں سے زیادہ تر لاکھوں افغانوں کو بھوکا مرنے سے بچانے پر خرچ ہوئے۔

ایک طرف غربت اور محرومی کی انتہا اور دوسری طرف چند خوش قسمتوں کی طرف سے شان وشوکت کی بدصورت اور بیہودہ نمائش جو موجودہ دور میں جاری ہے۔اس سے بالکل متضاد طالبان دورِ حکومت جو کارکردگی' برابری اور انصاف کی مثال تھا کہ سالوں کے قحط میں اقوام متحدہ کی معذورکن پابندیوں کے باوجود جو کچھ بھی میسر تھا اس کی تقسیم متوازن برابری اور انصاف سے کی جاتی تھی، اور معاشی پریشانیوں میں اعلیٰ ادنیٰ برابر حصہ لیتے تھے جس کی وجہ سے بھوک اور فاقہ کشی بھی نہ تھی اور جواہرات سے مزین پایوں والے پیراکی کے تالاب بھی نہیں تھے۔

۱۱ر ستمبر ۲۰۰۳ء کے ڈان نے بتایا کہ افغانستان میں بیس ملین سے زیادہ افراد قحط سے متاثر تھے۔چار ملین افغان فاقہ کشی کے کنارے تھے اور ایک ملین بھوک سے ہلاک ہوسکتے تھے' دوسال پہلے ہی افغان دیہاتوں میں پچاس فیصد مویشی ہلاک ہوچکے تھے' کئی علاقوں میں لوگوں کو پانی کے لیے کئی کلومیٹر سفر کرنا پڑتا تھا کبھی کبھی اس میں سارا دن لگ جاتا' آنتوں کی بیماریاں اور ٹائیفائیڈ کی وبا پھوٹ پڑی تھی۔ایک اور رپورٹ میں جو اِکانومسٹ میں ۵ جولائی ۲۰۰۳ء کو شائع ہوئی کہا گیا: ''بامیان مبینہ طور پر بھوکا علاقہ ہے جہاں بھوکے دیہاتی گھاس کھانے پر مجبور ہیں''۔

۲۹ جولائی ۲۰۰۳ء کے نیویارک ٹائمز میں ایک مضمون شائع ہوا کہ انسانی حقوق کے ایک کمیشن نے وسیع طور پر غیرقانونی طریقہ سے رقوم کی وصولیوں، مسلح ڈاکوں پولیس اور محکمہ خفیہ اور طالبان مخالفوں کی طرف سے اغوا کی وارداتوں کے حالات بیان کیے ہیں۔اس رپورٹ میں الزام لگایا گیا ہے کہ امریکہ بعض صریح مجرموں کی مدد کرتا ہے۔ نیویارک کی ایک نگران انسانی حقوق (Human Right Watch) نے ۱۰۱

صفحات کی ایک رپورٹ تیار کی ہے جس میں ۲۰۰۳ء کے کچھ مہینوں کے دوران مشرقی اور جنوب مشرقی افغانستان کے بارے میں صوبوں میں شہریوں کے خلاف جرائم اور پیش جرائم کی فہرست پیش کی گئی ہے۔ رپورٹ میں فوجیوں، پولیس عہدیداروں، کمانداروں یہاں تک کہ موجودہ وزیروں پر بھی جرائم اور تشدد کی کارروائیوں کا الزام ہے۔ کچھ محکموں اور حکومتی عہدیداروں کا خیال ہے کہ کرزئی کے تذبذب اور جنگجو سرداروں کو خوش کرنے کی پالیسی نے غلط کاروں کو اقتدار دے دیا ہے۔ سابق وزیر دفاع فیلڈ مارشل فہیم کے اہل کار مبینہ طور پر ایک اخبار کے مدیر کے پاس آئے جس نے فہیم اور کرزئی کا کارٹون شائع کیا تھا اور اسے دھمکی دی: ''ہمارے لیے تمھیں مار ڈالنا بہت آسان ہے۔ میں اپنے پاس موجود ساری تیس گولیاں تمھارے سینے میں بھی اتار سکتا ہوں اور مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔'' رپورٹ میں پولیس افسروں پر بھی ناجائز رقم وصولنے، بلاوجہ گرفتاریوں، مار پیٹ، تاوان وصولنے کے لیے نجی جیلوں میں محبوس رکھنے اور ممکنہ تشدد کے الزامات ہیں۔ پولیس افسروں اور سپاہیوں کو اکثر مہینوں تنخواہیں نہیں ملتیں۔ وزیر تعلیم شمالی اتحاد کے مسٹر قانونی نے ایک چھوٹی جماعت کے قائد کو فون کر کے دھمکی دی اس لیے کہ اس نے ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں مجاہدین پر تنقید کی گئی تھی۔ اس جماعت کو بین الاقوامی امن قائم کرنے والوں سے مدد مانگنا پڑی تھی۔ لیکن رپورٹ میں بتایا گیا کہ دوسرے بدمعاشوں کے پاس اعلیٰ اور اہم عہدے تھے اور وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکی فوجوں کے قریبی مددگار تھے۔

افغانستان میں حکومتی امداد اور تحریک سے ظہور میں آنے والی لوٹ مار کی مندرجہ بالا سنسنی خیز تصویر سے اپنے وقت میں جب کہ حکومت کی انتظامیہ خود ظلم و جبر کا ایک مہیب کارخانہ بن گئی ہے یہی بات واضح ہوتی ہے کہ افغان ریاست کا نظام بالکل تہس نہس ہو چکا ہے۔

۲۶/اپریل ۲۰۰۳ء کے نیویارک ٹائمز نے افغانستان میں متزلزل صورت حال پر روشنی ڈالی ہے کہ حقیقی معنوں میں جنگ ختم نہیں ہوئی ہے جیسا کہ آج رمزفیلڈ کی آمد

کے دن ایک حملہ اور امریکی فوجی کی ہلاکت سے واضح ہوتا ہے۔تقریباً ہر روز قتل' دھماکے' گولیاں چلنا اور غیر ملکی امدادی کارکنوں پر حملے ہوتے ہیں۔ افغان اہل کار اور امریکی افواج بھی حملوں کی زد میں ہیں۔ جنگجو سرداروں کی لڑائیاں بلا روک ٹوک جاری ہیں۔ جب سے گلبدین حکمت یار نے جہاد کا اعلان کیا ہے جنوبی اور مشرقی علاقوں میں جلاوطن طالبان حرکت میں آ رہے ہیں۔مشرقی افغانستان میں خصوصی افواج کے اڈے کے قریب حملہ میں ایک امریکی فوجی ہلاک ہوا۔ امریکی اور افغان سپاہیوں کی ایک پلٹن پر تقریباً بیس باغیوں نے گولیاں چلائیں اور پاکستان کی سرحد کی طرف بھاگ گئے۔ پانچ سو خصوصی افواج نے فضائی افواج کے ساتھ دو ہفتوں تک باگرام کی وادی اور ہلمند میں تلاش کی کارروائی کی لیکن ملا وحید اور ملا کبیر کو نہ پکڑ سکے۔مسلسل ہوائی حملے اور رات کی تلاشیاں افغان دیہاتیوں میں غصہ پھیلاتی ہیں۔ ایک ہوائی حملہ جو مبینہ طور پر باغیوں کے گروہ پر کیا گیا تھا ایک خاندان کے گیارہ افراد کی ہلاکت کا باعث بنا جو سو رہے تھے۔چھوٹے چھوٹے بچے بھی امریکی فوجیوں کی طرف بیہودہ اشارے کرتے ہیں۔

۱۹ اکتوبر ۲۰۰۵ کو ڈان کی رپورٹ ہے کہ دو سال پہلے بکھر جانے کے باوجود طالبان نے بے انتہا لچک کا مظاہرہ کیا ہے اور واپسی کے راستہ پر ہیں' بتایا جاتا ہے کہ جنوبی صوبہ زابل میں وہ اپنی مقبولیت واپس حاصل کر چکے ہیں جہاں مرکزی حکومت کے لیے دارالخلافہ قلات میں بھی اقتدار قائم کرنا مشکل ہے اور اسے جنگجو افراد کی موجودگی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ زابل حکومت کا اقتدار قلات سے باہر نظر آتا۔ قلات سے باہر جو بھی افراد مسلح ہوں وہ طالبان ہیں۔ زابل میں بھی اور علاقوں کی طرح لوگ طالبان کو پسند کرتے ہیں۔

۱۲/ اکتوبر کو ڈان نے بتایا کہ اکتالیس (۴۱) طالبان قیدی تین سو میٹر لمبی سرنگ کے ذریعے فرار ہو گئے جو ممکن نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ انھیں قید خانہ کے عہدیداروں کی مدد حاصل نہ ہوتی۔ ۹ ستمبر ۲۰۰۳ء کو ڈان ہی کی خبر تھی کہ تاجک سردار عطا محمد کے پچاس لڑاکے جنرل دوستم کی زیر قیادت ازبک مخالفین سے لڑتے ہوئے ہلاک یا زخمی

ہوئے۔ جنرل دوستم سابق نائب وزیر دفاع اور حالیہ کرزئی حکومت میں کابینہ کے مشیر ہیں۔

ڈان کی ۱۲ نومبر ۲۰۰۳ء کی رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ افغان پولیس اور سابق فوجی کمانداروں کے درمیان جنوب مغربی صوبہ ہلمند میں خونریز لڑائی ہوئی۔ یہ جھڑپ اس وقت شروع ہوئی جب پولیس نے سابق فوجی کماندار حاجی ادریس کی گاڑیوں کے قافلہ کو معمول کی تلاشی کے لیے روکا' کماندار نے مزاحمت کی اور مارا گیا۔ تین خواتین اور بارہ دوسرے شہری گولیوں کی زد میں آ گئے۔

ڈان کی ایک رپورٹ میں ۱۹/ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو بتایا گیا کہ طالبان نے مشرقی افغانستان میں ایک اہم قومی شاہراہ پر قبضہ کرلیا' داڑھی نہ رکھنے والے ڈرائیوروں کو سزا دی، موسیقی کے کیسٹوں کو ضبط کر کے توڑ دیا۔ ۲۱/ ستمبر ۲۰۰۳ء کے ڈان میں رپورٹ تھی کہ طالبان نے جنوبی افغانستان میں ایک شہر پر قبضہ کرلیا ہے۔ تقریباً سو طالبان نے ایک ماہ پہلے حکومت کے عہدیداروں پر حملہ کیا اور افغان فوجوں اور افسروں کو بھگا دیا۔

AFP اور رائٹرز کی ایک مشترکہ رپورٹ میں بتایا گیا کہ چونکہ طالبان نے صوبوں کے کچھ حصے واپس لے لیے ہیں اس لیے اقوام متحدہ چار صوبوں سے اپنا عملہ ہٹا رہی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ طالبان افغانستان کے ایک حصہ میں واپس آ چکے ہیں۔

کرزئی معاشی امداد کے لیے کشکول لے کر واشنگٹن گئے۔ ۲۷، فروری ۲۰۰۳ء کو رپورٹ شائع ہوئی کہ کرزئی نے اپنے دورہ میں انتظامیہ سے درخواست کی کہ افغانستان کو عراق کے لیے قربان نہ کیا جائے۔ انھوں نے امریکہ سے استدعا کی کہ اگر عراق کا مسئلہ واقع ہو بھی جائے ہمیں بھول نہ جائیں۔ اس کے بعد سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی کے سامنے انھوں نے ایک گھنٹہ تک گواہی دی اور کہا کہ دہشت گرد پاکستان کی سرحد سے آتے جاتے رہتے ہیں پھر انھوں نے سینٹ کمیٹی سے زیادہ متناسب معاشی امداد کی درخواست کی کیونکہ اس کا امکان ہے کہ دہشت گرد پاک افغان سرحد پر پھر سے جمع ہو سکتے ہیں۔

کرزئی کے دورہ کے بعد افغان وزیر خارجہ عبد اللہ عبداللہ جولائی ۲۰۰۳ء میں واشنگٹن گئے۔ انھوں نے CNN سے ایک انٹرویو میں صاف الفاظ میں کہا کہ ان کے ملک میں جو امداد مل رہی ہے وہ کافی نہیں۔ انھوں نے خبردار کیا کہ اگر مناسب امداد نہ ملی تو نتائج تباہ کن ہوں گے۔

ریاستہائے متحدہ کی خصوصی افواج کی عمر اور اسامہ کی گرفتاری میں ناکامی اور اس کوشش میں بار بار بے گناہ شہریوں کو نشانہ بنانا' کرزئی حکومت کے لیے کابل سے باہر اقتدار قائم کرنے کے قابل نہ ہونا مختلف جنگجو سرداروں کی حکومت سے وفاداری کے عہد کے باوجود آپس میں لڑائیاں' افغانستان کا مختلف سرداریوں میں تقسیم ہو جانا اور ان سب کا اپنی فوج اور ٹیکس نظام' عوام کی بے پناہ غربت' بڑھتی ہوئی لاقانونیت اور افراتفری جس کی وجہ سے اس کی فوج سمیت سرکاری اداروں کا وجود ناجائز طور پر رقوم چھیننے، ڈاکوں، بددیانتی اور آبروریزیوں میں ملوث ہونا، طالبان ایک دفعہ پھر افغان عوام میں مقبول ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے وقت بہ وقت مختلف علاقوں پر قبضہ کر رہے ہیں۔ ۲۵ دسمبر ۲۰۰۳ء کی رپورٹ کے مطابق ملا عمر ان کی پارٹی اور جنگجو افغانستان میں کارروائیاں شروع کر چکے ہیں۔ یہ سب کچھ افغانستان ریاست کی ناکامی کا ثبوت ہے جو طالبان کی فاتحانہ واپسی کی راہ ہموار کرے گی۔

اس تیز رفتار حقیقت کا ادراک اگرچہ کتنا ہی تکلیف دہ سہی بہرحال ریاستہائے متحدہ کی انتظامیہ پر ہو چکا ہے جس نے اپنی افغان پالیسی کو بہت حد تک تبدیل کر لیا ہے۔ اور اب طالبان کے معتدل عناصر سے مصالحت کے لیے شدید کوشش کر رہی ہے۔ ماضی میں کہا گیا تھا کہ کرزئی نے سابق وزیر صحت سے گفتگو کی تھی اور اس کے لیے انھیں بش انتظامیہ کی آشیرباد حاصل تھی۔ پچھلے ہی دنوں ستمبر یا اکتوبر ۲۰۰۳ء میں نائب سیکرٹری دفاع جناب آرمیٹج کے مطابق سابق طالبان وزیر خارجہ متوکل قید سے چھوٹ چکے تھے۔ صدر کرزئی کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ حکمت یار کے ایک معاون سے بھی گفت وشنید کرتے رہے ہیں۔ بتایا گیا کہ روس میں صدر پیوٹن سے ملاقات کے

دوران ہندوستان کے وزیر اعظم واجپائی نے اس بات پر تشویش ظاہر کی کہ کسی نہ کسی شکل میں طالبان کی واپسی کا خطرہ ہے۔ ۱۵ نومبر کی اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ افغانستان میں اعلیٰ فوجی کمان نے طالبان کو جنگ بندی کی پیش کش کی ہے۔ پیش کش میں کہا گیا ہے اگر طالبان لڑائی بند کریں تو ہم بھی کر دیں گے۔ اس عمل کو ریاستہائے متحدہ کی فوج کا چھٹ بھیے طالبان کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے۔ اپریل ۲۰۰۴ء کے دوسرے ہفتہ کی رپورٹ میں انکشاف ہوا کہ طالبان کے تعاون کی ضرورت اس قدر ضروری ہوگئی ہے کہ سفیر خلیل زاد اور جنرل بورو نے شمالی اتحاد کی شدید مخالفت کے باوجود کرزئی کی معتدل طالبان کے اشتراک کی تلاش کی پشت پناہی کی۔

اگر چہ شروع میں آرمیج کی خفیہ ملاقات کی تردید کی گئی تھی۔ افغانستان میں امریکی سفیر جناب خلیل زاد نے ہرحال اعتراف کیا کہ دونوں طرف سے افغان قائدین نے ایک دوسرے کی طرف بازو پھیلائے ہیں۔ یہ کیسے ہوا کہ چھٹ بھیے طالبان جن کا شیرازہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت نے بکھیر دیا تھا ابھر کر واپس آنے کے لیے تیار ہیں۔ اس کا جواب طالبان کا الوہی امداد پر نا قابل شکست ایمان ہے۔

۲۶؍ اپریل ۲۰۰۴ء کی اخباری رپورٹ میں بتایا گیا کہ کرزئی قندھار میں سابق طالبان سے گفتگو کر رہے ہیں' اس کو طالبان کی اخلاقی اور سیاسی فتح کے سوا کیا نام دیا جا سکتا ہے؟

اور بھی برا یہ ہوا کہ سمجھوتے کی یہ گفتگو ناکام رہی۔ اگر کچھ ہوا تو یہ کہ امریکی فوجوں کی طرف سے فوجی کارروائیوں میں اضافہ اور ارزگان اور زابل میں جون ۲۰۰۴ء میں فضائی حملہ میں بارہ طالبان کو ہلاک یا گرفتار کرنے کے دعویٰ کے باوجود طالبان نے قابض فوجوں کے خلاف تشدد میں اضافہ کر دیا' ان تمام فوجی کارروائیوں کے باوجود طالبان کی صلاحیتوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی جس کی شہادت اس کار بم دھماکہ سے ملتی ہے جس میں ہلمند کے گورنر اور ان کے محافظ زخمی ہوئے۔ جنوب مشرق میں عدمِ تحفظ کی یہ حالت تھی کہ کرزئی کے متعین کردہ افسران خود کو محفوظ نہیں سمجھتے تھے چہ جائیکہ دوسروں کو

تحفظ مہیا کرنے کا وعدہ پورا کر سکیں۔

شروع میں، انتخابات کا منصوبہ بھی ڈگمگا رہا تھا جب اسے مقررہ وقت ستمبر میں منعقد نہ کیا جا سکا کیونکہ اس وقت تک دس ملین رائے دہندگان میں سے ۵ فیصد کی بھی رجسٹریشن نہیں ہوئی تھی نہ ہی جون ۲۰۰۴ء تک حلقوں کی نشان دہی ہوئی تھی۔

بہر حال اکتوبر ۲۰۰۴ء کو انتخابات ہو گئے اور جیسا کہ توقع تھی صدر کرزئی اکیاون فیصد ووٹ لے کر جیت گئے اور اقوام متحدہ کے مطابق بڑی تعداد میں ووٹ ڈالے گئے۔ ان انتخابات کا بڑے پیمانہ پر دھاندلیوں کی وجہ سے تمام دوسرے امیدواروں نے بائیکاٹ کیا تھا۔

تقریباً ایک سال بعد افغانستان مقننہ کے انتخابات طالبان کی طرف سے دھمکیوں کے باوجود منعقد ہوئے۔ بہر حال خود مختار اور غیر جانبدار بین الاقوامی مبصروں کی غیر موجودگی کی وجہ سے کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ انتخابات کتنے شفاف، غیر جانبدارانہ تھے اور ووٹوں کی تعداد کیا تھی۔ انتخابات میں دھاندلیوں کی خبریں موجود ہیں، ان انتخابات میں تمام جنگجو سرداروں اور منشیات کے سوداگروں نے مبینہ طور پر کامیابی حاصل کی۔ اس طرح یہ لوگ ایوان نمائندگان میں داخل ہو چکے ہیں اور یوں اب جنگجو سرداروں کی خرابیوں سے چھٹکارا پانا، ان کی فوجوں کو غیر فعال کرنا اور منشیات کی تجارت کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ اس طرح جنگجو سردار اور ان کی عملداری اور منشیات کی تجارت اب افغانستان میں ادارہ جاتی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔

ایرک مارگولس نے ایک مقالہ میں (ڈان ۱۳ دسمبر ۲۰۰۴ء) انکشاف کیا ہے امریکہ کے کرائے ہوئے انتخابات میں تمام سنجیدہ جماعتیں اور شہری جو امریکی تسلط مخالف تھے الگ کر دیئے گئے، صرف اقلیتی فرقہ والوں مثلاً تاجک ہزارہ ازبک امیدواروں اور جنگجو سرداروں کو جو اسی (۸۰) فیصد علاقہ پر کنٹرول کر رہے تھے دسیوں ملین ڈالروں کی رشوت دی گئی تھی تاکہ وہ انتخابات میں کھڑے ہوں اور بعد میں کرزئی کی حمایت کریں۔ ایک اور ذریعہ نے بتایا ہے کہ دیہاتی بزرگوں کو بڑی تعداد میں

تیار کیا گیا کہ رائے دہندگان کو کرزئی کے لیے ووٹ ڈالنے کو بھیجیں۔ بتایا گیا ہے کہ ایک صوبہ میں تین سو (۳۰۰) بڑوں نے رائے دہندگان کو دھمکی دی کہ اگر انھوں نے کرزئی کے لیے رائے نہ دی تو ان کے گھر جلا دیے جائیں گے۔

پاکستان میں مشرف حکومت نے آگے بڑھ کر افغان مہاجروں پر کرزئی کے لیے ووٹ ڈالنے کے لیے اثر ڈالا جبکہ جنرل دوستم نے الزام لگایا جو خود بھی امیدوار تھے کہ اقوام متحدہ کے جو نمائندے انتخابات کے جائزہ کے لیے مقرر تھے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے دوسرے امیدواروں کو راضی کیا کہ نتائج کو تسلیم کر لیں۔

افتتاحی تقریب سے ذرا پہلے کرزئی حکومت نے طالبان کے لیے عام معافی کا اعلان کیا جنھوں نے جوابی کارروائی کے طور پر خوست افغان سپاہیوں کی ایک چیک پوسٹ کو دھماکہ سے اڑا دیا جس میں طالبان کے ترجمان ملا عبدالصمد کے مطابق دسیوں افغان سپاہی ہلاک ہوئے۔

کیا صدر کرزئی کا یہ انتخاب افغانستان میں امن وخوشحالی کا دور لا سکے گا؟ افغانستان کی حقیقتوں کو دیکھتے ہوئے اس کا جواب نفی میں ہے۔ صدر کرزئی نے خود اعتراف کیا ہے کہ جنگجو سرداروں کے پاس جتنی ملیشیا ہے اس کی قوت نئی تربیت یافتہ فوج سے زیادہ ہے۔ اور یہ طالبان کی باقیات سے زیادہ بڑا خطرہ ہیں۔ افغانستان کی خواتین کی انجمن (RAWA) کی ارکان نے (New internationalist) میں لکھتے ہوئے بیان کیا کہ بچیوں کے اسکول اور خواتین کے لیے روزگار خواب ہی ہیں۔ خواتین RAWA نے کہا کہ مرد رشتہ دار کے بغیر نہ تو وہ ٹیکسی لے سکتی ہیں نہ سڑک پر چل سکتی ہیں اگر ایسا ہو تو ایک خاتون کو خاص پولیس گرفتار کر کے اسپتال میں تفتیش کرا سکتی ہے کہ کہیں اس نے جنسی تعلقات تو قائم نہیں کیے اور ایسا ہونے کی وجہ سے آئے روز کئی لڑکیاں خودکشی کر لیتی ہیں۔ طالبان دور سے کہیں زیادہ۔

شمالی اتحاد کے زیر انتظام علاقوں کے بارے میں RAWA کی رکن نے ایک NGO کی بات دہرائی جو انھوں نے Amnesty International سے کہی،

طالبان کے دور میں بازار میں چلتے ہوئے اگر کسی عورت کی ایک انچ بھی جلد نظر آ جاتی تھی تو اسے کوڑے مارے جاتے تھے' اب اس کی آبروریزی ہوتی ہے۔گویا یہ ہے وہ مشہور آزادی جو خواتین کو کرزئی دور میں ملی۔

مزید برآں، بین الاقوامی بھلائی کا ادارہ Medicine Sans Frontiers (MSF) افغانستان میں پچھلے چوبیس سالوں سے یعنی سوویت یونین سے لے کر طالبان کے دور کی خانہ جنگی کے دوران کام کرتا رہا ہے۔جب ان کے پانچ اہل کاروں کو جنگجو سرداروں نے بلاوجہ ہلاک کر دیا اور مقتدر اداروں نے شکایت پر مجرموں کا پیچھا کرنے سے انکار کر دیا تو وہ اپنا کام بند کر کے واپس جانے پر مجبور ہو گئے۔ایک وقت ایسا بھی آیا جب اقوام متحدہ نے بھی لاقانونیت کی وجہ سے کام بند کرنے کا فیصلہ تقریباً کر ہی لیا تھا۔گولی پہلے چلانے اور سوال بعد میں کرنے کی پالیسی عوام کے تحفظ کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے' تعجب نہیں اگر افغان کھلم کھلا طالبان کی واپسی کی دعا کرتے ہیں اور امریکی سفیر خلیل زاد نے طالبان کے لیے عام معافی کا اعلان کیا جسے انھوں نے اسی حقارت سے ٹھکرا دیا جس کی وہ مستحق تھی۔اب کرزئی حکومت اور امریکی زیر قیادت فوج طالبان کو عام معافی قبول کرنے پر مجبور کرنے کے لیے بڑی کارروائی کر رہی ہے۔

چونکہ جنگجو سرداروں کو غیر فعال کرنا اور ان ملیشیاؤں کو غیر مسلح کرنا جو کرزئی حکومت کو للکارتے رہتے ہیں اب تک دُور اَز کار ہے۔ISAF کے کمانڈار نے اس ناکامی کا الزام فہیم اور ان کے حواریوں پر لگایا۔

منصوبہ یہ تھا کہ ایک لاکھ کی تعداد والی ملیشیا میں سے چالیس ہزار کو جون ۲۰۰۵ء تک غیر مسلح کر دیا جائے گا۔لیکن سرکاری بیانات کے مطابق اس وقت تک صرف ساڑھے تین ہزار سے نو ہزار تک غیر مسلح کیے جا سکے تھے۔کابل کی حفاظت بین الاقوامی فوجیں کر رہی تھیں لیکن یہاں سے بھی ملیشیا کو نکالا نہ جا سکا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اگرچہ ISAF اس ناکامی کی ذمہ داری فہیم پر ڈالتی ہے پھر بھی فہیم کے لیے امریکہ کی پشت پناہی بدستور جاری ہے۔

مزارشریف میں کرزئی حکومت کے متعین کردہ پولیس سربراہ اپنے گھر تک محدود رہے اوران کی پولیس نفری کوسردارعطا کے سپاہیوں نے غیر مسلح کر دیا۔

اسی طرح صوبہ ہرات میں کرزئی کے متعین کردہ محکمہ خفیہ کے سربراہ کے دفتر پر جنگجو سرداروں کی وفادارافواج نے قبضہ کرلیا' ایسا مارچ ۲۰۰۴ء سے چوتھی دفعہ ہوا تھا کہ شمال اورمغرب میں مقامی فرقہ جاتی فوجوں نے کرزئی کے افسروں کواعلیٰ صوبائی عہدوں پر یا تو کام نہ کرنے دیا یا انھیں بھگا دیا۔

بتایا گیا ہے کہ پشتون علاقوں میں رائے دہندگان کی طرف سے رجسٹریشن کی سخت مزاحمت کی وجہ سے کرزئی نے تاجک اور ازبک علاقوں میں رائے دہندگان کی جھوٹی رجسٹریشن کروائی اوراس طرح تاجکوں اور پشتونوں کے درمیان کشیدگی کواور بڑھادیا۔

۳۱ جولائی ۲۰۰۴ءکوڈان کے نمائندے کی رپورٹ میں سفر کے لیے ایک نئی تنبیہ کاذکر ہے جوفروری ۲۰۰۴ء میں جاری کی گئی تھی۔افغانستان میں سفر کرنے والے امریکی شہریوں کوخبردار کیا گیا تھا کہ تمام امریکی شہریوں اور NGO کے کارکنوں کواغوا اورقتل کی دھمکی ہے،اورافغان انتظامیہ میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ امن وامان اورشہریوں کے لیے تحفظ قائم کر سکے۔طالبان کی باقیات دہشت گرد القاعدہ تنظیم اور دوسرے حکومت مخالف گروہ فعال ہیں۔امریکی سفارتخانہ والوں کے اہل خانہ کوافغنستان میں رہائش کی اجازت نہیں ہوگی۔''

سارے امدادی کارکن سامان سمیٹ چکے ہیں۔گیارہ چینی اور پانچ فرانسیسی MSF کے کارکنوں کاقتل' تحفظ کی گرتی ہوئی صورت حال کے آئینہ دار ہیں۔پچھلے ہفتہ جولائی ۲۰۰۴ء میں واپس آنے والی برطانوی ایوان نمائندگان کی کثیر جماعتی کمیٹی نے تحفظ کی صورت حال کو خطرناک قراردیا۔ اور کہا کہ اگر موجودہ امداد جلد مہیا نہ کی گئی توافغانستان میں نتائج خطرناک ہوسکتے ہیں۔

افغانستان میں خودمختار اقتدار کا کوئی واضح نشان نہیں ہے۔۲۱ فروری ۲۰۰۱ء کی رپورٹ میں رائٹرز نے خبردار کیا کہ طالبان کے امریکی فوجوں کے ہاتھ سقوط کے تین

سال بعد بھی اگر عوامی مشکلات رفع نہ کی گئیں تو افغانستان افراتفری میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ملک میں متوقع شرح زندگی دنیا میں بدترین ہے۔خواتین کی حالت' بچوں کی حالت اور شرح تعلیم اقوام متحدہ کے مطابق بدترین ہے۔اگر لوگوں کی پریشانیاں مثلاً بے روزگاری، صحت، تعلیم اور سیاسی جماعتوں کے نظام درست نہ کیے گئے تو اس کمزور قوم میں پھر افراتفری کی کیفیت ہوگی۔اقوام متحدہ نے مزید بتایا، اگر ایسا ہوا تو افغانستان ایک بے تحفظ ملک ہوگا نہ صرف اپنے عوام بلکہ بین الاقوامی برداری کے لیے خطرہ۔

خواتین اور بچوں کی حالت بے حد خراب ہے۔پانچ میں سے ایک بچہ پانچ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے مرجاتا ہے۔زچگی سے متعلق امراض کی وجہ سے ہر تیس منٹ میں ایک عورت ہلاک ہوجاتی ہے۔افغانستان کرزئی کے دوبارہ انتخاب کے ایک سال اور طالبان کے سقوط کے چار سال بعد بھی مسلسل تباہی اور ذلت کے گڑھے میں گرتا جارہا ہے۔

دو میں سے ایک افغان غربت کی تعریف میں آتا ہے اور غریب ترین تیس فیصد لوگوں کو آمدنی کا صرف ۹ فیصد ملا۔ایک دفعہ سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ نے عراق پر حملہ کا یہ جواز پیش کیا تھا کہ امریکی فوجی کارروائی کے بعد جو آزادی اور بہتری افغانیوں کو ملی ہے عراق میں بھی لائی جاسکتی ہے۔اور تقریباً ایک سال پہلے انھوں نے بڑھک ماری کہ افغانستان میں بڑی جنگ ختم ہوچکی ہے اور اب تعمیرنو کا دور شروع ہوگیا ہے۔۴رجون کو بش کے اعلان کے بعد کہ افغانستان دہشت گردی کی جنگ میں پہلی فتح ہے۔افغانستان کی یہ دردناک حالت ہے۔

ایسی فتح جو افغانستان کے عوام کے لیے ایسی مصیبتیں اور ابتلا لے کر آئی ہے۔
جاری ابتلا اور مصیبتوں کا اندازہ ۲مئی ۲۰۰۵ء کو جاری کردہ حکومت پاکستان کی مردم شماری رپورٹ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۳۷۵ء۲ملین افغان پناہ گزیں جو پاکستان کے کیمپوں میں سڑ رہے ہیں ان میں سے اسی (۸۰) فیصد عدم تحفظ' بے روزگاری اور شیلٹر نہ ملنے کی وجہ سے واپس جانا نہیں چاہتے۔

باب : ۴

مجسمہ آزادی۔ ریاستہائے متحدہ نے تجھے کیا بنا دیا

مجسمہ آزادی: تصور اور حقیقت

۱۷۷۶ء کے امریکہ کے اعلان آزادی کی قابل احترام یادگار مجسمہ آزادی فرانس کی طرف سے تحفہ تھا۔ جس پر لکھا ہوا پیغام مساوات، آزادی اور بھائی چارہ امریکی اقدار کی علامت کے طور پر تحریر کیا گیا تھا۔ اس پر نصب تختیوں پر دوسری باتوں کے علاوہ یہ اعلان لکھا ہے کہ جو مشعل اس مجسمہ نے اٹھا رکھی ہے اس کا شعلہ سچائی' انصاف اور روشن خیال انسان کی نمائندگی کرتا ہے۔

سچ کی اس سے زیادہ مسخ شدہ شکل کیا ہوگی کہ اپنی بنیادی ریاست برطانیہ کے خلاف' جس نے اسے وجود میں لانے اور ترقی دینے کے لیے کیا کچھ کیا تھا مسلح بغاوت کو تو جنگ آزادی کا نام دیا جائے لیکن فلسطین، کشمیر، چیچنیا کے لوگ جب غیر ملکی تسلط اور جبر کے خلاف اسلحہ اٹھائیں تو دہشت گرد کہلائیں۔

یہ کیسا کج رو انصاف ہے کہ ریاستہائے متحدہ شمالی کوریا کے ساتھ جوہری تنازعہ پُر امن طریقہ سے حل کرنا چاہتا ہے حالانکہ اس نے اپنا جوہری ہتھیاروں کا پروگرام دوبارہ شروع کیا، اقوام متحدہ کے معائنہ کاروں کو بے دخل کر دیا، جوہری ہتھیاروں کے معاہدہ سے بھی الگ ہو گیا اور ساتھ ہی یہ اعلان کیا کہ اگر اس پر حملہ ہوا تو ریاستہائے متحدہ کے مغربی ساحلوں پر جوہری حملہ کرے گا اور اخیر میں اقوام متحدہ کو خبردار کیا کہ اگر

اس نے نہایت بے شرمی سے سیکیورٹی کونسل کی قرارداد نمبر ۱۴۴۱ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عراق پر حملہ کر دیا۔ جبکہ چار سال کے قبضہ کے بعد بھی کوئی کثیر تباہی کا ہتھیار برآمد نہ کر سکا جبکہ عراق نے بار بار اس بات کی تردید کی تھی کہ اس کے پاس کوئی ایسے ہتھیار ہیں۔ اور ساتھ ہی اقوام متحدہ کی طرف سے اسلحہ کے سخت ترین معائنہ کے عمل سے تعاون کر رہا تھا۔ ۶/ مارچ ۲۰۰۳ء کو اعلیٰ معائنہ کار نے اپنے حتمی اعلان میں بتا دیا تھا کہ عراق کی طرف سے معائنہ کاروں سے تعاون میں اضافہ ہوا ہے۔ یہاں تک کہ ریاستہائے متحدہ کی جارحیت کا خطرہ سر پر ہونے کے باوجود ان کی درخواست پر الصمد میزائیلوں کو تباہ کر دیا گیا۔

اس دھوکہ بازی اور دہرے معیار کی وجہ جو صدر بش نے بیان کی یہ ہے کہ پچاس سالوں میں شمالی کوریا نے عراق کی طرح کوئی جارحانہ اقدام نہیں اٹھائے ہیں حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ اگر شمالی کوریا اس قدر پرامن عزائم کا مالک ہے تو پھر جنوبی کوریا اور جاپان میں ریاستہائے متحدہ کی افواج اتنی بڑی تعداد میں تعینات رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور سب سے بڑھ کر پھر شمالی کوریا کو ایران اور عراق کے ساتھ ''بدی کی مثلث'' کا حصہ کیوں کہا گیا۔

اس دھوکہ بازی کی حقیقی وجہ جو جنوبی کوریا کے سابق امریکی سفیر نے بیان کی اور جن کی Fletcher School of Diplomacy کے سربراہ نے توثیق کی ہے کہ ریاستہائے متحدہ کے پاس شمالی کوریا میں کوئی دوسرا ترجیحی فوجی طریقہ نہیں ہے کیونکہ فوجی مہم جوئی کی صورت میں اس ملک میں جو خطرات ہیں ان کی سطح بہت اونچی ہے' یہ حقیقت ہے جو ریاستہائے متحدہ کے اصل ارادوں کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ چند سال پہلے ایک امریکی فوجی تجزیہ کار نے اندازہ لگایا تھا کہ شمالی کوریا کے خلاف جنگ کی صورت میں ایک ملین افراد کی ہلاکت ہوگی جس میں ایک لاکھ اسی ہزار (1,80,000) امریکی شامل ہوں گے۔ یہ ممکنہ اعداد و شمار ویت نام میں ہونے والی امریکی ہلاکتوں سے دگنے ہیں۔

مجسمہ آزادی کی ایک اور تختی اعلان کرتی ہے کہ مجسمہ آزادی کے تاج سے ابھرنے والی سات لہریں سات سمندروں اور سات براعظموں کی علامت ہیں۔اس طرح ریاستہائے متحدہ عالمی بھائی چارہ اورانسانیت کی خدمت کاذمہ دار ہے جنھیں افسوس!امریکہ کی سخت گیر یک طرفیت اور جارحانہ پیش بندجنگوں نے پاش پاش کردیا ہے،اورجس کی سب سے نمایاں مثال ساری دنیا کی مخالفت اور احتجاج کے باوجودعراق پرحملہ اوراس پر قبضہ ہے۔صرف نیویارک میں سخت سردی اور ریاستی رکاوٹوں کے باوجود چالیس ہزار افراد سڑکوں پر جمع ہوکرعراق پرحملہ کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔اگرچہ برطانیہ اور ہسپانیہ کی حکومتیں ریاستہائے متحدہ سے تعاون کر رہی تھیں۔تقریباً ایک ملین لوگوں نے لندن اور میڈرڈ کی سڑکوں پر مظاہرے کیے۔

(۳)ایک اور تختی کہتی ہے کہ مجسمہ کے پاؤں کی کھلی زنجیریں استبداد سے نجات کی علامت ہیں۔لیکن اس جبر و استبداد کوکیا کہاجائے جوریاستہائے متحدہ خوداپنے شہریوں اورامریکہ میں مقیم غیرملکیوں پرروا رکھتا ہے‘ گوانتاناموبے میں طالبان قیدیوں اور ابوغرائب میں جنگی قیدیوں کے ساتھ بربریت پرمبنی سلوک کوکیا کہاجائے جس نے انسانیت کے ضمیرکوکچل کرر کھ دیا ہے۔اس سلوک کے جواز کے لیے پینٹاگون کی پیش کردہ وجوہ کوتفصیلی مطالعہ کے بعد سابق صدرکلنٹن کے دفاعی مشیر انھونی لیک نے یکسر مسترد کردیا۔

ریاستہائے متحدہ کے پالیسی ساز کہتے ہیں کہ ۱۱ستمبر کی دہشت گردی نے جنگ جیسی صورت حال پیداکردی جس کی وجہ سے ریاستہائے متحدہ کو قانونی اور اخلاقی حق حاصل ہوگیا ہے کہ ویسے ہی اقدام اٹھائے جیسے دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنوں اور جاپانیوں کے خلاف کیے گئے تھے کہ انھیں کیمپوں میں محبوس کردیا گیا تھا۔یہ جواز کسی طرح درست نہیں کیونکہ دوسری جنگ عظیم میں امریکہ نے جرمنی اور جاپان کے خلاف اعلان جنگ کیاتھا جبکہ اس نے عراق اور افغانستان کے خلاف ایسانہیں کیا۔مزید برآں ان جرمن اور جاپانی قیدیوں پر نہ تو مقدمہ چلایا گیا نہ تشدد کیا گیا جبکہ القاعدہ اوردوسرے

نام نہاد متحارب دشمنوں پر بربریت اور غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا۔

یہاں تک کہ ان غیر انسانی اور وحشیانہ حرکات سے دہشت زدہ ہو کر جواب تک گوانتاناموکے قیدیوں کے ساتھ کی جارہی ہیں وسط جنوری ۲۰۰۴ء میں اقوام متحدہ اس بات پر مجبور ہو گیا کہ ریاستہائے متحدہ سے گوانتاناموکے قید خانے بند کرنے کو کہے جسے ماننے سے ریاستہائے متحدہ نے پوری ڈھٹائی سے انکار کر دیا۔

۱۷ر فروری ۲۰۰۴ء کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اقوام متحدہ کے پانچ ماہرین کے تیار کردہ چون صفحات پر مبنی تحقیقاتی تجزیہ میں ریاستہائے متحدہ پر ایسے عمل کا الزام لگایا جو ''تشدد کی حد کو چھوتے ہیں''۔ اور مطالبہ کیا گیا کہ زیر حراست افراد پر یا تو غیر جانب دار مقدمہ چلایا جائے یا آزاد کیا جائے۔ ماہرین نے جو ۲۰۰۲ء سے گوانتانامو تک رسائی کی درخواست کر رہے ہیں، ریاستہائے متحدہ کی اس پیش کش کو کہ تین ماہرین نومبر میں کیمپ کا دورہ کریں، اس وقت مسترد کر دیا جب کہا گیا کہ وہ قیدیوں سے گفتگو نہیں کر سکیں گے۔

اقوام متحدہ کے ترجمان Stephane Dujarric نے کہا کہ یہ رپورٹ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن کو جس نے ان ماہرین کو تعینات کیا تھا ۱۳ مارچ کو جنیوا میں پیش کی جائے گی۔

اقوام متحدہ کے محقق برائے تشدد Manford Norak نے جو ماہرین میں سے ایک تھے جنیوا میں اخبار نویسوں کو بتایا گیا کہ گوانتاناموکے قیدیوں کو یا تو آزاد کیا جائے یا کسی عدالت کے سامنے لایا جائے۔

اس سے پہلے ۱۱ ستمبر کے بعد تقریباً بارہ ہزار غیر ملکی جو تمام مسلمان تھے بغیر کوئی وجہ بتائے پکڑ لیے گئے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے نام تک بھی نہیں بتائے گئے۔ چنانچہ کسی کو نہیں پتہ تھا کہ وہ قیدی کہاں تھے اور ان کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ یہ بات اب تک کی جنگ وامن کی تاریخ میں ایک نرالی مثال تھی۔

ریاستہائے متحدہ کے نائب وزیر خارجہ برائے مشرق وسطیٰ ولیم برنس نے اعلان

کیا کہ دہشت گردی سے لڑنے کے طریقے واشنگٹن کو الجزائر سے سیکھنا چاہییں۔ ۴ جنوری ۲۰۰۴ء کو Independent کے ایک مقالہ میں رابرٹ فسک نے الجزائر کی پولیس کی ریاستی دہشت گردی پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً ملزم کے منہ پر کپڑا باندھ کر صفائی کرنے والے مواد سے تر کر دینا تا کہ اس کا دم گھٹ جائے۔ تشدد کے دوسرے طریقے ناخن نوچنے' نازک حصوں میں تار ڈالنا اور جیسا کہ رابرٹ فسک نے چشم دید تفصیل بیان کی'' بوڑھی خاتون کی پولیس تھانہ میں آبرو ریزی اور خون سے تر خاتون کا دوسرے قیدیوں کو مزاحمت کی ہمت دلانا''۔ قومی تحفظ کے ایک افسر نے جو CIA میں تھا، بھانڈا یوں پھوڑا کہ جب قیدیوں کا سوال ہوتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ ہمارے لڑکے ان کے گردوں میں ٹھوکر مار دیتے ہوں۔ قومی تحفظ کے ایک اور افسر نے اعلان کیا کہ ملزم مریضوں کے لیے درد کا کنٹرول بہت ہی خیالی چیز ہے۔

دلیل دی جاتی ہے کہ آزاد نظریات اور آزادی کے اصولوں کو اٹھا کر پھینک دینا پڑا تا کہ ملک کی حفاظت ہو سکے اور ریاستہائے متحدہ پھر سے آزادی کا گہوارہ بن سکے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ چار سالوں سے زیادہ عرصہ تک ان سخت گیر قوانین کے عمل کے بعد کیا یہ ملک اس سے زیادہ محفوظ ہے جتنا ۱۱ ستمبر کو تھا۔ صدر بش نے کچھ زیادہ دن نہیں گزرے کہ فخریہ کہا تھا کہ اسامہ کو اس کی تنظیم سے محروم کر دیا گیا ہے اور اگر وہ زندہ بھی ہے تو اپنے دہشت گردی کے منصوبوں پر عمل نہیں کر سکتا۔ چند ہی ماہ بعد جب اسامہ کے انتباہ پر ایشیا اور افریقہ کے کئی ملکوں میں دھماکے ہوئے تو اُنھیں اپنے اعلیٰ فاتحانہ مقام سے نیچے اتر کر اعتراف کرنا پڑا: ''القاعدہ بڑھ رہی ہے اور اب تک امریکہ کے لیے خطرہ ہے یہاں تک کہ فروری ۲۰۰۳ء میں دوسرے درجہ کا تحفظاتی انتباہ یعنی نارنجی رنگ کا پورے ریاستہائے متحدہ میں اعلان کر دیا گیا اور لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ بتائے گئے اوراق اور ٹیپ سے کھڑکیوں اور دروازوں کو مہر بند کریں کیونکہ القاعدہ ریاستہائے متحدہ پر حملہ کرنے والی ہے۔ ۲۴ مئی ۲۰۰۴ء کو اخباری ایجنسی کی رپورٹ میں کہا گیا کہ واشنگٹن ایک دفعہ پھر خوف کی لہر کی لپیٹ میں آ گیا تھا کہ القاعدہ ویسا ہی حملہ کرنے والی ہے جیسا

صدارتی انتخاب کی شام میڈرڈ میں ریلوے پر ہوا تھا تاکہ انتخابات کے نتائج پر ویسا ہی اثر ڈالا جائے جیسا اسپین میں ہوا تھا۔ FBI کے ڈائریکٹر Robert Muller نے امریکی قوم کو کہا کہ آنے والے مہینوں میں ہوشیار رہیں۔ ۲۴ مئی ۲۰۰۳ء کو انتظامیہ نے لوگوں کو خاص طور پر سات مسلح اور خطرناک القاعدہ کارکنوں سے خبردار کیا جو مبینہ طور پر ریاستہائے متحدہ پر حملہ کا منصوبہ تیار کر رہے تھے۔ ایک دفعہ پھر جولائی۔ اگست ۲۰۰۴ء میں دوسرے درجہ کا انتباہ جاری کیا گیا اور واشنگٹن شہر تقریباً محصور ہو گیا۔

جیسے جیسے خطرات بڑھ رہے ہیں، سخت گیر قوانین کا ڈھیر بڑھ رہا ہے۔ مزید برآں جب ان مقدمات کو وفاقی عدالتوں میں چیلنج کیا جاتا ہے تو عدالتیں ان کو قائم رکھتی ہیں۔

۸ جنوری ۲۰۰۳ء کو وفاقی اپیل عدالت نے صدر بش کے لیے تقریباً لامحدود اختیارات منظور کیے تاکہ امریکی امریکہ سے باہر کے دشمنوں کو پکڑ سکیں اور جب تک دہشت گردی کی جنگ جاری ہے ان کو غیر معینہ مدت کے لیے محبوس رکھ سکیں۔ حامدی کو طالبان کے ساتھ نومبر ۲۰۰۱ء میں افغانستان سے پکڑا گیا تھا اور وہ آج تک قید ہے۔ نہ تو اس پر کسی جرم کا الزام ہے اور اسے بغیر کسی قانونی اختیار کے پکڑا گیا تھا۔ اپیل کی عدالت نے کہا کہ صدر کو آئین نے جو جو اختیارات دیے ہیں ان میں یہ اختیار بھی شامل ہے کہ مسلح جدوجہد میں پکڑے جانے والوں کو قید رکھیں۔

اٹارنی جنرل ایش کرافٹ نے اس فیصلہ کی توصیف کی اور کہا کہ اس سے ایسے لوگوں کو پکڑنے اور قید کرنے کے لیے صدر کے اختیارات مضبوط ہو گئے ہیں جو میدان میں ہمارے دشمنوں کے ساتھ مل کر امریکہ یا اس کے اتحادیوں سے لڑتے ہیں۔

M.Freedman جو Hofstra قانون کے اسکول کے پروفیسر ہیں اور قیدیوں کے حقوق کے ماہر ہیں نے کہا: ''ہر قانون عدلیہ کو انتظامیہ پر غیر جانبدار نگرانی کی صلاحیت سے محروم کر دے گا۔''

جیسا کہ ظاہر ہے یہ امر انتظامیہ کی صوابدید پر ہے کہ وہ غیر متعینہ مدت تک

دہشت گردی کے خلاف جنگ کو جاری رکھیں، اس لیے یہ ظالمانہ قوانین لمبے عرصہ کے لیے نافذ العمل رہیں گے کیونکہ اس جنگ کے اختتام کے موہوم امکانات بھی نظر نہیں آتے۔ مستقبل قریب میں تو ایسی کوئی امید نہیں کہ ریاستہائے متحدہ پھر سے آزادی وحریت فکر کا گہوارہ بن سکے گا۔

اگر روسو اور والٹیر اس وقت اپنی قبروں سے باہر آ کر دیکھ سکتے کہ ریاستہائے متحدہ نے فرانس کے تحفہ مجسمۂ آزادی سے ابھرنے والے پیغام کو کس طرح تہہ تیغ کیا ہے تو اول الذکر تو ریاستہائے متحدہ کی مذمت ''اعلیٰ درجے کے وحشی'' کے خطاب سے کرتا اور آخر الذکر اپنے آپ کو گوانتانامو میں قید کے لیے پیش کر دیتا۔ ایک امریکی ہوائی مسافر نے جس کے اندر والٹیئر کی روح کی کچھ رمق معلوم ہوتی ہے ہوائی اڈہ پر تلاشی کے لیے سامان چھوڑتے ہوئے اس میں ایک پیغام لکھ چھوڑا: ''اس وردی پوش کٹھ پتلی کے نام جو اس کو کھول رہا ہے۔ مبارک ہو! تم نے ابھی ایک آزاد قوم کو فسطائی ریاست بننے کی طرف ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔''

وہ عظیم فرانسیسی فنکار جس نے اس تاریخی علامت کا تصور تشکیل دیا اپنی قبر میں بے چین ہوگا۔

رچرڈ نکسن نے ''اپنے امن سے آگے'' میں یوں فیصلہ دیا ہے کہ امریکی سازوسامان میں امیر لیکن روحانی طور پر غریب ہیں اور ان کے دشمن خود ان کے اندر ہیں۔ بریزنسکی نے ''اپنے قابو سے باہر'' میں فیصلہ دیا ہے کہ ریاستہائے متحدہ کے پاس نیا عالمگیر نظام لانے کے لیے کوئی اخلاقی جواز نہیں رہا ہے۔

امریکی خارجہ پالیسی کے مبصر George Kenan نے جو سوویت یونین میں امریکہ کے سفیر بھی رہے ہیں دس سالوں سے بھی پہلے لکھا تھا: ''میرا خیال نہیں کہ پچھلے پچاس سالوں میں ریاستہائے متحدہ کی تہذیب ایک کامیاب تہذیب رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس ملک کی ناکامی مقدر ہے جو نہ صرف افسوس ناک بلکہ بہت بڑے پیمانہ پر ہوگی''۔

Jonathan Power نے اپنے مقالہ (ڈان ۲۷ ستمبر ۲۰۰۱ء) میں Kenan کی پیش گوئی کی تفصیل بیان کی ہے اور جامع طور پر بتایا ہے کہ کس طرح ریاستہائے متحدہ کی بے لگام اور بے لحاظ عسکریت کے ساتھ خودغرضانہ مفادات کے تعاقب نے اسے بتدریج ساری دنیا سے دور کردیا ہے۔اور کس طرح اس کا اپنی بے پناہ عسکری طاقت کا بے محابا مظاہرہ کرتے رہنا دوسرے ملکوں کے امن کے لیے خطرہ کی گھنٹی بن گیا ہے۔

power کہتا ہے ریاستہائے متحدہ نے نیا ہزاریہ (Millenium) دنیا کی مسلح ترین قوم کی حیثیت سے شروع کیا۔ ریاستہائے متحدہ کی طرف سے عسکری قوت کا بے پناہ استعمال اور ذاتی آزادیوں پر قدغن، ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حملہ کا کوئی مناسب جواب نہیں ہے۔ اگر اس سے کچھ ہوا ہے تو بس یہ کہ اس نے دہشت گردی کی تازہ لہروں کو مہمیز دی ہے اور ساتھ ہی اس سے امریکی طرز زندگی پر جو پچھلی نصف صدی سے زوال پذیری کی طرف مائل تھا بہت برا اثر پڑا ہے۔

سہ ماہی National Interest (Summer ۲۰۰۲ء) نے اپنے ایک مضمون میں ۱۱ ستمبر کے حملے کے بارے میں مختلف زاویہ ہائے نظر پر بحث کی ہے اور اس نظریہ کی شدت سے مخالفت کی ہے کہ یہ حملہ انسانیت اور آزاد دنیا پر حملہ تھا۔ Susan Sontag نے نیویارک میں اپنی Talk of the Town (۲۱ ستمبر ۲۰۰۱) میں قصرابیض پر غصے کا اظہار یوں کیا ہے: ''یہ تہذیبوں، حریت، انسانیت یا آزاد دنیا پر بزدلانہ حملہ نہیں تھا بلکہ بزعم خویش، سپر پاور پر تھا اور یہ خاص طور پر امریکی اتحاد کے اقدام کا ردعمل تھا۔ امریکی افسروں اور ذرائع ابلاغ کی متفقہ ریاکارانہ، خلافِ حقیقت لاف وگزاف جو پچھلے دنوں سے جاری ہے، کسی بالغ جمہوریت کو زیب نہیں دیتی۔''

نوم چومسکی کا خیال ہے کہ ۱۱ ستمبر کے حملے، سوڈان میں دواؤں کے کارخانہ پر حملہ اور دوسری کئی امریکی زیادتیوں کے آگے ماند ہیں۔ ریاستہائے متحدہ نے سوڈان، صومالیہ اور نکاراگوا میں ہزاروں بے گناہ شہریوں کو ہلاک کیا، جس کی ہلاکت خیزی ۱۱

ستمبر کے حملہ سے کہیں زیادہ تھی اور اب فاقہ زدہ ملک افغانستان کو مزید تباہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے مصری اخبار ''الاہرام'' میں لکھا کہ وہ ریاستہائے متحدہ کو ایک ایسی قاتل طاقت سمجھتے ہیں جس کی تاریخ، اقوام، ممالک یہاں تک کہ برادریوں کی تباہی سے بھری ہوئی ہے جو ہولوکاسٹ سے کم نہیں۔ ٹورونٹو کے قانون کے پروفیسر کو یقین ہے کہ امریکہ کے ساتھ ۱۱ ستمبر کو جو کچھ کیا گیا اس کا قانونی اور اخلاقی بدل افغانستان پر بمباری ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی کے Eric Foner فیصلہ نہ کر سکے کہ زیادہ ہیبت ناک کیا ہے' وہ نقصان جو نیویارک شہر کو پہنچایا وہ القائی بیانات جو روزانہ قصر ابیض سے جاری ہوتے ہیں؟ ہیمپشائر کالج کے Peace Studies and World Security Studies کے پروفیسر Michacl Klare نے ریاستہائے متحدہ کی طرف سے ۱۱ ستمبر کے جواب میں سخت فوجی کارروائی کی مذمت کی۔ انھوں نے اس خوف کا اظہار کیا امریکی کارروائی دہشت گردی اور تشدد کے ایک نئے دور کا آغاز کرے گی۔

امریکی Friends Save Committee نے کہا ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ خونریزی مزید خونریزی کو جنم دیتی ہے۔ دہشت گردوں کو ان کی بنیادی وجوہ سے روکا جانا چاہیے۔ Russel Menons نے جنھوں نے ۱۹۷۳ء کی Wounded Knee میں بغاوت کی قیادت کی تھی کہا: ''جب میں مشرقی یورپ میں نام نہاد آہنی پردہ کے پیچھے تھا تو یہ سب دیکھا کرتا تھا۔ یہ میں نکاراگوا اور کولمبیا میں دیکھتا تھا۔

یعنی ریاستہائے متحدہ کے آئین کی وفاقی حکومت کے ہاتھوں خلاف ورزی اور نجی آزادیوں سے مسلسل محرومی۔

National Interest (Summer ۲۰۰۲ء) میں ساری دنیا کے دانشوروں کے مندرجہ بالا نظریات سے ظاہر ہے کہ دہشت گردی اسلحہ کے زور پر ختم تو کیا کم بھی نہیں کی جا سکتی' اس سے صرف دہشت گردی کی آگ کو مزید ایندھن ملے گا۔

جیسا کہ George Kenan نے کہا کہ امریکی تہذیب کا زوال دراصل

نصف صدی پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ اس بات کا اندازہ اس کے قانون نافذ کرنے والے اداروں خصوصاً FBI کی بڑھتی ہوئی طاقت سے ہوتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ کی بلاوجہ عسکری مہمات جو کمزور ممالک کی آزادی اور خودمختاری کو روندتی رہی ہیں۔ کمیونزم کے خلاف جنگ اور مبینہ آمرانہ حکومتوں میں جمہوریت لانے کے نام پر ان کے بارے میں اگر کہا جائے تو کیا کہا جائے۔ ۱۱ ستمبر کے پس منظر میں ہمدردی کی جو لہر پیدا ہوئی اس کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے افغانستان پر حملہ کر دیا گیا اور پھر عراق پر، لوگوں کی آزادی کے نام پر اور پھر ان ملکوں میں قتل عام اور تباہی کا دروازہ کھول دیا گیا۔ نتیجہ مزاحمتی تحریکوں کی شکل میں نکلا جو کم ہوتی نظر نہیں آتیں حالانکہ ان کی راہ میں امریکہ کا عسکری دیو موجود ہے۔ چھٹ بھیے طالبان نے بھی دنیا کی سب سے طاقتور فوج کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا ہے۔ عراق میں شورشیں ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھ رہی ہیں۔

اگرچہ امریکی تہذیب پچھلے پچاس سالوں سے انحطاط پذیر ہے پھر بھی کچھ دن پہلے تک اس کی عسکری قوت کی وجہ سے اس کو آزادی اور جمہوریت کا عظیم گہوارہ سمجھا جاتا رہا اور عزت دی جاتی رہی۔ لیکن ۱۱ ستمبر کے بعد اس کی عسکری بالادستی کو نہایت دلیری اور کامیابی سے افغان اور عراقی للکار رہے ہیں جو بے انتہا طاقتور امریکہ کے آگے بونے ہی ہیں۔

عرصہ ہوا کہ امریکہ حریت اور مواقع میں برابری کا گہوارہ نہیں رہا۔ اگرچہ تمام قانونی اہتمام موجود ہے مگر نسلی امتیاز خصوصاً سیاہ فاموں کے خلاف ابھی بھی بہت اونچا ہے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۹۱ء کو اکانومسٹ نے لکھا: ''نسل ابھی تک امریکہ کا سب سے بڑا داخلی مسئلہ ہے''۔ اور جیسا کہ ہفتہ وار نے بیان کیا: ''عام سیاہ فام کے لیے زیادہ ممکن ہے کہ وہ جیل جائے گا اور یونیورسٹی نہیں۔ زندگی کی توقع کم ہوتی جا رہی ہے اور اس کا خطرہ سات گنا زیادہ ہے کہ وہ کسی گورے لڑکے کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ پندرہ سے پچیس سالہ سیاہ فام کے لیے مارے جانے کا خطرہ ویت نام میں امریکی فوجی سے زیادہ ہے۔ سیاہ فاموں کی اوسط آمدنی کا تناسب گوروں کی نسبت چھپن فیصد ہے''۔

حال ہی میں ۱۵ جولائی ۲۰۰۱ء کو شائع شدہ ہارورڈ یونیورسٹی کے مطالعہ میں کہا گیا ہے کہ ماضی کے دس سالوں میں نسلی اور فرقہ وارانہ افتراق (پبلک اسکولوں میں) بڑھتا رہا۔ سیاہ فام اور لاطینی امریکی طلباء غربت زدہ اندرونی شہروں میں جمع ہوتے رہے اور سفید فام دولتمند مضافاتی محلوں میں الگ تھلگ اور ایسا اعلیٰ ترین عدالت کے اس فیصلہ کے دس سال بعد بھی موجود ہے، جس کے مطابق اسکولوں میں افتراق غیر آئینی قرار دیا گیا تھا۔

قومی تحفظ کی دستاویز (۱۹۵۰ء) کے ایک حصہ میں حیران کن باتیں ہیں---

"ہمیں ہر قسم کی جذباتیت اور خوش فہمیوں سے باہر نکل کر اپنی ساری توجہ ہر موقع پر فوری قومی مقاصد پر رکھنی چاہیے۔ ہمیں انسانی حقوق جیسے مبہم اور غیر حقیقی مقاصد، معیارِ زندگی بلند کرنے اور اونچ نیچ دور کرنے کی باتیں ترک کر دینی چاہئیں۔

مندرجہ بالا دستاویز، ان تمام اعلیٰ تصورات کی جو اعلان آزادی میں لکھے ہوئے ہیں جو کہتی ہے کہ سارے انسان برابر پیدا ہوئے ہیں اور اپنے رب کی طرف سے بے بدل حقوق لے کر آئے ہیں جن میں سب سے اہم زندگی، آزادی اور حصول مسرت ہے کی نہایت ڈھیٹ انداز میں نفی کرتی ہے۔

امریکہ کی قومی تحفظ کی دستاویز خود اعلان آزادی کو الٹ دیتی ہے، ایک کے بعد ایک حقوق آزادی، مساوات بلکہ حق زندگی اور حصول مسرت کی بھی نفی کر کے بلکہ معیارِ زندگی بلند کرنے اور اونچ نیچ دور کرنے کے قومی مقاصد سے بھی انکار کر کے دوسری جنگ عظیم کے بعد ہی جب ریاستہائے متحدہ فسطائیت پر فتح کا پرچم اڑاتا بے مثال قوت کی حیثیت سے ابھرا۔ George Kennan نے جو صدر ٹرومین کے پالیسی منصوبہ بندی کے عملہ کے چیف تھے، امریکہ کی خارجہ پالیسوں پر اختلافی نوٹ لے کر آئے ہیں جن میں آزادی اور جمہوریت کے ترانے گائے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی افسر شاہی کو اکسایا کہ انسانی حقوق، معیارِ زندگی بلند کرنے اور جمہوریت پر عمل جیسے غیر حقیقی مقاصد کے بارے میں احمقانہ گفتگو بند کریں۔ وہ دن دور نہیں جب ہمیں براہ راست طاقت

کے نظریات پر عمل کرنا پڑے گا۔ ہم تصوراتی نعروں کی رکاوٹوں سے جتنی دور رہیں بہتر ہے۔ ٹرومین کا نظریہ Kennan کے خیالات کے بر خلاف جمہوریت اور کم ترقی یافتہ اور جنگ سے تباہ ملکوں کے لیے بہتر معیارِ حیات کو امریکی خارجہ پالیسی میں اشتراکیت سے جنگ کے اوزار کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ۱۹۵۰ء کی امریکی حفاظتی دستاویز امریکی داخلی اور خارجہ پالیسیوں پر Kennan کی تجاویز کی بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ طاقت کو حتمی ثالث سمجھنا ہمیشہ سے امریکی ریاستی پالیسی کا بنیادی پتھر رہا ہے جبکہ آزادی اور جمہوریت اس کا اوپری لبادہ ہیں۔

نسلی امتیاز کے خلاف آئینی اہتمام کے عرصہ بعد، جب ریاستہائے متحدہ کو اقوام متحدہ کی نسلی امتیاز پر ڈربن کانفرنس میں غلامی اور غلاموں کی تجارت پر زرتلافی کی ادائیگی کے مطالبہ کا سامنا ہوا تو بجائے اس مطالبہ کا سامنا کرنے کے وہ غصہ میں کانفرنس سے اٹھ گیا۔ اندازہ ہے کہ دوملین سے زیادہ افریقی سیاہ فام غلاموں کی تجارت امریکہ کے ساتھ ہوئی تھی جنھیں برائے نام قیمت پر خریدا جاتا تھا اور افریقہ سے زنجیروں میں جکڑ کر لایا جاتا تھا۔ اس طرح ریاستہائے متحدہ نے اپنا ترقی اور خوش حالی کا قلعہ افریقہ سے لائے ہوئے سیاہ فاموں کے خون اور پسینہ سے تعمیر کیا جن کے خون کا ایک ایک قطرہ کوڑوں سے کھینچا گیا ان کے لیے تعلیم کا حصول قانوناً ناجائز تھا۔

اقوام متحدہ کی عالمی انسانی حقوق کی کانفرنس میں جو جون ۱۹۹۳ء میں ویانا میں منعقد ہوئی تھی، سابق صدر جمی کارٹر نے ایک چشم کشا بیان دیا تھا۔ ۱۴ جون ۱۹۹۳ء کو ایک اخباری انٹرویو میں انھوں نے کہا: ''امریکہ دو ہیں ایک دولت مند ایک فقیر''۔ اٹلانٹا دو ہیں، واشنگٹن دو ہیں، نیویارک دو ہیں شکاگو دو ہیں اور اسی طرح سے ایک خاصا خوش حال اور دوسرا بدحال، جہاں جرائم، غربت، بے گھری، بے روزگاری عروج پر ہیں۔

امریکی عدلیہ وقفہ وقفہ سے خاص طور پر قومی ہنگامی حالتوں کے دوران کانگریس کے منظور شدہ سخت گیر قوانین اور ان پر عمل درآمد میں افسر شاہی زیادتیوں کی تائید کر کے جو امریکی دستور کی خلاف ورزی ہیں عوام کے حقوقِ زندگی، آزادی اور حصولِ مسرت

پر مہلک وار کرتی ہے۔

اگست ۱۹۹۲ء میں Frank Wilkinson لاس اینجلس ہاؤسنگ اتھارٹی کے ماہر کی حیثیت سے گواہی دے رہے تھے۔ اتھارٹی کی خواہش تھی کہ پسماندہ آبادی کو ہٹا کر گھر بنائے جائیں، ولکنسن اتھارٹی کے عملہ میں دس سال سے شامل تھے اور عوامی سکونت کے لیے رہائش کی تعمیر میں نسلی انضمام کا خیال رکھا جائے کے اصول پر عمل پیرا تھے۔ سماجی انصاف کے لیے ان کی حمایت پہلے ہی انھیں FBI کی نظر میں لا چکی تھی جس نے خفیہ طور پر تحقیقات شروع کر دی تھیں اور کوشش تھی کہ ان کا رشتہ کمیونسٹ پارٹی سے جوڑا جا سکے۔ جب ولکنسن اپنی گواہی مکمل کر چکے تو جرح میں ان سے کہا گیا کہ وہ ادارہ کو سیاسی اور تمام تر معاملات کے بارے میں بتائیں جن میں وہ شریک رہے ہیں۔ ولکنسن نے پہلی ترمیم کے تحت اپنا حق استعمال کرتے ہوئے جواب دینے سے انکار کر دیا۔ اعلیٰ علاقائی عدالت نے ان کو شہادت کے لیے نااہل قرار دے کر ان کی شہادت کو منسوخ کر دیا۔ ولکنسن علاقائی کام اور آئین کے دفاع میں قانونی کوششیں کرتے رہے۔ FBI نے ان کی پہلی ترمیم سے متعلق ان کی مصروفیات کی تحقیقات، تنگ کرنا اور رکاوٹیں ڈالنا جاری رکھا۔ ولکنسن تیس سالوں تک زیر نگرانی رہے۔ جس میں وفاقی جیل کی ایک سیر بھی شامل تھی۔

FBI نے کئی ملین ڈالر کے خرچ سے ایک لاکھ تیس ہزار (1,30,000) صفحات کی تفصیلی رپورٹ ان کے اور ان کے دوستوں کے متعلق تیار کی۔ اس کے اخیر میں FBI نے جو کچھ کہا وہ صرف اتنا تھا کہ ولکنسن اور جو جماعت انھوں نے بنائی تھی وہ کسی غیر قانونی کام میں ملوث نہ تھی۔

۲۲ اپریل ۱۹۲۰ء کو ہزاروں لوگ پہلی دفعہ یوم کرۂ ارض منانے واشنگٹن DC مال پر جمع ہوئے تھے۔ ان ریلیوں میں جنھیں ماحولیاتی تحریک کی ابتدا کہا گیا پورے ملک میں ملین امریکیوں نے حصہ لیا۔ FBI نے چالیس شہروں میں اپنے اہل کاروں سے کہا کہ وہ یوم کرۂ ارض کی تقریبات منعقد کرنے والوں پر نظر رکھیں۔ ان کی رپورٹوں میں ان تمام

گروہوں اور افراد کی نشان دہی کی گئی جو تقریبات کی منصوبہ بندی میں شریک تھے۔ انھوں نے ماحولیاتی کارروائیوں کا تعلق ان تنظیموں سے جوڑنا شروع کیا جنھیں FBI نے مخبری، نگرانی اور انتشار کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ اپنی کوششوں کی انتہا پر FBI تمام احتجاجی تحریکوں کے بارے میں شہری حقوق، جنگ ویت نام کے خلاف احتجاجات یا آزادی نسواں کی حامی تحریکوں کے بارے میں تحقیقات کر رہی تھی۔ FBI کی معمول کی ٹیکنالوجی میں گھروں اور دفتروں میں جاسوسی آلات لگانا، ٹیلیفون ٹیپ کرنا، دراندازی اور مخبری، سب شامل ہیں' مزید برآں FBI نے آپس میں لڑوانے کے لیے غلط اطلاعات پھیلائیں اور غیر قانونی حرکات بھی کیں۔ ان کوششوں میں بے تحاشا وسائل خرچ ہوئے اور حکومت کی پالیسیوں میں پُر امن تبدیلی کے خواہش مندوں میں خوف اور بے اطمینانی پھیل گئی لیکن مجرمانہ کارروائی کی کوئی شہادت مہیا نہ ہو سکی۔

FBI نے ایک ہزار تین سو تیس (1330) جماعتوں کی سیاسی کارروائیوں کے بارے میں اطلاعات فراہم کیں جو وسطی امریکہ میں امریکی پالیسی کے مخالف تھے لیکن ان کو دہشت گردی کی حمایت کی کوئی شہادت نہ مل سکی۔

قادر موسیٰ حامدی ۱۹۲۱ء میں ہجرت کر کے ریاستہائے متحدہ آیا تھا اور نفسیات میں بیچلر ڈگری حاصل کی اور MBA کیا۔ وہ فلسطینی تحریکوں میں شامل ہوا۔

تین سال کی تحقیقات کے بعد FBI کو کسی قسم کی مجرمانہ حرکات کی کوئی شہادت نہ ملی نہ حامدی کے خلاف نہ لاس اینجلس میں PFLP کے کسی مبینہ رکن کے خلاف۔ لیکن پھر بھی FBI نے تارکین وطن اور شہریت کے محکمہ کو ہدایت کی کہ حامدی اور کئی دوسروں کو ان کی سیاسی کارروائیاں روکنے کی خاطر ملک بدر کر دیں۔ INS نے لاس اینجلس کے آٹھوں افراد کو گرفتار رکھنا چاہا لیکن کوئی شہادت نہ ہونے کی بنا پر تارکین سے متعلق جج نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور انھیں رہا کر دیا۔ وفاقی عدالت نے ملک بدری کو روک دیا اور حکومت سے درخواست کو احساس جرم پر مبنی قرار دیا، لیکن محکمہ انصاف نے اعلیٰ عدالت سے درخواست کی جس نے فیصلہ کیا کہ غیر ملکیوں کو چن کر ان کی قانونی

سیاسی کارروائیوں کی بنا پر بھی ملک بدر کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ ایرک مارگولس نے بیان کیا (ڈان نومبر ۲۰۰۳ء یا اس کے قریب ہی) ۱۹۸۳ء میں کسی وقت شمالی ورجینیا میں امریکی وفاقی عدالت، جو سوویت انداز کی عدالت ہے جس میں وفاق اب دہشت گردی کے مقدمے چلاتی ہے، ولسن کو لیبیا کے ہاتھ بائیس ٹن آتش گیر مواد فروخت کرنے پر دس سال کی سزا دی تھی۔ اس کو اقدام قتل کے ایک موہوم سے الزام میں بھی ملوث کیا گیا اور مزید پندرہ سالوں کی سزا دی گئی۔ اب ولسن (نومبر ۲۰۰۳ء) پچھتر سال کا ہے اور بیس سال کی انتہائی سزا کاٹ چکا ہے۔ اس نے ایک بیان کنندہ سے جو اس سے جیل میں ملا تھا کہا: ''مجھے حکومت نے پھانسا تھا' ان کی خواہش مجھے غائب کر دینے کی تھی کیونکہ میں بہت زیادہ جانتا ہوں''۔

ولسن CIA کا ایک سابق افسر تھا۔ نومبر ۲۰۰۲ء کے آخری ہفتہ میں وفاقی جج ہیوسٹن (Texas) کے Lyman Houston نے ولسن کی دو دہائیاں پہلے کی سزا کو باہر پھینک دیا۔ اس خاتون نے لکھا کہ حکومت نے جان بوجھ کر اس کے خلاف جھوٹی شہادت استعمال کی۔ ولسن تربیت یافتہ تجربہ کار ایجنٹ تھا اور اپنا کاروبار کر رہا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے اواخر میں CIA نے ولسن اور Terpil کو خفیہ طور پر قذافی حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے لیبیا بھیجا تھا۔ واشنگٹن کا منصوبہ یہ تھا کہ اس شعلہ بیاں قائد کو شمالی افریقہ اپنے مرد آہن کے طور پر استعمال کرے، جس طرح CIA کے اثاثہ انور سادات کو مصر میں عرصہ سے استعمال کیا جاتا تھا۔ ولسن نے لیبیا کے ہاتھ C4 آتش گیر مادہ فروخت کیا اور سابق Green Berets کو لیبیا میں کمانڈوز کو تربیت دینے کے لیے بھیجا۔ لیکن نئی ریگن حکومت نے قذافی کو دنیا کا نمایاں دہشت گرد اور امریکہ کے لیے خطرہ تصور کرتے ہوئے اس منصوبہ سے ہاتھ کھینچ لیا۔ CIA سے کہا گیا کہ قذافی کا تختہ الٹوا دے اور اس طرح یہ ایجنسی عجیب شرمندہ کن مخمصہ سے دوچار ہوگئی۔

جیسے ہی قذافی کے لیے امریکہ کی پشت پناہی کا راز باہر پھیلنے لگا ولسن اور ٹرپل (Terpil) بے سہارا ہوگئے اور انھیں مفرور مجرم قرار دے دیا گیا۔ وہ مشرق وسطیٰ فرار

ہو گئے۔

۱۹۸۲ء میں انھیں امریکی ایجنٹ کسی بہانہ ڈومینکن ریپبلک لے گئے اور وہاں سے اغوا کر کے ریاستہائے متحدہ لے گئے اور ان پر اسلحہ کی ناجائز تجارت کا الزام لگایا گیا۔مقدمہ کے دوران ولسن اس بات پر قائم رہا کہ وہ CIA کے لیے کام کر رہا تھا۔''تحفظاتی وجوہ'' (Security Reasion) کی بنا پر اسے جرح کی اجازت نہیں دی گئی۔

CIA کے ایک افسر نے جو تیسرے اعلیٰ عہدہ پر تھا،محکمہ انصاف کے اس بیان کو سچ ثابت کرنے کے لیے کہ ایجنسی کو ولسن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا ایک جھوٹا حلف نامہ پیش کیا۔ایک اکاؤنٹنٹ ED.G کو جو ایران میں پیدا ہوا تھا اور جسے جاسوسی کا کوئی تجربہ نہ تھا CIA نے ایران بھیجا کہ وہ موجودہ حکومت کی جگہ لینے کے لیے ایک حکومتی تنظیم تیار کرے تا کہ اسلامی انقلاب کو ختم کیا جا سکے۔تین سال تک ناتجربہ کارانہ جاسوسی کے بعد Ed.G کا راز کھل گیا اور وہ جان لے کر بھاگا۔ریاستہائے متحدہ پہنچنے کے بعد اس نے اپنے CIA کے ناظم کو فون کیا تو اسے جواب ملا'': یہاں اس نام کا کوئی شخص نہیں تھا،ہمارے پاس تمھارا کوئی ریکارڈ نہیں ہے''اور اس طرح اسے بھیڑیوں کے آگے پھینک دیا گیا۔Ed.G کو دوستوں سے مانگ کر گزارا کرنا پڑا۔

CIA اور FBI کے اندرونی نظام کی ان خفیہ مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ جب CIA اور FBI کے مفادات کا معاملہ ہوتا ہے تو ریاستہائے متحدہ میں جس آزادی اور جمہوریت کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں ان ہی کے پرخچے اڑا دیے جاتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ امریکی عدلیہ بشمول عدالت عالیہ (Supreme Court) اکثر ان قانون نافذ کرنے والے اور خفیہ اداروں کے ہاتھ میں کھیلتی رہی ہے۔ جبکہ آزادی اور جمہوریت کا ریکارڈ خود ریاستہائے متحدہ میں اس قدر افسوس ناک رہا ہے تو یہ ملک اس قابل کیسے سمجھا جا سکتا ہے کہ دوسرے ملکوں کو آزادی اور جمہوریت کا سبق دے اور اسلحہ کے زور پر عمل کروائے۔ جب صدر بش افغانستان اور عراق کے

لوگوں کی آزادی کو ان ملکوں پر اپنے حملوں کے جواز کے طور پر تسلیم کروانا چاہتے ہیں تو وہ کس قدر غلط بیان (جھوٹے) نظر آتے ہیں۔

یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ آزادی کے نام پر افغانستان اور عراق پر حملوں کے بعد ریاستہائے متحدہ نے ان دونوں باتوں پر ۱۱ستمبر کے بعد کے دور میں کیسی الٹی قلابازی کھائی ہے۔ ۱۱ستمبر کے حملوں کے فوراً بعد محکمہ انصاف نے سینکڑوں تارکین وطن پر جو زیادہ تر بے گناہ تھے بغیر کسی شہادت سخت گیری شروع کردی۔ حالانکہ ان کے بارے میں کسی ایسی شہادت کا شائبہ بھی نہ تھا کہ وہ ان حملوں میں کسی طرح بھی ملوث ہوں۔

Glenn A.Fine نے جو محکمہ انصاف کے انسپکٹر جنرل ہیں تارکین وطن کے خلاف کارروائیوں کا ریکارڈ دیکھنے کے بعد سینکڑوں تارکین وطن کی ناجائز اور غیر قانونی گرفتاریوں پر سخت اعتراض کیا۔ سات سو پچاس (۷۵۰) سے زیادہ غیر ملکیوں کو جنھوں نے مبینہ طور پر تارکین وطن سے متعلق قانون کی خلاف ورزی کی تھی گرفتار کرلیا گیا۔ یہ گرفتاریاں اور قید FBI کی تحقیقات سے متعلق تھیں جن کو Pemttleom کا نام دیا گیا تھا۔ انسپکٹر جنرل کا بیان ہے:

''یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ محکمہ کو دہشت گردی کا مقابلہ کرنے میں دشوار صورت حال کا سامنا ہے، ۱۱ستمبر کے قیدیوں سے جو سلوک کیا گیا اس میں کئی مسائل نظر آئے۔ INS نے مقررہ وقت میں گرفتار اور قیدی افراد کے خلاف الزامات کی شقوں سے مطلع نہیں کیا۔ اس تاخیر سے ان قیدیوں پر کئی طرح کے اثرات پڑے۔ نہ تو وہ یہ بات سمجھ سکتے تھے کہ انھیں کیوں پکڑا گیا ہے نہ وہ اس قابل تھے کہ قانونی وکیل حاصل کرسکیں نہ ہی وہ ضمانت کے لیے سماعت کی درخواست کرسکتے تھے۔''

''جہاں تک بدسلوکی کا الزام ہے، تو شہادتوں سے جسمانی اور زبانی بدسلوکی کی ایک ترتیب کا پتہ چلتا ہے جو MDC میں کچھ تادیبی افسران نے ۱۱ستمبر کی قید کے لوگوں پر روا رکھی۔ خاص طور پر حملوں کے بعد شروع کے مہینوں میں۔ اگرچہ تادیبی افسروں کی اکثریت نے جسمانی اور زبانی بدسلوکی سے انکار کردیا لیکن خاص شکایتوں کے بارے

میں ہماری گفتگو اور تحقیقات میں یہ شہادت ابھر کر آئی ہے کہ بدسلوکیاں ہوئی تھیں۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ خاص طور پر MDC کے مراکز میں قید کی بعض صورتیں بے جا طور پر سخت تھیں مثلاً قیدیوں کی کوٹھڑیوں کو چوبیس گھنٹہ روشن رکھنا۔''

افغان جنگ کے دوران ہتھیار ڈالنے والے طالبان کو کنٹینروں میں بھر کر لے جایا گیا جس کے نتیجہ میں اموات واقع ہوئیں۔ قلعہ جھنگی کے قیدیوں سے غیر انسانی اور وحشیانہ سلوک ہوا، اور بڑی تعداد کو قتل کر دیا گیا۔ جب اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن کی صدر نے غیر جانب دار تحقیقات کا مطالبہ کیا تو ان کی درخواست حقارت کے ساتھ رد کر دی گئی اور ریاستہائے متحدہ نے پوری ڈھٹائی کے ساتھ نہایت بھونڈے طریقے سے ان کو صدارت سے معزول کروانے کی کارروائیاں کیں۔

افغانستان سے قیدیوں کو بڑی تعداد میں گوانتاناموبے نہایت غیر انسانی اور شرمناک انداز میں لے جایا گیا۔ ''میں اپنے آپ کو مارنے کی کوشش کر رہا تھا'' یہ ایک بیس سالہ پاکستانی تھا جسے شمالی افغانستان سے پکڑ کر امریکی سپاہیوں کے حوالے کیا گیا تھا اور جنوری ۲۰۰۲ء میں گوانتاناموبے پہنچا دیا گیا تھا۔ اس نے مزید کہا: ''میں زندگی سے اس قدر بیزار تھا کہ چار دفعہ خودکشی کی کوشش کی' خودکشی کرنا اسلام کے خلاف ہے، لیکن وہاں رہنا بہت مشکل تھا۔ بہت سے لوگوں نے ایسا کیا' میں بے گناہ تھا اور وہ مجھ سے مجرموں جیسا سلوک کرتے تھے۔'' ان قید خانوں کے قیام کے اٹھارہ مہینوں میں اٹھارہ افراد نے اٹھائیس دفعہ خودکشی کی کوششیں کیں۔ یہ قیدی چالیس سے زیادہ ممالک کے تھے۔ گوانتاناموبے میں حالات اور قیدیوں کی مبہم حیثیت کے بارے میں انسانی حقوق کی تنظیم نے تشویش کا اظہار کیا ہے۔

امریکی فوج نے ان کے ساتھ جنگی قیدیوں جیسے سلوک سے انکار کر دیا ہے اگرچہ ان میں زیادہ تر میدان جنگ میں گرفتار ہوئے، اور انھیں وکیلوں تک رسائی کی بھی اجازت نہیں۔ ۲۰۰۳ء کے اواخر تک کسی ایک پر بھی کوئی الزام نہیں لگایا گیا۔ ان میں سے کچھ تو اٹھارہ مہینوں سے قید ہیں بغیر کسی مقدمہ یا قانونی حیثیت کے۔ اس طویل قید سے

فکر مند ہو کر بین الاقوامی صلیب احمر کمیٹی کے صدر نے جو قیدیوں سے ملنے جاتی ہے، بش انتظامیہ سے کہا کہ سینکڑوں قیدیوں کے لیے قانونی کارروائیاں شروع کرے اور ساتھ ہی قید کے حالات بہتر کرے۔ کیمپ کے ماہر نفسیات Brian Grady نے ایک حالیہ انٹرویو میں کہا کہ زیادہ تر قیدی اپنی کیفیات ساتھ لے کر آئے ہیں۔ ''مجھے پتہ نہیں کہ ان پر اس قید کے کیا اثرات ہیں، میں کوئی رائے دینے میں جھجکتا ہوں''۔ لیکن ریاستہائے متحدہ کے انسانی حقوق کی نگرانی کے پروگرام ڈائریکٹر Jamie Fuller نے ایک انٹرویو میں کہا: ''طویل عرصہ تک قید کے موجودہ حالات خود ہی بے حد نفسیاتی دباؤ کا باعث ہیں اور اس میں مستقبل کے متعلق بے یقینی کو بھی شامل کر لیجیے۔''

ان لوگوں کو میدان جنگ میں پکڑا گیا ہے اس لیے ایسی کوئی وجہ نہیں کہ انھیں جنگی قیدی نہ سمجھا جائے۔ خصوصاً جبکہ انھوں نے افغانستان کے دفاع کی جنگ لڑی اور وہیں گرفتار ہوئے جہاں وہ دو ماہ قید رہے اور پھر امریکیوں کے حوالے کیے گئے جو انھیں کیوبا لے گئے۔ ان پر مقدمہ اگر چلایا جائے تو افغانی عدالتوں میں افغان قوانین کے تحت چلایا جانا چاہیے۔ سابق صدر کلنٹن کے حفاظتی مشیر Anthony Lake نے ریاستہائے متحدہ کے تمام دلائل کا جائزہ لیا اور ان قیدیوں سے جنگی قیدیوں کا سلوک کرنے کے ان تمام دلائل کو ایک کے بعد ایک مسترد کر دیا کہ یہ قابل غور نہیں ہیں کیونکہ جنیوا کنونشن کے تحت اگر دشمنوں کی قانونی حیثیت مشکوک ہو تو اس کا فیصلہ ایک قابل عدالت قیدیوں کو سماعت کی سہولت دینے کے بعد ہی کر سکتی ہے۔

قید سے چھوٹنے والے پاکستانی قیدیوں میں سے ایک جناب محمد نے کہا کہ پہلے تو انھوں نے اس لیے خودکشی کی کوشش کی تھی کہ انھیں مہینوں عربوں کے درمیان رکھا گیا تھا جبکہ وہ عربی نہیں بول سکتے تھے۔ اتنے دن تک کسی سے بات کیے بغیر رہنا بہت مشکل تھا۔ ڈاکٹر اکثر انھیں مسکّن دوائیں دیتے تھے، لیکن انھوں نے گولیاں کھانا چھوڑ دیں اور ایک دفعہ پھر خودکشی کی کوشش کی۔ تب ڈاکٹروں نے ان کو اس قدر طاقتور انجکشن لگایا کہ انھیں اپنے سر اور منہ پر قابو نہ رہا اور نہ ہی ہفتوں تک کھانا کھا سکے۔

مندرجہ بالا انکشافات سے پتہ چلتا ہے کہ ان قیدیوں کے ساتھ جو کسی بھی عدالت کے دائرہ کار سے باہر محبوس تھے جو وحشیانہ بدسلوکی ہو رہی تھی، اس ہولوکاسٹ سے بھی زیادہ ہیبت ناک اور تکلیف دہ تھی جس میں نازیوں نے کروڑوں یہودیوں کو قتل کیا تھا کم از کم انھیں اس ذہنی ایذا اور صعوبت سے نہ گزرنا پڑا جو گوانتانامو کے قیدیوں کا مقدر ہے۔

گوانتانامو ابوغرائب: انسانیت پر دھبہ

اول الذکر جالی کا پنجرہ، اس میں ایک فولادی بستر ہے، ایک جائے ضرور ایک نلکا اس کی کوئی بیرونی دیواریں نہیں ہیں۔ قیدی موسمی حالات کے سپرد ہیں اور انھیں کوئی تخلیہ میسر نہیں۔ دن رات روشنیاں جلتی رہتی ہیں۔ ہفتہ میں تین سے پانچ دن انھیں ورزش کے لیے ایک بڑے کمرے میں لے جایا جاتا ہے۔ شروع میں حالات زیادہ وحشت ناک تھے جب قیدیوں کو ایسے پنجروں میں رکھا گیا تھا جس میں صرف ایک بالٹی اور پانی کی بوتلیں تھیں۔ پہلے ڈیڑھ ماہ تک انھیں ایک دوسرے سے سرگوشی کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ انھیں کسی مذہبی عمل کی اجازت نہ تھی نہ ہی عبادت کی اور نہ اذان دینے کی۔ جب قیدیوں نے بھوک ہڑتال کی تو ان سختیوں میں کچھ کمی ہوئی اور کچھ سہولتوں کی جن میں نماز بھی شامل تھی اجازت ملی۔ لیکن جو بات سب سے زیادہ وحشیانہ تھی وہ یہ کہ ان کی کوئی معلوم حیثیت نہ تھی اور مستقبل مکمل تاریکی میں تھا۔

ریاستہائے متحدہ انھیں جنگی قیدی نہیں کہتا کیونکہ وہ وردی نہیں پہنتے تھے۔ یہ سلوک جنیوا کنونشن کی شق نمبر ۵ کی صریح خلاف ورزی ہے جس کی ہدایت یہ ہے کہ جن قیدیوں کی حیثیت غیر واضح ہو انھیں ''مجاز عدالت'' کے فیصلہ تک جنگی قیدی ہی سمجھا جائے گا۔ ریاستہائے متحدہ نے ۱۹۹۱ء کی جنگ خلیج میں ایسی سینکڑوں عدالتیں تشکیل دی تھیں، لیکن افغان قیدیوں کے لیے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ بعد میں ایک فوجی عدالت کا اعلان ہوا۔ AFP نے ۲۲ جنوری ۲۰۰۴ء کو ایک رپورٹ میں کہا: ''ایک فوجی

وکیل'' نے جو آسٹریلوی قومیت کے حامل قیدی David Hicks کی نمائندگی کر رہا تھا کہا کہ ۱۱ ستمبر کے ملزلوں کے مقدموں کے لیے جو عدالت تشکیل دی گئی ہے، ناانصافی پر مبنی اور انصاف فراہم کرنے کے قابل نہیں۔'' ریاستہائے متحدہ کی قومی کونسل برائے گرجا جات نے کہا کہ پینٹاگون نے گوانتانامو کے قیدیوں سے ملاقات کی ان کی درخواست کو رد کر دیا۔

حکومت کا اصرار رہے کہ دشمن لڑاکوں کی حیثیت سے قیدیوں کو طویل عرصہ تک بغیر قانونی نمائندگی محبوس رکھا جاسکتا ہے صدر ریاستہائے متحدہ نے چھ قیدیوں کو جن میں Hicks بھی شامل ہے فوجی عدالتوں میں مقدمہ کے قابل قرار دیا ہے۔ وکیل نے ایسی عدالتوں کی تشکیل میں بہت خامیاں پائیں جو ان کی طرف سے قائم کی جائیں جنھیں صرف ملزموں کی سزایابی چاہیے۔

ریاستہائے متحدہ نے ۱۹۰۳ء میں گوانتانامو کیوبا سے پٹے پر حاصل کیا تھا۔ جس کی تجدید ۱۹۳۴ء میں غیر معینہ مدت کے لیے کاسترو سے پہلے والی حکومت کے ساتھ کی گئی۔ کاسترو نے اس پٹے کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن امریکہ نے تعاون سے انکار کر دیا۔ کاسترو حکومت اپنی مرضی کے خلاف جاری اس پٹے کے خلاف احتجاج کے طور پر سالانہ چار ہزار پچاسی ڈالر کی کرائے کی رقم قبول نہیں کر رہی ہے۔

ریاستہائے متحدہ گوانتانامو کو ریاستہائے متحدہ کا حصہ نہیں سمجھتی۔ اگر ایسا ہے تو یہ حکومت کیوبا کا حصہ ہے اور کیوبا کی حکومت کو حق حاصل ہے کہ کرایہ نامہ منسوخ کر دے، چاہے کرایہ نامہ میں جو بھی شرائط ہوں۔

ایک وفاقی اپیل کی عدالت نے کہا کہ گوانتانامو امریکی عدالتوں کے دائرہ کار میں نہیں آتا۔ بہرحال آخری اخباری رپورٹ یہ ہے کہ عدالت یہ مقدمہ وفاقی عدالت کے فیصلہ کو نظرانداز کر کے سن سکتی ہے اور اس طرح امریکی قوانین کا دائرہ عمل گوانتانامو کے قیدیوں تک بڑھا سکتی ہے۔ اس کے بعد عدالت عالیہ نے ان قیدیوں کے قید کے خلاف حق کو تسلیم کر لیا ہے۔

امریکی پشت پناہی میں قائم کرزئی حکومت کے دور میں افغان جیلوں میں قیدی طالبان کے ساتھ ایسا ہی وحشیانہ اور بہیمانہ سلوک کیا گیا۔

۳ مئی ۲۰۰۲ء کو بوسٹن گلوب کی رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ افغانستان سے رہاشدہ بدنام زمانہ، بدحال، پریشان حال طالبان قیدیوں نے بتایا کہ انھیں پچاس اور ساٹھ کی تعداد میں ایک کوٹھڑی میں بھرا جاتا تھا جس میں صرف پانچ افراد کی جگہ ہوتی تھی اور اس قدر قلیل مقدار میں کھانا دیا جاتا تھا کہ کبھی کبھی موت واقع ہوجاتی تھی۔ سینکڑوں قیدی جن کے بال جوؤں کی وجہ سے اتار دیئے گئے تھے اور کمر کے ساتھ چیتھڑے لٹک رہے تھے گھر جانے کے لیے بس اسٹاپوں پر شدید سردی میں چادریں لپیٹے کھڑے تھے۔ وہاں ابھی تک بچے قید ہیں۔ رہائیوں کے باوجود قید خانہ میں گنجائش سے تین گنا زیادہ قیدی موجود ہیں۔

دوستم کے ترجمان نے کہا کہ شبرگان میں دوہزار تین سو (۲۳۰۰) قیدی باقی ہیں جن میں آٹھ سو (۸۰۰) غیر ملکی ہیں جو تقریباً سب کے سب پاکستانی ہیں' ان میں چودہ اور پندرہ سالہ لڑکے بھی ہیں۔ تقریباً چارسو (۴۰۰) رہاشدہ افراد بسوں کے ایک قافلہ میں کابل پہنچے' ان کو بین الاقوامی صلیب احمر نے ادائیگی کی جو ہر قیدی کے لیے تقریباً چودہ (۱۴) ڈالر تھے' قافلہ کو کابل کے باہر فوجی چوکی پر تین گھنٹے روکے رکھا گیا اور قیدیوں کو مجبور کیا گیا کہ ۱۰۴۰ ڈالر فی کس محافظوں کو ادا کریں قبل اس کے کہ ان کو سفر جاری رکھنے کی اجازت دی جائے۔ تمام قیدیوں نے بتایا کہ ان کے رشتہ داروں کو ان کی رہائی کے لیے جیل کے عہدہ داروں کو رشوت دینی پڑی جو زیادہ تر صورتوں میں پانچ سو ڈالر تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ بازار میں مول تول ہورہا ہے۔'' حرمت اللہ نے کہا جس نے اپنے بھائی کی رہائی کے لیے اسپن بولدک سے سفر کیا تھا ''انھوں نے چھ سو (۶۰۰) ڈالر سے شروع کیا اور وہاں سے کم ہونے لگا۔ تاہم ان کی رہائی دوستم کے نمائندوں کے ساتھ ایک وفد کی آمد کے بعد ہی ہوئی۔

رہائی پانے والوں نے کہا کہ اس وفد میں گورنر قندھار گل آغا کا رشتہ دار محمد شاہ

شامل تھا۔قیدیوں نے شبرگان میں برے حالات کے بارے میں بتایا اور وہ خود اس کا زندہ ثبوت تھے۔ہر ایک تکلیف دہ حد تک دبلا تھا۔ان کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے اٹھائے گئے تو پسلیاں نظر آئیں۔کئی کی آنکھیں زخموں سے سرخ تھیں اور کچھ کے بازوؤں پر رگوں کے ذریعے غذا دینے'' کی وجہ سے سوئیوں کے نشانات تھے۔کچھ فاقہ زدہ تھے' صلیب احمر نے تمام قیدیوں کو شبرگان میں ایک مہینہ پہلے غذا دینا شروع کی تھی اور شدید غذائی قلت سے نکلنے کے لیے رقیق غذا دی جارہی تھی تاکہ وہ ٹھوس غذا ہضم کرنے کے قابل ہوسکیں۔ ۱۸ سالہ عبدالاحد نے جو سابقہ پوست کا کاشتکار تھا، بتایا کہ ''سات افراد کے لیے ایک روٹی اور رات کو تھوڑے سے چاول دیئے جاتے تھے جبکہ ہمیں پانی بھی کافی نہیں ملتا تھا''۔اس نے مزید بتایا کہ حالات کچھ بہتر ہوئے جب صلیب احمر پہنچی اگرچہ کئی قیدیوں نے بتایا کہ ان کی دی ہوئی غذائی اشیا کا بڑا حصہ محافظ لے لیتے تھے۔رہائی پانے والے کئی افراد ابھی تک پلاسٹک کے پٹے کلائی میں پہنے ہوئے تھے۔انھوں نے بتایا کہ امریکی افسروں نے اس بات کی تفتیش کے لیے یہ پٹے پہنائے تھے کہ ان کا اسامہ سے کوئی تعلق تو نہیں۔ پٹوں پر ہاتھ سے لکھا ہوا کوڈ تھا''45Echo''۔

گوانتانا موسے بہت ہی بری حالت عراق میں ہوئی جہاں قیدیوں پر ناقابل یقین بہیمیت اور شرمناک کارروائیاں روا رکھی گئیں جن سے دنیا کا ضمیر مشتعل ہوگیا۔ CBS کے خبروں کے پروگرام میں ۲۸ اپریل ۲۰۰۴ء کو ابوغرائب کی تصویریں دکھائی گئیں جن میں عراقیوں پر ڈھائے گئے مظالم دکھائی دے رہے تھے۔ایک عراقی کی جلد پر انگریزی میں گالی لکھی تھی۔دوسرے کو ڈبہ پر کھڑا کر کے سر پہ کپڑا ڈال کر ہاتھ سے تار چپکا دیے گئے تھے۔اس تنبیہ کے ساتھ کہ اگر وہ گرا تو بجلی لگ کر مر جائے گا۔اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل یہ تصویریں دیکھ کر بہت ''پریشان'' ہوئے۔عرب اخبار القاعدہ العربی کے مدیر عطوان نے لکھا: ''یہ یقیناً، یقیناً ''بہت بڑا ظلم ہے۔یہ مسلمانوں کی عزت اور فخر پر حملہ ہے۔انھیں ماردینا اس طرح تذلیل سے بہتر ہے۔اس کے بعد سے

نیو یارکر نے ۵۳ صفحوں کی رپورٹ حاصل کرلی ہے جس میں جنرل سانچیز کی ہدایت پر ابوغرائب کے قید خانہ میں بدسلوکی کی تفصیلات ہیں' رپورٹ میں بدسلوکیوں کی فہرست ہے جن میں کیمیائی بلب توڑ کر رقیق فاسفورس قیدیوں پر گرانا، انھیں ڈنڈوں اور کرسیوں سے مارنا، مردوں کو بدکاری کی دھمکی، ایک قیدی کو کیمیائی روشنی کی ٹیوب سے جنسی تکلیف دینا اور شاید جھاڑو کے ڈنڈے سے بھی۔ جو چیز اس عمل کو اور بھی زیادہ مجرمانہ اور دہشت ناک بناتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ فوجی خفیہ محکمہ کے حکم پر ہو رہا تھا۔ مانچسٹر گارڈین کے مطابق قیدیوں کو تین دنوں تک ٹھنڈی اور نم کوٹھڑیوں میں رکھا جاتا تھا، جبکہ ان کے پاس کم سے کم یا پھر کوئی لباس نہیں ہوتا تھا۔ نہ جائے ضرور یہ نہ رواں پانی نہ ہوا کا نظام نہ کھڑکیاں۔ اس سے بھی بری بات یہ تھی کہ جب ان بدسلوکیوں کے بارے میں افسروں کو بتایا جاتا تھا تو وہ ڈانٹ کر کہتے تھے ''فکر نہ کرو''۔ اور جن لوگوں نے یہ حرکتیں کی تھیں ان کو ''ایک شاندار کام کرنے پر'' مبارکباد دیتے تھے۔ ان بہیمانہ حرکات پر تو وحشی منگول جنھوں نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تاراج کیا تھا اپنی قبروں میں تلملا گئے ہوں گے۔

ایک ستارہ والے جنرل Janis karpinski نے جو عراق میں ابوغرائب سمیت تمام قید خانوں کے انتظامات چلاتا ہے ایک انٹرویو میں BBC ریڈیو سے کہا دو ستاروں والے ایک جنرل Geffry Miller کو گوانتاناموکے امریکی قید خانہ سے عراق بھیجا گیا، جس نے ان کوٹھڑیوں کے بارے میں جہاں عراقیوں سے تفتیش ہوتی تھی نئے طریق کار کا حکم دیا۔

جنرل ملر نے نئے طریق کار کا حکم دیتے ہوئے جوشیلی تقریر میں کہا: ''گوانتانامو میں ہم نے یہ سیکھا کہ قیدیوں کو ہر چیز حاصل کرنے کے لیے اسے کمانا پڑے گا، وہ لوگ کتوں کی طرح ہیں اور اگر آپ نے کبھی انھیں یہ باور کرنے کا موقع دیا کہ ایسا نہیں ہے تو آپ ان پر قابو نہیں رکھ سکیں گے۔''

واشنگٹن پوسٹ نے امریکی فوجیوں کی عراقی قیدیوں سے بدسلوکی کی چار تصاویر

شائع کیں جن میں وہ تصویر بھی شامل ہے جس میں ایک امریکی عورت ایک برہنہ عراقی قیدی کو گلے میں بندھی ہوئی زنجیر سے کھینچ رہی ہے جبکہ وہ قیدی اپنا سر فرش سے اٹھائے رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ایک اور تصویر میں ایک برہنہ عراقی جس کے سر پر ایک گہرے رنگ کا ہڈ ہے کوٹھڑی کے دروازے کے ساتھ ہتھ کڑی سے جکڑا ہوا ہے۔ایک اور عراقی بستر کے ساتھ ہتھکڑی سے بندھا ہوا ہے۔اس کے بازو اس قدر پھیلے ہوئے ہیں کہ اس کی پیٹھ جھک گئی ہے اور اس کا سر اور چہرہ ایک زنانہ زیرجامہ سے ڈھکا ہوا ہے۔اس دوران ایک فوجی افسر نے تصدیق کی ہے کہ قیدخانوں اور بندی خانوں میں کم از کم ایک درجن اموات ہوئی ہیں۔۶ مئی کی رائٹرز کی رپورٹ میں کہا گیا کہ صلیب احمر کی بین الاقوامی کمیٹی نے بار بار ریاستہائے متحدہ سے کہا کہ ابوغرائب جیل میں حالات درست کریں۔اس رپورٹ کے مطابق میجر جنرل Taguba نے پہلے بھی تین سادیت زدہ بے ہودہ اور بے مقصد مجرمانہ بدسلوکیوں کی نشان دہی کی تھی۔یہ ہے وہ سلوک جس کے ذریعے انسانی حقوق اور جمہوریت کے پیروکار ریاستہائے متحدہ نے انسانیت کا سینہ چھلنی کیا ہے۔یہ کام وحشیوں میں سے بدترین بھی نہیں کر سکتے تھے جس کے سامنے بغداد کا وحشی فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔

۷ مئی کو رمز فیلڈ نے اعتراف کیا کہ امریکہ عراق میں اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کر سکا اور انھوں نے امریکی فوجوں کی بدسلوکیوں کے لیے عراقیوں سے معافی مانگی۔ عراقیوں کے ساتھ بدسلوکی کی پوری ذمہ داری قبول کرتے ہوئے انھوں نے صاف الفاظ میں اپنے آپ کو عراقی قیدیوں کی تمام تکالیف کا ذمہ دار ٹھیرایا۔لیکن وہ سینٹ کی Arms Service Committee کا غصہ ٹھنڈا نہ کر سکے جن کے سامنے وہ ابوغرائب کے قیدخانہ میں ہونے والے واقعات کی شہادت دے رہے تھے۔ان کا استقبال ''رمز فیلڈ کو نکالو'' کے نعروں سے کیا گیا۔

عراقی جنگ کے معمار، نئے رجعت پسند عقاب وولفوٹز نے بھی عراقی قیدیوں کے ساتھ بدسلوکی پر اظہار افسوس کیا۔کولن پاول نے یہاں تک کہا کہ ابوغرائب میں جو کچھ

ہوا، اس کی وجہ سے ان کی خارجہ پالیسی کو شدید نقصان پہنچا اور آخر کار بش نے بھی اپنے افسوس کا اظہار کیا۔

لیکن ابوغرائب کے رسوا کن واقعات پر امریکی انتظامیہ کی ساری فوں فاں زیادہ تر دنیا کے اشتعال اور غصہ کا ابال ٹھنڈا کرنے کے لیے تھی اور اس کا مقصد صدارتی انتخابات سے پہلے سانس لینے کی گنجائش حاصل کرنا تھا۔ وولفوتز، رمز فیلڈ اور صدر بش نے اپنے اپنے طریقوں سے ان غیرانسانی سفاکیوں کو ہلکا دکھانے کے لیے اس بات پر زور دیا کہ ابوغرائب میں بدسلوکیاں ریاستہائے متحدہ اور اس کی فوج کی اعلیٰ روایات سے انحراف تھیں۔ انھوں نے اس کی ذمہ داری چند امریکی فوجیوں پر ڈال کر اسے جھاڑ کر ایک طرف کر دیا اور امریکی فوج اور قیادت کو اس کی ذمہ داری سے بری قرار دیتے ہوئے رمز فیلڈ کا استعفاء غیرضروری قرار دیا۔ ''وہ میری کابینہ میں رہیں گے'' بش نے اپنی تقریر میں فرمایا۔ ابوغرائب میں کی جانے والی سفاکیاں ریاستہائے متحدہ کی طویل روایات سے بالکل بھی مختلف نہیں ہیں۔ درمیانہ بائیں بازو کے گارڈین نے برطانوی فوجی کی بات دہرائی کہ: ''ابوغرائب میں قیدیوں کی جنسی تذلیل کسی ایک محافظ کی ایجاد نہ تھی بلکہ بدسلوکی اور تذلیل کے ایک طریق کار کا حصہ تھی جس کا استعمال خصوصی افواج کرتی تھیں''۔

برطانوی فوجی سپاہیوں کو ایک تکنیک کی تربیت دی گئی ہے جسے R-21 ''تفتیش سے عدم تعاون کا نام دیا گیا ہے۔ روزنامہ ''مرر'' نے یہ دعویٰ شائع کیا کہ: Queen's Lancashire Regiment کے ارکان نے قیدیوں کی پٹائی کی CDS یادگار کے طور پر بنائیں۔ واشنگٹن پوسٹ نے ۱۸ مئی ۲۰۰۴ء کو رپورٹ شائع کی کہ ایک فوجی پر عراقی قیدیوں سے بدسلوکی اس اصول کے مطابق کام کر رہی تھی کہ قیدیوں کے لیے اسے ''جہنم بنا دیا جائے''۔ ورجینیا کی ایک ۲۶ سالہ خصوصی پولیس افسر Sabina Herman نے پوسٹ کو بتایا "MI" کا کام یہ تھا کہ انھیں جاگتا رکھیں۔ ان کے لیے جہنم بنا دو تا کہ وہ بولنے لگیں۔''

عالمی سوشلسٹ ویب سائٹ پر ۱۸ مئی ۲۰۰۴ء کو Bill Van Auken نے ایک مضمون میں صدر بش کے اس دعویٰ کی مکمل تردید کی کہ ابوغرائب میں جو ہوا وہ ''امریکی رویہ نہیں تھا''۔ اس نے اصرار کیا کہ تاریخی شہادتوں کی روشنی میں جس قسم کا تشدد ابوغرائب میں کیا گیا وہ امریکن ''اپیل پائی'' ہے۔ ۱۱/۹ اپریل سے امریکی سیاسی انتظامیہ نے دہشت گردی کی جنگ میں تشدد کو ایک ضروری ہتھیار کے طور پر استعمال کا ضابطہ سکھانے کی باقاعدہ مہم چلا رکھی تھی۔ ہارورڈ کے قانون کے پروفیسر Alan Dershowitz نے اس بات پر زور دینے کے لیے کہ تشدد کو قانون کی پشت پناہی حاصل ہونی چاہیے ذرائع ابلاغ کا دورہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ بجائے اس کے کہ عدالتیں انسانی حقوق کی اس خلاف ورزی کو نظر انداز کرتی رہیں انھیں اختیار حاصل ہونا چاہیے کہ تشدد کی اجازت دینے کے وارنٹ جاری کریں جو بین الاقوامی قوانین کے مطابق ممنوع ہے۔ اسی طرح امریکی انتظامیہ کے تحت قائم قیدی کیمپوں میں گوانتانامو سے لے کر افغانستان میں باگرام کے اڈے تک اور کئی نامعلوم مقامات میں قیدیوں پر تشدد ایک معمول کی بات ہے۔ نومبر ۲۰۰۵ء کے دوسرے ہفتہ میں اخباری رپورٹیں آنا شروع ہوگئیں کہ مشرقی یورپی ممالک میں CIA کے حکم سے خفیہ قید خانے قائم کیے گئے ہیں بعض جگہ تو وہاں کی حکومت کو خبر بھی نہیں ہے۔ ۱۸ نومبر ۲۰۰۵ء کو AFP نے، رپورٹ دی کہ ایڈمرل Schans Fieldturner نے جو سابق ڈائریکٹر CIA ہیں، نائب صدر ڈک چینی پر الزام لگایا کہ انھوں نے مشتبہ دہشت گردوں پر تشدد کی پالیسی کی نگرانی کر کے قوم کی نیک نامی پر دھبہ لگایا ہے۔ ۱۸ نومبر کو ایک ٹیلویژن انٹرویو میں ایڈمرل نے اس طرح اپنے تنفر اور اذیت کا اظہار کیا: ''مجھے شرمندگی ہے کہ ریاستہائے متحدہ کے پاس ایک نائب صدر برائے تشدد ہے' میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی حیثیت کا کوئی شخص ایسی مثال کیسے قائم کرسکتا ہے۔'' ان جگہوں پر لوگوں کو محبوس کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا اس کے لیے ہر قانونی بندش اور عدالتی نگرانی سے بچ جائیں۔ ممکن ہے کہ ابوغرائب میں جو کچھ افشا ہوا اس سے بھی برا سلوک ان دوسرے

قید خانوں میں ہو رہا ہو۔ ریاستہائے متحدہ کے اس رسواکن وطیرہ کی ایک طویل تاریخ ہے جو جنگ ویت نام تک جاتی ہے جب اس قدر تشدد کیا گیا تھا کہ امریکہ کے بدنام زمانہ ''شیر کے پنجروں'' میں ہزاروں افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ امریکہ نے نہ صرف خود بڑے پیمانہ پر تشدد کیا ہے بلکہ دوسروں کو تشدد کے فن کی تربیت بھی دیتا رہا ہے، جس کی مثال لاطینی امریکہ کے آمر ہیں جو معمول کے طور پر سیاسی قیدیوں پر تشدد کرتے ہیں۔ تشدد کرنے والے ان اہلکاروں میں سے زیادہ تر کی تربیت ریاستہائے متحدہ نے کی تھی۔ شاہ ایران کی بدنام زمانہ خفیہ پولیس ساواک CIA ہی کی تشکیل کردہ تھی۔ ۱۹۷۹ء میں ایرانی انقلاب کے بعد ایران کے CIA ہیڈ کوارٹر سے ایسی دستاویزات اور تربیت کا مواد برآمد ہوا تھا جس میں خاص طور پر بتایا گیا تھا کہ خواتین پر کس طرح تشدد کیا جائے۔

انتظامیہ کی تادیب کا سامنا کرنے والے اعلیٰ افسر بریگیڈیر جنرل کارپنسکی نے جو قید خانہ کا نگران تھا، اصرار کیا کہ عراق میں عمومی کماندار جنرل سانچیز کو بھی تادیبی کارروائی میں شامل کیا جائے، جس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس قید خانہ کو فوجی خفیہ محکمہ کے حوالے کر دیا جائے اور انھیں یہ ہدایت دی تھی کہ بڑھتی ہوئی مزاحمت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ''جو طریقہ چاہیں'' استعمال کریں۔ اور یہ فیصلہ اعلیٰ فوجی کمان نے کیا تھا۔ فوجی محکمہ خفیہ نے تفتیش کاروں کو حکم دیا کہ تصویروں میں دکھائے گئے اذیت ناک اور سادیت پر مبنی طریقوں کے ذریعے تفتیش کے معمول افراد کو ''نرم'' کریں۔ سابقہ عراقی انسانی حقوق کے وزیر عبدالباسط ترکی نے بھی انکشاف کیا کہ انھوں نے تشدد کے بارے میں تسلط کے سربراہ پال بریمر کو نومبر ۲۰۰۳ء میں ہی مطلع کر دیا تھا۔ انھوں نے سن لیا لیکن ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا'' اور ترکی کے قید خانہ کے اندر جانے پر پابندی لگا دی گئی۔ ایک رہا شدہ قیدی نے جو مزاحمت کار بن چکا تھا جاپانی مغوی کو بتایا کہ اس کی پٹائی کی گئی، تشدد کیا گیا اور ایک دن الگ کمرے میں لے جا کر اس پر جنسی تشدد کیا گیا۔

ویت نام کی جنگ میں حصہ لینے کے فوراً بعد کیری نے جو بعد میں صدارتی امیدوار بنے واپس آنے پر خارجہ تعلقات کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ ریاستہائے متحدہ کے فوجیوں نے عصمت دریاں کیں، شہریوں پر بغیر کسی وجہ گولیاں چلائیں اور گاؤں کے گاؤں اس طرح تباہ کیے جیسا چنگیز خان کا طریقہ تھا۔''

مشہور برطانوی طبی جریدہ Lancet نے بتایا کہ امریکی فوج کے ڈاکٹر جو ابوغرائب میں کام کر رہے تھے تفتیشی حربے تیار کرنے میں مدد کرتے تھے اور مار پیٹ سے جو اموات ہوتی تھیں ان کی رپورٹ نہیں دیتے تھے۔

۸ رمئی کے ہفتہ وار اکانومسٹ نے تبصرہ کیا: ''اس بات کا پورا امکان ہے کہ تشدد کے شکاروں کی تصویریں خاص طور پر ایک ایسے مرد کی جس کے سر پر نقاب منڈھا ہوا ہے اور اس میں تار لگے ہوئے ہیں جیسے اسے بجلی گزار کر ہلاک کیا جا رہا ہو، علامت بن جائیں اور آنے والے سالوں میں امریکہ کے لیے اس طرح اعصاب زدگی کا باعث ہوگی جیسے ویت نام کی وہ مشہور تصویر جس میں ایک برہنہ بچی نیپام حملوں کے دوران بھاگتی نظر آتی ہے۔ اس خطرہ سے نمٹنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ اپنا علامتی عمل دکھائیں یعنی پینٹا گون کے سربراہ کو نکال باہر کرنا۔ وہ شخصیت جو پچھلے تین سالوں میں امریکہ کی فوجی طاقت کے استعمال کی پہچان رہی ہے۔ وہ بہرحال وہی ہے جو بدسلوکی کے رجحان کے ساتھ سب سے زیادہ منسلک ہے۔

۱۵ رمئی کی AFP رپورٹ نے نیویارک کی سند پر کہا کہ کوئی اور انھیں بلکہ دفاعی سیکرٹری رمزفیلڈ ہی تھے جنھوں نے خفیہ پروگرام کی منظوری دی تھی جس کے تحت وہ تفتیشی طریق کار طے کیا گیا تھا جو ابوغرائب میں استعمال ہوا۔ پچھلے سال رمزفیلڈ نے ایک خفیہ آپریشن کی منظوری دی تھی جس میں جسمانی تشدد اور عراقیوں کی جنسی تذلیل کی ہمت افزائی کی گئی تھی تاکہ بڑھتی ہوئی مزاحمت کے متعلق زیادہ معلومات حاصل ہو سکیں۔ نیویارکر کے تحقیقاتی رپورٹر سیمور ہرش نے موجودہ اور سابق خفیہ اہل کاروں کی معلومات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ تفتیش کے لیے جو اصول بنایا گیا وہ یہ تھا ''جس کی

ضرورت ہو اسے پکڑلو اور جو جی چاہے کرو"۔ جس کی امریکی محکمہ خفیہ کے ارکان نے مخالفت کی تھی۔ یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ یہ تکنیک افغانستان میں استعمال ہو چکی ہے۔ اس طرح صدر بش کے اس بیان کی حتمی طور پر نفی ہو جاتی ہے کہ ابوغرائب میں جو ہوا وہ غیر امریکی طرز عمل اور کام کرنے کے امریکی طریقہ کے خلاف تھا۔

عراق کے دوسرے علاقوں سے بھی مزید ہیبت ناک کہانیاں تواتر سے آتی رہی ہیں۔ جبکہ واشنگٹن پوسٹ نے ابوغرائب ہی کی مزید ہیبت ناک کہانیاں شائع کیں، ۲۱ مئی ۲۰۰۴ء کے شمارہ میں واشنگٹن پوسٹ نے ابوغرائب میں تشدد کی دو بھیانک کہانیاں شائع کیں جس کے ساتھ نئی تصویریں، شہادتیں اور اعترافات شامل ہیں۔

کچھ قیدیوں کو اسلام کی مذمت کرنے اور سوٗر کا گوشت کھانے پر مجبور کیا گیا۔ دوسروں نے اس قسم کے تشدد کی تفصیل بتائی۔ مثال کے طور پر جنسی تشدد کی دھمکی اور خواتین فوجیوں کے سامنے زبردستی جنسی حرکات کروانا۔ دو قیدیوں نے قسم کھا کر بتایا کہ انھوں نے امریکی فوجیوں کو ایک نو عمر عراقی لڑکے کے ساتھ بدکاری کرتے اور تیسرے کو امریکی سپاہی کے ہاتھ مرکری ٹیوبوں اور ڈنڈے سے زیادتی کرتے دیکھا۔ ایک تصویر میں امریکی سپاہی ہتھکڑی میں جکڑے عراقی قیدی پر ایک غراتا ہوا کتا چھوڑنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ ایک ویڈیو میں دکھایا گیا کہ کس طرح امریکی فوجیوں نے عراقیوں کو برہنہ کیا اور انھیں ایک دوسرے پر ڈھیر کر کے اہرام بنایا۔

ابو غرائب کی بھیانک کہانیوں پر اضافہ ان کہانیوں سے ہوتا ہے جو Battlefield Interrogation Fascilities کے متعلق ہیں۔ FBI کے قیدیوں کی گرفتاری کے فوراً بعد سے نقاب منڈھ دیا جاتا ہے اور انھیں تاریک گندی کوٹھڑیوں میں رکھا جاتا ہے۔ ڈیلٹا فورس کے سپاہیوں کو ان پر چھوڑ دیا جاتا ہے جو انھیں اس حد تک پانی میں دبائے رکھتے ہیں کہ وہ محسوس کریں کہ ڈوب رہے ہیں اور یوں دم گھٹنے کی حد تک پہنچ جائیں۔

اگرچہ فوجیوں کا کورٹ مارشل ہوا لیکن ساری کارروائی خفیہ رہی اور پریس کو

کارروائی دیکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس وجہ سے یہ ممکن نہیں ہوا کہ ملزم سپاہیوں نے کیا کیا، انھیں کس نے احکامات دیے اور کس کی طرف سے۔ اس دکھاوے کے مقدمہ اور چند ادنیٰ عہدوں کے حامل فوجیوں کو سزا کے باوجود امریکی انتظام میں قید خانوں میں قیدیوں پر تشدد اور بدسلوکی بدستور جاری ہے۔ امریکی شہری آزادیوں کی یونین نے ایک مقدمہ کے بارے میں امریکی حکومت پر الزام لگایا کہ وہ گوانتاناموں میں تشدد میں ملوث ہے اور اس کی بنیاد ان دستاویزات پر ہے جو اگست ۲۰۰۴ء تک کے دو سالوں کے عرصہ پر محیط ہے اور اس کی نشان دہی کی ہے کہ گوانتانامو کے قید خانوں میں تشدد کا سلسلہ جاری ہے۔ FBI کی ایک دستاویز کا ذکر کرتے ہوئے امریکی شہری آزادیوں کی یونین نے کہا کہ قیدیوں کو جنین کی سی حالت میں چوبیس گھنٹوں سے زیادہ فرش پر بندھا رکھا جاتا ہے بغیر کھانے اور پانی کے اور انھیں اپنے اوپر رفع حاجت کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ دستاویز میں FBI کے ایجنٹ نے بتایا کہ پینٹاگون کے دعویٰ کے خلاف کہ کتوں کے استعمال پر ابوغرائب کے بعد سے پابندی لگادی گئی ہے اس نے خود غراتے ہوئے کتوں کو قیدیوں کو دھمکانے کے لیے استعمال کیے جاتے دیکھا۔

ایک FBI ایجنٹ نے بتایا کہ اس نے ایک قیدی کو اسرائیل کے جھنڈے میں لپٹا ہوا دیکھا اور اس کی مزاحمت کو کم کرنے کے لیے انتہائی پرشور موسیقی سے اس پر بمباری کی جارہی تھی۔ مزید دستاویزوں میں بتایا گیا کہ FBI کے ایجنٹوں نے عراق کے قید خانوں میں بھی اسی قسم کا تشدد ہوتے دیکھا جہاں امریکی فوجی قیدیوں کی پٹائی کرتے، گلے گھونٹتے اور ان کے کانوں میں جلتے ہوئے سگریٹ ٹھونستے دیکھے جاسکتے تھے۔ ایجنٹ نے ایک ایسے قیدی کے بارے میں لکھا جو تقریباً بے ہوش تھا اور جس کے بال رات بھر میں نوچ دیے گئے تھے۔ امریکی شہری آزادیوں کی یونین نے FBI کی ایک ای میل دکھائی جس میں کہا گیا تھا کہ صدر بش نے خود بلاواسطہ عراقی قیدیوں پر غیر انسانی سلوک کا اختیار دیا تھا۔ مثلاً نیند سے محرومی اور کتوں کا استعمال۔ قصر ابیض نے گوانتانامو اور عراق میں قیدیوں سے بدسلوکیوں کی مکمل تفتیش کا اعلان کر کے ان الزامات سے نکلنے

کی کوشش کی۔

ڈان کے نمائندوں نے واشنگٹن سے اپنی مشترکہ رپورٹ میں ۲۴ اپریل ۲۰۰۵ء کو لکھا تھا: ''انسانی حقوق کی اہم جماعتوں نے کانگریس سے کہا کہ عراق کے قیدخانوں میں ہونے والی بدسلوکیوں میں اعلیٰ امریکی قائدین کے کردار کے بارے میں خودمختار اور غیر جانبدار تحقیقات شروع کرے''۔

Human Rights Watch نے تحقیقات کے لیے صدر بش کے سیکرٹری رمزفیلڈ اور CIA کے ڈائریکٹر Tenet کے نام تجویز کیے۔ امریکی شہری آزادیوں کی یونین نے فوج کی داخلی تحقیقات کو رد کردیا جس میں جن پانچ اعلیٰ افسروں کے خلاف بدسلوکیوں میں ملوث ہونے کے شبہات تھے' ان میں سے تین کو بری قرار دے دیا گیا تھا۔ ایسوسی ایٹڈ پریس نے لندن سے اپنے مراسلہ میں ۲۲ مئی ۲۰۰۵ء یا اس کے قریب تفصیل بتائی کہ کس طرح بے گناہ لوگوں کو ان کی شناخت کی بھی تصدیق کیے بغیر گوانتانامو روانہ کردیا گیا۔ مراسلہ میں کہا گیا کہ جولائی ۲۰۰۴ء کے منعقد ہونے والے ۵۵۸ مقدموں میں سے چند کی نمائندگی ہوئی ہے۔ ان شہادتوں میں دور دراز قیدخانوں سے شکایتیں ہیں کہ ان لوگوں کے خلاف کوئی شہادتیں نہیں۔ ان گردش زدوں کی کہانیاں دو ہزار صفحات پر مشتمل اس دستاویز میں کہیں دبی ہوئی ہیں جو ریاستہائے متحدہ کی حکومت نے Freedom of Information Act کے تحت مقدمہ کی وجہ سے ایسوسی ایٹڈ پریس کو مہیا کی ہے۔

گوانتانامو کی حالیہ صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے Brdery Giller نے اپنے مضمون (ڈان ۱۴ ستمبر ۲۰۰۴ء) میں انکشاف کیا کہ دو سو سے زیادہ قیدی بھوک ہڑتال کے پانچویں ہفتہ میں ہیں جیسا کہ گارڈین کو پتہ چلا۔ قیدیوں کے بیان سے انکشاف ہوا کہ یہ لوگ غیر انسانی سلوک بشمول قرآن پاک کی بے حرمتی کے خلاف احتجاجاً فاقہ کشی کر رہے ہیں۔ جون ۲۰۰۵ء سے یہ دوسری ہڑتال ہے جب امریکی انتظامیہ نے وعدہ کیا تھا کہ دس دنوں کے اندر اس قیدخانہ کو جنیوا کنونشن کے مطابق بنادیا

جائے گا اوردفاعی سیکرٹری اس معاہدہ میں شریک تھے لیکن یہ وعدہ کبھی پورانہ ہوا اورقیدیوں کودھوکہ دیا گیا۔ ۲۰ ستمبر ۲۰۰۵ء کو Human Rights Watch نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ ۲۰۰۳ء سے ۲۰۰۴ء تک وسطی عراق کے ایک اڈے میں امریکی فوجیوں نے عراقی قیدیوں کی بے تحاشا پٹائی اورتشدد اعلیٰ افسروں کے حکم اور پسندیدگی کے مطابق کیا۔ Human Rights Watch نے مطالبہ کیا کہ ۹/۱۱ کمیشن کی طرز پر کانگریس ایک کمیشن تشکیل دے۔

تمام احتجاج کے باوجود گوانتانامو میں قیدیوں پرتشدد جاری رہا یہاں تک کہ اقوام متحدہ کودخل دینا پڑا اوراس نے ریاستہائے متحدہ سے درخواست کی کہ گوانتاناموکے قیدخانہ کو بند کیاجائے اورقیدیوں پر یا تو قانون کے مطابق مقدمات چلائے جائے یاانھیں آزادکیاجائے۔

نازی مجرموں پر جنھوں نے جنگ عظیم دوم میں تمام جنگی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انسانیت کے خلاف جرائم کیے تھے، نیورایمبرگ سے مقدمات چلائے گئے تھے۔ نیورایمبرگ میں جنگی مجرموں پرمقدمات نے یہ مثال قائم کردی تھی کہ جنگی جرائم صرف ریاستوں کی نہیں بلکہ افراد کی بھی ذمہ داری ہیں ۔موجودہ معاملہ میں ابوغرائب کے قیدیوں پر بہیمیت کا ارتکاب اعلیٰ فوجی کمان کی زیرقیادت ہوا جن کے بارے میں وقت وقت سے متسلط انتظامیہ کے سربراہ بریمرکواطلاع دی جاتی رہی اور یہ سب کچھ اعلیٰ ترین غیرفوجی دفاعی قوت رمزفیلڈ کی توثیق پرہورہا تھا۔اس طرح فوجی ارکان کے ساتھ جو بہیمانہ حرکات کررہے تھے پوری کی پوری فوجی کمان اورمحکمہ ملوث اورجواب دہ ہیں اوران پر بین الاقوامی فوجی عدالت میں مقدمات چلنے چاہئیں۔ اسی طرح جیسے نیورایمبرگ میں چلتے تھے اوراسی مثالیہ کے مطابق جو نیورایمبرگ میں تشکیل پایا۔

اس کے برخلاف طالبان اسلامی روایات کے مطابق اپنے قیدیوں کے ساتھ نرم اورفراخ دل تھے۔ سنڈے ایکسپریس کی نمائندہ Ridley طالبان حکومت کے متعلق

معلومات اکٹھی کرتے ہوئے موقع پر پکڑی گئی تھی' ایسے وقت میں جب افغانستان پر جنگ کے بادل چھا رہے تھے۔ رہا ہونے کے بعد اسلام آباد میں ان کا عام بیان تھا کہ زمانۂ جنگ میں بھی ان کے ساتھ مثالی طور پر فیاضانہ سلوک کیا گیا۔ بعد میں اس خاتون نے اسلام قبول کرلیا اور شریعت کے مطابق زندگی گزار رہی ہے۔ حالیہ مثال ان امدادی کارکنوں کی ہے جو طالبان کے خلاف تبلیغ کرتے ہوئے پکڑی گئی تھیں اور رہائی کے بعد اسلام آباد میں اخباری کانفرنس میں طالبان کے فیاضانہ سلوک کی بے حد تعریف کی تھی امریکی اور آسٹریلوی امدادی کارکنوں نے قید سے آزادی پر رپورٹ کے مطابق کہا (ڈان ۱۲ نومبر ۲۰۰۲ء)۔

''۲۴ سالہ امریکی Heather Mercer نے اخباری رپورٹروں کو اخباری کانفرنس میں بتایا: انھوں نے ہمارے ساتھ بہت ہی احترام کا سلوک کیا اور جو کچھ بھی بہترین دے سکتے تھے وہ دیا۔ ۳۰ سالہ Dayana Curry نے کہا کہ ''طالبان محافظ ہمیں بہنیں کہتے تھے''، کچھ طالبان نے ہمیں یقین دلایا کہ وہ ہمیں کوئی نقصان پہنچنے نہیں دیں گے اور ہمیں کوئی ضرر پہنچنے سے پہلے وہ اپنی جان تک دے سکتے ہیں۔''

افغانستان پر امریکی حملہ اور پھر اس کے تسلط نے پاک باز طالبان کی جگہ بدنام ترین اور درحقیقت دہشت گرد شمالی اتحاد کو جنھیں طالبان نے افغانستان سے نکال دیا تھا لا بٹھایا ہے۔ امریکی طرز جمہوریت نے افغانستان کی یہی خدمت انجام دی ہے۔

پیٹریاٹ ایکٹ:

ڈیموکلیس کی تلوار جو عوام کی آزادی اور تحلیے پر لٹک رہی ہے

کانگریس نے ریاستہائے متحدہ کے آئین کو زبردست رگڑا دیا جب اٹارنی کے الٹی میٹم کے زیر اثر اس نے پیٹریاٹ ایکٹ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور اس کے لیے مقننہ کے تمام رائج طریق کار سے صرف نظر کرلیا۔ اس کی منظوری بے حد عجلت میں تقریباً بغیر پڑھے' بلا سوچے سمجھے اور بلا ساختہ عمل میں آئی۔ جب اُسے پورے ایوان کے

سامنے منظوری کے لیے پیش کیا گیا تو بل کے مخالفین یا ایوان کی قیادت کی طرف سے کوئی شہادت نہیں لائی گئی۔ ایوان کے کسی ایک رکن نے بھی اس بل کو پڑھا نہیں جس پر انھوں نے رائے دی (دہشت گردی اور آئین مصنفہ James Demposy David Cole) اس ایکٹ نے تمام حدود اور عدالتی اختیار کو ختم کر کے جو تفتیشی مقتدروں اور ان کے کام مختصر کرنے کے طریقے کے خلاف تھے تا کہ بے گناہ محفوظ رہیں اور مجرم پکڑے جائیں، حکومتی اختیار کے لیے ایک خفیہ خول مہیا کر دیا۔ ایکٹ آئین پر سے درّانہ گزر گیا اور بعض بنیادی حفاظتی تدبیروں کو ہوا میں اڑا دیا۔

پیٹریاٹ ایکٹ (۱) تارکین وطن پر رابطہ کے جرم کا اطلاق کرتا ہے جو ۱۹۹۴ء کے ایکٹ کی اس فلاسفی سے بھی آگے چلا گیا ہے (۲) صرف اس شک پر کہ کسی تارک وطن نے کسی وقت کوئی جرم کیا تھا یا کسی ممنوع جماعت کی مدد کی تھی اسے قید کیا جا سکتا ہے (۳) حکومت کو اجازت دیتا ہے کہ صرف کسی تقریر کی بنیاد پر کسی غیر ملکی کو ملک میں داخل ہونے سے روک دے۔ اس سے مک کارتھی دور کے پرانے آثار کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ (۴) کسی مجرم کے جرم میں ملوث ہونے کی کوئی وجہ دکھائے بغیر حکومت کو تلاشی اور ٹیلیفون ٹیپ کرنے کی اجازت دیتا ہے (۵) ایسے معاملوں میں بھی خفیہ تلاشیوں کی اجازت دیتا ہے جن کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں (۶) مرکزی خفیہ ایجنسی کو طاقتور گرانڈ جیوری کے برابر کر دیتا ہے اور (۷) عدالتی نگرانی کو محض معلومات اکٹھا کرنے تک محدود اور FBI کے لیے نئے معلوماتی ریکارڈوں کی رسائی کا دائرہ بہت بڑھا دیتا ہے۔

۱۹۹۶ء کے Anti Terrorism Act کی بنیاد پر مزید اضافہ کرتے ہوئے پیٹریاٹ ایکٹ مجرمانہ رابطہ کو وسیع کر دیتا ہے۔ یہ مک کارتھی دور کا فلسفہ تھا جس کے بارے میں عدالت عالیہ نے یہ کہہ کر مذمت کی تھی کہ یہ کسی آزاد معاشرے کی روایات اور خود پہلی ترمیم کے لیے نئی چیز ہے۔ نئے قانون نے دہشت گردی کی تعریف یوں کی ہے: ''اس میں کوئی بھی تشدد یا تشدد کی دھمکی شامل ہے''۔ اور دہشت گرد جماعت کے لیے اس کی تشریح یوں کی ہے: ''دو یا دو سے زیادہ افراد کا گروہ جس نے تشدد کیا یا اس کی

دھمکی دی ہو۔'' اس طرح جماعتی کارروائی کی ممانعت تقریباً ہر قسم کے رابطہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے چاہے وہ خانہ جنگی ہو یا تشدد پر مبنی جرم مثلاً وہ گروہ جس نے ایک دفعہ اسقاط حمل کے کلینک میں کام کرنے والوں کو دھمکا دیا تھا یا افریقی نیشنل کانگریس آئرش ریپبلکن پارٹی، یا افغانستان کا شمالی اتحاد۔ کسی غیر ملکی نے اگر کسی ممنوعہ جماعت کے بچوں کی روزانہ دیکھ بھال کے مرکز میں رنگ بھرنے کی کتابوں کا تحفہ بھیج دیا تو اسے ملک بدر کیا جا سکتا ہے چاہے وہ دکھا دے کہ یہ کتابیں صرف تین سالہ بچوں کے لیے ہیں۔ ۱۹۹۶ء کے ایکٹ کے برخلاف نیا قانون دواؤں اور مذہبی مواد کو بھی استثناء نہیں دیتا۔ ملکی جماعتوں کی حیثیت کو بغیر کانگریس کو اطلاع دیے چیلنج کرنے اور گروہوں کو ممنوعہ فہرست میں شامل کرنے کا اضافی اختیار بھی حکومت کو مل گیا ہے۔ رابطہ کے جرم کی مخالفت کا اصول اشتراکی جماعت کے خلاف جنگ کے زمانہ میں وضع کیا گیا تھا۔ ایک ایسا ایجنڈا جسے کانگریس دریافت کیا اور عدالت عالیہ نے تسلیم کرلیا کہ غیر ملکی زیر اثر جماعت ہے جو امریکی حکومت کا طاقت اور تشدد کے ذریعے تختہ الٹنے کے لیے دہشت گردی اور تخریب کاری کا استعمال کرتی ہے۔ چنانچہ اگر ایسی جماعت کے ساتھ رابطہ کے خلاف حفاظت کی ضرورت ہے تو لازماً اُن جھوٹی جماعتوں کے خلاف بھی حفاظت ضروری ہے جنھوں نے کبھی کوئی دھمکی دی ہو یا تشدد استعمال کیا ہو۔

چونکہ رقم قابل مبادلہ ہے اس لیے کسی ہسپتال کو کمبلوں کا عطیہ بھی ایسے ذرائع کھول دے گا جو دہشت گردی کے لیے ہوں' اس مفروضہ کے مطابق افریقی نیشنل کانگریس کے لیے عطیہ کا ہر ڈالر جو نسلی امتیاز کے لیے اس کو غیر متشدد اختلاف کے لیے دیا گیا ایک ڈالر کی رقم فاضل کر دے گا جو ANC کسی متشدد تخریبی کارروائی پر خرچ کرے گی۔ حماس جسے دہشت گرد جماعت کہا جاتا ہے خود اسرائیلی حکومت کے اندازہ کے مطابق وسائل کا ۹۵ فی صد قانونی شہری بھلائی کے کاموں پر خرچ کرتی ہے اور صرف ۵ فی صد کارروائیوں پر۔ اس کی وجہ سے ۱۹۹۴ء میں امریکی حکومت نے حماس کی رکنیت کی بنا پر ویزہ نہ دینے کی مخالفت کی تھی۔ بغیر وجہ بتائے حفاظتی قید قانونی عمل کی خلاف

ورزی ہے۔ یہ قانون حکومت کو اس صورت میں بھی کہ کسی ایسے غیر ملکی کو جو واپسی کے لیے تیار ہو اسے غیر معینہ مدت کے لیے قید رکھنے کا اختیار دے دیتا ہے۔ ایسے شخص کو قید رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کو سارے جرائم سے معافی ملنے کے بعد بھی قید رکھا جائے۔ غیر معینہ مدت کی قید کی تشریح کرتے ہوئے INS نے اپنے مقدمہ میں کہا: ''یقین کرنے کے لیے معقول جواز'' اب ''معقول حد تک شبہ'' قید کرنے کے لیے پیمانہ ہے۔

کسی نظر بندی کے اہتمام کے لیے دستوری طور پر ضروری ہے کہ حکومت جائز طریقہ سے مدافعتی نظر بندی کا جواز پیش کرے۔ پیٹریاٹ کسی ثبوت کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ یہ بغیر الزام چند دنوں کی نظر بندی کی اجازت دیتا ہے۔ عدالت عالیہ نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ مجرمانہ صورت حال میں الزامات ۴۸ گھنٹوں کے اندر عائد کر دیے جائیں۔ یہ ایکٹ نظریاتی استثناء بھی عطا کرتا ہے اور غیر ملکیوں کا داخلہ صرف ایسی تقریر کی بنا پر روکنے کی اجازت دیتا ہے جس میں دہشت گرد کارروائیوں کی حمایت کی گئی ہو۔

جبکہ عدالت عالیہ نے بہت پہلے فیصلہ دے دیا ہے کہ غیر ملکی جو امریکہ کی سرحدوں سے باہر ہیں برخلاف ان کے جو ملک کے اندر رہتے ہیں کسی طرح کا دستوری حق نہیں رکھتے، ایسا نظریاتی امتیاز آئین سے متعلق خدشات پیدا کر دیتا ہے۔ پہلی ترمیم کا مقصد ایک کھلا اور مضبوط عوامی مباحثہ قائم رکھنا اور یہ ترمیم اگر ہماری حکومت یا پسندیدہ خیالات کے حامل لوگوں کو دور رکھے گی تو ہماری سننے اور ان خیالات پر غور کرنے کی صلاحیت میں کمی واقع ہو گی اور ہمارے لیے زیادہ سمجھ داری حاصل کرنے کے مواقع بند ہو جائیں گے۔

زیادہ وسیع تناظر میں لوگوں کو صرف ان کے خیالات کی بنیاد پر الگ رکھنا آزادی کی اس روح کے خلاف ہے جس کی ریاستہائے متحدہ نمائندگی کرتا ہے۔ جو اس نئے زمانہ میں وضع کردہ تلاشیوں اور جرائم کی تفتیش کے دوران بغیر کسی ممکنہ مجرمانہ عمل بھی ٹیلیفون ٹیپ کرنے کی اجازت حکومت کو دیتا ہے، چوتھی ترمیم نے حکومت کو یہ اجازت

صرف اس صورت میں دی ہے جب کوئی فرد مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہو اور اس کے واضح ثبوت موجود ہوں۔ لیکن پیٹریاٹ ایکٹ حکومت کو اس شرط سے بری کر دیتا ہے صرف یہ دعویٰ کر کے کہ اس کی تفتیش بھی اہم اور غیر ملکی جاسوسی مقاصد کی حامل ہے۔

پیٹریاٹ ایکٹ نے دہشت گردی کی توضیح کی آڑ میں خفیہ جاسوسی کارروائی کے لیے حکومت کے اختیار کو بے حد بڑھا دیا ہے۔ ایکٹ کی شق ۲۱۵ حکومت کو اجازت دیتی ہے کہ کوئی بھی متعلق شے (کتابیں، ریکارڈ) قبضہ میں لے جا سکتی ہے، اگر تفتیش کے لیے ان کی ضرورت ہو۔ پیٹریاٹ ایکٹ کے تحت FBI کسی پبلک لائبریری میں جا کر ہر اس فرد کے بارے میں ریکارڈ طلب کر سکتی ہے جس نے کبھی بھی لائبریری کا استعمال کیا ہو۔

وہ یہی کچھ کسی بھی بینک میں کر سکتا ہے یا ٹیلیفون کمپنی، ہوٹل، موٹل، اسپتال اور یونیورسٹی میں صرف اس دعویٰ پر کہ ان معلومات کی بین الاقوامی دہشت گردی یا خفیہ جاسوسی کی کارروائیوں کے سلسلہ میں ضرورت ہے۔ اس طرح کی طاقت کا حصول صرف دعویٰ کی بنیاد پر بہت ہی سرسری اور من مانا ہے۔ کیونکہ یہ کوئی بھی ممکنہ وجہ بتانے کی ضرورت ختم کر دیتا ہے۔

سوال یہ نہیں ہے کہ FBI ایسے لوگوں کے بارے میں تفتیش کر سکتی ہے یا نہیں جو کہتے کہ وہ امریکیوں کو قتل کرنا چاہتے ہیں ان کے بارے میں ضرور تفتیش ہو سکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ FBI ان لوگوں کی تفتیش کر سکتی ہے یا نہیں جو کہتے ہیں کہ وہ فلسطینی ریاست کی حمایت کرتے ہیں۔

FBI نے تاریخی طور پر اپنی زیادہ تر دہشت گردی مخالف کوششیں کھلے ہوئے سیاسی معاشرہ کی نگرانی پر صرف کی ہیں۔

۱۱ ستمبر کے حملوں کے بعد ایک ڈرامائی عمل قانون نافذ کرنے کے لیے نسلی اور فرقہ وارانہ امتیاز پر مبنی تعارفی خاکوں پر عوام کی رائے میں تبدیلی تھا۔ تقریباً ۸۰ فی صد امریکی نسلی خاکوں کو غلط قرار دیتے تھے لیکن ۱۱ ستمبر کے بعد رائے شماری میں بتایا گیا کہ ۶۰ فی صد

امریکی پراثر خاکوں کی حمایت کرتے ہیں اگر یہ کام صرف عربوں اور مسلمانوں کے بارے میں ہو۔اس طرح ایک خاص مذہب کے خلاف مخاصمت ریاستہائے متحدہ کے قانونی نظام میں درآئی۔

نومبر میں وزارت انصاف نے ارادہ ظاہر کیا کہ وہ پانچ ہزار تارکین وطن کے انٹرویو کرے گی جس میں ان سے ان کی عمر' قانونی حیثیت اور کس ملک سے آئے ہیں اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔حقیقت میں تمام وہ لوگ جن سے سوالات کیے گئے عرب اور مسلمان تھے اور ان کی فہرست یہ تکلیف دہ احساس دلاتی تھی کہ یہ سب کچھ عربوں اور مسلمانوں کی پہچان کے لیے تھا اور خاص طور پر فرقہ واریت پر مبنی تھا۔

شکوک کے لیے یہ فرقہ وارانہ نیابت اس عقلی جواز کی یاد دلاتی ہے جو جنگ عظیم دوم کے دوران ایک لاکھ دس ہزار جاپانی النسل افراد کی حراست کے لیے استعمال کی گئی تھی۔

اس ملک میں نسلی امتیاز کی تاریخ کی وجہ سے آئین کی مساوی حفاظت کی شق نسلی یا فرقہ وارانہ تفریق کی سختی سے مخالفت کرتی ہے۔عدالت کا کہنا تھا کہ اگر ۲ فی صد اٹھارہ سے اکیس سالہ جوان شراب پی کر گاڑی چلاتے ہوئے گرفتار ہوئے تو یہ اس بات کا جواز نہیں بن سکتا کہ اس عمر کے تمام جوانوں کے لیے الکوحل پر مبنی مشروبات کی خریداری ممنوع قرار دی جائے۔

حکومت نے بارہ سو سے زیادہ افراد کو تفتیش کے لیے گرفتار کیا۔یہ گرفتاریاں بے انتہا خفیہ طریقہ سے ہوئیں۔شروع میں محکمہ انصاف نے ان قیدیوں کے متعلق کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا۔حکومت نے یہ بھی نہیں بتایا کہ کتنے لوگ پکڑے گئے ہیں اور ان کے اوپر جرائم کے الزام ریاستی نوعیت کے ہیں یا مقامی نوعیت کے۔حکومت نے ان قیدیوں کی شناخت بتانے سے بھی انکار کر دیا جو مہاجرتی یا معاملاتی گواہ تھے۔دسمبر ۲۰۰۱ء تک پانچ سو افراد قیدی تھے جس کی وجہ سے حکومت کے ارادوں کے متعلق سوالات پیدا ہوئے۔صرف ایک قیدی زکریا موسوی پر الزام کی تفتیش ہو رہی ہے۔حکومت نے کہا کہ

زکریا سمیت دس یا بارہ قیدی ان کے خیال میں القاعدہ کے رکن ہیں جو دوسرے چار سو نوے افراد کو قید رکھنے کا شافی جواز ہے۔

مہاجرتی قیدیوں پر خفیہ مقدمے چل رہے ہیں اور لوگوں کو کارروائیوں کا کچھ پتہ نہیں۔ نہ ہی مبصروں یا خاندان والوں ہی کو۔ ان کے مقدمات عوام کے لیے فہرستوں میں شامل نہیں ہیں اور مہاجرتی ججوں کو ہدایات ہیں کہ اگر ان سے دریافت کیا جائے تو ایسے مقدمات کی موجودگی سے ہی انکار کر دیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح عدلیہ کو انتظامیہ کی ہدایات پر چلنا ہوتا ہے۔

اکتوبر ۲۰۰۱ء میں محکمہ انصاف نے INS مقدمات کے لیے نئے قوانین جاری کیے جن میں ضلعی ڈائریکٹروں کو اس صورت بھی غیر ملکوں کو گرفتار رکھنے کا حق دیا گیا جب جج نے فیصلہ دے دیا ہو کہ ان کی قید کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اگر یہ عدالت کے فیصلوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی نہیں تو اور کیا ہے؟

Board of Immigration Appeals کے پاس صرف ایک درخواست دے کر INS غیر ملکی ''Automatic Stay'' حاصل کر لیتا ہے جسے اب اس وقت تک چھوڑا نہیں جا سکتا جب تک درخواست کا فیصلہ نہ ہو جائے جس میں ایک سال بھی لگ سکتا ہے اور دس سال بھی۔ اس طرح امریکی انصاف مکمل بکواس بن گیا اور قانون کے امریکی طریقِ کار کے لیے موت کی گھنٹی بج گئی ہے جو امریکی انصاف کے نظم اور انسانی حقوق کے لیے بنیاد کا پتھر ہے۔

معاملہ کے گواہوں کی قید کے سلسلہ میں رازداری قانونی اجازت سے بہت دور کی بات ہے۔ قانون حکومت کو اجازت دیتا ہے کہ اگر یہ محسوس ہو کہ کسی فرد کے پاس معاملہ کی معلومات ہیں جو مقدمہ اور جیوری کے سامنے لانے کے لیے ضروری ہیں اور اگر اس فرد کو عدالت نے بلایا تو وہ شاید فرار ہو جائے تو اسے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مقصد حکومت کو بغیر کسی موزوں وجہ کسی کو قید رکھنے اور بعد میں مزید شہادتیں تلاش کرنے کا اختیار دینا نہیں اگرچہ اس کے خلاف کوئی شہادت ہو نہ کارروائی کی ہو۔

حکومت نے وفاق کی قید میں افراد اور ان کے وکیلوں کی گفتگو سننے کا حق دیا ہے' اگر اسے جائز شبہ ہو کہ اس گفتگو سے دہشت گردی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

محکمہ انصاف نے بغیر کسی الزام کی تفتیش کیے سینکڑوں ایسے افراد کو گرفتار کیا ہے جن کا القاعدہ سے کوئی تعلق نہیں لیکن قید افراد کے نام تک بتانے کو تیار نہیں۔ اور مہاجرتی مقدمے بھی نہایت رازداری سے چلائے گئے ہیں۔ وکیلوں اور موکلوں کی گفتگو کی جاسوسی کی ہے اور جج کے فیصلہ کے خلاف لوگوں کو قید رکھا ہے۔ یہ اقدام کسی طرح دہشت گردی کی روک تھام یا ۱۱ ستمبر کے مجرموں کا پتہ لگانے کے لیے کوئی جواز نہیں ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جبر کے یہ قوانین اور گستاپو حکمت عملی کیا کسی صورت میں بھی امریکہ کے تحفظ میں اضافہ کرے گی۔ صدام حسین اور اس کے بیٹوں کی گرفتاری کے بعد بھی صدر بش کو سرنگ کے آخر میں روشنی نظر نہیں آ رہی ہے۔ وہ صدام کی مضحک گرفتاری کے بعد بھی کچھ بہت رجائی نظر نہیں آئے۔ انھوں نے متنبہ کیا کہ ''عراق میں امریکی زیر قیادت افواج کو صدام حسین کی گرفتاری کے بعد مسلسل مشکلات کا سامنا ہے' عراق میں دہشت گرد بدستور خطرناک ہیں۔ ہمارے اتحاد کا کام ابھی بھی مشکل ہے اور مزید قربانیوں کی ضرورت ہے''۔ یہ پیغام مستقبل قریب میں دہشت گردی کے اختتام کے لیے امید کا نہیں بلکہ مایوسی کا ہے۔ جہاں تک افغانستان کا تعلق ہے ایک فوجی افسر سے جب پوچھا گیا کہ وہ طالبان کو شکست دے سکتے ہیں؟ ان کا جواب تھا: ''شاید نہیں''۔

طالبان وقتاً فوقتاً افغانستان کے مختلف صوبوں میں علاقوں پر قبضہ کرتے رہتے ہیں' جہاں تک ریاستہائے متحدہ کی حفاظت کا تعلق ہے تو ۱۱ ستمبر کے حملوں سے تقریباً دو سال بعد جولائی ۲۰۰۳ء میں قومی تحفظ کے ترجمان نے کہا کہ ریاستہائے متحدہ مستقبل میں دہشت گردوں کے حملوں کے خلاف خطرناک حد تک غیر محفوظ ہے۔

یہ ترجمان کتنا درست تھا' اس کا پتہ اس امر سے چلتا ہے کہ نیویارک کے شہر کے

اندر نیویارک کی ایک محفوظ سرکاری عمارت پر دہشت گرد حملہ ہوا ہے جسے میئر نے خود امریکہ پر حملہ قرار دیا۔

اس سخت گیر قانون نے ریاستہائے متحدہ کے تحفظ میں اضافہ کے بجائے امریکی انتظامیہ کے ہاتھ میں طاقت کے غلط استعمال کا پروانہ دے دیا ہے جس سے شہریوں اور غیر ملکیوں کو اذیت اور پریشانی کے سوا کچھ نہ ملا۔

۸/ مئی ۲۰۰۳ء کے نیویارک ٹائمز نے اس قانون کے غلط استعمال کی مثال دی ہے۔ جب قانون نافذ کرنے والوں نے انعام کا لالچ دے کر گواہ یوسف حمیسہ کو مبینہ دہشت گردی کی تفتیش میں بے گناہ لوگوں کو ملوث کرنے پر آمادہ کرلیا۔ حمیسہ کو تیار کیا گیا کہ ایک معاملہ میں چار مدعیان علیہ کو ایک ایسا دہشت گرد گروہ بتائے جو وسیع حملوں کے منصوبے بنا رہا تھا لیکن عمر سیستانی نام کے ایک ۴۰ سالہ شخص نے جو حمیسہ کی کوٹھڑی کا ساتھی رہ چکا تھا گواہی دی کہ حمیسہ ملزموں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا وہ صرف بدلہ لینا چاہتا تھا کیونکہ انھیں پسند نہیں کرتا تھا۔ سیستانی نے جو امریکی شہری ہے کہا: ''وہ (حمیسہ) صرف خود پھندے سے نکلنا چاہتا تھا''۔ ڈیٹرائٹ کا مقدمہ ۱۱ ستمبر کے بعد پہلا دہشت گردی سے متعلق مقدمہ تھا۔ یہ چار ملزمان' ایک الجزائری اور تین مراکشی مسلمانوں پر دہشت گردوں کی مدد کرنے کا الزام تھا۔ انھوں نے جرم سے انکار کیا تھا۔ استغاثہ کے مقدمہ کی بنیاد زیادہ تر حمیسہ کی گواہی پر تھی۔

سیستانی نے کہا کہ وہ حمیسہ سے قید خانہ کی کوٹھڑی کے دروازے میں ایک سوراخ کے ذریعے گفتگو کیا کرتے تھے' جب ملن مش کے وفاقی قید خانہ میں تھے حمیسہ نے ان سے کہا تھا کہ اگر وہ حکومت کی مرضی کا بیان دیں تو سزا کم ہوسکتی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ان سے کچھ بھی ایسا کہوں جس میں کچھ نام آجائیں تو چھوٹ سکتا ہوں۔

قانون نافذ کرنے والے اداروں خصوصاً FBI کا پچھلا ریکارڈ سیاسی مصلحتوں کی خاطر بے گناہوں کو ملوث کرنے اور جھوٹے ثبوت تیار کرنے کی مذموم شہادتوں سے بھرا پڑا ہے۔

نیویارک ٹائمز نے اپنے ۲۷؍اکتوبر ۱۹۹۳ء کے شمارہ میں حیران کن رپورٹ شائع کی کہ کس طرح FBI نے مسلمان قائدین کے بارے میں سازش تیار کی کہ وہ اقوام متحدہ کو بم سے اڑانے والے ہیں۔اس سے ان کا مقصد ان ملزموں کو مزید ملوث کرنا تھا جن پر پہلے سے فرد جرم عائد تھی اور جن کی سازباز کے بارے میں پہلے ہی امریکی ذرائع ابلاغ اور حکومتی ادارے شور مچا رہے تھے۔نیویارک ٹائمز نے لکھا: ''حکومت کے ایک مخبر کو جس نے اقوام متحدہ کو تباہ کرنے کے منصوبہ کے ملزموں کی خفیہ ٹیپ ریکارڈنگ تیار کی تھی جو FBI نے ترتیب دی کہ کس طرح ان کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ بے خبری کی گفتگو میں جرم اپنے سر منڈھ لیں۔''

سالم نامی مشتبہ شخص نے خفیہ ریکارڈنگ کے ساتھ اپنی اور ایجنٹوں کی گفتگو بھی ٹیپ کرلی تاکہ اس کے پاس 8.1 ملین ڈالر کے لیے سند رہے اور ایجنٹ اپنے وعدہ سے مکر نہ جائیں اور اس طرح بساط الٹ گئی۔''ٹیپ میں FBI کا ایجنٹ John Antocev سالم کو معلومات حاصل کرنے کا طریقہ بتاتے ہوئے کہتا ہے: ''پمپ جانتے ہونا، اس کو ذرا پمپ کرو۔'' ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ کس طرح مال اور چالیں دہشت گردی سے متعلق تفتیش جھوٹے ثبوت حاصل کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

فرانسیسی مسلمان زکریا موسوی جس پر ۱۱ستمبر کے حملوں کی منصوبہ بندی کا مقدمہ ہے کے خلاف صرف ایک گوانتاناموکے قیدی کا اعترافی بیان ہے جس میں اسے ۱۱ستمبر کے حملوں کی پلاننگ میں ملوث کیا گیا ہے جس سے بعد میں وہ منحرف ہوگیا۔

مقدمہ کے دوران زکریا نے عدالت سے گزارش کی کہ گوانتاناموکے قیدی کو جس نے اسے ملوث کیا ہے عدالت میں بلاکر جرح کی جائے۔عدالت نے گواہ کو لانے کا حکم دیا لیکن استغاثہ نے عدالت کے حکم کی تعمیل سے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ اس سے ملک کے تحفظ کو خطرہ لاحق ہوگا۔اور یہ بھی کہ عدالت کو اس کا اختیار نہیں کہ گوانتاناموکے قیدی کو لانے پر مجبور کرے۔عدالت نے گوانتاناموکے قیدی کے بیان کی بنیاد پر شہادت کو

ماننے سے انکار کردیا اور استغاثہ سے کہا کہ یا تو گواہ کو حاضر کریں یا اس کی شہادت پر انحصار نہ کریں۔ استغاثہ بضد رہا کہ گواہ کو نہیں لایا جائے گا اور اخیر میں دھمکی دی کہ وہ مقدمہ واپس لے کر اسے فوجی عدالت میں لے جائیں گے۔ اس طرح کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ موسوی کو غلط بیانی سے ملوث کیا گیا ہے' ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ بش حکومت کس طرح ہٹ دھرمی سے عدالت کے احکامات کی خلاف ورزی کرتی ہے۔

مندرجہ بالا سخت گیر قوانین اور ان کا وحشیانہ استعمال صدر بش کی ''مسلم دنیا میں آزادی کی ترویج کی حکمت عملی'' کی دھجیاں اڑاتا ہے ''یہ صرف صدر بش کے بلند بانگ دعووں کا مذاق ہے۔''

جیسا کہ جم لوب نے ۱۰ دسمبر ۲۰۰۳ء کو ڈان میں شائع شدہ اپنی رپورٹ میں بتایا امریکہ کا قریب ترین اتحادی ازبکستان جس نے افغانستان پر حملہ کے لیے امریکہ کا اڈہ بننا قبول کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت کے لیے کسی بھی معنی خیز سیاسی اصلاح کے خلاف مورچہ زن ہو چکا ہے۔ مغرب کی طرف سے دباؤ کے باوجود صدر کریموف نے مخالف جماعتوں کو غیر قانونی قرار دیا۔ مخالفوں کو قید اور آزار میں مبتلا کیا اور وعدوں کے باوجود کوئی معنی خیز قدم نہیں اٹھایا کہ ان کے مخالفوں کو ان کی طرف سے پہنچائے جانے والے آزار رک سکتے۔ خصوصاً ان مسلمانوں کو جو ریاستی مساجد سے باہر اپنے مذہب پر عمل پیرا ہوں۔ اپنے شہریوں پر جبر میں وہ ہرگز صدام حسین سے پیچھے نہیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف زبردستی میں وہ بدنام زمانہ صدام سے کہیں آگے بڑھ چکا ہے۔ یہ حقیقت صدر بش کی جمہوریت سے محبت کو دروغ پر مبنی قرار دیتی ہے۔ واشنگٹن پوسٹ نے (۱۰ دسمبر ۲۰۰۳ء) کو رپورٹ دی کہ امریکی فوجوں نے عزت الدرانی کی تلاش میں ناکام ہو کر سمارا کے شہر پر حملہ کر کے ۲۶ نومبر کو اس کے بے گناہ رشتہ داروں کو گرفتار کرلیا۔ یہ جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی تھی جس میں زیر تسلط شہریوں کے حقوق اور مسلط قوت کی ذمہ داریاں یوں بتائی گئی ہیں: ''کوئی بھی فرد کسی ایک جرم کے لیے سزا نہیں پا سکتا جو اس نے خود نہ کیا ہو' اجتماعی سزا اور اس کے تمام اقدام اور تشدد ممنوع ہیں۔'' Lord

Steyn جوعموی Lord of Appeal ہیں اور برطانیہ کی اعلیٰ ترین عدالت کے دو ججوں میں سے ایک ہیں اپنے تبصرہ میں کہتے ہیں ''ایک ایسے وکیل کی حیثیت سے جو امریکی جمہوریت اور انصاف کو مثال سمجھتا ہوا پلا بڑھا ہے' مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ انصاف کی دیوقامت ناکامی ہے''۔

۱۱ر ستمبر کے دہشت گرد حملوں میں عالمی تجارتی مرکز کے دو مینار تباہ ہوئے لیکن دہشت گردی کے خلاف اقدام جو بعد میں ہوئے انھوں نے امریکی انصاف اور جمہوریت کی عمارت کو منہدم کر دیا جس پر ریاستہائے متحدہ کے عظیم معاشرہ کی بنیاد ہے۔

امریکی معاشرہ کی اتنی زیادہ عزت اس کی فوجی یا سماجی برتری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی اعلیٰ اقدار اور آزادی اور جمہوری اداروں کی وجہ سے ہے۔

امریکی آئین جمہوری اور وفاقی حکومت کا ایک نمونہ مہیا کرتا ہے' اس میں ریاست کے مختلف اداروں کے درمیان توازن قائم رکھنا' قانونی عمل پر کارروائی' نجی سرمایہ کاری کے لیے جنت اور لامحدود مواقع کا ملک بنانا شامل ہے۔ اس کی حقیقی عظمت اور شانداری اس کی پسندیدگی' کشش اور مثالیہ بن جانے میں مضمر ہے۔ لیکن افسوس اب ۱۱ستمبر کے بعد نہیں۔ اگر چہ ریاستہائے متحدہ کے نشیب وفراز رہے ہیں ۔ یہ ان تمام سیاسی شورشوں، مصیبتوں اور معاشی وبا اور کساد بازاری سے گزرا ہے۔ ان مصیبتوں کے دوران اس نے کم وبیش اپنے تمام تصورات اور آزادی اور جمہوری اداروں کو قائم رکھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اس نے اپنے شہریوں اور غیر ملکیوں پر پابندیاں ضرور عائد کی تھیں۔ اس نے ایک لاکھ دس ہزار جاپانی النسل امریکی شہریوں کو قید ضرور کیا تھا لیکن ان سے قیدیوں ہی کا سلوک کیا گیا، امریکی قوانین کے مطابق گوانتاناموکے اور ابوغرائب کے قیدیوں کی طرح یا افغانستان کی کوٹھڑیوں میں قید لوگوں کی طرح نہیں جو جنیوا کنونشن کی صریح خلاف ورزی ہے۔ ریاستہائے متحدہ کی آزادی اور لوگوں کی نجی زندگی کے تخلیہ کو کبھی اس طرح نشانہ نہیں بنایا گیا جیسا کہ ۱۱ستمبر کے بعد کیا گیا۔ اور زیادہ

قابل مذمت یہ ہے کہ اس تمام عمل سے امریکہ ۱۱ ستمبر کے مقابلہ میں زیادہ محفوظ بھی نہ ہوگا۔ جنوری ۲۰۰۴ء تک ریاستہائے متحدہ میں دوسرے درجہ کی حفاظتی تنبیہ نافذ کی جا چکی ہے' القاعدہ کے خطرہ کی وجہ سے کئی دنوں تک امریکہ اور برطانیہ کے درمیان پروازیں منسوخ رہیں۔ الجزیرہ پر اپنے ٹیپ شدہ پیغام میں اسامہ نے ایک دفعہ پھر مسلمانوں کو عراق میں امریکی فوجوں سے لڑنے کی ترغیب دی جو وہ اب تک کرتے رہے ہیں۔

آیئے اب ایک نظر اس پر کہ امریکہ کیا تھا جواب نہیں ہے۔

ریاستہائے متحدہ کی بنیاد ڈالنے والوں نے ۱۷۷۶ء میں فلاڈیلفیا میں اپنے اجلاس میں اپنے آپ کو آزاد اور خودمختار ریاست قرار دیا تھا۔ جارج واشنگٹن کی قیادت میں انھوں نے برطانیہ کے جارج سوم کو امریکی جنگ آزادی میں شکست دی اور برطانیہ نے ۱۷۸۳ء میں معاہدۂ پیرس میں اس کی آزادی کو تسلیم کرلیا۔ ۱۷۷۶ء کے اعلان آزادی نے انسانوں کو مساوات' زندگی' آزادی اور حصول مسرت کے حقوق کا اعلان کیا۔ انقلاب کے بعد سے فرانس نے جو مساوات' آزادی اور بھائی چارے کا گہوارہ تھا امریکہ کو آزادی کی یادگار کے طور پر مجسمہ آزادی کا تحفہ دیا جو امریکی اقدار کا نشان تھا۔ امریکہ کی بنیاد ڈالنے والوں نے ۱۷۸۹ء میں امریکہ کا آئین مرتب کیا جس میں ایک ایسے وفاق اور اس کی رکاوٹوں کے درمیان تعلقات کی حدود بھی متعین کر دی گئیں۔ بہرحال کئی سالوں بعد تیرھویں آئینی ترمیم کے Bill of Rights کے ذریعے شہریوں کے بنیادی حقوق کی تفصیل آئین میں شامل کی گئی ہے۔

پہلی ترمیم کانگریس کے کاموں کو لادینی رکھنے' آزادیٔ تقریر' آزادیٔ ابلاغ اور آزادیٔ پُرامن میل جول اور حکومت سے اپنی تکالیف کی شکایت کا حق دیتی ہے۔ چوتھی ترمیم لوگوں کو ان کے گھروں' املاک اور تمام چیزوں کی ضبطی اور تلاشی سے محفوظ رکھنے کا حق دیتی ہے۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ بغیر معقول وجہ اور جگہ کی تفصیل بتائے ہوئے چیزوں کی ضبطی اور لوگوں کی گرفتاری کا وارنٹ جاری نہیں کیا جاسکتا۔ پانچویں ترمیم میں کہا گیا کہ بغیر ایک دفعہ جیوری کے سامنے پیشی کے کوئی بھی شخص کسی بڑے یا دوسرے

جرم میں جواب دہ نہ ہوگا سوائے ان جرائم کے جو بحری بری فوج سے متعلق حالت جنگ میں یا عمومی خطرہ نوعیت کے ہوں۔ چھٹی ترمیم میں کہا گیا کہ تمام فوجداری مقدمات میں ملزم کو حق ہوگا کہ تیز رفتار مقدمہ غیر جانبدار جیوری کے سامنے چلے جو اسی ضلع کے ہوں جہاں جرم ہوا ہے اور اسے اس کے الزامات سے آگاہ کیا جائے' گواہوں کے بارے میں بتایا جائے' اپنے حق میں گواہی حاصل کرنے کا حق ہو اور اپنے دفاع کے لیے وکیل کا حق ہو۔

بنیادی حقوق کے لیے ان تفصیلی انتظامات کے بعد جو شہریوں اور غیر ملکیوں دونوں کے لیے ہیں امریکی آئین نے ان حقوق کو اور بھی جامع بنایا ہے اور ریاستی اداروں کی طرف سے جانبدارانہ اقدامات کے امکانات کے خلاف قوانین بنائے۔ چودھویں ترمیم کے مطابق ایسے تمام افراد جو ریاستہائے متحدہ میں پیدا ہوئے یا شہری بنے اور اس کے قوانین کے دائرہ میں آئے ریاستہائے متحدہ کے شہری ہیں اور اس ریاست کے جہاں وہ رہتے ہیں کوئی بھی ریاست ایسے قوانین نہیں بنائے گی جو شہریوں کے تحفظ اور سلامتی کے خلاف ہوں۔ نہ ہی کوئی ریاست کسی شخص کو اس کی زندگی آزادی یا ملکیت سے بغیر کسی قانونی عمل کے محروم کرے گی نہ ہی اپنی حدود میں کسی کو قانون کی حفاظت سے محروم کرے گی۔ قانونی عمل دور رس ہیں اور امریکی جمہوریت کو دنیا کی دوسری جمہوریتوں سے ممتاز کرتے ہیں۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ قانون میں تحریر بنیادی حقوق کے باوجود نسلی امتیاز مختلف ریاستوں میں قائم تھا اور اس قسم کے امتیازات سے تحفظ کے لیے ۱۹۶۴ء میں شہری حقوق کے قوانین کے ذریعے مزید سخت قوانین بنائے گئے جو کینیڈی کی بنیادی تجویز سے آگے بڑھ کر تھے۔ ان قوانین کے نفاذ کے لیے کانگریس کا یہ قوی ترین عہد تھا۔ اس میں سب کے لیے تمام عوامی رہائش گاہوں مثلاً ریستوران، میخانوں، ہوٹل، قربان گاہوں اور جوا خانوں میں جانے کے لیے برابر مواقع کی گارنٹی دی گئی تھی۔ اس میں رہائش اور ترقی میں امتیاز کا مقابلہ کرنے کے لیے وفاقی مشینری کو مضبوط کیا گیا ہے

اور وفاقی حکومت کو اسکول میں امتیاز کے خلاف مقدمہ قائم کرنے کا اختیار دیا گیا اور ووٹ دینے کے حق کو بھی مضبوط کیا گیا۔ اس میں اداروں اور تجارتی یونینوں کو ملازمتوں میں برابر کے مواقع فراہم کرنے کی ہدایت کی گئی اس میں غربت کے خلاف جنگ کا اعلان کیا گیا ہے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کے G.A.Res 217III کے ذریعے انسانی حقوق کا اعلان کیا تھا جس میں کہا گیا تھا:

۱۔ تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور برابر کی عزت اور حقوق کا حق رکھتے ہیں ہر ایک کو ہر حق اور آزادی کا جو اس اعلان میں دیے گئے ہیں بغیر کسی امتیاز حاصل کرنے کا حق ہے۔

۲۔ ہر ایک کو زندگی اور آزادی اور تحفظ کا حق حاصل ہے۔

۳۔ کسی کو بھی غلام یا جبری مشقتی نہیں بنایا جائے گا۔

۴۔ کوئی پر تشدد، غیر انسانی اور ذلت آمیز سلوک یا سزا کسی کو نہیں دی جا سکے گی۔

۵۔ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور بغیر کسی امتیاز قانون کے مساوی تحفظ کے حقدار ہیں۔

۶۔ ہر ایک کو یہ حق ہے کہ پوری مساوات کے ساتھ خود مختار اور غیر جانبدار عدالت کے سامنے عوامی سماعت اپنے حقوق اور فرائض کے تعین اور اپنے خلاف کسی الزام کے سلسلہ میں حاصل کرے۔

۷۔ ہر ایک ملزم کا حق ہے کہ قابل سزا جرم ثابت ہونے تک اسے بے گناہ سمجھا جائے۔

۸۔ کسی ایسے عمل یا مقصد کی بنا پر کسی کو بھی قابل سزا جرم کا مجرم نہیں سمجھا جائے گا' جو قومی یا بین الاقوامی قانون کے تحت اس وقت قابل سزا جرم نہیں تھا جب اس کا ارتکاب ہوا۔

۹۔ ہر ایک کو آزادیٔ افکار' آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ مذہب کے ساتھ مذہب بدلنے کی

آزادی ہے۔

۱۰۔ ہر ایک کو آزادی رائے اور آزادی اظہار' اجتماع اور آزادی جمعیت ہے۔

۱۱۔ حکومت کے اختیار کی بنیاد لوگوں کی رائے پر ہوگی جس کا اظہار وقتاً فوقتاً رائے شماری کے ذریعے ہوگا۔

۱۲۔ ہر ایک کو روزگار کے معاوضہ کا برابر حق ہے۔

۱۳۔ ہر ایک کو تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے۔

۱۴۔ اپنے حقوق اور آزادی پر عمل کے سلسلہ میں ہر ایک کے لیے صرف وہی حدود ہوں گی جو قانون میں مقرر کی گئی ہیں۔ اور جن کا مقصد دوسروں کے حقوق اور آزادی کی پہچان اور احترام اور اخلاق' امن عامہ اور جمہوری معاشرہ کی ضروریات پوری کرنا ہے۔

انسانی حقوق کے اس وسیع تناظر میں جو ریاستہائے متحدہ کے آئین اور جنرل اسمبلی کے عالمی اعلانِ انسانی حقوق میں نقش ہیں۔ پیٹریاٹ ایکٹ جس کی دو سو شقیں ہیں یا وہ سلوک جو طالبان اور القاعدہ کے ساتھ گوانتانامو اور ابو غرائب میں ہوئے امریکی آئین اور جنرل اسمبلی کی قرارداد اور ۱۹۴۸ء میں دیے گئے انسانی حقوق کی شدید خلاف ورزی ہے۔

ریاستہائے متحدہ کا تصورِ انصاف اور جمہوریت جو لوگوں کو متاثر کرتے تھے اب تاریخ کے اوراق میں گم ہوتے جا رہے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ کی عدلیہ نے جو انسانی حقوق اور قانونی عمل کی رکھوالی کرتی تھی ۱۱ ستمبر کے بعد بجائے انتظامیہ کی زیادتیوں کا متاثر کن ازالہ کرنے کے انتظامیہ کا ساتھ دینے کا راستہ چن لیا ہے اور کانگریس کے منظور کردہ سخت گیر قوانین اور ان کے وحشیانہ نفاذ کی توثیق کر دی ہے۔

ریاستہائے متحدہ کی عدالت عالیہ نے ایسا لگتا ہے کہ انتظامیہ کو اتنی لمبی رسی عطا کر دی ہے کہ اس سے وہ خود عدالت عالیہ کو بھی پھانسی دے سکتے ہیں۔ ۱۲ جنوری ۲۰۰۴ء کو اعلیٰ عدالت نے شہری آزادی کی جماعت اور دوسری جماعتوں کی درخواست

سنے بغیر کسی تبصرہ سے انکار کردیا، جو پہلی ترمیم کی خلاف ورزی میں کی جانے والی خفیہ گرفتاریوں اور آزادی معلومات کے ایکٹ اور آزادی اظہار کے متعلق تھیں۔ عدالت عالیہ نے اپیل کورٹ کے فیصلہ کی سرسری انداز میں توثیق کردی کہ ناموں کا انکشاف قومی تحفظ کے لیے نقصان دہ ہوگا اور القاعدہ کو مستقبل میں دہشت گردی کے منصوبوں میں مدد ملے گی۔ عدالت اپیل نے اپنے فیصلہ میں کہا تھا کہ حکومت مہاجرتی قانون کے زیر دفعہ محبوس سات سو (۷۰۰) سے زیادہ افراد اور طیاروں کے اغوا کی تفتیش کے لیے قید ہونے والے گواہوں کے نام خفیہ رکھ سکتی ہے۔ وکیلوں کا کہنا تھا کہ ایسی خفیہ قید پہلی ترمیم کی صریح خلاف ورزی ہے جس میں سوائے شدید مجبوری کے گرفتاری کو خفیہ رکھنا ممنوع ہے۔ ان وکیلوں نے مزید بحث کی کہ اپیل کی عدالت نے حکومت کی ترجیحات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ جو ظاہری شکل میں ہی غیر موثر اور ضرورت سے زیادہ وسیع ہیں جن کی ریکارڈ سے کوئی بنیاد نہیں ملتی ہے''۔

امریکی عدالت عالیہ پر پچھلے دنوں نہ صرف حقیقی دنیا سے دوری بلکہ اکڑ' بے ایمانی' شانداری اور اصولوں' تاریخ یا منطق کا کوئی احترام نہ کرنے کا الزام لگایا جاتا رہا ہے جیسا کہ ستمبر ۲۰۰۵ء کے ماہنامہ اٹلانٹک میں Benjamin Watts نے اپنے مضمون میں لکھا ہے۔ مصنف نے امریکی عدالت اپیل کے چند تبصروں کی مثال دی ہے۔ Sibberman نے جو DC سرکٹ کی عدالت اپیل کا جج ہے عدالت عالیہ کو ناعدالت کہا ہے یعنی ایک ایسی عدالت جو اپنے آپ کو اپنی ہی سابقہ آراء کا پابند نہیں سمجھتی۔ ۱۷ویں سرکٹ کے جج Richard Rosenar نے کہا: ''عدالت عالیہ نے اپنی ہی پچھلی مثالوں پر کوئی دھیان نہیں دیا ہے۔'' سرکٹ عدالتوں کے میانہ رو ججوں نے عدالت عالیہ کے فیصلوں پر تنقید کی۔ ۲۰۰۳ء کے ایک عوامی پینل میں نویں سرکٹ عدالت کے ایک جج William Fletcher نے عدالت عالیہ پر حقائق کو مسخ کرنے کا الزام لگایا اور شدید مذمت کی۔ ایک اور میانہ رو جج نے یاد دلایا کہ کچھ جج حضرات نے بغیر حقائق سے پوری طرح واقفیت حاصل کیے ہی فیصلے دے دیے۔ اور یہ عدالت عالیہ

خود فریبی کا شکار ہے اور اپنے اختیار کی اکڑ میں مبتلا ہے جو کہ دراصل حکومت کی دوسری شاخوں کے لیے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ امریکی آئین کی شق II میں صدر کے انتظامی اختیارات کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے اور بادشاہوں کے اختیارات کی طرح لامحدود ہے اور یہ اس قانون کی ذیل میں آتا ہے جسے شاہی اختیار کہتے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ شاہی اختیار کی وسیع تاریخ کی وجہ سے دلیل کے مطابق آئین سازوں نے فوراً ہی انتظامیہ کے اختیارات پر بحث کی تھی۔ شق نمبر ا کے برخلاف جس میں کانگریس کے لیے صرف چند قانون ساز اختیارات کا ذکر ہے۔ شق نمبر II انتظامی اختیارات صدر کو دیتی ہے یعنی پورے اختیارات' اس کا کچھ حصہ نہیں۔ ہملٹن نے فرانس اور انگلستان کے درمیان جنگ میں امریکہ کی غیر جانبداری کے اعلان کا دفاع اس بنیاد پر کیا تھا کہ صدر کو اس کا اختیار ہے۔ Madison نے الزام لگایا کہ ہملٹن کا بیان شاہی اختیار دوبارہ قائم کرنے کی کوشش ہے۔ یہ دلیل امریکی تاریخ میں کئی دفعہ دہرائی گئی ہے خاص طور پر بحرانی صورت حال میں' لنکن نے حاضری کے حکم (Habeas Corpus) کو ملتوی رکھنے کے لیے وسیع اختیارات کا استعمال کیا تھا۔ بعد میں ''وڈرو وِلسن' فرینکلن روزویلٹ اور نکسن نے ایسے ہی وسیع اختیارات کا دعویٰ کیا۔ تھیوڈور روز ویلٹ نے صدر کے اختیارات کے تصور کے بارے میں کہا: ''میں اس نظریہ کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ قوم کے لیے جو کچھ ضروری ہو اس کے لیے صدر خاص منظوری کے بغیر عمل نہ کر سکے' مجھے یقین ہے کہ یہ صدر کا حق نہیں بلکہ فرض ہے کہ قومی ضرورت جو بھی ہو وہ کرے سوائے اس کے کہ یہ عمل آئین کے خلاف ہو''۔

۱۰ جولائی ۲۰۰۳ء کو نیویارک ٹائمز نے رپورٹ دی کہ ایک بری طرح منقسم وفاقی عدالت پر اپیل نے صدر بش کے ایسے اختیارات کی توثیق کی جس کے تحت وہ کسی دشمن لڑاکے' امریکی شہری' میدان جنگ میں گرفتار لوگوں کو غیر محدود مدت کے لیے قید رکھ سکتے ہیں اور اسے وکیل کے حق سے محروم رکھ سکتے ہیں۔ چوتھے سرکٹ کی عدالت نے ۸ میں

سے ۴ ووٹوں سے جنوری میں ایک فیصلہ کی توثیق کی جو اعلیٰ انتظامیہ کی اہم ترین قانونی فتح ہے جس کے ذریعے اس کا اختیار پہلی ستمبر سے شروع کیا گیا۔ دونوں طرف کے چار چار ججوں نے الگ الگ اور بعض اوقات سخت الفاظ پر مبنی آراء دیں جس سے قومی تحفظ کے مفادات اور شہری آزادیوں کے معاملہ میں گہری تقسیم نظر آتی ہے۔ جنوری ۲۰۰۳ء میں ایک بائیس سالہ سعودی النسل امریکی جسے بظاہر افغانستان میں پکڑا گیا تھا اور اب فوجی قید میں ہے دشمن جنگجو کی حیثیت سے اپنی گرفتاری کو چیلنج نہیں کرسکتا۔ پینل نے کہا کہ چونکہ ایام جنگ کے صدر کی دہشت گردی سے لڑنے کے لیے زیادہ اہمیت ہے اس لیے عدالت کو جناب حمدی کے لیے وکیل کی خدمات سے انتظامیہ کے انکار پر عدالت کو سوال نہیں اٹھانا چاہیے۔ نہ ہی حمدی کو یہ حق ہے کہ ان کی قید کی مدت کے بارے میں ان کو بتایا جائے۔ جج Diana Gribble Motts نے مکمل کورٹ کے فیصلہ سے انحراف کرتے ہوئے کہا کہ جنوری کا فیصلہ گویا: ''ہماری تاریخ میں پہلی دفعہ کسی وفاقی عدالت نے شہریوں کی حفاظت کے خاتمہ کی منظوری دی ہے جو انھیں آئین میں حاصل ہے اور اس کے لیے صرف انتظامیہ کی وہ تعریف استعمال کی جو وہ دشمن جنگجو کی کرتے ہیں بغیر اس تشریح کی حقیقت سمجھے۔

وفاقی اپیل کے پینل نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ گوانتاناموکیوبا کے بحری اڈہ پر افغانستان سے لائے گئے اور قیدی اپنی قید کو چیلنج نہیں کرسکتے کیونکہ وہاں وفاقی عدالت کا اختیار نہیں۔ ۱۲ جون کو ایک منقسم وفاقی عدالت نے فیصلہ دیا کہ محکمہ انصاف ان سات سو سے زیادہ گرفتار افراد کے نام چھپانے میں حق بجانب ہے جنھیں ۱۱ ستمبر کے حملوں کے بعد مہاجرتی قوانین کی خلاف ورزی کے لیے قید کیا گیا تھا۔ حمدی اور Jose Padilla کے معاملہ میں ایک مختصر حکومتی اعلان ہے کہ جس میں انھیں دشمن جنگجو کہا گیا ہے۔ جج نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ انتظامیہ نیک نیت ہے لیکن عدالتوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ امریکی شہریوں کی آزادی بغیر قانونی عمل نہ چھیننے دیں۔ ولکنسن سوم جس نے جنوری والی رائے لکھی تھی کہ حمدی کی قید کا معنی خیز عدالتی جائزہ لیا گیا ہے۔ لیکن دوران جنگ

بہر حال ہماری افواج موقع پر بے شمار امتیازی فیصلے کرتی ہیں جن میں سے کئی میں موت اور زندگی کا سوال ہوتا ہے۔ غیر ملکی لڑائی میں کیے گئے امتیازی فیصلوں کو داخلی آزادی سے ملانا ایسا عمل ہوگا جس کی مثال نہیں۔ چنانچہ Lord Steyin کے بیان کے مطابق امریکی انصاف اور جمہوریت کا اعلیٰ مثالیہ جو ''بری طرح ناکام رہا ہے''۔ حالیہ اخباری رپورٹ بتاتی ہے کہ اب عدالت عالیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ وفاقی عدالت اپیل کے خلاف ۱۱ ستمبر کے سلسلہ میں قیدیوں کی اپیل کی سماعت کرے گی۔

یہ ہے کہ ریاستہائے متحدہ دُنیا کی سب سے طاقتور فوجی طاقت جسے اپنے شہریوں کے تحفظ کے لیے اپنے قیمتی اثاثے ''آزادی اور تخلیہ'' کے حق کی قربانی دینی پڑی۔ زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ ریاستہائے متحدہ اپنے شہریوں کی آزادی اور تخلیہ کی قربانی دینے کے بعد بھی گمشدہ تحفظ دوبارہ حاصل کرنے کے قریب بھی نظر نہیں آتا۔ اس لیے ریاستہائے متحدہ کے پاس کوئی ایسا اخلاقی یا قانونی حق باقی نہیں رہا کہ جمہوریت اور آزادی پر مبنی نیا عالمی نظام (Order) نافذ کرے۔ صدر بش کے لیے زیادہ اچھا ہے کہ امریکی عوام کی آزادی اور جمہوریت کو مصنوعی تنفس دیں کیونکہ اس کا دم گھٹ رہا ہے بجائے اس کے کہ غلط فوجی مہم جوئی کے ذریعے مشرق وسطیٰ کے ملکوں پر جمہوریت نافذ کرنے پر تل جائیں۔ طبیب کے لیے خود اپنا علاج کرنا ضروری ہے۔

باب : ۵

امریکی سامراج۔ ذرا مختلف

ایک اخباری کانفرنس میں الجزیرہ کے نمائندہ نے رمز فیلڈ سے پوچھا کہ کیا ریاستہائے متحدہ اپنا سامراج پھر سے قائم کرنے پر تلا ہوا ہے؟ یہ سوال سیکرٹری دفاع کی برداشت سے باہر ہوگیا اور انھوں نے غصہ میں چیخ کر کہا کہ ریاستہائے متحدہ کبھی سامراجی طاقت نہیں تھا، نہ کبھی ہوگا۔

اس کے بعد امریکی پریس خود بھی اُبھرتے ہوئے امریکی سامراج پر غور کرتا رہا ہے۔ John Ikenberry نے اپنے چبھتے ہوئے اور فکر انگیز مضمون میں Foreign Affairs Sept, Oct. 2002) بہت ہی جامع طریقہ سے ریاستہائے متحدہ کے نئے سامراجی منصوبہ کو ایک یک قطبی دنیا کی تشکیل کے لیے عظیم الشان حکمت عملی قرار دیا ہے۔ یہ حکمت عملی امریکہ کے لیے طاقت کے یک طرفہ اور پیش بند استعمال پر منحصر ہے۔ اگر ممکن ہو سکے تو ہم خیال اتحاد کے ساتھ لیکن انجام بین الاقوامی برادری کے اصولوں سے صرفِ نظر کر کے۔

Ikenberry کے خیال میں ریاستہائے متحدہ نے ان جدید سامراجی تصورات کے ذریعے عالمی معیارات کے قیام، خطرات کے تعین، طاقت کے استعمال، انصاف مہیا کرنا، سب کے لیے اپنا عالمی کردار متعین کر لیا ہے۔ اور اس طرح بین الاقوامی برادری اور سیاسی حصہ داری کی چادر کو تار تار کرنے کی دھمکی دی ہے، خاص طور پر ایسے وقت جب برادری اور حصہ داری کی سخت ضرورت ہے۔

۱۱ر ستمبر کے بعد ریاستہائے متحدہ نے جو نئی سامراجیت کی مہم چلائی وہ امریکہ کی

اس دوشاخہ خارجہ پالیسی سے متضاد ہے جو ۱۹۴۰ء میں طے کی گئی تھی اور جس کی بنیاد حقیقت پ... نہ اثرات کے سدباب اور حملے روکنے پر تھی۔ ریاستہائے متحدہ کی غلط مہم جوئی ایسا لگتا ہے کہ تاریخ کو اپنے آپ کو دہرانے پر اکسا دے گی، جو اس دفعہ پورے انتقامی جوش کے ساتھ عالمی طاقت کے توازن کو تباہ کر دے گا۔

رمز فیلڈ نے پیش بند کارروائی کا یہ جواز گھڑا کہ ثبوت کی غیر موجودگی کثیر تباہی کے ہتھیاروں کی غیر موجودگی کا ثبوت نہیں ہے۔ لیکن Ikenberry کہتا ہے کہ اس قسم کی تجویز اقوام متحدہ کے میثاق کی شق نمبر ۵۱ میں متعین کیے گئے دفاع کے بین الاقوامی اصول کو بے معنی کر دیتی ہے۔

West Print میں صدر بش نے اپنے اعلان: ''فوج کو دنیا کے کسی بھی تاریک گوشہ پر حملہ کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے'' کے ذریعے پیش بند فوجی حملہ کی امریکی تجویز پیش کی اور اس طرح دنیا کے لیے طاقت کے استعمال کا کوئی واضح اصول نہ رہا۔

بین الاقوامی اصولوں اور قانونی جواز کی رکاوٹ کے بغیر بے لگام سامراجی عزم قرین قیاس ہے کہ ریاستہائے متحدہ کو بھی پچھلی سامراجی طاقتوں کی طرح خود حصاری کے پھندے میں پھنسا دے، جس کا انجام شدید ردعمل ہوتا ہے۔ تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ جب اس قدر ریاستوں نے جنھیں کوئی ریاست یا ریاستوں کا اتحاد چیلنج نہیں کر سکتا تھا، خود ف... کے جال میں پھنسنا پسند کر لیا تو وہ تقریباً ہمیشہ اپنی خود فریبی کا شکار ہو کر خود ہی اپنے زوال کا سبب بنیں گی۔ سہ ماہی جریدہ National Interest نے ۲۰۰۲ء میں موسم بہار کا ایک پورا شمارہ، ریاستہائے متحدہ کے سامراجی رجحانات کے لیے مخصوص رکھا اور مختلف سامراجوں کے عروج و زوال کے تجزیہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ریاستہائے متحدہ سامراجیت کی راہ پر بہت آگے نکل چکا ہے۔ اخیر میں جریدہ نے متنبہ کیا کہ اپنے سامراجی مقاصد کے حصول میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ کے لیے مقدر ہو چکا ہے کہ دوسری سامراجی قوتوں کی راہ پر ہی چلے گا اور اپنے آپ کو

اس قدر پھیلا لے گا کہ خود ہی اپنے زوال کا باعث بن جائے گا۔

اس جریدہ نے ایک مضمون میں سامراج کی تعریف اس طرح کی ہے کہ کوئی ایک قوم دوسروں کے ظاہری رویہ کے اصول طے کرے اور داخلی رویوں کے لیے بھی ایسی قابل قبول حد مقرر کرے جو انھیں زیردست رکھے۔

جریدہ امریکی تاریخ سے گزرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچا، انیسویں صدی کے اواخر سے ریاستہائے متحدہ فی الواقع مغربی نصف کرہ کے زیادہ تر حصہ میں سامراجی طاقت تھا اور مغربی فلپائن میں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۹۸ء تک اعلانیہ طور سے جریدہ نے نشاندہی کی کہ آج امریکہ مغربی نصف کرہ میں خلیج فارس کے عرب ساحل پر اسقف اعظم کے درجہ سے تھوڑا ہی کم اثر رکھتا ہے۔ پرانی طرز کی فتوحات، جس میں علاقوں پر قبضہ اور آبادیوں پر زبردستی تسلط قائم کیا جاتا ہے جو تادیر قائم رہتا ہے کبھی کبھی سیاسی مسئلہ کے طور پر نہیں اٹھایا جاتا۔ ہم معیشت اور ثقافت کے ذریعے نوآبادیات بناتے ہیں چاہے ہمارا نقطہ نظر کتنی ہی بے شرم مادیت پر مبنی ہو۔

ایک اور مضمون میں جریدہ نے دلیل دی ہے کہ طالع آزما اور غلط کار سامراجی طاقتیں ہمیشہ طاقت کے توازن میں تبدیلی کے خوف کی وجہ سے پیش بند حملوں میں ملوث ہوتی رہی ہیں۔ اس کی مثال جرمنی کا روس پر جنگ مسلط کر دینا ہے تاکہ روس کو اس قدر فوجی طاقت حاصل کر لینے سے روکا جا سکے کہ وہ جرمن فوج کو شکست دینے کے قابل ہو جائے۔ لیکن یہ ترکیب الٹی پڑ گئی جس کی وجہ سے جو فوج ممکن تھی وہ حقیقت بن گئی اور بعد میں دوسری طاقتیں جرمنی کے خلاف متحد ہو گئیں تاکہ اس کو سب کے اوپر حاوی ہونے سے روک سکیں۔ بین الاقوامی نظام میں ریاستیں اور دوسری طاقتیں کسی خطرناک ریاست کے خلاف معاہد ہو جاتی ہیں۔ بسمارک کا قول ہے کہ پیش بند جنگ ایسی ہے جیسے کوئی موت کے ڈر سے خودکشی کر لے۔

جب سامراجی طاقتیں دشمنوں کو کاغذی شیر سمجھنے کے باوجود سامراج کے تحفظ کے لیے ایسا خطرہ سمجھ لیں جسے مطمئن رکھا جا سکتا ہو مگر ایک سخت حملہ کے ذریعے تباہ کر دیا

جاسکے تو وہ ضرورت سے زیادہ پھیلاؤ اختیار کرلیتی ہیں۔ جاپانی جنگ پسند ریاستہائے متحدہ کو ایک بہت بڑی طاقت سمجھتے تھے جسے شکست دینے کے لیے بہت بڑی طاقت کی ضرورت ہے۔ ساتھ ساتھ جاپانی امریکہ کی حکومت کو اتنا کمزور اور مذبذب سمجھتے تھے کہ پرل ہاربر پر ایک سخت حملہ انھیں جوابی جنگ سے روک دے گا۔ اسی طرح بش حکومت نے عراق کے خلاف جنگ کے لیے اس مفروضہ کو بنیاد بنایا کہ اگر فوراً پوری طاقت سے حملہ نہ کیا گیا تو صدام کو کثیر تباہی کے ہتھیار بنانے سے روکا نہیں جاسکتا۔ رمزفیلڈ نے کہا کہ اگر حملہ کیا گیا تو صدام کثیر تباہی کے ہتھیار استعمال نہیں کرے گا کیونکہ عراقی فوج اس کے لیے اس کا حکم نہیں مانے گی۔

سامراجی حکومت کے قیام کے لیے ایک اور غلط فہمی پر مبنی مقصد یہ ہے کہ ریاستوں میں فوجی طور پر طاقتور سامراج کی گاڑی پر سوار ہوجانے کا رجحان ہوتا ہے۔ دوسری جنگ کے دوران سوویت یونین نے اپنے آپ کو اس خودفریبی میں مبتلا ہونے دیا کہ برلن، کیوبا، اور ترقی پذیر دنیا میں طاقتور فوجی کارروائی اس کی سیاسی اور فوجی طاقت کا ایسا زوردار مظاہرہ کرے گی کہ نام نہاد ترقی پذیر طاقتیں فوراً سوویت گاڑی پر سوار ہوجائیں گی اور طاقت کا توازن اشتراکی بلاک کے حق میں مزید بہتر ہوجائے گا۔

سوویت یونین نے اسے ''طاقتوں کے ربط'' کا نام دیا۔ درحقیقت گاڑی پر سوار ہونے کے تاثر سے طاقت کے توازن کا تاثر زیادہ اہم تھا۔ یک طرفہ فوائد کے لیے ضرورت سے زیادہ دباؤ ڈالنے کی وجہ سے سوویت یونین کمزور تر رہ گیا۔ اس کی وجہ سے چرچل نے یوں کہا انھوں نے آزاد دنیا کو متحد کرنے کے لیے تین سالوں تک دانستہ کوشش کیوں کی۔

۱۹۹۱ء کی جنگ خلیج کے دوران سابقہ بش انتظامیہ کی دلیل یہ تھی کہ عراق کے کویت پر قبضہ کو ختم کرنا یوں ضروری ہے کہ مشرق وسطیٰ میں دوسری عرب ریاستوں کو عراق کی گاڑی پر سوار ہونے سے روکا جاسکے۔ موجودہ بش انتظامیہ کو امید ہے کہ گاڑی پر سواری کی حرکیات کو اپنے حق میں استعمال کرسکے گا۔

ریاستہائے متحدہ نے عراق پر حملہ کے لیے حمایت حاصل کرنے میں مشکلات کے باوجود اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرلیا کہ پیش بند حملوں کی حکمت عملی دوسروں کو اس کی گاڑی پر سوار ہونے کی تحریک دے گی۔ عراق کے خلاف جنگ کے ایک امریکی معمار رمزفیلڈ نے کہا کہ اگر جنگی قائد درست عمل کریں تو دوسرے ہمارے پیچھے آئیں گے اور ہمارے انصاف پر مبنی مقصد کی حمایت کریں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے انھوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کیا۔ انتظامیہ میں کچھ حقیقت پسندوں نے بحث کی ہے کہ ان کی پالیسی طاقت کے توازن کے نظریہ کے مطابق تو ہے مگر NSS کی لفاظی اس نظریہ کو الٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اپنے اور دوسروں کے تحفظ کے لیے طاقت کے استعمال کے ذریعے ریاستہائے متحدہ طاقت کا توازن قائم رکھنے کے لیے اپنے عزم کی نمائش کرتا ہے جس کی وجہ سے ایک طاقت کا عدم توازن پیدا ہوجاتا ہے جو امریکہ کے حق میں ہے۔ یہ تصور قانوناً اسی قدر غلط ہے جس قدر سوویت یونین کا نظریہ ''طاقتوں کا ربط۔''

''بڑی ریاست کا فرضی تصور'' ایک اور عقیدہ ہے جو سامراجی طاقت بنانے اور اسے مضبوط کرنے کی وجہ ہے۔ ریاستہائے متحدہ سامراج کہلائے جانے کو کتنا ہی ناپسند کرے وہ اسی طرح دوسروں کے ہاتھ مروڑ کر تعاون حاصل کرتا رہا ہے جس طرح تاریخ میں تمام سامراج کرتے آئے ہیں۔

عراق کے مسئلہ پر اتحادیوں اور دوسروں کو یک طرفہ عمل کی دھمکی دی گئی، روس کو مجبور کیا گیا کہ ہتھیاروں کو محدود رکھنے کی حکمت عملی پر امریکی شرائط قبول کرے جو قبول کرنے یا نہ کرنے پر مبنی تھیں۔

یورپی یونین کے ارکان کو مجبور کیا گیا کہ امریکی افسروں کے لیے عالمی جرائم کی عدالت میں مقدموں سے استثناء قبول کریں۔ جرمنی کو جنگ عراق کی مخالفت پر جھڑکا گیا۔ اسی طرح ماحولیات پر کثیر القومی تحاریک کو نامنظور کردیا گیا۔ سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ نے حکمت عملی پر اپنی ذاتی رائے میں کہا کہ دوسروں کو راضی کرنے کی اس حد تک کوشش

سے بچنا ہے کہ ہمارا مقصد ضبط ہو جائے۔ کبھی کبھی سامراجی پھیلاؤ کے موعودہ فوائد
نظریاتی بھی ہو سکتے ہیں مثال کے طور پر فرانس کا تہذیب پھیلانے کا مشن یا دنیا
کو جمہوریت کے لیے محفوظ بنانے کا امریکی مشن۔ جان فوسر ڈلس نے دس سال پہلے
آئزن ہاور کے وزیر دفاع بننے سے پہلے لکھا تھا کہ تمام سامراجی طاقتیں عظیم عقائد سے
متاثر رہی ہیں مثلاً ظاہر قضائے مبرم یعنی (manifest destiny) گورے کا بوجھ۔
انھوں نے لفاظی کی، ''ہم امریکیوں کو ایک عقیدہ کی ضرورت ہے جو ہمیں طاقت دے
ایک ایسا واضح نظریہ کہ ہم خود بھی محسوس کریں کہ ہمارے پاس اسے پوری دنیا میں
پھیلانے کا مشن ہے۔'' انتظامیہ کی حکمت عملی کی دستاویز عراق اور دوسرے ملکوں میں
جمہوریت کی ترویج کے لیے بلند آواز لفاظی سے بھری ہوئی ہے جو جبر کا شکار ہیں۔
N.S.S کی دستاویز سے پیش لفظ میں دعویٰ کیا گیا کہ ریاستہائے متحدہ کے پاس بے
مثال فوجی قوت ہے جس کی وجہ سے آزادی کے فوائد پوری دنیا میں پھیلانے کا موقع
پیدا ہوا ہے۔ ہم جمہوریت، ترقی، آزاد بازار اور آزاد تجارت دنیا کے ہر گوشہ تک پہنچانے
پر واقعی کام کریں گے۔ سماعت کو یہ عوامی تعلقات کی ایک مشق لگتی ہے جو امید وار بش کی
تنبیہ پر الٹ پڑتی ہے جو ملک سے باہر قوموں کی تعمیر کے خلاف تھی۔ قومی تحفظ کی حکمت
عملی پر سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ کے بیانات میں جمہوریت کی نوید کا موضوع بہت کم آیا ہے
جس سے انتظامیہ کی نیت کے بارے میں بہتر پتہ چلتا ہے۔

بش حکمت عملی کے خلاف نیویارک ٹائمز میں ایک اشتہار میں بتیس نمایاں
تعلقات عامہ کے ماہرین نے جن میں سے زیادہ تر حقیقت پسند ہیں، اپنا معاملہ یوں
پیش کیا ہے: ''نئی پیش بند جنگی حکمت عملی کے محرک الزام لگاتے ہیں کہ ایسے حقیقت
پسند ایک ایسی دنیا سے واقف نہیں جس میں امریکہ کی عظیم الشان طاقت کے خلاف
توازن پیدا کرنے کے لیے کوئی اتحاد بنانا ممکن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی
بدمعاش ریاستیں اور ان کے حواری اپنے طور پر روایتی طریقوں سے امریکہ کا کچھ بگاڑ
نہیں سکتے۔ یہ بھی درست ہے کہ روس اور چین جیسی امکانی بڑی قوتیں ابھی تک کی فوجی

مداخلتوں کی سخت مخالفت سے کتراتی رہی ہیں۔

حقیقت پسند بحث کرتے ہیں کہ ریاستہائے متحدہ کو پتہ چلے گا کہ اس کا اپنا جارحانہ عمل ان کا عملی مماثل پیدا کرتا ہے۔ کچھ سابق توسیع کار سامراجی قوتوں نے توازن پیدا کرنے والے اتحاد کی مخالفت میں سست روی کے باوجود اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ پھیلا ہوا اور دشمنوں میں گھرا پایا۔ اگرچہ بعد کے فاتحین نپولین اور ہٹلر کو متاثر کن متوازن اتحاد بنانے میں مشکل ہوئی تھی۔

افغانستان ورعراق میں سامراج کے لیے نئے جوش وخروش کے تعاقب میں ریاستہائے متحدہ کی غلط کاری زیادہ تر نشانہ سے ہٹ گئی ہے اور بڑی حد تک بڑی ریاست طاقت کے توازن، طاقت کی سواری اور بے مثل فوجی طاقت کے غلط فہمی پرمبنی سامراجی نظریات کو دھماکے سے اڑا دیا گیا ہے۔ بعد از جنگ افغانستان مختلف جنگجوؤں کی جاگیر بن گیا ہے جو ایک دوسرے سے دست وگریباں ہیں' طالبان واپس آنے کے لیے پر تول رہے ہیں اور امریکی طاقت کے خلاف افغانستان میں شورش بڑھتی جارہی ہے۔ افغانستان میں ایک حفاظتی افسر نے کہا کہ کسی کو نہیں معلوم کہ افغانستان میں کون جیت رہا ہے۔

لویا جرگہ کے منظور کیے ہوئے دستور کے مطابق کوئی بھی قانون قرآن اور سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔ یہ بات امریکی جمہوریت کا مذاق اڑاتی ہے' عراق میں اگر کچھ ہو رہا ہے تو صدام کے دونوں بیٹوں کی لڑتے ہوئے ہلاکت اور پھر خود صدام کی گرفتاری کے باوجود شورش بڑھ رہی ہے۔ عراقیوں نے جمعہ کی نماز کے بعد صدام کی گرفتاری کے خلاف مظاہرہ کیا جو بغداد میں سب سے بڑی مسجد امام ابوحنیفہ میں ہوا۔

صدام کی گرفتاری کے بعد بھی بغاوت کے کم ہونے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صدام کی وفادار طاقتوں کے علاوہ دوسری طاقتیں ہیں جو عراق میں گوریلا جنگ کی حقیقی کمان اور اختیار کی حامل ہیں۔

اگرچہ صدام کا کوئی بھی حامی نہیں۔ جو ملک عراق میں امریکی فوجی کارروائی کی

مخالف کرتے رہتے ہیں، وہ بھی امریکی زیر قیادت متسابط حکومت کی حمایت کر رہے ہیں اور انھوں نے امریکہ کی بنائی ہوئی گورننگ کونسل کو عراق کی نمائندہ حیثیت سے تسلیم کرلیا ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک سے انصاف پسند عراق میں جمع ہو گئے ہیں تاکہ قابض فوجوں سے لڑیں اور اُن سے سخت مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس بات نے حقیقت پسندوں کے نظریہ کو درست ثابت کر دیا ہے جو بش کی اس حفاظتی حکمت عملی کے خلاف تھا جس کی بنیاد طاقت کے توازن اور طاقت کی سواری کے سیاسی اور فوجی طاقت کے نظریہ پر تھی۔ حقیقت پسندوں کا نظریہ یہ کہتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ کو پتہ چلے گا کہ ''اس کا اپنا جارحانہ عمل ان کا عملی مماثل پیدا کرتا ہے۔ کچھ سابق توسیع کار سامراجی قوتوں نے اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ پھیلا ہوا اور دشمنوں میں گھرا ہوا......''

نپولین کے زیر قیادت فرانسیسی اور ہٹلر کے زیر قیادت جرمن سامراجوں نے بیک وقت اپنے مخالفوں پر حملے کر دیے کہ متاثرکن حقیقی اتحاد آخر کار عمل میں آ گیا اور نپولین اور ہٹلر سے مقابلہ کر کے ان کو شکست فاش دی۔

آج بھی بہت ہی اعلیٰ روابط کے حامل اتحاد کی عدم موجودگی میں کچھ پریشان کن ریاستوں اور دہشت گرد گروہوں کی بیک وقت مزاحمت عالمی پیش بند کارروائی کی حکمت عملی کے لیے بڑا خطرہ بن سکتی ہے۔ ملکی حفاظت کی بہت ہی پرجوش مزاحمت اکثر بہت ہی طاقتور ریاستوں کو جو بہت زیادہ نقصان برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتیں زچ کر دیتی ہے جس طرح ویت نام اور الجزائر میں ہوا۔ اگر وہ مغربی کنارے کی طرح حاوی نہ بھی ہوں تو جنگ جاری رکھ سکتے ہیں جو طویل عرصہ تک کثیر اخراجات کا باعث ہوں۔

زمانہ حال میں امریکہ اس قدر طاقتور ہے کہ اس کے نشانہ کی زد میں کمزور ریاستوں میں یہ فکری نتیجہ بڑھ سکتا ہے کہ دہشت گرد حکمت عملی کے ساتھ کثیر تباہی کے ہتھیار ہی ریاستہائے متحدہ کی فوجی غلط کاریوں کا جواب ہو سکتے ہیں۔ امریکہ کی بے پناہ ناقابل چیلنج فوجی طاقت کے باوجود اس کے خطرہ میں مبتلا کمزور طاقتیں اس قسم کی کثیر خرچ مزاحمت کے لیے باہر سے وسائل حاصل کرتی ہیں۔

بش کی حکمت عملی کا مطمح نظر کسی مخالف کو اس کے مقابل آنے یا آگے بڑھنے کی امید میں فوجی طاقت کے حصول کی کوشش سے باز رکھنا ہے۔

آج مخالفوں کا کوئی اتحاد بھی موجودہ حالات میں امریکہ کے برابر آنے کی امید نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر ان مخالفین کو فوجی طاقت کے استعمال سے مستقل خطرہ محسوس ہوتا رہا تو وہ اس دیو کو دور رکھنے کے لیے دہشت گردی یا کثیر تباہی کے ہتھیاروں ہی کی طرف جاسکتے ہیں۔

بلاشبہ سامراج کی پرفریب تاریخ یہی بتاتی ہے کہ پیش بند جنگ کا عام اصول یہی ممکنہ نتیجہ سامنے لاتا ہے جس سے بچاؤ بش حکمت عملی کا مقصد ہے۔

امریکہ کی ان تمام سامراجی غلط کاریوں کے پیش نظر جو اس نے افغانستان اور عراق میں کیں اور ایران، شام، اور شاید سعودی عرب کے بھی خلاف اس کے ارادے جن کا مقصد امریکہ کے مفادات اور اقتدار کے مطابق مشرق وسطیٰ کی تشکیل نو ہے، ریاستہائے متحدہ امریکہ سامراجی قوت جیسا کردار ہی ادا کر رہا ہے۔ بادی النظر میں ایسا ہی محسوس ہوگا کہ سامراجیت کا یورپی تجربہ امریکہ سے مماثلت نہیں رکھتا۔

اولاً یورپی واضح طور سے اور سرکاری طور پر اپنے سامراجی نظام کو سامراج کہتے تھے اور اپنے زبردست علاقوں کو نو آبادیات اور تابع کا نام دیتے تھے، جبکہ امریکی اپنے سامراجی تعلقات کے لیے ان الفاظ کے استعمال سے بچتے ہیں۔ یورپی نو آبادیات کے قریب ترین مماثل وہ علاقے تھے جن پر امریکی سپانوی جنگ میں فتح کے بعد امریکہ قابض ہوا تھا خاص طور پر فلپائن اور پورٹو ریکو۔ لیکن بہر حال ان دونوں کو جلد ہی دولتِ مشترکہ کا مقام عطا کر دیا گیا اور یہ طے پایا کہ آخر کار انھیں آزادی مل جائے گی اگر انھوں نے خواہش کی۔ ایک اور اہم فرق جو یورپی اور امریکی سامراج کے مابین ہے وہ یورپ کے مذکورہ صدر اقوام سے تابعین کے سے تعلقات ہیں۔ کچھ یورپی سامراج جس میں وہ وسیع علاقہ شامل ہے جہاں غیر رسمی یا بالواسطہ سامراجی تسلط تھا مقامی حکومتوں کو پرنس، سلطان یا شیخ کا نام دیا جاسکتا تھا اور انھیں کسی حد تک اختیار حاصل ہوتا تھا۔ یہ

طریقہ برطانوی سامراج میں عام تھا (مثلاً ہندوستان کے رجوڑے، ملایا کی وفاقی ریاستیں اور خلیج فارس کے شیوخ) اور فرانسیسی سامراج میں بھی (مثلاً مراکش، تیونس، لاؤس، کمبوڈیا)۔ یہ نوآبادیات اس تسلط سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھیں جو اسی وقت امریکہ کو کریبین ممالک اور وسطی امریکہ میں حاصل تھیں اور جس کی پشت پناہی ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۰ء تک ڈومینیکن پبلک، ہیٹی اور نکاراگوا میں فوجی تسلط سے ہوئی اور اس طرح وسطی امریکہ کے دوسرے ممالک کو بھی خبردار کردیا گیا کہ اگر انھوں نے امریکی طور طریقوں سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی تو ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوسکتا ہے۔

۱۹۴۵ء کے اواخر تک یورپی یہ سمجھ سکتے تھے کہ تین بڑے سامراجی نظاموں یعنی برطانیہ، فرانس، اور امریکہ میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ جنھیں اس وقت تک سرکاری طور پر برطانوی دولت مشترکہ، فرانسیسی یونین اور پین امریکی نظام کہا جاتا تھا۔ یقیناً یورپ کے تمام سمندر پار سامراج کا خاتمہ متشدد بغاوت یا شورش کے ذریعے ہوا۔

لیکن بہرحال وسطی امریکہ اور کریبین، گوئٹے مالا، ل سلواڈور، جمہوریہ ڈومینیکن نکاراگوا اور گرینیڈا میں ناکام اشتراکی حکومتیں یا تحریکیں نوآبادیات سے نجات کے لیے عوام کی بغاوت کی نمائندہ تھیں۔ یہ کوششیں ریاستہائے متحدہ کی بے پناہ طاقت کی وجہ سے ناکام ہوئیں جس کی یورپیوں کے پاس کمی تھی اور انھیں ان نوآبادیات سے واپس جانا پڑا۔ اس لیے بیسویں صدی میں امریکی سامراج اور یورپی تجربہ میں خاصی مماثلت تھی ۔ اکیسویں صدی کی سامراجیت یورپی انداز سے بہت مختلف اور اپنی مثال آپ ہے، جو طاقت کے زور سے اپنی نوآبادیات کا استحصال کرتی تھی۔ اب جو امریکی سامراج ہے وہ اس کی بہترین تعریف نرم طاقت یعنی اطلاعاتی جال اور مقبول عام ثقافت ہوسکتی ہے، نہ کہ معاشی استحصال اور فوجی قوت کی سخت طاقت، یہ سامراج اطلاعاتی دور کا نمائندہ ہے نہ کہ صنعتی دور کا۔

امریکی سامراج کی اپنے علاقوں پر حکومت کرنے کی صلاحیت اس بات پر منحصر ہے کہ وہ ایک خاص قسم کے تارکین وطن پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کرے

جواس کے خاص سامراجی شہری افسران کی خدمات انجام دے سکیں۔ ماضی کے سامراجوں میں صدر مملکت دماغ اور نو آبادیات جسم کا کام کرتے تھے۔ امریکی سامراج سامراجی دماغ اور جسم کا مسئلہ ایک نئے طریقہ سے حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو ایک طرح سے نو آبادیاتی جسم میں آپریشن کے ذریعے سامراجی دماغ نصب کرنا ہے۔

ماضی کے یورپی سامراج اور صنعتی دور کے سامراجوں نے بھی نو آبادیات میں سے ذہین ترین افراد کو سامراجی طور طریقے سکھانے اور تعلیم دینے کی کوششیں کیں۔ لیکن اخیر میں وہ نو آبادیاتی قومیت کو ابھرنے اور سامراج کے اختتام کو روک نہ سکے بلکہ اس مقصد کو آگے بڑھایا۔ اطلاعاتی دور کا سامراج سابقہ سامراجوں سے زیادہ نظریات پر مبنی ہے۔ Michael Mandel کی حالیہ تدوین میں یہ "وہ نظریہ ہے جس نے دنیا فتح کی۔ امن، جمہوریت اور آزاد بازار اصل میں یہ وہی نظریات ہیں جو Thomas Jefferson کے مطابق ریاستہائے متحدہ کے پیدائشی سرٹیفکیٹ اعلان آزادی میں شامل تھیں، زندگی، آزادی اور حصول مسرت۔ جب تک امریکی سامراج زندگی، آزادی اور حصول مسرت کے مواقع کسی حد تک بھی مہیا کرتا نظر آتا رہے گا وسیع تناظر میں لوگوں کے لیے امید باقی ہے۔"

اور اخیر میں جریدہ نے فیصلہ دیا ہے کہ اگر امریکی سامراج جنگیں، مفسدانہ آمریت کے طاعون، عالمی کساد بازاری یا اپنے اعلیٰ طبقہ کی بیگانگی نہ روک سکا تو اس کے نظریات دنیا پر حاوی نہیں ہوسکیں گے اور ایک سامراجی اشرافیہ سامراج کے زیر تسلط علاقوں کو نہیں سنبھال سکے گی۔ یہ سامراج بھی سابقہ سامراجوں کی طرح اختتام پذیر ہو جائے گا۔

Patriot Act جیسے سخت گیر قوانین کی منظوری اور انتظامیہ کی طرف سے ان کے جناتی نفاذ اور امریکی عدلیہ کے ان قوانین اور ان کے نفاذ کی توثیق گوانتانامو اور ابوغرائب میں قیدیوں کا سالوں سے نہایت غیر انسانی ماحول میں سڑتے رہنا، جبکہ ان پر نہ کوئی الزام ہے نہ انھیں عدالت تک رسائی حاصل ہے، ساتھ ہی ریاستہائے متحدہ کا

پیش بند جنگوں کا بڑھتا ہوا شوق جو افغانستان اور عراق کے مسلمانوں پر مسلط کی جا چکی ہیں اور ان پر قبضہ ہو چکا ہے لیکن دوسری آمرانہ حکومتوں کے مسلمانوں پر ناانصاف اور امتیازی سلوک پر کوئی ایسی جنگیں نہیں کی جاتیں۔ اس بات نے زندگی، آزادی، حصول مسرت کے اس مثالیہ کو بری طرح زخمی کر دیا ہے، جس پر امریکی معاشرہ کی عظمت کا انحصار ہے۔ ریاستہائے متحدہ کے لیے تیز رفتار ترقی تو درکنار، باقی رہنے کے بھی امکانات کم نظر آتے ہیں۔ امریکی سامراج کے اختتام کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئی ہیں۔

تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو یورپیوں کے امریکہ کی سرزمین پر جا کر آباد ہونے کی وجہ ان کے اپنے اوطان میں مذہبی جبر و استبداد تھا بعد میں ان ہی تارکین وطن نے قدیم امریکی باشندوں پر جو وہاں کے اولین باشندے تھے اسی جبر و استبداد کا سلوک کیا۔

گوروں اور سرخ ہندیوں کے درمیان بڑھتے ہوئے جھگڑوں کے ذکر سے پہلے سرخ ہندیوں کے تاریخی پس منظر اور بعد کی یورپی مہاجرت اور پورے ملک میں ان کے آباد ہونے پر ایک نظر۔ امریکہ کے قدیم باشندوں کو ہندیوں کا نام کولمبس نے ۱۴۹۲ء میں دیا تھا۔ ان ہندیوں کے ایشیائی اجداد کے بارے میں خیال ہے کہ سائبیریا اور الاسکا کے درمیان اس خطہ زمین میں داخل ہوئے جو سمندری سطح سے نیچے ہونے کی وجہ سے ابھرا ہوا تھا۔ ۴۰۰۰۰ ق م سے ۳۵۰۰۰ ق م کا برفانی دور تھا۔ جانوروں اور مچھلیوں کا شکار کرتے ہوئے وہ دونوں امریکاؤں میں پھیلتے رہے۔ وہ دونوں براعظموں اور قریبی جزائر کے وارث تھے اور ہر قسم کے موسمی حالات والے علاقوں، جنگلوں، ریگستانوں، میدانوں اور دریائی وادیوں میں آباد تھے۔

جیسے جیسے تخصص بڑھتا گیا کئی طرح کے معاشرے اور زبانیں وجود میں آئیں۔ کچھ ہندی کسان مکئی، آلو، ٹماٹر، شکرقندی، مونگ پھلی، سیاہ مرچ، میٹھا کدو، کوکا اور مرچوں کے اولین کاشت کار تھے جبکہ وہ تمباکو بھی اگاتے تھے۔ کینیڈا میں ان کی منظم قومی ہندی برادری تھی۔ ریاستہائے متحدہ کی ۱۵۴ ملین آبادی میں سے تقریباً نوے ہزار مخصوص علاقوں کے قریب آباد تھے۔ زیادہ تر ایریزونا، نیو میکسیکو، یوٹا، اوکلاہاما،

ٹکساس، واشنگٹن اور شمالی اور جنوبی ڈکوٹا میں۔ آبادی اب بھی اتنی ہی ہے جتنی کولمبس کے زمانہ میں تھی لیکن اب ملی جلی نسل کے افراد بھی شامل ہیں۔

عام طور سے یہ ڈھول پیٹا جاتا ہے کہ سرخ ہندی وحشی اور ظالم تھے اور گوری آبادیوں کے ساتھ ان کی لڑائیاں ریاستہائے متحدہ کی معاشی، سیاسی اور ثقافتی ترقی کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھیں۔ سرخ ہندیوں کی زندگی اور کاموں اور گوری آبادیوں سے ان کے جھگڑے کے بارے میں کچھ معروضی اور تحقیقاتی مطالعات نے سرخ ہندیوں کو بہتر روشنی میں پیش کیا ہے۔ اس میں ریاستہائے متحدہ کی معاشی ترقی میں ان کے حصہ کو تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ بہترین زراعت کرتے تھے، نئی فصلیں اگاتے تھے اور پرانی فصلوں کو ترقی دیتے تھے۔ انھوں نے سونے اور چاندی کی کانیں دریافت کیں اور ان پر کام کیا۔ کہیں کہیں کچھ استثناء کے ساتھ وہ گوری آبادیوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات چاہتے تھے اور ان کے قبائلی سرداروں نے ریاستہائے متحدہ کی حکومت سے کئی معاہدے کیے۔ لیکن ان معاہدوں کی خلاف ورزی زیادہ تر گوری آبادیوں نے زرخیز زمینوں اور سونے چاندی کی کانوں پر قبضہ کے لیے کیں۔

سب سے پہلے ہسپانوی ۱۵۶۶ میں فلوریڈا میں آباد ہوئے۔ پہلی انگریز آبادی ورجینیا کے جیمس ٹاون میں ۱۶۰۷ء میں قائم ہوئی ۱۶۲۰ء میں انگریز تارکین وطن پہلی دفعہ پلائی ماؤتھ میں اترے اور میساچوسٹس، اور پھر کنیکٹی کٹ میں آبادی قائم کی۔ انگریز کیتھولک عیسائیوں نے ۱۶۳۴ء میں میری لینڈ قائم کیا۔ انگریز Quaker نے ۱۶۶۲ء میں پنسلوانیا قائم کیا۔ ۱۶۱۱ء میں ولندیزی مین ہٹن کے جزیرہ میں آباد ہوئے اور اس کا نام نیو ایمسٹرڈیم رکھا جسے انگریزوں کے قبضہ کے بعد ۱۶۶۴ء میں نیویارک کا نام دیا گیا۔ ۱۷۷۵ء میں تیرہ نو آبادیاں براعظمی کانگریس میں متحد ہوئیں اور میساچوسٹس اور لیگزنگٹن میں برطانوی فوجوں سے لڑیں۔ ۱۷۷۶ء میں فلاڈیلفیا میں انھوں نے اپنے امریکی انقلاب میں انگریز فوجوں کو شکست دی۔ برطانیہ عظمیٰ نے تیرہ نو آبادیوں کی آزادی کو تسلیم کرلیا۔ ۱۷۸۹ء میں آئین منظور کیا گیا۔

لوریانا کا علاقہ ۱۸۰۳ء میں نپولین سے خرید ا گیا ورفلوریڈا ۱۸۱۹ء میں ہسپانیہ سے ۔ ۱۸۴۶ء۔ ۱۸۴۸ء کی جنگ میں اریزونا، نیومیکسیکو اور ٹیکساس، کیلی فورنیا کولورا و کے کچھ علاقے اور وایومنگ، نیواڈا، یوٹا شامل ہو گئے، الاسکا ۱۸۶ء میں روس سے خرید ا گیا۔ ہوائی ۱۸۴۸ء میں ریاستہائے متحدہ میں شامل ہو گیا

یہ بات ظاہر ہے کہ ریاستہائے متحدہ نے علاقائی فتوحات ورو سری سامراجی طاقتوں سے علاقوں کی خریداری کے ذریعے وسعت پائی۔ ہتھیا ں کی طاقت کے ذریعے علاقوں پر قبضہ نہ اَخلاقی طور پر درست ہے نہ قانونی طور پر۔ سی طرح علاقوں کی خرید وفروحت سامرا ! کی غیر اخلاقی روایت ہے۔

اگر سرخ ہندی ویسے ہی وحشی ہوتے جیسا ان کے بارے میں کہا جاتا ہے نو تارکین وطن کے لیے ریاستہائے متحدہ کی زمین پر قدم رکھنا ممکن نہ ہوتا چہ جائکہ آبادیاں قائم کرنا اور امن وخوشحالی کے ساتھ رہنا۔ Hutchinson's Encyclopedia)

Herman J.Vio. نے اپنی کتاب Trial to wounded knee میں مریکی صدر کی دعوت پر تبادلہ خیالات کے لیے سرخ ہندیوں کے واشنگٹن کے سفر اور ہاں قیام کے بارے میں یہ لکھا ہے:

’بلاشبہ ہندی وفد کو واشنگٹن جانے کی دعوت کی پشت پر صل مقصد مقامی امریکی ندوں کو سفید تہذیب کی شانداریوں سے متاثر کرنا تھا اور انھیں قائل کرنا تھا کہ ن لیے سفید دنیا سے اطاعت اور انضمام کا تعلق رکھنا ہی مناسب ہو سکتا ہے۔ ذرا دیکھیے کہ سرخ ہندیوں یعنی امریکہ کے صل باشندوں سے جنھوں نے ریاستہائے متحدہ کی زمینوں اور کانوں کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ ’’سفید تہذیب کی شانداریوں کے آگے سر اطاعت خم کر دیں۔ یہی ہے جو تمام سامر جی قوتیں پنے زیر دست لوگوں کو اپنی فتوحات اور قبضہ کو اعلیٰ رجہ دینے کے لیے کہتی رہی ہیں۔

۱۸۶۳ء میں اس وفد کے دورہ کا نقطۂ عروج ۲۷، مارچ کو قصر ابیض میں صدر لنکن

سے ملاقات تھی ۔ یک اخباری نمائندہ نے جو اس ملاقات کا جائزہ لے رہا تھا بیان کیا:

''یہ ہندی اچھے لوگ معلوم ہوتے ہیں ۔ ان کے چہروں پر وہ سخت اور ظالم لکیریں ہیں جو ہمارے خیال میں وحشیوں کا خاصہ ہیں لیکن دراصل یہ ذہین اور اعلیٰ کردار کے لوگ ہیں۔ ن میں پُروقار اور دو تانہ دونوں انداز تھے او انھوں نے ہر بات کو دلچسپی سے سنا۔''

سونے ورچاندی کی بے تحاشا تلاش نے کولوراڈو کو ایک ایسا علاقہ بنادیا جو بس پھٹنے ہی والا ہو۔ خانہ جنگی کے شروع میں ہی دس ہزار گورے زبردستی کولوراڈو میں گھسے اور شینی ار پ لو کیووا او دیگر قبلوں کو ان کے علاقوں سے بے دخل اور مشتعل کردیا۔ کیلی فوریا میں سونے کی دریافت کے ساتھ ہی ریاستہائے متحدہ کی حکومت نے ہندیوں کو وہاں سے نکال کر آباد کا ن کے لیے راستہ صاف کرنا شروع کردیا تھا۔ حکومت نے شمال اور جنوب میں علاقے ہندیوں کے لیے مخصوص کردیے ور وعدہ کیا کہ اگر وہ ان علاقوں میں چلے جائیں تو ان کی کچھ مدد کی جائے گی۔ مِنی سوٹا میں Sontee Siony نامی قبیلہ پرامن طریقہ سے ان مخصوص علاقوں میں منتقل ہوگیا تھا، اس امید پر کہ موعودہ امداد مہیا کی جائے گی۔ خانہ جنگی میں مصروف وفاقی حکومت وعدہ پورا نہ کرسکی۔

بھوکے ہ کلی مقامی تجارتی مرکز پر غذا کی تلاش میں پہنچے تو کچھ لوگوں نے ایک تاجر کو کہتے سنا کہ ''ن کو گھاس کھانے دو''۔ وعدہ خلافی سے تلخ کام اور مایوس Sontee قبائلی پنی زمین یس حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جنرل پوپ کی قیادت میں امریکی افواج جو Bull Run کی جنگ میں حال ہی میں شکست کھاچکی تھیں مِنی سوٹا پہنچیں تو پانچ نو آباد کار قتل کیے جاچکے تھے۔ امریکی افسر نے بیس ہزار ہندیوں کو گرفتار کرلیا او تیس سوتین کو سزائے موت دے دی۔ سارے مغرب میں گوری آبادی خوف او عداوت میں مبتلا ہوگئی۔

ہفتہ وا Rocky Mountain news کے ایڈیٹر نے پھنکارتے ہوئے لکھا:

''بے تحاشا خرچ کرکے وحشیوں کے وفد کو واشنگٹن'' لے جانے کے بجائے کیا یہ بہتر نہیں

ہے کہ بدمعاش آوارہ گردوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔‘‘

لیکن دوسری باتوں کے ساتھ ہندیوں کو یہ بتایا کہ ’اگر وہ سفید لوگوں کی طرح خوشحال ہونا چاہتے ہیں تو انھیں اپنا طرز زندگی بدلنا ہوگا۔‘‘

۱۸۶۴ء تک ان (ہندیوں) کے گاؤں بھوک اور موت میں مبتلا تھے۔ غائب ہو رہے تھے۔ جن بھینسوں پر سرخ ہندیوں کا انحصار تھا دوسو مخصوص علاقوں سے دوسو میل تک کہیں نہیں پائے جا رہے تھے جو Treaty of Fortwise کے ذریعے قائم کیے گئے تھے۔ چھوٹے شکار بھی بہت کم تھے۔

وہ گاڑیوں کے قافلوں اور گوروں کی چوکیوں کو تنگ کر رہے تھے مگر وہ غذا کی تلاش میں تھے نہ کہ کھوپڑیوں کی۔ زیادہ تر غلط کام جو انھوں نے کیے بھوک سے مجبور ہو کر۔

’’ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ فاقہ کشی کی حالت میں انھیں کچھ لینے کی اجازت نہیں ہے‘‘۔

’’سونے اور چاندی کے بھوکے، علاقہ میں داخل ہونے والے ہندیوں کو بس اپنے راستہ سے ہٹانا چاہتے تھے‘‘۔

امریکی فوجیوں نے غریب سرخ ہندیوں کے قتل عام اور تباہی میں امن اور دوستی کے معاہدہ کے باوجود کس طرح آبادکاروں کی مدد کی اس کی ایک جھلک۔

Lean Bear اپنے بیٹے Star کے ساتھ ایک کاغذ لہراتا ہوا آگے آیا۔ سپاہیوں نے گولی چلانا شروع کردی اور دونوں اپنے گھوڑوں سے گر پڑے۔ سپاہی گھوڑے دوڑاتے ہوئے آئے اور گرے ہوئے ہندیوں پر پھر گولی چلائی۔ جب سپاہیوں نے Lean Bear کی لاش کا معائنہ کیا تو اس کا لنکن تمغۂ امن ابھی تک اس کی گردن کے گرد آویزاں تھا اور اس کے ہاتھ میں ابھی تک ریاستہائے متحدہ کی حکومت کے سرکاری کاغذ پر لکھا ہوا لفظ موجود تھا جس پر لکھا تھا: یہ اس بات کی سند ہے کہ Lean Bear جو کولوراڈو کے شینی فیصلہ کا ایک رکن ہے واشنگٹن کے شہر آچکا ہے۔ اس نے اپنے بزرگ والد سے وعدہ کیا ہے کہ گوروں کے ساتھ ہمیشہ دوستی رکھے گا اور جب وہ اس علاقہ سے

گزریں گے تو نقصان نہیں پہنچائے گا اور ہر اس گورے کو جسے وہ یہ کاغذ دکھائے ہدایت کی جاتی ہے کہ اس کے ساتھ دوستی کا سلوک کرے اور احتیاط رکھے کہ اسے اپنے بزرگ والد سے کیا گیا وعدہ توڑنے کی کوئی وجہ نہ مہیا ہو"۔

۱۸۵۰ء تک مغرب بعید وسیع ہندی علاقہ باقی نہ رہا تھا۔ یہ نظریہ مختلف قبیلوں کے لیے علاقے قائم کرنے کی حکمت عملی میں دب گیا۔ مخصوص علاقوں کا مقصد ہندیوں اور آبادکاروں کو محفوظ علاقے مہیا کرنا اور ایک دوسرے کی دست برد سے بچانا اور ساتھ ہی گوروں کے مغرب کی طرف آگے بڑھنے کے راستہ سے ہندیوں کو دور رکھنا تھا۔"

مخصوص علاقوں میں ہندیوں کو گوروں کا طرز زندگی سیکھنا تھا۔ اپنی روایات اپنا کر کے چھوٹے خود کاشت کسان بن جانا تھا جو اپنی معاش کمانے کے ساتھ ساتھ قومی معیشت کی بہتری مہیا کریں گے۔ لیکن حقیقت میں اس کا الٹ ہوا۔ حکومت نے ناچ، مقامی مذہبی رسوم اور روایتی رسوم پر پابندی لگادی جس سے نئی زندگی کی طرف تبدیلی آسان ہو گئی۔ بنیادی طور پر وہ گوشت خور تھے جو اپنے معاش کے لیے بھینسوں کا شکار کرتے تھے۔ ہندیوں کو مخصوص علاقوں میں حکومت کا ذبیحہ گوشت آٹا، چینی، اور کافی جو نامانوس تھے ماہانہ یا سہ ماہی بنیاد پر مہیا کیے جاتے تھے۔ حکومتی اہل کار اخراجات کم کرنے کی فکر میں راشن کم دیتے تھے تاکہ ہندی زیادہ خود انحصار نہ ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخصوص علاقوں میں تقریباً ہر فرد بھوکا رہنے لگا۔ اس بات نے ان کے وجود کو بنیاد سے اکھاڑ دیا اور دوبارہ تباہی کا راستہ کھل گیا۔

آج کے سرخ ہندیوں نے اپنی بقا کی جدوجہد میں کامیابی نئے حالات اور چیلنجوں سے موافقت کے ساتھ اور قدیم اور ناقابل شکست روایات کو زندہ رکھنے کی صلاحیت کی بدولت حاصل کی۔ شمال میں گورے آبادکاروں اور ہندی قبیلوں کے درمیان چار سو سالہ مسلح تصادم کا اختتام ہوا۔

اس لیے یورپی منبع سے پیدا ہونے والی امریکی قوم کا وجود اور خوشحالی کی جڑیں سامراجی اصولوں اور طور طریقوں میں ہیں۔ جبکہ سابقہ سامراجی طاقتیں دور دراز علاقوں

میں آباد لوگوں کی زندگی اور تقدیر پر حکومت کرتی تھیں۔ ریاستہائے متحدہ نے ایک قوم کی حیثیت سے اپنا سفرحیات اس سرزمین کے ان لوگوں کے قتل عام اور لوٹ مار سے شروع کیا جو یہاں ساٹھ ہزار سے پینتیس ہزار قبل مسیح سے آباد تھے اور جنھوں نے اس ملک کی زراعت کو ترقی دی تھی۔ گورے آبادکار اور امریکی افواج ہندیوں کے ساتھ دوستی اور امن کے معاہدوں کا بہت کم احترام کرتے تھے۔ انھیں ان زرخیز زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا جو انھوں نے خود محنت کر کے آباد کی تھیں اور مختلف مخصوص علاقوں میں ہنکا دیا گیا جو ترقی یافتہ نہ تھے اور جہاں زندگی سخت گزار تھی۔ انھیں ''مہذب'' بنانے اور لوگوں کے طور طریقوں کی موافقت میں لانے کی کئی ناکام کوششیں کی گئیں۔ اسلامی دنیا کو عمومی طور پر اور مشرق وسطی کو خصوصاً'' امریکی وضع کی ''جمہوریت' میں تبدیل کرنے کا امریکی مشن چاہے اس کے لیے طاقت استعمال کرنی پڑے بھی اسی طرح ناکامی سے دوچار ہو گا۔

امریکی سپاہی ایسا معلوم ہوتا ہے شروع ہی سے بربریت اور بدکاری کی سامراجی روایتوں میں تربیت پاتے ہیں جو ماضی بعید میں ہندیوں کے قتل عام اور اس کے لیے ریاستہائے متحدہ کی طرف سے انعام واکرام پانے سے ظاہر ہے۔ انھوں نے ایسا ہی بہیمانہ قتل عام ویت نام، کوریا، افغانستان اور عراق میں کیا۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی (دسمبر ۲۰۰۳ء کا دوسرا ہفتہ) انھوں نے بے حساب بمباری سے افغانستان میں پندرہ معصوم بچوں کو مار دیا۔ ۲۱ دسمبر کی ایک اخباری رپورٹ بتاتی ہے کہ امریکی افواج نے تین عراقی پولیس والوں کو مار دیا جو متسلط فوجوں کے حامی تھے۔

ریاستہائے متحدہ نے اپنا سفرِ حیات سامراجی طاقت کی حیثیت سے نہ صرف شروع کیا تھا بلکہ اسی راستہ پر چلتا رہا ہے۔ ڈونلڈسن نے امریکی لوگوں کی تاریخ میں امریکی سامراج کے عروج کا اس طرح مشاہدہ کیا ہے:

سامراجیت ۱۹۹۰ء کے قریب اپنے عروج پر پہنچ گئی جب یورپی قوموں نے دنیا کی فتح کے مقابلہ میں کئی جگ مکمل کر لیے تھے۔ اس وقت تک ریاستہائے متحدہ اپنی

آشکار تقدیر پر مطمئن پورے شمال میں پھیل چکا تھا۔ ۱۹۰۰ء تک امریکی ایک سرکاری سامراج بن چکے تھے جو ہوائی اور فلپائن کے دور دراز علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔

انیسویں صدی کے اواخر میں امریکی معیشت کے لیے بیرونی تجارت کی اہمیت بڑھتی جا رہی تھی۔ ۱۸۷۰ء میں قومی برآمدات تین سو بانوے ملین ڈالر کے قریب تھیں جو ۱۸۹۰ء میں بڑھ کر آٹھ سو ستاون ملین ڈالر ہو گئی تھیں اور ۱۹۰۰ء تک ایک سو چار بلین ہو چکی تھیں۔ کئی امریکیوں نے برآمدات کے لیے بازار تلاش کرنا شروع کر دیا۔ سینیٹر Albert T Beveridge نے ریاستہائے متحدہ کی بڑھتی ہوئی پیداوار کا ذکر کیا جو مقامی طور پر کھپائی نہیں جا سکتی تھی اور جسے برآمد کرنا لازمی تھا۔ یورپ میں عروج پر سامراجی بخار سے متاثر نمایاں طاقتیں افریقہ میں بڑے بڑے علاقے حاصل کرنے کے لیے مقابلے پر تھیں۔ کچھ امریکی اس کو ضروری سمجھتے تھے کہ اپنی سامراجی سلطنت بنانے میں پیچھے نہ رہیں۔ بنیادی طور پر اضافی پیداوار کے لیے بازار تلاش کرنے کے لیے۔ ہنری کیبٹ لاج نے جو اپنے رجحان اور مزاج میں سامراجی تھے، متنبہ کیا کہ ریاستہائے متحدہ کو ''وقت پر سفر شروع کرنے میں پیچھے نہیں رہنا چاہیے''۔ دانشوروں اور دوسروں نے توسیع کے لیے چارلس ڈارون کے نظریہ ''مضبوط ترین بقا'' کا فلسفیانہ سہارا لیا۔

کانگریس کے ایک مذہبی رکن جوزف اسٹرانگ نے جو سمندر پار مشنری کے حامی تھے اپنی کتاب: ''ہمارا ملک اس کا ممکنہ مستقبل اور اس کا موجودہ بحران (۱۸۸۵ء) میں کہا کہ اینگلوسیکسن ''نسل'' اور خاص طور پر اس کی امریکی شاخ شہری آزادی اور خالص عیسائیت کے عظیم نظریات کی نمائندہ اور ساری دنیا میں اداروں کے فروغ کے لیے ''الوہی طور پر منتخب ہے''۔

کولمبیا یونیورسٹی کے بانی John H.Burgess نے سامراجیت کو دانشورانہ توثیق عطا کر دی۔ ۱۸۹۰ء میں اپنے مطالعاتی مقالہ ''سیاسیات اور معاصر قانون'' میں انھوں نے صاف صاف کہا کہ اینگلوسیکسن اور ٹیوٹانک قومیں سب سے پہلے سیاسی

صلاحیتوں کی حامل ہیں ۔ان کا فرض ہے کہ کم خوش قسمت لوگوں کی مدد کریں اور اگر ضروری ہو تو ان پر زبردستی اعلیٰ ادارے نافذ کریں۔

انہوں نے لکھا کہ ''بربریت کے لیے کوئی انسانی حقوق نہیں''۔

سامراجیت کے طاقتور ترین ترجمان Alfred Thayer Mahan تھے جو کپتان اور امریکی تجربہ کے ایڈمرل تھے، بحری طاقت کے تاریخ پر اثرات پر اپنے مقالے The Mahan Thesis میں کہا: ''دو سمندروں کی عظمت اس کی بحری طاقت پر منحصر ہے۔ بحری طاقت کی لازمی شرائط پیداواری قومی معیشت، غیر ملکی تجارت، مضبوط تجارتی بیڑا اور راستوں اور نو آبادیات کی حفاظت کے لیے تجربہ ہیں جو خام مال اور بازار مہیا کریں۔'' James G Blaine جنھوں نے ۱۸۸۰ء کی دہائی میں دو ریپبلکن حکومتوں کے ادوار میں وزیر خارجہ کا عہدہ سنبھالا، لاطینی امریکہ میں ریاستہائے متحدہ کے اثرات کی توسیع کی اولین کوششوں کے قائد تھے جو امریکہ کی اضافی پیداوار کی کھپت کے لیے بازار کی تلاش کے لیے تھیں۔اکتوبر ۱۸۸۰ء میں انھوں نے پہلی امریکی کانگریس کی تشکیل میں مدد دی۔ نمائندوں نے ایک پین امریکی یونین بنانے کی منظوری دی جو واشنگٹن میں قائم ہو اور طلاعات کے مرکز کے طور پر کام کرے۔

نئے Pacific میں ہوائی کے جزیرے چینی تجارت کے راستہ پر امریکی جہازوں کے لیے اہم گزرگاہ تھے۔ ۱۸۸۰ء کی دہائی تک پرل ہاربر ریاستہائے متحدہ کی بحریہ کے لیے ایک بڑے بحری اڈہ کے طور پر پسندیدہ نظر آنے لگا۔امریکیوں کی بڑی تعداد اس جزیرہ میں آباد ہو چکی تھی اور اس کی معیشت اور سیاسی زندگی پر چھا چکی تھی۔مشنریوں نے انیسویں صدی کے اوائل میں یہاں زمینیں آباد کر لی تھیں اور ۱۸۳۰ء میں بوسٹن کے تاجر ''ولیم ہوپر'' نے زمین خرید کر جزیرہ پر پہلی مرتبہ گنے کی کاشت کی تا کہ شکر بنانے کے لیے راستہ ہموار ہو۔

ان جہازوں پر مشنریوں اور کاشت کاروں کی آمد ہوائی کے معاشرہ کے لیے تباہ کن تھی۔ نئے آنے والے نادانستہ طور پر بیماریاں لے کر آئے جن کے خلاف مزاحمت

ہوائی والوں میں بھی امریکی ہندیوں کی طرح موجود نہیں تھی۔ انیسویں صدی کے وسط تک آدھی سے زیادہ مقامی آبادی ہلاک ہو چکی تھی۔ بیماریوں نے ایک دفعہ پھر آدھی آبادی کو نگل لیا۔ مشنریوں نے مقامی مذہب کو کمزور کیا۔ دوسرے گورے آبادکاروں نے شرابیں، ہتھیار اور تجارتی معیشت کے اصول متعارف کرائے جنھوں نے ہوائی کے معاشرہ کے روایتی کردار کو مٹا دیا۔ ۱۸۴۰ء تک امریکی زمین دار پورے جزیرہ پر پھیل چکے تھے اور امریکی آبادکار King Karmes Homilies, III G.P.Judd کے تحت ہوائی کا وزیر بن گیا۔ ریاستہائے متحدہ نے ہوائی کے ساتھ ایک اڈہ پرل ہاربر میں بنانے کے لیے معاہدہ کیا۔ اس وقت تک امریکہ سے برآمد کے لیے چینی کی پیداوار ہوائی کی معیشت کی بنیاد بن گئی تھی جو ۱۸۷۵ء کے معاہدہ کا نتیجہ تھی جس میں ریاستہائے متحدہ میں شکر پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا گیا تھا۔ گنے کی کاشت اور شکر بنانے کا پورا نظام امریکیوں کے زیر اثر تھا جس نے مقامی ہوائی باشندوں کو نہ صرف ان کی زمینوں سے بے دخل کیا بلکہ اس کا سارا انحصار امریکی تارک وطن کارکنوں پر تھا جنھیں ہوائی کے مقامی باشندوں کے مقابلہ میں زیادہ اطاعت شعار اور قابل بھروسہ سمجھا جاتا تھا جو احتجاج کے بغیر اطاعت قبول نہیں کرتے تھے۔ ۱۸۹۱ء میں انھوں نے ایک طاقتور وطن پرست کو تخت پر بٹھا دیا: ملکہ Lilio Kalam جس نے جزیرہ پر امریکہ کے بڑھتے ہوئے اختیار کو للکارنا شروع کر دیا۔ ۱۸۹۰ء میں ریاستہائے متحدہ نے بین الاقوامی تجارت میں ہوائی کی شکر کی امتیازی حیثیت ختم کر دی جو جزائر کی معیشت کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ ۱۸۹۳ء میں امریکیوں نے بغاوت کی اور حفاظت کے لیے ریاستہائے متحدہ کو بلایا۔ جب امریکی وزیر نے ہنولولو کی بندرگاہ سے فوجیوں کو باغیوں کی مدد کے لیے جانے کا حکم دیا تو ملکہ نے ہتھیار ڈال دیے۔

۱۸۹۰ء تک ریاستہائے متحدہ سامراجیت کی راہ پر جم چکا تھا اور سامراجی مہمات کے سلسلہ میں ۱۸۹۸ء کی جنگ ہسپانیہ ایک سنگ میل تھی۔ اس نے دور دراز سمندر پار علاقوں میں امریکی سامراج کے قیام کے ایک نئے دور کا آغاز کر دیا تھا۔ ہسپانیہ کی

جنگ کیوبا کے واقعات سے شروع ہوئی جو پورٹو ریکو کے ساتھ ہسپانیہ کا بچا کھچا حصہ تھا جو کبھی ایک بڑی سامراجی سلطنت تھی۔ کیوبا ہسپانوی سامراج کی مخالفت ۱۸۶۸ء سے کر رہا تھا جب اس نے آزادی کی جدوجہد شروع کی تھی۔

۱۸۹۵ء میں کیوبا کے لوگ ۱۸۹۴ء میں Wilson German Tarrif کے خلاف پھر اٹھ کھڑے ہوئے جس کی وجہ سے کیوبا کی غیر ملکی تجارت جو زیادہ تر ریاستہائے متحدہ کو برآمد پر مبنی تھی، جو جزائر کا نمائندہ بازار تھا، تباہ ہوگئی۔

جنرل ویبر کے زیر کمان ہسپانوی فوج نے شہریوں کو کیمپوں میں قید کر دیا جہاں وہ ہزاروں کی تعداد میں ہلاک ہوگئے۔ ان مظالم نے ریاستہائے متحدہ میں ایک ہلچل پیدا کر دی اور زرد صحافت کے ذریعے ایک موقع پیدا کر دیا جس نے اس وقت تک ریاستہائے متحدہ میں کیوبا کے تارکین وطن کی بڑی تعداد کو اپنے زیر اثر لے لیا تھا۔ یہ لوگ کیوبا کی انقلابی جماعت کی حمایت کرتے تھے جس کا مرکزی دفتر نیویارک میں تھا۔ اسی دوران ایک امریکی جنگی جہاز ہوانا کی بندرگاہ میں دھماکہ سے اڑ گیا جس میں دوسو ساٹھ افراد ہلاک ہوئے۔ امریکیوں کو یقین تھا کہ ہسپانوی آبدوز نے جہاز کو مارا تھا، جب تفتیشی عدالت نے بغیر کسی تفتیش عجلت میں فیصلہ دے دیا کہ آبدوز کی تباہی خارجی دھماکہ کی وجہ سے ہوئی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ ایک انجن میں حادثاتی دھماکہ تباہی کا سبب تھا لیکن بہرحال جنگی دیوانگی سارے ملک پر چھا گئی اور کانگریس نے متفقہ طور پر پچاس ملین ڈالر فوجی کارروائی کے لیے منظور کر لیے۔ Remember Mori انتقام کے لیے فطری نعرہ بن گیا تھا۔ اسی روایت کے ساتھ گلف ٹونکن کو ویت نام کی جنگ کے بہانہ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ اسی طرح کثیر تباہی کے ہتھیاروں کو عراق پر حملہ کے لیے استعمال کیا گیا، کیوبا کی طرف واپس آتے ہوئے۔ ہسپانیہ جنگ روکنے کے لیے اور قیدی کیمپ ختم کرنے پر راضی ہوگیا لیکن باغیوں سے مذاکرات سے انکار کرتے ہوئے اس بات کا حق محفوظ رکھا کہ جب جی چاہے لڑائی دوبارہ شروع کر دے گا۔ اس بات سے نہ تو تارکین وطن مطمئن ہوئے نہ کانگریس۔ اور چند دنوں بعد صدر

Mckinley کی درخواست پر ۲۵/اپریل کو کانگریس نے کیوبا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ وزیر خارجہ John Hay نے ہسپانوی امریکی جھگڑے کو Splendid Little War قرار دیا۔ جنگ بہرحال اگست میں ختم ہوگئی۔ وہاں نسلی جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ امریکہ بھیجی جانے والی افواج میں قابل ذکر تعداد سیاہ فام سپاہیوں کی تھی جو ایک قومی مشن پر قومی فوج کا حصہ تھے لیکن پھر بھی نسلی امتیاز اور تذلیل کا شکار تھے۔ سیاہ فام سپاہیوں نے کیوبا جاتے ہوئے جارجیا میں ارادتاً ممانعت کی خلاف ورزی کی اور فلوریڈا میں صرف سفید فاموں کے لیے پارک کو استعمال کیا۔ مشروبات کی ایک دکان دار کو مانگ پوری نہ کرنے پر مارا۔ ٹمپا میں سفید فاموں کے چڑانے اور سیاہ فاموں کی جوابی کارروائی کے نتیجہ میں رات بھر فسادات ہوئے جس میں بیس افراد زخمی ہوئے۔ نسلی منافرت قومی فوج کے گورے ارکان میں بھی بہت گہری تھی۔ جب کہ خود ریاستہائے متحدہ میں نسلی امتیاز کا یہ حال تھا' اس کے پاس کیا حق تھا کہ انسانی حقوق کے نام پر ہسپانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دے۔

بحریہ کا نائب سیکرٹری تھیوڈور روز ویلٹ ایک جوشیلا سامراجی تھا اور جنگ کا سرگرم حامی۔

روز ویلٹ نے بحریہ کے ایک اسکواڈرن اور اس کے کمانداز کو ہدایت دی کہ جنگ کی صورت میں ہسپانیہ کی نوآبادی فلپائن میں موجود ہسپانوی بحری افواج پر حملہ کر دیں۔ اعلان جنگ کے فوراً بعد مئی ۱۸۹۸ء میں امریکی بحریہ منیلا پر حملہ آور ہوگئی اور وہاں تعینات پرانے ہسپانوی بیڑے کو تباہ کر دیا۔ ہسپانویوں نے منیلا شہر کو گھیرے میں لے لیا۔ اب جنگ کا انداز بدل رہا تھا۔ جو جنگ کیوبا کے عوام کو سامراجی جبر سے نجات دلانے کے لیے شروع ہوئی تھی اب ہسپانوی نوآبادیات پر قبضہ کرنے کی جنگ بن چکی تھی۔ امریکہ کی یہ مہم اپنے تمام مقاصد اور ارادوں میں دور دراز علاقوں میں نوآبادیات کے حصول کی جنگ تھی۔ اس کا مقصد سامراجی توسیع تھا نہ کہ انسانی حقوق۔ معاہدۂ امن میں ہسپانیہ نے کیوبا کی آزادی کو تسلیم کیا' پورٹو ریکو اور بحرالکاہل کا جزیرہ گوام ریاستہائے

متحدہ کو مل گیا اور ہسپانیہ نے منیلا پر امریکہ کا جاری قبضہ تسلیم کر لیا' جب تک فلپائن کا حتمی فیصلہ نہ ہو جائے۔

فوریکر ایکٹ نے پورٹو ریکو پر فوجی حکمرانی ختم کر دی اور ایک سرکاری نوآبادیاتی حکومت قائم کر دی' ایک امریکی حکومت جس کے دو ایوان مقننہ تھے۔ ایوان بالا عوام کے ارکان ریاستہائے متحدہ کے منتخب کردہ اور ایوان زیریں عوام کے منتخب کردہ' پورٹو ریکو کے منظور کیے ہوئے۔ کسی بھی قانون کو ریاست ہائے متحدہ تبدیل یا ویٹو کر سکتا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں پورٹو ریکو اور امریکہ کے مابین تعلقات کی وضاحت کے لیے دباؤ کی وجہ سے کانگریس نے جونز ایکٹ منظور کیا جس میں پورٹو ریکو کو امریکی علاقہ قرار دے دیا گیا اور وہاں کے تمام لوگوں کو امریکی شہری بنا دیا گیا۔ یہاں امریکی سامراج کھلے بندوں اپنا کھیل کھیلتا رہا ہے۔ پورٹو ریکو کی سرزمین پر فوجی قبضہ کر کے اسے کانگریس کی ایک قرارداد کے ذریعے ریاستہائے متحدہ کا حصہ بنا دیا گیا' اس انضمام میں پورٹو ریکو کے عوام کی مرضی کا کہیں دخل نہ تھا۔

پورٹو ریکو کے قبضہ پر کوئی تنازعہ پیدا نہیں ہوا لیکن فلپائن کے قبضہ پر طویل اور پرجوش بحث شروع ہو گئی۔ ایک نئے کریبین جزیرہ پر قبضہ مغربی کرہ پر مکمل سامراجی اختیار کے لیے سامراجی نقشہ میں آرام سے سج جاتا تھا لیکن ہزاروں میل دور ایک گھنی آبادی والے علاقہ پر اختیار قائم رکھنا مسائل سے بھرپور اور ڈراؤنا نظر آتا تھا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ عظیم امریکی تہذیب پر کمتر فلپائنی تہذیب سے میل ملاپ گندے اثرات ڈال سکتا ہے۔

۱۲ دسمبر ۱۸۹۸ء میں معاہدہ پیرس پر دستخط ہوئے اور جنگ سرکاری طور پر ختم ہو گئی اس میں پورٹو ریکو اور کیوبا کے بارے میں معاہدۂ امن کی شرائط کو قائم رکھا گیا۔ لیکن جب امریکی مصالحت کاروں نے فلپائن پر امریکی تسلط کا مطالبہ کیا تو ہسپانوی حیران رہ گئے۔ یہ معاہدہ امن سے آگے کی چیز تھی امریکہ کی طرف سے بیس ملین ڈالر کی پیشکش تمام مزاحمت کا اختتام ثابت ہوئی اور ہسپانویوں نے امریکہ کی تمام شرائط منظور کر لیں' اس

طرح افریقہ اور ایشیا میں یورپی اقوام کی طرح ریاستہائے متحدہ بھی مکمل سامراجی قوت بن کر ابھرا۔

فلپائن پر بحث پھر بھی جاری رہی' میساچوسٹس کے سینیٹر ہنیری کیبٹ نے جو نمایاں سامراجی ہیں نشان دہی کی: ''اگلے دن ایک اعلیٰ ڈیموکریٹ دانشور نے اعلان کیا کہ ریپبلکن لوگوں کی کوئی رعایا نہیں ہو سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ بات بھول گئے ہیں کہ اس جمہوریہ نے شروع ہی سے رعایا نہیں بنائی تھی بلکہ ہم نے ایسے خریدا ہے ہم نے ہندی قبیلوں کو حاکمیت کا انتخاب یا شہری بننے کا بنیادی حق بھی نہیں دیا''۔

سابق سیکرٹری دفاع ڈونلڈ رمزفیلڈ کو جو الجزیرہ کے نمائندہ کی اس بات پر چھت سے جا لگے تھے کہ ریاستہائے متحدہ سامراج قائم کر رہا تھا امریکی سامراجیت کی تاریخ کے ان حقائق کو نظر میں رکھ کر اپنی چھت کو اور اونچا کروالینا چاہیے۔

کیوبا کا معاملہ ذرا تیکھا تھا۔ امریکی فوج نے اس جزیرہ کو آزادی کے لیے تیار کرنے کے لیے ۱۹۰۲ء میں اس پر قبضہ کیا تھا۔ انھوں نے سڑکیں' ہسپتال اور اسکول بنانے کے ساتھ اس پر عرصہ تک معاشی احتیاج کی بنیاد بھی رکھ دی' جب کیوبا نے ایک ایسا آئین بنایا جس میں ریاستہائے متحدہ کا کوئی تذکرہ نہیں تھا تو کانگریس نے جوابی طور پر ۱۰۹۱ء میں platt ترمیم منظور کی جس میں کیوبا کو امریکہ کی شرطیں شامل کرنے پر مجبور کیا گیا۔ پلٹ ترمیم نے کیوبا کے دوسرے ملکوں سے معاہدہ کرنے پر پابندی لگادی۔ گویا کیوبا کی خارجہ پالیسی پر اختیار حاصل کرلیا۔ اس ترمیم نے ریاستہائے متحدہ کو آزادی' زندگی اور مال کی حفاظت کے لیے دخل اندازی کا حق دیا اور کیوبا کے لیے ضروری قرار دیا کہ اپنی سرزمین پر امریکہ کو بحری اڈے رکھنے کی اجازت دے۔ اس ترمیم نے کیوبا کے لیے صرف موہوم سی سیاسی خودمختاری ہی باقی رہنے دی۔ ریاستہائے متحدہ کا ارادہ کیوبا کی کارکردگی افغانستان اور عراق میں دہرانے کا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جاری شورش کی وجہ سے وہ اتنا پر یقین نہیں ہے کہ ان دو ملکوں پر امریکی مفادات اور اقدار کا حامل آئین مسلط کر سکے گا۔

عراق پہنچنے والے نئے سفیر زلے خلیل زاد نے آئین سازی کے عمل میں کارستانی شروع کردی۔اقوام متحدہ کے اعانتی مشن کے مقامی آئینی معاون الیگزینڈر ریہ نشان دہی کیے بغیر نہ رہ سکے کہ ''یہ ایک ایسے ملک کے لیے سخت نامناسب تھا جس کی ایک لاکھ چالیس ہزار فوجیں ملک میں موجود ہوں''۔لندن میں حالیہ عراقی مطالعات کی بین الاقوامی انجمن کے قانونی ماہر زید العلی نے بھی جو بغداد میں قانون سازی کے عمل کی نگرانی کر رہے تھے ایسا ہی مشاہدہ بیان کیا۔زید العلی نے سب سے زیادہ چشم کشا انکشاف کیا کہ کس طرح امریکی سفیر نے بنیادی متن سے وہ شق نکلوانے کے لیے آئین ساز کمیشن کے ہاتھ مروڑے جس کے تحت ملک میں غیر ملکی فوجی موجودگی کو مقنّنہ میں دوتہائی اکثریت کے بغیر ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ ۱۹۰۷ء کے آئین کے مطابق قابض طاقت کا یہ فرض ہے کہ مقبوضہ ملک کے قانونی نظام کو برقرار رکھے۔ یہ پہلی دفعہ ہوا ہے کہ قابض مقتدرہ نے داخلی قانونی نظام کو منہدم کردیا ہے۔یہ طریقہ ہے جس کے ذریعے ریاستہائے متحدہ نے عراقی عوام کے اختیارات کی منتقلی کے باوجود اپنا اختیار برقرار رکھا ہے۔

افغانستان کے لویا جرگہ (Grand Assembly) نے پس پردہ کارگزاریوں اور بلاواسطہ دخل اندازیوں کے باوجود افغانستان کو سرکاری مذہب اسلام کے ساتھ اسلامی جمہوریہ کا نام دینے سے روکا نہ جاسکا۔ابھی مجوزہ آئین لویا جرگہ میں زیر بحث ہی تھا جب اس شق پر کہ قرآن اور سنت کے خلاف کوئی قانون بنایا نہ جاسکے گا امریکی سفیر بھنویں سکیڑے بغیر نہ رہ سکے تھے۔اسی طرح عراق کا عبوری آئین امریکہ نے اپنی پسند کے مطابق تراشا ہے' اگر یہ ان دونوں ملکوں میں سامراجی داخل اندازی نہیں تو اور کیا ہے؟ اسلامی دنیا اور خاص طور سے مشرق وسطیٰ کی امریکی اقدار اور مفادات کے مطابق تشکیل نو کی طرف ایک دیو قامت قدم۔

امریکیوں کو اگرچہ وہ ظاہر سے سامراجیت کے یورپی مثالیہ کے مخالف تھے جلد ہی پتہ چل گیا جیسا کہ وہ اپنے ہاں سرخ ہندیوں کے ساتھ تعلقات میں پہلے ہی جان

چکے تھے، دوسروں کو زیر نگیں کرنے کے لیے محض نظریات کافی نہیں۔ اس کے لیے طاقت اور بربریت ضروری ہے۔ کم از کم فلپائن میں امریکی تجربہ کا سبق یہی تھا جہاں امریکی فوجی جلدی ہی مزاحمت کاروں کے خلاف ایک طویل اور خوں آشام جنگ آزادی میں پھنس گئے۔ یہ ایک طویل ترین (۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۲ء تک) اور غضب ناک جنگ تھی۔ اس میں بارہ لاکھ امریکی فوجی ملوث تھے اور چار ہزار تین سو ہلاک ہوئے۔ یہ تعداد امریکی ہسپانوی جنگ میں ہلاک ہونے والوں سے دس گنا زیادہ تھی۔ فلپائنی ہلاک شدگان کی درست تعداد آج تک واضح نہیں اور خیال ہے کہ کم از کم پچاس ہزار مقامی باشندے ہلاک ہوئے تھے۔

فلپائن پر اپنے سامراجی اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ریاستہائے متحدہ کو ایک طویل خون آشام جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ویسی ہی گوریلا جنگ پھوٹ پڑی جیسی کیوبا میں ہسپانوی فوجوں کے خلاف شروع ہوئی تھی اور بہت جلد امریکی فوج بھی اسی قسم کی بربریت میں مبتلا ہوگئی جو ہسپانوی جنرل کریبین میں روا رکھتے تھے تو امریکی غصہ کا اظہار کرتے تھے۔ فلپائنیوں نے ہسپانوی فوجوں سے بغاوت کی اور بعد میں فلپائن نے امریکیوں کے خلاف گوریلا جنگ شروع کی جس کے سربراہ Emaloi Agninaldo تھے جو ایک جائز حکومت کی سربراہی کے دعویدار تھے۔ فلپائنی امریکی قابض فوجیوں کو تین طویل سالوں تک ایک سے دوسرے جزیرہ میں بھگاتے رہے۔ ڈگلس میک آرتھر کے والد جنرل میک آرتھر کو جلد ہی یقین آگیا کہ فلپائنی عوام باغی قائدین کی مدد کر رہے تھے اور ریاستہائے متحدہ کی حکومت کو لکھا:

''میں بادل ناخواستہ اس بات پر یقین کرنے پر مجبور ہوں کہ فلپائنی عوام Agninaldo اور اس کی موعودہ حکومت کے وفادار ہیں۔''

لیکن میک آرتھر کی طرف سے باغی قائد کی عوامی حمایت کے اعتراف کے باوجود امریکی حکومت نے معقولیت اور مصالحت کا رویہ اپنانے کے بجائے سخت اقدامات اٹھائے جو وقت گزرنے کے ساتھ اور بھی غضب ناک اور وحشیانہ ہوتے گئے۔ فلپائنی

گوریلے گرفتار ہوتے تو قاتل قرار دے کر فوراً ہی ہلاک کر دیے جاتے۔ کچھ جزیروں پر سے تمام آبادی کا انخلاء کر دیا گیا اور انھیں قیدی کیمپوں میں مقید کر دیا گیا جبکہ امریکی فوجوں نے ان کے گاؤں، کھیتوں، فصلوں اور مویشیوں کی تباہ کر دیا۔

George Donald Son Moss اپنی کتاب "American People" میں اعتراف کرتا ہے کہ "امریکی فوجیں وحشیانہ پن کے گھیرے میں آ گئیں جو فلپائنیوں کو نیم انسان سمجھتے تھے اور اکثر ان کو بلاوجہ مارنے کا مزہ لیتے تھے۔ ایک امریکی کمانڈار نے اپنی فوجوں کو حکم دیا "مارو اور جلاؤ، جتنا زیادہ تم مارو گے اور جلاؤ گے اتنی زیادہ مجھے خوشی ہوگی"۔ دس سال سے اوپر کے ہر شخص کو گولی مار دو۔ "ہر زخمی امریکی کے لیے پندرہ فلپائنی ہلاک کر دیے جاتے تھے۔" یہ جنگ اس وقت تک کی امریکی حربی تاریخ کی خونی ترین جنگ تھی"۔ امریکیوں کی بربریت کی یہ بھیانک کہانیاں وحشی منگولوں کی وحشیانہ کارروائیوں کی یاد دلاتی ہیں جو وہ ان علاقوں میں کرتے تھے جنھیں تاخت و تاراج کر دیتے تھے۔ ۱۹۰۲ء تک یہ بغاوت کمزور پڑ گئی اور اجنی نالڈو کی گرفتاری کے نتیجہ میں امریکی افواج تقریباً تمام جزائر پر قابض ہو گئیں۔ بعد میں اجنی نالڈو نے ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کر دیے اور اپنے حامیوں کو جنگ ختم کرنے کی ہدایت کر دی۔ اور امریکی اقتدار کو تسلیم کر لیا۔ اجنی نالڈو کی گرفتاری کے باوجود بعض جگہوں میں مزید ایک سال تک جنگ جاری رہی۔ ۱۹۰۱ء کے موسم گرما میں فوج نے جزائر کا اختیار William Howard Taft کے حوالے کر دیا جو پہلے شہری گورنر بن گئے اور اعلان کیا کہ فلپائن میں امریکی مشن جزائر کو آزادی دینے کے لیے تیار ہے۔

امریکہ کے ساتھ تجارت اس حد تک بڑھ گئی کہ فلپائن کی معیشت مکمل طور پر امریکہ کی محتاج ہو گئی۔ ایک کے بعد ایک امریکی گورنر Taft سمیت فلپائن کو آزادی دینے کی پالیسی کا اعلان کرتے رہے، فلپائنوں کی خودمختاری کو رفتہ رفتہ بڑھایا گیا اور آخر ۴ جولائی ۱۹۴۶ء میں جزائر کو آزادی حاصل ہوئی۔

امریکی جمہوریہ اپنی موجودگی کے شروع سے ہی توسیع پسند رہی ہے۔ انیسویں

صدی کے پہلے نصف میں ریاستہائے متحدہ کی آبادی مغرب کی طرف بڑھتی رہی اور مسلسل نئے علاقے حاصل کرتی رہی مثلاً فلوریڈا، ٹیکساس، اوریگن، کیلی فورنیا، نیو میکسیکو اور الاسکا۔ یہ ان کا آشکار تقدیر (Manifest Destiny) پر ایمان تھا جس نے امریکیوں کو نئے علاقوں میں توسیع کی طرف ہنکا دیا۔ انیسویں صدی کے اواخر کے قریب امریکی توسیع پسندی امریکی برعظیم سے ابل کر دور دراز علاقوں تک پہنچ گئی۔

خانہ جنگی کے بیس سال بعد تک امریکہ مزید توسیعی مہمات کے لیے بہت تھکا ہوا تھا۔ بہرحال ۱۸۹۰ء سے امریکی ایک دفعہ پھر آشکار تقدیر کی طرف سے سفر کے لیے تیار ہو چکے تھے، جس نے ان کے آباؤ و اجداد کو ۱۸۴۰ء کے توسیعی دور میں میکسیکو سے سامراجی سلطنت چھین لینے کی تحریک دی تھی۔

کچھ واقعات نے امریکہ کی توجہ براعظمی توسیع سے سمندر پار توسیع کی طرف مبذول کروادی۔ اب تک امریکیوں کو سامراجیت کا مزہ آ چکا تھا۔ پہلے سرخ ہندیوں کو زیردست کیا گیا اور بعد میں زیردست لوگوں پر نو آبادیاتی اختیار قائم کیا۔ ۱۸۹۰ء میں Fredrick Jackson Turner اور کئی دوسروں نے سرحدوں کی بندش کا ڈر پیدا کر کے کم ہوتے ہوئے قدرتی وسائل کا بھیانک خواب پیدا کیا اور باہر سے متبادل وسائل حاصل کرنے کی سخت ضرورت پر زور دیا۔ اس کی وجہ سے تاجر سمندر پار بازار ڈھونڈنے پر مجبور ہوئے۔

ماضی میں ریاستہائے متحدہ کی سامراجی مہمات کا محور اس کی معاشی احتیاج اور بے پناہ فوجی قوت تھے۔ سستے تیل تک رسائی اور وسعت پذیر برآمدی مواقع سے زیادہ جمہوریت کے لباس میں اپنی اقدار کا نظام مسلط کرنا، اور اگر ضرورت ہو تو ہتھیاروں کی طاقت سے کام لینا' ریاستہائے متحدہ کی سامراجی و فوجی تحاریک کا بنیادی مقصد رہا ہے۔

۱۹۳۰ء میں امریکی صدر روزویلٹ نے پانامہ کو کولمبیا سے الگ کرنے کے لیے جنگی کشتیاں بھیجیں کیونکہ حکومت نے نہر کی تعمیر کے لیے روزویلٹ کی شرائط قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۴ء تک امریکی بحری فوج نے چار دفعہ کیوبا پر حملہ کیا

دو دفعہ ہیٹی پر، ایک دفعہ گوئٹے مالا، سات دفعہ ہنڈوراس، چار دفعہ جمہوریہ ڈومینیکن، دو دفعہ پانامہ، تین دفعہ میکسیکو اور چار دفعہ کولمبیا پر حملہ کیا۔ کئی ملکوں میں امریکی بحری فوج قابض حیثیت سے برسوں مقیم رہی۔ جب فوجی واپس گئے تو ایسے دوست آمروں کو اختیار عطا کر گئے جو ہتھیاروں سے لیس اور اپنے عوام پر جبر کرنے کے لیے تیار تھے۔ یہی عمل وہ عراق اور افغانستان میں دہرانا چاہتے ہیں۔

ایرک مارگولس نے اپنے مضمون میں (ڈان ۳۱ اگست ۲۰۰۴ء) مسلمان دنیا اور اس کے قدرتی وسائل کو اپنی گرفت میں رکھنے کے لیے اس امریکی سامراجی شہ رگ منصوبہ پر روشنی ڈالی ہے۔ مضمون میں کہا گیا ہے کہ ریاستہائے متحدہ بلغاریہ اور رومانیہ میں نئے اڈے بنائے گا جنھیں وسط ایشیا پاکستان عراق اور خلیج میں زیرِ تعمیر اڈوں سے ملا کر ''مہماتی جنگ'' کی تشکیل نو کی جائے گی۔ بھارتی ٹینکوں اور توپ خانہ کی جگہ کینیڈا میں ساختہ ہلکی پہیے والی مسلح گاڑیاں استعمال کی جائیں گی۔ فوجوں کو مزاحمت مخالف اور شہری جنگ کی تربیت دی جا رہی ہے۔ کم خرچ سرعت سے قائم کیے گئے چھوٹے اڈوں کا ایک Lily Pad تصور جو امریکی فوجوں کے دنیا کے گرد اچھلتے پھرنے کا راستہ ہموار کرنے کے لیے قائم ہوگا۔

امریکی بحریہ ''ساحلی جنگی جہاز'' تیار کر رہی ہے جو ساحلی کارروائیاں کریں گے اور فوجوں کو گولہ بارود فراہم کریں گے۔ گہرے سمندر میں موجود دوسرے رسد کے جہاز ساری دنیا کے گرد متعین کیے جائیں گے تاکہ مسلح افواج زیادہ عرصے تک میدان میں رہ سکیں۔ برطانیہ کے ناقابل شکست عظیم بیڑے کے جدید پہلو امریکی ہوائی جہاز کو اس مقصد سے تیار کیا گیا ہے کہ فوری طور پر بمباروں اور جائزہ لینے والے طیاروں کو ''A Strike Package of Attack'' کے طور پر مختصر وقت میں دنیا میں کہیں بھی استعمال کر سکیں۔ نئے مال بردار جہاز تیار کیے جا رہے ہیں۔ جاسوس خلائی جہازوں کے جھنڈ سمعی آلات اور بغیر ہواباز جاسوس طیاروں کے جھنڈ تمام دنیا میں واشنگٹن کی آنکھوں اور کانوں کا کام کریں گے۔ یہ ہے مسلمان دنیا اور اس کے وسائل پر حکومت کرنے

کا منصوبہ۔

طالبان کے ساتھ وسط ایشیا سے افغانستان کے راستے سے تیل کی رسد کے لیے رسائی کا معاملہ قابل غور تھا اور طویل عرصہ تک زیر غور رہا اور طالبان راہداری کی سہولت دینے کے لیے اس صورت میں تیار تھے کہ ان کی آزادی کو کسی قسم کا خطرہ نہ ہو یہ افغانوں کا اپنی آزادی پر اصرار ہی تھا جس کی وجہ سے مذاکرات کامیاب نہ ہو سکے۔

یقیناً صدام حسین بھی قابل عمل شرائط پر تیل مہیا کرنے پر راضی ہوسکتا تھا لیکن امریکی سامراجی منصوبہ اور مہمات کے قلب میں مشرق وسطیٰ اور آخر کار پوری اسلامی دنیا کی نظریاتی فتح ہے۔ عراقی عوام زندگی میں اسلامی اقدار اور طرز زندگی سے محرومی کی شکایت کر رہے ہیں۔ ہفتہ وار ٹائم نے ۲۲ دسمبر ۲۰۰۳ء کو لکھا کہ عراقیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد شراب اور بدکاری کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ امریکی پشت پناہی اور عیش پرستی کے زیر اثر اخلاقی گراوٹ پریشان کن حد تک بڑھ گئی ہے۔ یہ اس آزادی کا پہلا ثمرہ ہے جو امریکی عراقیوں پر تھوپنا چاہتے ہیں۔

باب : ٦

دہشت گردی کے خلاف جنگ کا حال
کیا یہ جنگ امریکہ کے حق میں جا رہی ہے؟

۲۸۰ ق م میں خون آشام جنگ Heracles میں فتح کے بعد شاہ Pyrrhus نے کہا ''ایک اور فتح اور ہم تباہ ہو گئے۔'' اپنی کتاب Decline and Fall of Roman Empire میں ایڈورڈ گبن نے کہا ہے کہ کئی فاتح اپنی فتوحات پر ماتم کرنے کو زندہ رہے ہیں۔

۴۰ سال پہلے کے عظیم جدید فوجی دانشور Fuller نے تبصرہ کیا تھا: ''جنگ کا اصل مقصد فوجی فتح نہیں بلکہ سیاسی فائدہ کا حامل امن ہے''۔ ریاستہائے متحدہ نے نام نہاد فوجی فتح تو بے بس افغانوں کے خلاف حاصل کر لی ہے لیکن سیاسی فتح ابھی تک اس سے دور ہے۔

جنرل Peter Shoemaka نے جو ریاستہائے متحدہ کی فوج کے Chief of Staff ہیں جنگ عراق کی لہروں کا مشاہدہ کرنے کے بعد اور جنگوں کی تاریخ کے تحقیقاتی مطالعہ پر مبنی یہ اعلان ۱۵ جون ۲۰۰۴ء کو کیا: ''یہ جنگ جس میں ہم مبتلا ہیں فوجی طریقہ سے جیتی نہیں جا سکتی''۔ جاری جنگِ عراق پر مزید تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا: ''یہ ایک رسہ کشی ہے اس بات کی کہ قومی ریاستیں قانون کی حکمرانی اور اپنی تہذیب کی بقا کے لیے اپنی مخالف تمام قوتوں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کر سکیں گی یا نہیں، یہ حقیقت میں تصورات کا ٹکراؤ ہے۔''

چار سالوں سے زیادہ عرصہ سے جاری دہشت گردی کے خلاف جنگ سیاسی شکست کی طرف جا رہی ہے جیسا کہ شاہ Pyrrhus کو ڈر تھا اور اپنی تباہی کو خود دعوت دے رہی ہے۔ کس کو پتہ ہے کہ صدر بش اور سیکرٹری رمز فیلڈ اتنا عرصہ زندہ رہیں گے کہ افغانستان اور عراق میں اپنی ''فتوحات'' کا ماتم کر سکیں۔

نیویارک میں ریپبلکن پارٹی کے کنونشن کے ساتھ نشر شدہ انٹرویو میں صدر بش سے جب پوچھا گیا کہ کیا ریاستہائے متحدہ دہشت گردی کے خلاف جنگ جیت سکتا ہے تو ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا کہ جنگ جیتی نہیں جا سکتی اور اگر کوئی اُمید ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ دنیا کے کچھ علاقوں میں دہشت گردی کے طور طریقوں کی پسندیدگی کم ہو سکتی ہے۔ اس بلند بانگ دعویٰ سے کہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک دہشت گردی کا پورا نظام تباہ نہیں ہو جاتا گر کر کہاں پہنچ گئے۔ یہ دہشت گردی کی جنگ میں امریکہ کی شکست نہیں تو اور کیا ہے؟ کنونشن سے ایک دن پہلے جو تقریر صدر بش نے کی اس کا سخت ردعمل ہوا۔ اپنے آپ کو بھنور میں محسوس کرتے ہوئے صدر بش نے اپنی تقریر کو مثبت رُخ دینے کی کوشش کی اور اپنے پرانے موقف پر آ گئے کہ جنگ فتح تک جاری رہے گی۔ لیکن بہر حال بش اپنی تقریر کے دوسرے زیادہ اہم حصہ یعنی یہ کہ زیادہ سے زیادہ یہی امید کی جا سکتی ہے کہ دہشت گردی کی پسندیدگی کم ہو جائے گی کی کوئی تشریح نہ کر سکے۔ الفاظ پر غور کریں ''کم ہو جانا'' بجائے ''ختم کر دینا'' اور ''دنیا کے کچھ حصوں میں'' بجائے ''ساری دنیا سے''۔

ریاستہائے متحدہ دہشت گردی کے خلاف جیت رہا ہے یا اسے شکست ہو رہی ہے اس کا اندازہ بڑی حد تک سیکرٹری دفاع رمز فیلڈ کی فکر مندی سے لگایا جا سکتا ہے جنھوں نے ۲۰۰۲ء میں ایک خفیہ خط میں اپنے اعلیٰ عملہ کو لکھا ہم روزانہ جتنے دہشت گردوں کو گرفتار کر رہے ہیں مار رہے ہیں باز رکھ رہے ہیں یا بددل کر رہے ہیں ان کی تعداد مدرسوں اور شدت پسند مذہبی لوگوں کے پاس تربیت پا کر نکلنے والے ہمارے مخالفوں سے زیادہ ہے یا نہیں؟ جم لوب نے نشان دہی کی کہ سیکرٹری دفاع کی فکر مندی

سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ اپنی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بری طرح ناکام ہے''۔

Friday Financial Times اس سے بھی آگے بڑھ گیا۔اس کا اعلان ہے اگرامریکی فوج کی مسلسل موجودگی مسئلہ کے حل کا حصہ بننے کے بجائے خود مسئلہ کا حصہ ہے جیسا کہ اس بات سے واضح ہوگیا کہ ستمبر ۲۰۰۴ء میں اسی (۸۰) یا اس سے زیادہ حملے روزانہ ہورہے ہیں جو ایک سال سے پہلے سے زیادہ ہیں۔جم لوب کہتا ہے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ''یہ مدرسے یا اسلامی مذہبی رہنمانہیں ہیں جو مزید دہشت گرد'' پیدا کررہے ہیں بلکہ ایسا ریاستہائے متحدہ کی موجودگی کی وجہ سے ہورہا ہے۔آج کسی ایسے دہشت گرد مخالف ماہر کی تلاش مشکل ہے جو یہ سوچے کہ عراقی جنگ نے ریاستہائے متحدہ کے لیے خطرہ کم کردیا ہے یا کہ بڑھایا ہے۔ جریدہ The Atlantic میں ایک نمائندہ قومی تحفظ کے ماہر صحافی James Fellows نے لکھا:''آج عراق میں مارچ ۲۰۰۳ء سے زیادہ جہادی موجود ہیں۔'' Robert Cressy نے کہا جو بش کی قومی تحفظ کونسل میں بین الاقوامی خطرہ کے سابق ڈائریکٹر ہیں:

اقوام متحدہ کی ایک حالیہ رپورٹ میں متنبہ کیا گیا ہے کہ نئے متشدد گروہوں نے اسامہ کے نظریات اور طریقے اپنا لیے ہیں۔ان کا سراغ لگانا القاعدہ سے بھی مشکل ہے اور وہ کہیں زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں' اس رپورٹ نے توجہ دلائی ہے کہ ۱۱ مارچ کو میڈرڈ میں ٹرین بم دھماکوں کے بعد سے اگست ۲۰۰۴ء میں دوروسی ہوائی جہازوں کی تباہی تک دہشت گرد حملے ایسے گروہوں نے کیے تھے جن کا القاعدہ سے کوئی تنظیمی تعلق نہیں تھا۔

Sidney Blumenthale نشان دہی کرتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ کے نمایاں حکمت عملی کے ماہرین اور سابق جنرلوں کے مطابق بش جنگ ہاری جا چکی ہے۔ انھوں نے قومی تحفظ کی ایجنسی کے سابق سربراہ William Odom کا حوالہ دیتے ہوئے مزید کہا کہ بش کو کثیر تباہی کے ہتھیار نہیں ملے، اور نہ ہی القاعدہ اور وہ اس محاذ پر شکست کھا چکے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ کو عراق میں جمہوریت لانے میں بھی کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی'

وہ مقصد بھی فوت ہو چکا ہے۔ جنرل اوڈم نے کہا ''اس وقت ہم جس راستہ پر ہیں اس سے ہم خود اسامہ بن لادن کو اس کے مقاصد حاصل کروا رہے ہیں''۔

سابق مرین فوجی کمانداراور مرکزی مرین (Marine) کمان کے سربراہ جنرل Joseph Hoare کا بیان ریکارڈ پر ہے کہ ''یہ خیال کہ سب کچھ ان لوگوں کے بنائے ہوئے منصوبوں کے مطابق ہوگا مضحکہ خیز ہے۔'' Airwar College کے پروفیسر Jeffrey Recordo نے کہا مجھے افق پر امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی'' Army war College of strategic studies Institute کے پروفیسر Andrew Terrel جو عراق پر ایک ماہر بھی ہیں نے کہا: ''میرے خیال میں آپ مزاحمت کو ہلاک نہیں کر سکتے۔فلوجہ سمیت کئی شہروں اور قصبوں میں شورش پھیل رہی ہے اور ریاستہائے متحدہ کی پالیسی کے نتیجہ میں زیادہ باصلاحیت ہوتی جا رہی ہے۔ہمارے مقابل ایک وسعت پذیر تر گروہ ہے' ہمیں مستقبل میں زیادہ مربوط فوجی حملے نظر آ رہے ہیں۔وہ بہتر ہوتے جا رہے ہیں اور خود افزائش کر سکتے ہیں۔ یہ خیال کہ مزاحمت کاروں کی تعداد اتنی ہے کہ وہ مر جائیں گے تو ہم نکل سکیں گے غلط ہے۔مزاحمت نے خود افزائش کی صلاحیت کا اظہار کیا ہے۔کیونکہ ہلاک شدگان کی جگہ لینے کے خواہش مند موجود ہیں۔

''جنرل اوڈم نے کہا کہ عراق کے بارے میں بش انتظامیہ اور اعلیٰ فوجی افسران کے درمیان جس قدر تناؤ ہے وہ انھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا' میں نے سیکرٹری دفاع اور فوج کے درمیان ایسا برا حال پہلے نہیں دیکھا۔ایک قابل ذکر اکثریت سمجھتی ہے کہ یہ تباہی ہے۔وہ دو احزاب جن کے مقاصد کو فائدہ پہنچا ہے ایرانی اور القاعدہ ہیں۔ بن لادن یہ دلیل دے سکتا ہے کہ ہمارا عراق جانا ویسا ہی ہے جیسا جرمنوں کا اسٹالن گراڈ جانا۔انھوں نے زیادہ تعداد وہاں جھونک کر اپنے آپ کو شکست سے دوچار کر لیا''۔

پال کینیڈی نے ''بڑی طاقتوں کے عروج و زوال'' میں ریاستہائے متحدہ کی وسعت پذیر عالمی ذمہ داریوں اور اس بوجھ کو سہارنے کے لیے سکڑتی معاشی صلاحیت پر روشنی ڈالتے ہوئے عالمی قوت کی حیثیت سے اس کے زوال کی پیش گوئی کی ہے:

''ریاستہائے متحدہ نے ۱۹۴۵ء سے جو عالمگیر فوجی ذمہ داریاں اٹھارکھی ہیں ان کے مقابل ان ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لیے اس کی صلاحیت اتنی نہیں رہی جتنی کئی دہائیاں پہلے تھی، جب عالمی صنعت کاری اور قومی آمدنی میں اس کا حصہ کہیں زیادہ تھا' اس کی زراعت بحران کا شکار نہ تھی' اس کی ادائیگیوں کا توازن کہیں بہتر تھا۔ حکومت کا بجٹ متوازن تھا اور وہ تمام دنیا کا اس حد تک مقروض نہ تھا غیر ملکوں میں اس کی صنعتی پیداوار کی نامسابقت اور زرعی پیداوار کی گرتی ہوئی برآمد نے ظاہری تجارت میں شدید خسارہ پیدا کر دیا ہے۔ ایک سو ساٹھ بلین امریکی ڈالر مئی ۱۹۸۶ء تک کے بارہ مہینوں میں۔ اس سے زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ اس قسم کی کمی پوشیدہ آمدنی کے ذریعے پوری نہیں کی جا سکتی۔ امریکہ کے لیے ادائیگی کا ایک ہی طریقہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ رقوم کی درآمد کرے جس کی وجہ سے وہ چند ہی سالوں میں دنیا کے سب سے بڑے قرض خواہ سے سب سے بڑا قرض دار بن گیا ہے۔

کیا ریاستہائے متحدہ دہشت گردی کے خلاف جنگ جیت لے گا؟

افغانستان، عراق، فلپائن، یمن اور جارجیا میں پیش بند فوجی کارروائیوں کے ذریعے دہشت گردی پر بند باندھنے میں اسے کتنی کامیابی ہوئی، اور امریکی پشت پناہی سے کی جانے والی اسرائیلی فوجی کارروائیوں نے فلسطینی انتفاضہ کو کس حد تک ختم کیا جسے ریاستہائے متحدہ دہشت گرد کہتا ہے۔

ریاستہائے متحدہ افغانستان میں اپنی غلط کارمہمات میں اگر فتح پا چکا ہے تو کس حد تک؟ بیان کردہ مقاصد مثلاً اسامہ اور عمر کی گرفتاری اور ان کی تنظیم کی مکمل تباہی۔ اس موضوع پر رمیش پٹینسر نے ہفتہ وار ٹائم میں پہلی جون ۲۰۰۲ء کو روشنی ڈالی ہے: ''جنوبی اور مشرقی افغانستان میں بڑے بڑے علاقوں پر القاعدہ اور طالبان کے ہمدردوں کا قبضہ ہے۔ ملا عمر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ قندھار کے قریب پہاڑوں میں پناہ گزیں ہے۔ مئی ۲۰۰۲ء میں اس نے ظاہری طور پر لندن کے ایک عرب اخبار کو انٹرویو دیا جس میں اس نے ریاستہائے متحدہ کو شکست دینے کی قسم کھائی اور کہا کہ اسامہ بن لادن زندہ

ہے......امریکی خفیہ اداروں کے لیے یہ ایک بھیانک خواب ہے۔''

مارچ ۲۰۰۴ء میں افغانستان میں مہم بنام ''Storm Mountain'' جو پاکستان میں مہم بنام ''Hammer and Anvil'' کے ساتھ چلی تھی اور جس کا مقصد اسامہ بن لادن اور دوسرے القاعدہ قائدین کی حراست تھا، نہ صرف ناکام رہی بلکہ بری طرح الٹی پڑ گئی۔

۲۸ یا ۲۹ اپریل ۲۰۰۲ء کو واشنگٹن پوسٹ نے لکھا کہ کثیر تعداد میں افغان طالبان کی واپسی کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ اسی اخبار نے ۳۰ جون ۲۰۰۲ء کو ایک چشم کشاترین وقوعہ کی خبر دی کہ حزب اللہ اور القاعدہ امریکہ کے خلاف اتحاد کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ چیف اسٹاف کے سربراہ جنرل مائرز نے اعتراف کیا کہ ''افغانستان میں دہشت گردی کے خلاف جنگ سست پڑ رہی ہے۔ القاعدہ نے ہماری حکمت عملیوں سے بہتر طور پر نمٹنا شروع کر دیا ہے جبکہ ہم ایسا نہیں کر سکے۔'' ۵ نومبر ۲۰۰۲ء کے بوسٹن گلوب نے اعلیٰ ڈیموکریٹ سینٹر Daschle کا بیان شائع کیا ''القاعدہ کے قائدین کو پکڑنے میں ریاستہائے متحدہ کی ناکامی سوالات پیدا کرتی ہے کہ آیا ہم دہشت گردی کی جنگ جیت بھی رہے ہیں۔ ۳۰ ستمبر ۲۰۰۲ء کو نیویارک ٹائمز میں John F.Burns نے تبصرہ کیا: ''دنیا کی سخت جان ترین فوجوں سے جنھیں سیارہ جاتی ٹیکنالوجی اور ہیلی کاپٹروں سے لے کر جدید ترین تکنیکی سہولیات کی تمام جادوگری حاصل ہے اسامہ کا بچا رہنا اسے مسلم دنیا میں بہتوں کے لیے ایک پرکشش ترین مثال بنا چکا ہے خصوصاً نوجوانوں کے لیے اسامہ زندہ یا مردہ افغانستان کی فتح پر لمبے سائے ڈال رہا ہے اور امریکہ کی پشت پناہی میں قائم حکومت کو ہٹا کر طالبان حکومت کے دوبارہ قیام کی دھمکی دے رہا ہے'' ہوسکتا ہے کہ افغانستان میں اسامہ کے لیے بھرتی اور تربیت کی سہولتیں باقی نہ رہی ہوں لیکن اس کے حمایتی اور ہاتھ پاؤں ساٹھ دوسرے ممالک میں پھیل گئے ہیں اور اب اسامہ اور اس کے معتقدین صرف القاعدہ کے ترجمان نہیں ہیں بلکہ ساری اسلامی دنیا کے ترجمان ہیں جو اُن کی باتیں احتیاط اور دھیان سے سنتی ہے۔

ریاستہائے متحدہ نے فلپائن، جارجیا میں چھپے ہوئے چیچنیوں اور یمنیوں کی نشان دہی ایسے لوگوں کی حیثیت سے کی ہے جو القاعدہ کے جادو کے زیر اثر آ چکے ہیں اور جن کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ آزادی کے لیے جاری مسلح جدوجہد میں حصہ لے رہے ہیں۔ چنانچہ ریاستہائے متحدہ نے تربیت یافتہ ترین فوجیں فلپائن، جارجیا اور یمن میں دہشت گردوں کے خلاف جنگ میں مدد دینے کے لیے بھیجیں۔ امریکی کارروائیوں کو تمام جگہوں پر شکست فاش ہوئی۔

دہشت گردی کے خلاف ابوسیاف کی جماعت سے لڑنے اور اس کے قلع قمع کے لیے فلپائنی فوجوں کی تربیت کے لیے امریکہ نے بارہ سو فوجی بھیجے۔ جب امریکی فوج نے تربیت مکمل کر لی تو بحرالکاہل کی کمان کے سربراہ Thomas B.Fargo نے دعویٰ کیا کہ ان کی مہم نے ابوسیاف کو منتشر اور فرار پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن فوراً ہی ایڈمرل کا دعویٰ نامناسب ثابت ہوا جبکہ امریکی افواج کا تربیتی مشن مکمل کر لینا سراب ثابت ہوا۔ دہشت گردوں کا سیاف گروپ اب بھی مضبوط تھا' یہ اس بات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگست ۲۰۰۲ء کے تیسرے ہفتہ میں انھوں نے پھر شدید حملہ کیا اور چھ Jehovah گواہوں کو خوشبویات فروشوں کا بھیس بدل کر اغوا کر لیا۔ اس طرح ثابت ہوا کہ ابوسیاف جماعت کے قلع قمع کے لیے امریکی پشت پناہی میں مہم کے باوجود یہ جماعت خطرناک تھی۔ یہ سانحہ فلپائنی حکومت کے لیے دھچکا تھا جس نے چند ہفتے ہی پہلے دعویٰ کیا تھا کہ سیاف جماعت ختم ہو چکی ہے اس لیے وہ ان کے خلاف جنگ سے کچھ وسائل ہٹا رہے ہیں نتیجتاً فلپائنی حکومت نے گھٹنے ٹیک دیے اور جھک کر اسی ابوسیاف جماعت کے پاس مغویوں کی رہائی کے لیے نمائندے بھیجے جن کے بارے میں دعویٰ تھا کہ وہ مٹا دیے گئے ہیں۔

۵/اکتوبر ۲۰۰۲ء کو نیویارک ٹائمز نے رپورٹ شائع کی کہ امریکی حکومت کے اس اعلان کے دو ماہ بعد ہی سے مسلم گوریلوں کا گروپ جڑ سے اکھاڑ دیا گیا ہے باغی پھر سے مجتمع ہو گئے ہیں اور ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو جنھوں نے بم دھماکہ کیا جس میں ایک فلپائنی ہلاک

اور دو زخمی ہوئے۔ یہ حملہ سیاف کی طرف سے اس عہد کے بعد ہوا کہ وہ فلپائن میں امریکہ سے متعلق تمام شہری اور فوجی نشانوں پر حملہ کریں گے۔ اس تصور کی وجہ سے کہ امریکی بم دھماکہ کی وجہ سے ہٹ رہے ہیں فلپائن کے سیکرٹری دفاع کو امریکی کمانڈار سے بات کرنی پڑی جنھوں نے یقین دلایا کہ بم دھماکہ کی وجہ سے امریکی لڑاکے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو بوسٹن گلوب نے ایک مضمون میں لکھا: ''۱۱ اکتوبر کی ہلاکتوں کے لیے القاعدہ سے متعلق مسلمان ذمہ دار ہو سکتے ہیں جس میں چھ افراد ہلاک اور ایک سو چوالیس (۱۴۴) زخمی ہوئے تھے اور زمبوانگا کے عیسائی شہر میں دو ڈیپارٹمینٹل اسٹور تباہ ہو گئے تھے۔ جنوبی فلپائن میں چھ لاکھ کی آبادی والا ایک شہر اس دہشت گردی مخالف تربیت کے چھ ماہ بعد بھی دھماکوں سے لرز اٹھا''۔

۱۲۳ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو بوسٹن گلوب نے زمبوانگا کیتھولک عیسائی مرکز میں بم دھماکہ کی خبر دی جس میں ایک فرد ہلاک ہوا۔ زمبوانگا کا شہر ۱۲ اکتوبر کے دھماکہ سے ایک ہفتہ پہلے سے سخت حفاظتی نگرانی میں تھا جس میں ۲۵ / افراد زخمی بھی ہوئے تھے اور امریکہ کے Grace Beret نے جس کی ذمہ داری القاعدہ اور ابو سیاف کے گٹھ جوڑ پر ڈالی تھی۔ منیلا کے مرکزی تجارتی علاقہ میں دو اور دھماکے ہوئے۔ بعد میں دارالخلافہ میں ایک بس میں دھماکہ ہوا جس میں دو افراد ہلاک اور دو سو زخمی ہوئے۔ ایک لمبے وقفہ کے بعد جب یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ ابوسیاف گروپ ختم ہو چکا ہے اس نے ایک دفعہ پھر حملہ کیا اور اواخر نومبر ۲۰۰۴ء میں ایک بازار میں کئی فلپائنی ہلاک ہوئے۔ اس کے بعد پھر تقریباً ایک سال کے وقفہ کے بعد جنوبی فلپائن میں ایک فیری پر بم حملہ ہوا، ۲۸ / اگست 2005ء کو جس میں کم از کم ۱۳۰ افراد زخمی ہوئے۔

یمن میں بھی جہاں یمنی افواج کو دہشت گردوں کے خاتمہ کے لیے تربیت دینے کے لیے امریکی افواج بھیجی گئی تھیں کوئی فرق نہیں پڑا جیسا کہ فرانسیسی بحریہ کے جہاز پر یمنی سمندروں میں حملہ سے پتہ چلا جو امریکی فوجوں کی واپسی کے بعد ہوا۔ اس طرح فلپائن اور یمن دونوں جگہ امریکی مشن برائے انسداد دہشت گردی مکمل طور سے ناکام

رہا۔ یمنیوں کے بارے میں میں ابھی تک یہی رپورٹ ہے کہ سعودی حکومت کے خلاف متشدد حملوں میں حصہ لے رہے ہیں تا کہ اسے امریکہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کی سزا دے سکیں۔ اپریل ۲۰۰۵ء کی رپورٹ یہ ہے کہ یمن میں ریاستہائے متحدہ مخالف شورش کی وجہ سے صنعاء میں ریاستہائے متحدہ کا سفارت خانہ بند ہو گیا۔

سال کے شروع میں (۲۰۰۲ء) ریاستہائے متحدہ نے مشتبہ القاعدہ سے متاثر چیچن گوریلوں کے خلاف جارجیا کی فوجوں کی تربیت کے لیے فوجی تربیت کار بھیجے جو پانکسی کی وادی میں کام کر رہے تھے۔ جارجیا کے ٹیلی ویژن اسٹیشن نے رپورٹ دی کہ تقریباً پانچ سو مسلح چیچن اور عرب جنگوں دارالحکومت تلبسی سے چالیس میل شمالی پہاڑوں میں جمع تھے۔ مقامی لوگوں کا یہ بیان بھی سنا گیا کہ پولیس ان لڑاکوں کے لیے کپڑے کھانا اور خیمے لائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ روسی جیٹ طیاروں نے پانکسی کی وادی پر نا کام حملہ کیا۔ چیچنوں نے ایک روسی ہیلی کا پٹر مار گرایا جس میں ایک سو اٹھارہ روسی فوجی سوار تھے۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ریاستہائے متحدہ کی دہشت گردی مخالف فوجی کارروائیاں جارجیا میں بھی مکمل طور پر نا کام رہیں، چیچن آج بھی روسی نشانوں پر حملے کر رہے ہیں۔ ۱۸ مئی ۲۰۰۴ء کو انھوں نے روس کے حمایت یافتہ صدر قادروف اور دوسروں کو قتل کر دیا اور پھر کئی حملے کیے جن میں اکتوبر نومبر ۲۰۰۴ء میں بلسان کا حملہ بھی شامل ہے، بعد میں ۲۰۰۵ء میں روسی فوجیوں پر کئی حملے ہوئے اکتوبر ۲۰۰۵ء تک قیادت میں تبدیلی کے بعد سو ۱۰۰ چیچن جنگجوؤں نے جنوبی روس میں پولیس اور فوج کی عمارتوں پر حملے کیے۔

Nalichik نامی ایک فوجی گاؤں میں درجنوں لوگ ہلاک ہوئے۔ یہ بات کریملن کے اس دعویٰ کی نفی کر رہی تھی کہ انھوں نے تمام دھڑوں کو قابو میں لے لیا ہے۔ عبدالخبسا دولوف کے انتظام سنبھالنے کے بعد باغیوں کی پہلی بڑی باغیانہ کارروائی تھی جو چیچن گوریلوں نے مارچ ۲۰۰۵ء میں کی۔

ریاستہائے متحدہ نے فلپائن میں دہشت گردی کے خلاف اپنی مہم کی ناکامی تسلیم

کر لی اور جنوری ۲۰۰۳ء میں دوسرا تربیتی مشن شروع کرنے کا منصوبہ عمل میں لایا جس میں تین سو سے چار سو تک کی تعداد میں فوجیوں نے حصہ لیا تھا۔ اس میں جنگل پہرہ بھی شامل ہوسکتا تھا۔ یہ پینٹا گون میں اس بڑھتی ہوئی سوچ کا عکس ہے کہ متشدد اسلامی جال امریکیوں کے لیے اور جنوبی ایشیا میں ان کے مفادات کے لیے خطرہ ہے۔ اور فلپائن میں تربیتی مشن مسلم گوریلوں کو ختم کرنے میں ناکام رہا' بمباریوں کے ایک سلسلہ کے بعد جس میں سارجنٹ درجہ اول Tackron زمبوانگا میں ہلاک ہوا تھا اور جس نے ملک میں دہشت گرد تنظیموں کے ایک پریشان کن اتصال کا اشارہ دیا تھا۔ پینٹا گون کا رویہ قابل ذکر حد تک بدل گیا۔ ۲۸ دسمبر ۲۰۰۲ء کے بوسٹن گلوب نے لکھا کہ فلپائنی باغیوں نے نو اہل کاروں کو گھیرا اور ۲۱ کو ہلاک کر دیا' فوج نے ان دونوں حملوں کی ذمہ داری مورو آزادی محاذ پر ڈالی۔ امریکہ کی اس تجویز کا کہ ریاستہائے متحدہ کی فوج گوریلا مخالف کارروائیوں میں بلاواسطہ حصہ لے، فلپائن میں سخت سیاسی مخالفت ہوئی اس لیے اسے ملتوی کر دیا گیا۔

ایک دفعہ پھر افغانستان کی طرف واپس آتے ہیں...... عراق میں جنگ کے بعد سے افغانستان میں گوریلا کارروائیاں بڑھتی رہی ہیں اور زیادہ متواتر اور تباہ کن ہوگئی ہیں جن میں ریاستہائے متحدہ کے فوجی کامیابی کے ساتھ نشانہ بنائے گئے ہیں اور طالبان بڑے بڑے علاقوں پر قبضہ کرتے رہے ہیں۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۳ء کے ڈان میں واشنگٹن سے اس کے نمائندہ نے کہا: ''ان کامیابیوں کے باوجود ریاستہائے متحدہ کے دہشت گردی کے ماہرین جو ۹/۱۱ کی دوسری سالگرہ کے موقع پر مختلف ٹیلیوژن پروگراموں میں شریک ہوئے اعتراف کیا کہ القاعدہ ابھی بھی ساری دنیا میں کارروائی کرنے کی اہل ہے۔ انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ عراق پر امریکی حملہ نے القاعدہ کو نیا میدان جنگ اور بھرتی کا نیا مرکز عطا کر دیا ہے۔ اب یہ گروہ نئے شہیدوں کو تلاش کر رہا ہے تاکہ مسلمان علاقوں کو قابض مغربی فوجوں سے آزاد کرانے میں مدد کرے جیسا کہ اسامہ نے اپنے ایک حالیہ ٹیپ بیان میں کہا: امریکی ماہرین کا کہنا ہے کہ افغان جنگوں کے تجربہ کار عرب جو ہمیشہ

القاعدہ کے سخت گیر مرکز میں رہے ہیں، اب عراق میں جمع ہو رہے ہیں تاکہ امریکہ مخالف مزاحمت میں شریک ہو سکیں۔"

۱۱ر ستمبر ۲۰۰۳ء کو رائیٹرز کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ چار افغان جو ایک مغربی ادارہ کے اہل کار تھے متشدد کارروائی میں مارے گئے جس کا الزام پھر سے ابھرنے والی طالبان ملیشیا پر لگایا گیا۔ ایک افغان افسر نے بتایا: مئی ۲۰۰۳ء سے یہ دارالخلافہ اور جنوب کے درمیان سڑک پر دوسرا حملہ تھا۔ ۲۱ ستمبر کی صبح رپورٹ آئی کہ ایک مہینہ سے زیادہ عرصہ سے مشرقی افغانستان کے شہر برمال پر طالبان نے حکومتی فوجوں کو بھگا کر قبضہ قائم کر رکھا ہے۔ اگست سے شکین میں تعینات امریکی فوجیں اکثر حملوں کی زد میں آتی تھیں۔ ستمبر ۲۰۰۲ء تک امریکی اور افغان فوجوں کے خلاف طالبان حملوں کی کامیابی کی یہ صورت حال تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ طالبان پھر سے مجتمع ہو کر واپس آ رہے ہیں۔

۲۵ ستمبر ۲۰۰۳ء کو ڈان میں رائٹرز کی ایک رپورٹ شائع ہوئی کہ افغنستان میں ریاستہائے متحدہ کے زیر قیادت دو سالہ مہم کے باوجود یہ ملک ابھی تک حالت جنگ میں تھا اور پچھلے دو ماہ میں تقریباً تین سو اموات ہوئی تھیں جو طالبان کے سقوط کے بعد خونی ترین عرصہ تھا۔ ۲۵ ستمبر کو ڈان میں AFP کی ایک رپورٹ شائع ہوئی کہ ملا عمر نے افغان اور امریکی قیادت میں فوجوں پر حملے شدید تر کرنے کا عہد کیا ہے۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا تھا کہ اپنی ملیشیا کے کمانداروں سے ایک خفیہ ملاقات میں انھوں نے جہاد کو وسعت دینے کی ہدایت کی تھی۔ ملا عمر نے اپنی دس رکنی شوریٰ سے بھی ملاقات کی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ملا اپنی جماعت کے آلات اور جنگجوؤں کی تنظیم کے ساتھ افغانستان میں بدستور کام کر رہا ہے۔ طالبان کی حربی کامیابوں سے بھی زیادہ اہم ان کی اخلاقی فتح ہے۔ انھوں نے افغان عوام میں اپنے آپ کو عزیز تر کر لیا ہے جو ان کی واپسی کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ۱۳ر اکتوبر کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ طالبان نے افغنستان میں امریکی فوج کے محفوظ ترین ہوائی اڈے باگرام میں بھی راستے بنا لیے ہیں اور بم دھماکوں سے کئی گھروں کو تباہ کر دیا ہے۔ محافظوں کی سازباز کے بغیر ایسا

ہونا ناممکن تھا' مرنے والوں کی شناخت اور تعداد سے متعلق معلومات خفیہ ترین ہیں۔

روزنامہ Independent (لندن ۲۱ ستمبر ۲۰۰۲ء) میں رابرٹ فسک نے افغانستان سے ایک مراسلہ میں جو عینی شہادتوں پر مشتمل ہے لکھا ہے کہ افغانی ان طالبان کی قبروں پر پابندی سے حاضری دیتے ہیں جو اپنے ملک کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوئے ہیں۔ ہر روز افغانوں کی ایک بڑی تعداد ان قبروں پر جمع ہوتی ہے اور قبروں سے مٹی اٹھا کر زبان پر رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس طرح بیماریوں سے شفا ملتی ہے۔

قبرستان کے محافظوں سے گفتگو کرنے کے بعد رابرٹ فسک نے لکھا:

''قبرستان کے دو محافظ بھی اسی تصوراتی تنویم کے اسیر نظر آتے تھے۔ داڑھی مونڈے ہوئے ایک آدمی نے جو کلاشنکوف لیے تھا مسکراتے ہوئے مجھے بتایا یہ درست ہے کہ لوگ قبر پر آ کر شفا پاتے ہیں' میں نے بہروں کو دیکھا جو پھر سے سننے لگے۔ ایک دفعہ میں نے گونگے کو بولتے دیکھا۔ فسک نے یوں نتیجہ نکالا'' طالبان کے لیے محبت اور عقیدت افغانیوں کے دل میں دوبارہ پیدا ہونے کی وجہ وہ جبر اور بہیمیت ہے جو طالبان کے بعد کے دور میں انہوں نے بھگتی جبکہ کرزئی حکومت ان کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے میں بھی مکمل طور سے ناکام رہی ہے۔ ۲۹ جولائی ۲۰۰۳ء کے نیویارک ٹائمز میں Carlotta Gall نے نیویارک میں قائم انسانی حقوق کے نگران ادارہ کی ایک سو ایک صفحات پر مشتمل رپورٹ کا خلاصہ شائع کیا ہے جس میں افغان شہریوں کے خلاف جرائم کی فہرست مہیا کی گئی ہے اور فوجیوں' پولیس افسروں' کمانداروں یہاں تک کہ موجودہ کابینہ کے وزیروں تک پر الزام لگایا ہے کہ وہ بھتہ خوری' بلاوجہ گرفتاریوں' مار پیٹ' نجی قید خانوں میں اغوا برائے تاوان کے اسیروں کو قید رکھنے اور ممکنہ تشدد میں ملوث ہیں اور یہ بھی کہ ان میں زیادہ تر مجرم کرزئی حکومت سے بہت قریبی تعلقات رکھتے ہیں اور بعض تو امریکی فوج سے بھی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کچھ زیادہ ہی قربت رکھتے ہیں۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۳ء کو شائع شدہ ڈان کی رپورٹ کے مطابق طالبان کے سقوط کے

بعد امریکی حمایت یافتہ کرزئی حکومت کے دور میں ۲۰ ملین افغان آبادی میں سے آدھے سے زیادہ قحط سے متاثر ہو گئے۔ ۴ ملین فاقہ زدگی میں مبتلا تھے اور ایک ملین فاقہ کشی کے نتیجہ میں ہلاک ہو چکے تھے۔ دو سالوں میں پچاس فی صد مویشی ہلاک ہو چکے تھے۔

افغانستان کے بعض علاقوں میں لوگوں کو پانی لانے کے لیے سارا دن چلنا پڑتا تھا۔ ہاضمے کی بیماریاں اور ٹائیفائیڈ وبا کی طرح پھیل چکے ہیں۔ قحط زیادہ علاقوں میں بڑی تعداد میں بچے گندا پانی پینے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ ایک جاپانی سماجی خدمت گار ناکامورا نے نشان دہی کی کہ غیر ملکی امداد کا ستر فی صد غیر سرکاری اداروں اور اقوام متحدہ کے گروپوں کو چلا گیا۔ ۹ ستمبر ۲۰۰۳ء کو ڈان کی ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ ریاستہائے متحدہ کی انتظامیہ نے اپنے بجٹ میں سے صرف چار سو ملین ڈالر افغانستان عوام پر خرچ کیے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے ستم خوردہ عوام طالبان کی واپسی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ ۲۰۰۳ء میں جب امریکی محکمہ خارجہ کے ڈپٹی سیکرٹری قندھار اور کابل کے دورہ پر آئے تو یہ افواہ پھیل گئی کہ انھوں نے طالبان کے وزیر خارجہ متوکل وکیل سے ملاقات کی ہے جو قید سے چھوٹ کر آ چکے تھے۔ اگر چہ کرزئی اور امریکی سفیر خلیل زاد نے اس کی تردید کی آخر الذکر نے بہر حال تسلیم کیا کہ دونوں طرف کے افغان قائدین میں کچھ ''ہاتھ بڑھانے کا عمل'' ہوا ہے۔ افغان قائدین کے درمیان اس ہاتھ بڑھانے کے عمل سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ڈوبتی ہوئی امریکی حمایت یافتہ کرزئی حکومت کو بچانے کے لیے میانہ رو طالبان کے ساتھ چاپلوسی کی جا رہی تھی۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ طالبان ایک دفعہ پھر قابل غور طاقت ہیں جو جلد یا بہ دیر واپس آ سکتے ہیں۔ یہ طالبان کے لیے بڑی اخلاقی فتح ہے۔

۲۵ راکتوبر ۲۰۰۳ء کو AFP اور رائٹرز کی مشترکہ رپورٹ (ڈان ۲۶ اکتوبر) افغان فضا میں اڑتی ہوئی کرزئی حکومت کے خاتمہ اور طالبان کی واپسی کی ہوائی لے کر آئی' رپورٹ یوں ہے:

''اقوام متحدہ کو افغانستان کے چار جنوبی صوبوں میں تشدد میں اضافہ اور اس

خطرہ کے پیش نظر کہ امدادی کارکن مقامی جنگجوؤں کا نشانہ بن سکتے ہیں اپنا کام روک دینا پڑا''۔

ایک اعلیٰ افسر نے اعلان کیا:

''قیام امن کے کاموں کے لیے اقوام متحدہ کے نائب سیکرٹری جنرل نے اعلان کیا ہے کہ طالبان فوجیں افغانستان کے علاقوں پر پھر سے قبضہ کر رہی ہیں اور بعد از جنگ حکومت کمزور ہونے لگی ہے۔'' AFP رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ شمالی اتحاد کی فوجیں جنھوں نے طالبان کے سقوط میں نمایاں کردار ادا کیا تھا اور جو حقیقت میں افغانستان پر حکومت کر رہے تھے بکھر چکی ہیں، ازبک جنرل دوستم اور تاجک جنرل عطا محمد اقتدار کی جنگ میں پھنسے ہوئے ہیں۔

طالبان کے سقوط کے فوراً بعد صدر بش نے فخریہ کہا تھا کہ اگر اسامہ اور عمر پکڑے نہ بھی گئے تو کوئی بات نہیں کیونکہ دہشت گرد حملوں کے لیے ان کی صلاحیت معذور ہو چکی ہے۔ اس صدارتی اعلان کے صرف دو سالوں بعد خبریں یہ ہیں کہ طالبان کی طرف سے دہشت گرد حملے بڑھ رہے ہیں۔ مزید برآں طالبان کی افغان علاقوں پر پھر سے قبضہ کی صلاحیت بھی بڑھ رہی ہے۔ ساتھ ہی کرزئی حکومت کے دو وفادار دھڑے جو شمالی اتحاد کے مضبوط ترین مقابل دھڑے ہیں امریکی بری اور بحری افواج کی موجودگی میں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں اور ترقیاتی کاموں سے اقوام متحدہ کا اس بنا پر ہاتھ روک لینا کہ چار افغان صوبوں کے بڑے حصے میں طالبان واپس آچکے ہیں ان تمام حقیقتوں نے کرزئی حکومت میں امن اور تحفظ کی رہی سہی امیدوں کو چکنا چور کر دیا ہے۔

ان ہی وجوہات کی بنا پر افغانستان امریکی قیادت میں کرزئی حکومت کے تحت ناکام ریاست بن چکا ہے جس نے طالبان کی واپسی کی راہ ہموار کر دی ہے۔ ۱۲ نومبر ۲۰۰۳ء کو روسی صدر سے گفتگو کے دوران ہندوستانی وزیر اعظم واجپائی نے ماسکو میں کسی نہ کسی طرح طالبان کی واپسی کے خطرہ پر اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ اسی دن (۱۲ نومبر) افغانستان میں امریکی فوج نے طالبان کو جنگ بندی کی پیش کش کی جس میں اعلان

کیا گیا: ''ہمارے پاس کوئی نظام الاوقات نہیں ہے لیکن اگر طالبان کل ہاتھ روک لیں تو ہم کل ہی رک جائیں گے''۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر صدر بش کو دہشت گردی کی جنگ تمام تنظیموں کے قلع قمع تک جاری رکھنے کے عہد کو ٹھنڈا کرنا پڑا۔

ریاستہائے متحدہ کی طرف سے جنگ بندی کی پیش کش ایسے وقت آئی ہے جب جنوبی افغانستان میں طالبان نے ایک حصہ پر قبضہ کرلیا یہاں تک کہ اقوام متحدہ کو اپنے کارکن علاقہ سے ہٹانے پڑے۔ ۸ مارچ ۲۰۰۴ء کو ہفتہ وار ٹائم نے انکشاف کیا۔ ''امریکی فوجی افسران کو یقین ہے کہ طالبان جنگجو ریاستہائے متحدہ اور اس کے افغان اتحادیوں کے خلاف بڑا حملہ کرنے کی تیاری کررہے ہیں جو اگلے ماہ ہوسکتا ہے''۔

جنرل مائرز امریکی فوجی سربراہ نے کہا: ''جیسے جیسے موسم بہتر ہوگا اور دشوار گزار راستوں میں سفر ممکن ہوگا ہمیں تشدد میں اضافہ کی امید ہے''۔ اس جریدہ کے مطابق اسپن بولدک میں امریکہ حامی گیریزن کمانڈر عبدالرزاق نے کہا کہ: ''انھیں سرحدی شہروں جیسے کہ چمن میں قبائلی اتحادیوں سے خفیہ اطلاعات ملی ہیں کہ طالبان ایک بڑی گوریلا مہم کی تیاری کررہے ہیں۔ وہ آرہے ہیں یہ صرف وقت کی بات ہے'' ۱۹ اپریل ۲۰۰۴ء کی ایک اخباری رپورٹ میں بتایا گیا کہ جنوبی افغانستان میں ایک امریکی اڈے پر پانچ راکٹ گرے ہیں۔ اس لیے تعجب نہیں کہ ریاستہائے متحدہ اب معتدل طالبان' کی آبیاری کرنے کی کوشش کررہا ہے اور اسی لیے سابق طالبان وزیر متوکل کو رہا کیا گیا ہے۔

جنرل Baro اور امریکی سفیر خلیل زاد اب کھلے بندوں معتدل طالبان سے تعاون حاصل کرنے کے لیے کرزئی حکومت کی پشت پناہی کررہے ہیں اور شمالی اتحاد کی سخت مخالفت کو نظر انداز کردیا ہے۔ ایجنسیوں کی رپورٹ (ڈان ۲۷ اپریل ۲۰۰۴ء) میں خبر ہے کہ صدر کرزئی نے قندھار میں جو طالبان کا قلعہ رہا ہے سابق طالبان ارکان سے مذاکرات شروع بھی کردیے ہیں۔

دسمبر ۲۰۰۴ء میں صدر کرزئی کے حلف اٹھانے کی شام کابل نے طالبان کے لیے

عام معافی کی پیش کش دہرائی جس کا جواب طالبان نے خوست میں حکومت کی چیک پوسٹ کو دھماکہ سے اڑا کر دیا جس میں دس افغان سپاہی ہلاک ہوئے تھے۔ دوبارہ ۲ جون ۲۰۰۵ء میں ایک امریکی اور ایک افغان سپاہی ہرات کے قریب ہلاک ہوئے اور کئی زخمی ہوئے' حال ہی میں افغانستان میں شورش تیز تر ہوگئی ہے اور امریکی ہلاکتیں مزید بڑھ گئی ہیں۔ ۵ اگست کو زابل میں چار امریکی فوجی ہلاک اور تین زخمی ہوئے اور طالبان نے ذمہ داری قبول کی۔ اس سال ۱۵ اگست تک امریکی افواج کے اسّی (۸۰) سے زیادہ ارکان افغانستان کی جھڑپوں میں ہلاک ہوئے ہیں جس کی وجہ سے یہ سال طالبان کے سقوط کے بعد کا بدترین دور بن گیا ہے۔ سرحد کے قریب ۳۰ اگست کو کثیر التعداد بمباری میں ستاون طالبان کی ہلاکت کا شبہ ہے' اس سے جاری شورش کو مزید ایندھن ملے گا۔ ۱۳/ اکتوبر ۲۰۰۵ء کنڈولیزا رائس کے افغانستان کے دورہ کے موقع پر طالبان نے راکٹوں سے کابل پر حملہ کر دیا اور ۱۱ افراد ہلاک ہوئے جس میں ۶ افغان فوجی شامل تھے۔

اس طرح یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ امریکہ دہشت گردی کی جنگ ہار چکا ہے، کم ازکم نظریاتی طور پر اور کسی حد تک فوجی طور پر بھی اور کسے پتہ کہ کچھ اور وقت گزرنے پر مکمل طور پر ہار جائے' جسمانی طور پر بھی اور حربی طور پر ممکنہ شکست کے خطرہ کی گھنٹی مسلسل بج رہی ہے۔

اب ریاستہائے متحدہ کے پاس عراق میں کامیابی کی کیا امید رہ گئی ہے؟ گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد ساری دنیا میں ریاستہائے متحدہ کے لیے ہمدردی کی وجہ سے افغانستان پر فوجی حملوں کی بہت سے ملکوں نے تائید کی تھی لیکن اس کے برخلاف عراق کے خلاف فوجی کارروائی کی مخالفت اور مذمت کی گئی اور ساری دنیا میں ہسپانیہ اور برطانیہ سمیت بڑے بڑے عوامی مظاہرے ہوئے' اگرچہ ان ملکوں کی حکومتوں نے فوجی کارروائیوں میں عراق کے خلاف امریکہ کا ساتھ دیا۔ ساری دنیا کے اختلاف کے باوجود صدر بش اور ان کی انتظامیہ عراق پر حملہ کے لیے مصر ہے۔ اس نے عراق پر

بمباری اس پروپیگنڈے کے ساتھ کی کہ صدام کے پاس کثیر تباہی کے ہتھیاروں کے پہاڑ چھپے ہوئے ہیں جو اقوام متحدہ کے معائنہ کاروں کی رسائی میں نہیں۔ نائب صدر ڈک چینی نے کہا کہ صدام نے جوہری ہتھیاروں کا پروگرام پھر شروع کر دیا ہے یہ بھی الزام لگایا ہے کہ صدام کے القاعدہ سے تعلقات ہیں اور یہ ہتھیار امریکہ پر حملہ کے لیے ان کے ہاتھ لگ سکتے ہیں اور اسی طرح صدام کو ۱۱ ستمبر کے حملہ میں شامل کر لیا۔ امریکی قوم کو یہ باور کرایا گیا کہ عراق کے خلاف کارروائی زیادہ دن نہیں جاری رہے گی اور اس پر بہت زیادہ خرچ بھی نہیں ہوگا کیونکہ امریکی فوج کا نجات دہندہ کے طور پر استقبال ہوگا اور عراق میں جمہوریت کو فروغ حاصل ہوگا جس کے بعد مشرق وسطیٰ کے بقیہ ممالک جمہوریت کو گلے لگانے کے لیے بھاگ پڑیں گے۔ یہ تمام پیش گوئیاں اور یقین دہانیاں جو امریکیوں سے کی گئیں بے بنیاد ثابت ہوئیں اور زمینی حقائق جیسا کہ سامنے آرہے ہیں بالکل الٹ ہیں۔

ریاستہائے متحدہ نے آزادی کا وعدہ کیا اور طوائف الملوکی تحفے میں دی، اس نے عراقیوں کے لیے خوشحالی کا وعدہ کیا ایسی لوٹ مار اور ڈاکوں کا بازار گرم کر دیا جو وحشی منگولوں کی کارروائیوں سے بھی آگے نکل چکی ہے۔

ریاستہائے متحدہ نے اقوام متحدہ کے معائنہ کاروں کی حتمی رپورٹ کا انتظار کیے بغیر اور سیکورٹی کونسل کی قرارداد نمبر ۱۴۴۱ کی مکمل خلاف ورزی کرتے ہوئے عراق پر حملہ کر دیا۔

جیسے ہی جنگ شروع ہوئی امریکی فوجوں سے نجات دہندہ جیسا سلوک تو دور کی بات ہے اس کی شدید مزاحمت شروع ہو گئی' سوائے اعلیٰ جمہوری محافظوں کے جنھیں بغداد کی حفاظت پر مامور کیا گیا تھا اور انھیں رشوت دے کر امریکی فوجوں کو بغداد میں داخل ہونے کا موقع دیا گیا۔ سقوط کے بعد سے امریکی افواج عراقی مزاحمت کاروں کے ممکنہ حملوں کے لیے نشانے پر ہیں۔

سقوط عراق کے بعد پورے ملک میں غصے اور نفرت کی ایک لہر آئی ہے۔ سقوط

کے لوگ امریکی موجودگی کے خلاف مزاحمتی شورش کے ایک مشترک پروگرام پر مجتمع ہو رہے ہیں ۔اس نے الفاظ چھپائے بغیر کہا کہ ویت نام اور عراق کی جنگوں میں جو چیز مشترک تھی وہ ''دلدل'' ہے۔ چند دنوں بعد جولائی میں صحافیوں سے بات کرتے ہوئے مرکزی کمان کے سربراہ کی حیثیت سے جنرل ابی زید نے بتایا کہ ''عراق میں ایک گوریلا قسم کی مہم شروع ہو چکی ہے''۔

اگست ۲۰۰۳ء تک عراق میں روزانہ اوسطاً امریکی زیر قیادت اتحاد کا ایک فوجی ہلاک اور دو سے تین زخمی ہو رہے تھے ۔یہ تعداد رفتہ رفتہ بڑھ کر دو سے پانچ ہلاکتوں اور اتنے ہی زخمیوں تک پہنچ گئی۔ پینٹاگون کے نئے اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ ۳۱ مارچ سے اپریل ۲۰۰۴ء تک ایک سودس امریکی فوجی ہلاک ہو چکے ہیں اور بریگیڈیر جنرل Kimmit کے مطابق روزانہ حملوں کی تعداد بڑھ کر پچاس تک پہنچ چکی ہے۔ اعلان بغداد سے بھی پہلے ہی سے شورش بڑھنے لگی تھی ۔۲۰۰۲ء میں مزاحمت کاروں نے اقوام متحدہ کے مرکز پر ٹرک بم سے حملہ کیا تھا اور مشن کے سربراہ سمیت ۲۳ اہل کار ہلاک اور تقریباً پچاس دوسرے لوگ زخمی ہوئے تھے۔

اس کے بعد ایک اعلیٰ شیعہ قائد اور ان کے حامیوں کی ایک کثیر تعداد پر کار بم کا حملہ ہوا' ان کا گناہ قابض مقتدرہ کا ساتھ دینا تھا' فقط چند دنوں بعد ۲۰ ستمبر کو ایک مزاحمت کار نے عراقی گورننگ کونسل کی ایک خاتون رکن کو گولی ماردی جو بعد میں ہلاک ہوگئی۔ اس کے فوراً بعد ۲۲ ستمبر کو ایک خودکش بمبار نے اقوام متحدہ کے مرکزی دفاتر پر حملہ کر کے ایک محافظ کو ہلاک اور ۱۹ دوسروں کو زخمی کر دیا' یہ حملہ پہلے سے صرف ایک ماہ بعد ہوا۔

صدام حسین عراق ہی میں پوشیدہ تھا اور گوریلوں کی کمان اور کنٹرول کر رہا تھا۔ پیغامات ویڈیو ٹیپ پر توجہ اور احترام سے سنے جا رہے تھے اور ان پر عمل بھی ہو رہا تھا۔ دسمبر ۲۰۰۳ء میں اس کی گرفتاری نے مزاحمت کو نئی تیزی عطا کر دی۔

اس اثناء میں ہزاروں رضا کار مجاہدین عراق میں داخل ہو چکے ہیں اور اپنے عراقی بھائیوں کے ساتھ قابض فوج سے جنگ میں شریک ہیں ۔اس طرح عراق کی

آزادی کی جنگ اب انتہا پسندی کی طرف جا کر اسلامی تحریک بن چکی ہے۔ امریکی فوج بددل ہو کر اپنی نجات میں دیر پر رمزفیلڈ کو کوستے رہے ہیں۔ وہ اس قدر اعصابی دباؤ میں ہیں کہ اپنے محافظوں کو ہی قتل کرنے لگے ہیں' کچھ سپاہیوں نے اپنے خاندان والوں کو ای میل میں جو ٹیلیوژن پر دکھائے گئے اپنے آپ کو ''فراموش شدہ اور بے وفائی کا شکار سپاہی'' کہا۔ ۷ انومبر ۲۰۰۴ء تک کم از کم ۱۹ امریکی سپاہیوں نے خودکشی کرلی۔ کمان سنبھالنے کی بعد فوراً ہی جنرل ابی زید کو عراق میں مقیم امریکی فوجیوں کو فوجی قواعد اور آداب کی خلاف ورزی پر انتباہ جاری کرنا پڑا اور خودکشیوں کی وجوہات معلوم کرنے کے لیے ایک خصوصی کمیشن مقرر کرنا پڑا۔

جنگ کے اوائل سے ہی صدر بش کو عراق میں فوجی اور ملک میں سیاسی اور معاشی پسپائی کا سامنا ہے۔ ۲۰۰۳ء میں ماہرین کا اندازہ تھا کہ مزید چار لاکھ فوجیوں کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ داخلی منظرنامہ کے مطابق اندازہ تھا کہ ایک سال کی باریوں کے حساب سے موجودہ تعداد قائم رکھنے کے لیے بھی محفوظ فوجیں (Reservists) کو بلانا پڑے گا۔ ۲۰۰۴ء تک بجٹ کا خسارہ آدھے ٹریلین ڈالر کی حد سے گزر چکا تھا۔ پینٹا گون اپنے انہتر بلین ڈالر خرچ کر بھی چکا اور رپورٹ کے مطابق مزید ساٹھ سے اسی بلین ڈالروں کی درخواست کر رہا ہے جو ۲۰۰۴ء کے اخراجات کے لیے ہے۔ AFP کے ایک نامہ نگار نے واشنگٹن سے خبر دی کہ امریکی کانگریس میں حزب مخالف کے قائد نے ۱۴ مئی ۲۰۰۴ء کو صدر بش پر امریکیوں سے جنگ کے اخراجات خفیہ رکھنے کا الزام لگایا اور صدر بش سے کہا قوم کو ''کڑوا سچ'' بتائیں کہ امریکی افواج کب تک عراق میں رہیں گی ایوان کی ڈیموکریٹ قائد نینسی پلوسی نے کہا کہ لڑائی میں اضافہ کی وجہ سے جنگ کے اخراجات انتظامیہ کے بتائے ہوئے اندازوں سے کہیں زیادہ بڑھ چکے ہیں۔ ۱۵ مئی کو صدر بش کی طرف سے کی گئی مزید ۲۵ بلین ڈالروں کی درخواست پر پلوسی نے کہا کہ اس جنگ کے اخراجات پر اس سے کہیں زیادہ خرچ کی ضرورت ہو گی۔ کم از کم اس وقت مانگی ہوئی رقم سے دوگنا۔

ریاستہائے متحدہ میں لڑکوں کو عراقی میدان جنگ سے واپس بلانے کے لیے شور بڑھنے لگا تھا۔ اس لیے صدر بش کو اپنے اس اعلیٰ مقام سے نیچے آنا پڑا جہاں سے انھوں نے اقوام متحدہ کو ''بے محل'' قرار دیا تھا اور اپنے تمام تر غرور کے چھن جانے کے قابل رحم مقام سے انھوں نے اقوام متحدہ سے بھیک مانگی کہ وہ امریکہ کو اس مشکل سے نکالے۔

کارنیگی Endowment اور خارجہ پالیسی کے ایک مشترک مطالعہ میں انتباہ کیا گیا تھا کہ ''عراق میں بعد ازاں جنگ یہ امتحان ہوگا کہ کہیں ۱۹۸۰ء میں افغانستان کی طرح عراق میں مداخلت بھی ایسی فوجی فتح تو نہیں ہوگی جس کا نتیجہ کثیر خرچ سیاسی شکست ہو (خارجہ پالیسی جولائی اگست ۲۰۰۲ء) رائٹرز اور AFP کی ایک مشترکہ رپورٹ میں کہا گیا کہ ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو بیس ہزار مظاہرین واشنگٹن میں نکل آئے جو عراق میں امریکی موجودگی کے خلاف نعرے لگا رہے تھے اور صدر بش کو جھوٹا قرار دے رہے تھے۔ یہ ہے وہ طریقہ جس سے عراق دوسرا ویت نام بن چکا ہے۔ ایک اور رپورٹ تھی جس میں کہا گیا ہے کہ مزاحمت کاروں نے ایک Black Hawk ہیلی کاپٹر گرا لیا اور کچھ دنوں بعد ہی ۱۲ر نومبر ۲۰۰۳ء کو ایک اور CH-45 ہیلی کاپٹر مار گرایا جس میں سولہ امریکی فوجی ہلاک اور اکیس زخمی ہوئے۔ اور پھر ۷، نومبر کو ایک اور Black Hawk مزاحمت کاروں نے گرا لیا جس میں سوار تمام ۴ فوجی ہلاک ہو گئے جس کا مطلب ہے کہ عراقی آسمان پر امریکہ کے تصرف کو للکار دیا گیا ہے اور فضا سے مزاحمت کاروں پر حملوں کی امریکی صلاحیت قابل بھروسہ نہیں رہی۔ عراق میں تعینات ایک فوجی کمانڈار نے کہا کہ اکتوبر میں حملوں کی رفتار اگست کی نسبت ۱۵ سے ۲۰ سے بڑھ کر ۳۵ تک پہنچ گئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۲۰۰۲ء سے ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ مزاحمت برف کی لڑھکتی ہوئی گیند کی طرح بڑھ رہی ہیں۔

۲۷ر اکتوبر ۲۰۰۳ء کو ڈان میں شائع شدہ خبر میں کہا گیا تھا کہ گوریلوں نے بغداد میں انتہائی قلعہ بند ہوٹل پر راکٹوں سے حملہ کیا جہاں امریکی سیکرٹری دفاع پال وولفوٹز ٹھیرے ہوئے تھے۔ ایک امریکی سپاہی ہلاک ہوا اور پندرہ افراد زخمی ہوئے' جناب

آسٹریلیا کے انتخابات میں فوجوں کی واپسی مرکزی معاملہ بن گیا۔ پولینڈ پر بھی دباؤ تھا کہ وہ اپنی فوج جس کی تعداد نو ہزار تھی واپس بلالے۔ ۱۹ اپریل ۲۰۰۴ء کے جریدہ ٹائم نے رپورٹ دی ''امریکی فوجی افسران شکایت کرتے ہیں کہ پچھلے ہفتے عراق میں دوسری غیر ملکی افواج نے دکھایا کہ انھیں اپنی حکومتوں کی طرف سے سخت لڑائیوں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں اوران کے پاس مقتدی الصدر کی ملیشیا جیسے چھوٹے دشمنوں سے لڑنے کے قابل گولہ بارود کی طاقت بھی نہیں۔'' اس لیے ہسپانیہ میں انتخابات کے نتائج ریاستہائے متحدہ کی حکومت کے لیے حیران کن تھے۔

۱۷ مارچ ۲۰۰۴ء کو DPA میں اپنے مضمون میں Laszlo Trankvovits نے کہا ''یہ ہمارے لیے بہت بڑی شکست ہے کہ ہم نے بغداد میں جو حکومت تبدیل کی اس سے بڑی تبدیلی حکومت القاعدہ نے کردی ''بغیر کسی خرچ کے۔'' انتخابات کے نتائج دہشت کے لیے فتح اور دوررس اثرات کے حامل تھے۔'' پینٹا گون کے ایک اہل کار نے واشنگٹن ٹائم کے مطابق کہا۔

ریاستہائے متحدہ کے اخبارات نے نیویارک ٹائمز سے ملتے جلتے اداریے شائع کیے یقیناً میڈرڈ کے واقعات بش انتظامیہ کے لیے سخت دھچکا ثابت ہوئے ہیں''۔ مشرق وسطیٰ کے معاملات کے ماہر Anthony Gordesman نے کہا ''یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ درحقیقت القاعدہ اوراسامہ جنگ جیت رہے ہیں۔ اگر القاعدہ کے نظریات جیت جاتے ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اگر القاعدہ اس عمل میں تباہ بھی ہوجائے''۔ Gremn Frankel نے واشنگٹن پوسٹ میں اپنے معنی خیز تبصرہ میں نشان دہی کی کہ میڈرڈ کے حملوں نے اس یقین کو تقویت دی کہ عراق میں امریکی زیر قیادت جنگ نے دہشت گردوں کو ایک نیا مرکز عطا کردیا ہے۔ سرد جنگ کے دور کے برخلاف زیادہ تر مغربی یورپی ریاستہائے متحدہ کے ساتھ جوہری حملوں کے مشترک خوف میں مبتلا تھے۔ اب بہت سے یورپی دہشت گردی کو ایک منتخب خطرہ سمجھنے لگے ہیں جس سے وہ امریکہ سے فاصلہ قائم کرکے بچ سکتے ہیں۔ برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیر نے تسلیم کیا کہ

ایسا ہوسکتا ہے کہ میڈرڈ دھماکوں نے ریاستہائے متحدہ اور مغربی یورپ کے درمیان فاصلے بڑھادیے ہوں ۔اس طرح القاعدہ یورپ اور ریاستہائے متحدہ کے درمیان کیل گاڑنے میں کامیاب ہوگئی ہے اور ہوسکتا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف اپنے بچاؤ میں ریاستہائے متحدہ تنہارہ جائے۔ایک سال سے زیادہ عرصہ کے بعد القاعدہ نے لندن کی زیرزمین ریلوں میں ۱۷جون ۲۰۰۵ء کوخودکش حملے کیے جس میں پچاس افراد ہلاک اورتقریباً سترہ سوافرادزخمی ہوئے۔ بلیرحکومت نے جواباً کئی ایسے قوانین منظور کیے جن سے اس کے شہریوں کی بہت سی آزادیاں سلب ہوگئیں' بلیرحکومت نے اپنے آپ کو یہ حق بھی عطا کردیا کہ لوگوں کی شہریت منسوخ کردے' مسجدوں کو بند کردے' دہشت گردی کی تعریف کی کوشش پر سزا دے اور کسی شہری یا برطانیہ کے ساکن کوملک بدرکردے۔ برطانوی حکومت نے عدلیہ کوبھی دھمکی دی ہے کہ اگر وہ ملک بدری کی پالیسی میں مزاحم ہوئی تووہ انسانی حقوق کے برطانوی قانون کوبدل دیں گے۔

دہشت گردی کے شبہ میں نوے(۹۰) دن تک بغیر جرم بتائے۔قید میں رکھنے کے بل کومقتدرہ نے ردکردیا اور لیبر پارٹی کے چالیس ارکان نے اس کی حمایت نہیں کی اکتوبر نومبر ۲۰۰۵ء میں ایک کے بعد ایک دوبم دھماکے ہوئے ہیں ۔پہلا دہلی جس میں ایک سوساٹھ افراد ہلاک ہوئے اوردوسرا اردن میں جہاں انسٹھ ہلاکتیں ہوئیں۔ ایک اسلامی انقلابی جماعت نے دہلی کے دھماکہ کی ذمہ داری قبول کی اورالزرقاوی نے اردن کے دھماکہ کی۔ دہلی دھماکہ نے عالمی جہادی تحریک میں ایک نئے پہلوکا اضافہ کردیا ہے کیونکہ یہ پہلی دفعہ ہوا ہے کہ اس نے کشمیر کا معاملہ اٹھایا ہے اور بھارت کوقبضہ ختم کرنے کا نوٹس دیا ہے۔

اسی طرح اردن کے دھماکہ نے اس تصور کوختم کردیا کہ اردن غیرملکیوں خصوصاً امریکیوں کے لیے نسبتاً محفوظ جگہ ہے۔کچھ ماہ پہلے شرم الشیخ اور بالی میں بھی دھماکے ہوئے تھے ۔ان واقعات سے جہادی تحریکوں میں اضافہ کی نشان دہی ہوتی ہے۔

فرانس میں حالیہ فساد کی ذمہ داری جہادیوں پرڈالنے کی بھرپورکوششیں ہورہی

ہیں، درحقیقت اس کی وجہ دو عرب نژاد لڑکوں کا جو فرانس ہی میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے اور پسماندہ علاقوں میں رہنے پر مجبور تھے بجلی لگ کر ہلاک ہونا تھا۔ ان بچوں نے پولیس کے تعاقب سے بچنے کے لیے ایک جرنیٹر کے پیچھے پناہ لی جس میں دیکھ بال نہ ہونے کی وجہ سے خرابی پیدا ہو چکی تھی اور اسی خرابی کی وجہ سے بچوں کی اموات واقع ہوگئیں۔ ذرائع ابلاغ نے خبر دیتے ہوئے اس بات کو نمایاں کیا کہ غیر مسلموں نے بھی فسادات میں حصہ لیا تھا اور فرانسیسی وزیر داخلہ نے فسادیوں کو (Scum) نکمے کہہ کر شعلوں پر تیل چھڑک دیا۔ Daniel Pipes نے فوراً ہی فسادات کو ''یورپ کا پہلا انتفاضہ'' کہہ کر مذمت کی، اس طرح یہ حقیقت کہ فسادی ایسے پسماندہ علاقوں میں رہنے پر مجبور تھے جہاں شہری سہولتوں کا فقدان ہے اور بے روزگاری چالیس فی صد ہے جو اشتعال بھڑکانے کے لیے چقماق کا کام کرتی ہے۔ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ گفتگو کے لیے صدر شیراک کی طرف سے تحریک پر فسادیوں نے فوراً مثبت جواب دیا تاکہ تعلیم اور روزگار کے مواقع میں بہتری آسکے۔

القاعدہ اور طالبان اب راستہ پر اور قریب دو دور سرایت کر چکے ہیں خبر ہے کہ وہ امریکی موجودگی کے خلاف عراق کے جہاد میں شامل ہو چکے ہیں، عراقی عبوری مقتدرہ کے ایک اعلیٰ افسر نے ۱۳ اپریل کو انکشاف کیا کہ القاعدہ کا الزرقاوی فلوجہ کی بغاوت میں روح رواں تھا اور یقین کیا جاتا ہے کہ فلوجہ میں یا اس کے قریب ہی کہیں مقیم ہے۔ شروع ہی سے فلوجہ مزاحمت کے مرکز کے طور پر ابھرا اور اس کی وجہ سے یہ نہیں تھی کہ یہ علاقہ کسی طرح بھی صدام کا حمایتی تھا بلکہ اس کے برخلاف فلوجہ کے باشندے وہابی ہونے کی وجہ سے صدام سے متفق نہیں تھے، اور ان کے اماموں نے جمعہ کے خطبوں میں صدام کا نام شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ فلوجہ کے باشندے جہادی روایات اور فلسفۂ شہادت کے زیر اثر امریکی قبضہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ القاعدہ نے اپنی کارروائی ہسپانیہ میں شروع کی تاکہ اس ملک کو عراق پر حملہ اور قبضہ میں ریاستہائے متحدہ کا ساتھ دینے کی سزا دے سکے۔ سال بھر سے جاری شورش جو صدام کی گرفتاری سے پہلے بھی

بڑھ رہی تھی اپریل ۲۰۰۴ء کے پہلے ہفتہ میں مکمل بغاوت میں تبدیل ہوگئی جب بنیاد پرست شیعہ ہفتہ وارالحوضہ کو بند کیا گیا جس کے بعد مقتدیٰ الصدر کے اہم ساتھی یعقوب کو گرفتار کرلیا گیا جو نوجوانوں اور نوکری پیشہ شیعوں کے قائد تھے۔ایک اخباری کانفرنس میں جنرل سانچیز نے تسلیم کیا کہ مقتدیٰ کی مہدی فوج نجف اور قطس میں مکمل اختیار میں ہے اور وہاں امریکی زیر قیادت افواج شہر سے باہر اپنے اڈوں تک محدود ہیں' اپریل ۲۰۰۴ء میں فلوجہ میں تشدد بہت بڑھ گیا تھا جس میں چھ سو عراقی ہلاک اور ۱۲ سو زخمی ہوئے تھے۔ جو عراقی ہلاک ہوئے ان میں سے بعض خواتین بچے اور بزرگ تھے۔ جم لوب کے ایک مضمون کے مطابق (ڈان ۱۲ اپریل ۲۰۰۴ء) جب مقتدی کے مزاحمت کاروں نے اتحادی افواج کو للکارا تو عراق کی نئی حفاظتی افواج میں سے زیادہ تر یا تو مزاحمت کاروں سے مل گئے یا فرار ہوگئے۔ایک سپاہی کے نقصان کے بعد قطس میں یوکرین کا دستہ پیچھے نسبتاً محفوظ اڈے پر واپس چلا گیا اور اس کا چھوڑا ہوا تمام اسلحہ مہدی کی فوج کے ہاتھ لگا جب کہ یہ دستہ اپنے اڈے پر ہی رہا اور مزاحمت کاروں کے راستہ میں آنے سے گریز کیا۔

زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ چھ سو فوجیوں کی ایک نئی بٹالین نے عراقیوں سے لڑنے سے صاف انکار کردیا جیسا کہ ہفتہ وار اکانومسٹ نے ۱۰ اپریل ۲۰۰۴ء کو نشان دہی کی۔ یہ حقیقت بھی اتنی ہی تشویش ناک تھی کہ اٹھتر ہزار (۸۷۰۰) افراد پر مشتمل نئی تربیت یافتہ عراقی پولیس الصدر ملیشیا جیسی پرعزم فوجوں کے مقابلہ کے قابل نہیں تھی۔ یہ دو خطرناک حقیقتیں امریکی افواج کے لیے ان محفوظ اڈوں میں مقیم ہوجانے کے اس کے امکانات کو مسترد کردیتی ہیں جو اِن افواج کے طویل قیام کی خاطر عراق میں بنائے جارہے ہیں جہاں سے ''وہ خودمختار'' عراق کی ڈوریاں ہلاتے رہیں اور امن وتحفظ کی ذمہ داری نئی عراقی فوج اور پولیس کی ہو' صاف نظر آرہا ہے کہ کمزور عراقی فوج اور پولیس کو امریکی بندوقوں کے نشانہ پر رکھنا ہوگا۔ اس طرح عراق کے خلاف جنگ کا اصل مقصد مطلقاً فوت ہوگیا ہے' اس لیے اگر ریاستہائے متحدہ ویت نام والے انجام

سے بچنا چاہتا ہے تو اس کے پاس اس کے سوائے کوئی چارہ نہیں کہ اسی وقت واپس چلا جائے جب واپسی ممکن ہو۔ سیکرٹری رمز فیلڈ اور صدر بش دونوں کو تسلیم کرنا پڑا کہ امریکہ کو عراق میں مشکل حالات کا سامنا ہے' عراق میں صورت حال امریکہ کے لیے کتنی مشکل ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ برطانیہ کو امریکہ کی اجازت سے (اگر یوں نہ کہا جائے کہ درخواست پر) ایران سے درخواست کرنی پڑی کہ ثالثی کرے' جی ہاں وہی ایران ''جو بدی کی مثلث'' کا بدترین حصہ تھا۔ عراق کے صدر تابانی نے اواخر نومبر ۲۰۰۵ء میں ایران کا دورہ کیا۔ امید ہے کہ امریکی سفیر خلیل زاد ایران کے تعاون اور عراق کے استحکام کے لیے ایران کی زیارت کو جائیں گے۔

مقتدیٰ کے اعلان بغاوت کے بعد صورت حال قابو سے باہر ہوگئی ہے۔ یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ مقتدیٰ کی عوامی حمایت بڑھتی جارہی ہے جس کی وجہ سے علی سیستانی کو جن کی شہرت اتحادی فوجوں کی حمایت تھی امریکی افواج کو نجف اور کربلا میں متبرک مقامات میں داخل نہ ہونے کے انتباہ میں مقتدیٰ کا ساتھ دینا پڑا۔ اتحادی افواج کی طرف سے مہدی فوج کو ختم کرنے اور مقتدیٰ کو ہتھیار ڈالنے کے لیے دی ہوئی حتمی تاریخ گزر جانے کے بعد بھی قابض فوجوں کی ہمت نہ پڑی کہ بہت بعد میں بھی ان کا پیچھا کرتے ہوئے متبرک شہروں میں داخل ہوسکیں۔ ایک امریکی جنرل نے اعلان کیا تھا کہ اگر مقتدیٰ نے تاریخ گزرنے سے پہلے ہتھیار نہ ڈالے تو نجف پر حملہ ہوسکتا ہے اور انھیں ہلاک یا گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ مقتدیٰ کی بغاوت بہرحال زور پکڑتی رہی اور انتباہ سے قطع نظر صدر خاتمی بھی اتحادی فوجوں کے کربلا یا نجف میں داخلہ کے خلاف متنبہ کرنے میں مقتدیٰ اور سیستانی کے ساتھ شریک ہوگئے۔ آخر کار مقتدیٰ نے اتحادی فوجوں کو خبردار کیا کہ اگر متبرک جگہوں پر حملہ کیا گیا تو وہ خودکش حملوں کا سلسلہ شروع کردیں گے۔ فلوجہ کے محاذ پر اتحادی افواج کو مزاحمت کاروں کو ہتھیار ڈالنے کے لیے متحدہ کو مکمل بے چارگی کی حالت میں شیطانوں یعنی ''صدام کی باقیات'' کا ساتھ حاصل کرنا پڑا جب اس نے فیصلہ کیا کہ انھیں انتظامیہ اور فوج دونوں میں شامل کیا جائے

یہاں تک کہ پینٹا گون کے لاڈلے شیلابی کو بھی ''شیر آیا'' پکارنا پڑا۔جس نے بجا طور پر بعث پارٹی کے رکن کو حکومت میں شامل کرنے کے امریکی فیصلہ کو جرمنی میں دوسری جنگ عظیم کے نازیوں کا حکومت میں واپس آنا قرار دیا۔

۶رمئی ۲۰۰۴ء کو عراق کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے واشنگٹن پوسٹ نے نشان دہی کی ''حمایتیوں کے لیے صرف سیاسی شکست پر شرمندگی ہی داؤ پر نہیں ہے۔اب عراق میں ناکامی اس قوم اور اس کے مفادات کے لیے تباہ کن ہوگی اور اسلامی انتہا پسندوں کے لیے تاریخی فتح''۔واشنگٹن پوسٹ کے مطابق ریاستہائے متحدہ اپنے آپ کو اس تعطل میں مبتلا پاتا ہے کہ واپس آئے یا نہ آئے۔عراق میں جنگ جاری رکھنے پر جو بھی اخراجات ہوں یہ حقیقت ہے کہ ایک مستحکم عراق کا قیام قابل حصول نہیں ہے اور یہ عمل فوری واپسی کے فیصلہ کے لیے ضروری نہیں۔اس کے برخلاف ان انتہا پسند قوتوں کو ابھرنے سے روکنے کے لیے مضبوط فوجی موجودگی لازمی ہوگی جو ریاستہائے متحدہ اور اس کے اتحادیوں کے لیے ضرر رساں ہوگی''۔

بہرحال واشنگٹن پوسٹ کا اختتامیہ مایوس کن ہے ''ایک قابل عمل راستہ ڈھونڈنا ضروری ہے اور یہ کام ریاستہائے متحدہ نہیں بلکہ اقوام متحدہ اور خود عراقیوں کو کرنا ہے۔'' ریاستہائے متحدہ کے لیے اس سے بڑی سیاسی شکست نہیں ہوسکتی کہ آگے بڑھنے کا راستہ ڈھونڈنے کے عمل سے اسے ہٹا دیا جائے اور یہ کام اقوام متحدہ اور عراق کریں۔

۹رمئی ۲۰۰۴ء کو واشنگٹن پوسٹ نے دو ہزار چار سو الفاظ پر مبنی ایک مضمون شائع کیا جس میں اعلیٰ فوجی کمانداروں کے انٹرویو شامل ہیں' اس میں دو باتوں کو نمایاں کیا گیا: (۱) جنگ کی وسعت کے ساتھ عراق میں بڑھتی ہوئی امریکی ہلاکتیں (۲) عراقیوں کو اختیار کی منتقلی میں بڑھتی ہوئی مشکلات۔فوجی میجر جنرل (Charles H.Swannack) سے جو بیاسی (۸۲) ہوائی ڈویژن کے کماندار ہیں جب پوچھا گیا کہ کیا ریاستہائے متحدہ کو شکست ہورہی ہے؟ تو ان کا جواب تھا ''میرا خیال ہے کہ حکمت عملی کے حساب سے ہم ہار رہے ہیں''۔پوسٹ نے مزید روشنی ڈالی کہ ''افسروں میں

سیکرٹری دفاع رمز فیلڈ اوران کے مشیروں کے خلاف غیر معمولی غصہ پروان چڑھ رہا ہے۔'' کچھ کمانداریوں ابل پڑے کہ رمز فیلڈ اور پال وولفوٹز کی برطرفی ضروری تھی۔ امریکہ کی عراق میں غلط پالیسیوں کے یہی ذمہ دار ہیں جن کی وجہ سے حکمت عملی اورکارکردگی کی حماقتیں سرزد ہوتی ہیں''۔ یہ حقیقت کہ عراق میں لڑنے کا تجربہ رکھنے والے اتنے فوجی کمانڈر ایسی مایوسی' تلخی اور غصہ میں مبتلا ہوں کہ اپنے سیکرٹری دفاع اوران کے مشیروں کے خلاف تو وہ کیسے فتح حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح صرف سیاسی اور پھر آخر کار فوجی شکست ہی حاصل ہوسکتی ہے۔

کانگریس میں بھی سیاسی ہوا اب پینٹاگون کے حق میں نہیں چل رہی یہاں تک کہ بغیر کسی ظاہری فتح کے آثار نظر آئے عراق کی جنگ کے بارے میں شکوک بڑھ رہے تھے۔ AFP کے ایک واشنگٹن کے نامہ نگار نے ۱۴ مئی ۲۰۰۴ء کو خبر دی کہ کانگریس نے صدربش پر جنگ عراق کے اصل اخراجات امریکی عوام سے چھپانے کا الزام لگایا۔ کانگریس نے صدربش سے کہا کہ قوم کو وہ کڑوی حقیقت بتادیں کہ امریکی فوج کب تک عراق میں رہے گی۔ ایوان کی ڈیموکریٹ قائد نینسی پلوسی نے کہا: ''جنگ میں وسعت نے اخراجات انتظامیہ کے اندازے سے کہیں زیادہ بڑھادیے ہیں''۔ ۵ مئی کو صدربش کی طرف سے مزید ۲۵ ملین ڈالروں کے لیے درخواست پر پلوسی نے کہا ''جنگ کے اخراجات کے لیے اس سے بہت زیادہ کی ضرورت ہوسکتی ہے کم ازکم ابھی مانگی گئی رقم کا دوگنا۔''

یہ یادرکھنا چاہیے کہ چار ٹھیکیداروں کی اموات کا انتقام لینے کے لیے فلوجہ پر شدید حملہ ہوا تھا۔ لیکن فوجی حملہ کی تمام تر شدت اور ہیبت ناکی اور وحشت خیزی کے باوجود جس میں سات سو شہری ہلاک ہوئے اور اس سے دگنے زخمی ہوئے' قاتل گرفت میں نہ آسکے اور جنگ بندی اس درخواست کے ساتھ کرنی پڑی کہ فلوجہ کے شہریوں نے ہتھیار دینے سے انکار کردیا اور عہد کیا کہ قبضہ کے اختتام تک جنگ جاری رکھیں گے۔ اتحادی فوجوں کو بہرحال تھوکا ہوا چاٹنا پڑا اور انھوں نے فلوجہ میں تحفظ کی ذمہ داری صدام

دور کے ایک جنرل کے حوالے کی جو اپنی بعثی وردی میں ملبوس بعثی جھنڈے لہراتا ہوا فلوجہ کی سڑکوں سے گزرا اور ہجوموں نے تالیاں بجا کر اس کا خیر مقدم کیا۔

اسی طرح جب مقتدیٰ الصدر نے اعلان بغاوت کے ساتھ نجف کربلا اور قطس پر قبضہ کر لیا تو اتحادی افواج نے انھیں ہتھیار ڈالنے کے لیے ایک حتمی تاریخ کے ساتھ الٹی میٹم دیا تھا جس کے بعد انھیں گرفتار یا ہلاک کر دیا جانا تھا۔ کثیر تعداد میں ہلاکتوں کے باوجود الصدر نے اس الٹی میٹم کو کوئی اہمیت نہ دی اور جہاد جاری رکھا اگرچہ علی سیستانی جو شیعہ اکثریت کے نمائندہ تھے ان کی حمایت نہیں کر رہے تھے لیکن انھیں سنی فرقہ کی کثیر حمایت حاصل تھی۔ الصدر نے شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کے لیے قابض مقتدرہ کے خلاف مشترک مقصد مہیا کر دیا اور علی سیستانی کی قیادت کو سخت نقصان پہنچایا۔ ابھرتے ہوئے شیعہ اتحاد اور مقتدیٰ کے لیے قبول عام سے گھبرا کر اتحادی فوجوں نے سو ٹینکوں کے ساتھ نجف پر حملہ کر دیا جس کا مقصد مقتدیٰ کی وفادار افواج کو تباہ کرنا تھا لیکن ایک ہفتہ کی جنگ کے بعد بھی مقتدیٰ نے ہتھیار نہ ڈالے۔

اتحادی فوجیں جنھوں نے مقتدیٰ کی طرف سے گفتگو کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا ان کی ناقابل شکست مزاحمت سے مجبور ہو کر تھوکا ہوا چاٹ کر ان کی فوجوں سے معاہدہ کرنے پر مجبور ہوئیں' اس طرح مقتدیٰ الصدر سب سے مضبوط طاقت بن کر ابھرے جنھوں نے شیعہ سنی اتحاد کو مستحکم کر دیا۔ لیکن یہ معاہدہ ۲۴ گھنٹے بھی قائم نہ رہا جس کے بعد ایک دوسرا معاہدہ ہوا جو دیرپا ثابت ہوا۔

David Leigh نے Guardian News کے شائع کردہ ایک مضمون میں بتایا کہ جنرل Taguba نے جو تحقیقات کے سربراہ تھے ایک ایسی فوج کا نقشہ کھینچا جو نہ صرف وحشی تھے بلکہ نا اہلی سے بھرپور بھی۔ ایک فوجی پولیس یونٹ کے سربراہ فوجی خواتین کی لاعلمی میں ان کی برہنہ تصاویر اتارنے میں اچھا وقت گزارتے رہے تھے۔ کیپٹن Morales نے اپنی فوجوں کی ایسی تربیت کی کہ ان میں سے ایک تو ہر دفعہ گاڑی سے اترتے ہوئے اپنی M-16 رائفل حادثاتی طور پر چلا دیتا تھا' کمانڈر ایک دوسرے کا

گلا کاٹنے کو تیار تھے۔ جنرل Janis Karpinski محکمہ خفیہ کے کرنل Thomas Pappas سے بات کرنے کے روادار نہ تھے جنھوں نے ان سے ابوغرائب جیل کے اختیارات واپس لے لیے تھے۔ مختلف افسروں کے درمیان ذمہ داروں کا تعین بھی واضح نہ تھا اور کمان کی سطح پر اشتراک عمل بہت کم تھا۔

امریکی فوجی اس قدر پست معیار کیوں ہیں؟ ان کی تشویش ناک نااہلی کی بنیاد میں یہ بات تھی کہ کئی افسران اور سپاہی سال میں دو ہفتوں کی تربیت پانے والے اضافی فوجی تھے' جنرل Karpinski جو بریگیڈ کی سربراہ تھیں' شہری زندگی میں انتظامی مشیر تھیں۔ کمپنی کمانڈر کیپٹن Donald Reese جو اپنے سپاہیوں کی دیکھ بھال میں ناکام رہا ایک گشتی دکاندار تھا۔

ریاستہائے متحدہ کی موجودہ انتظامیہ نے سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ کی قیادت میں عراق کی جنگ کم ترین خرچ پر لڑنا چاہی۔ انھوں نے دو لاکھ فالتو جزوقتی فوجیوں سے کام چلانا چاہا اور اس سے بھی بڑھ کر انھوں نے بہت سے کام کمرشل اداروں کی نجی تحویل میں دے دیے کیونکہ سو باقاعدہ سپاہیوں پر آنے والے اخراجات جزوقتی اضافی سپاہیون کے مقابلہ میں ۷ گنا زیادہ ہوتے ہیں' اس طرح کے سستے انتظام نے اپنی قیمت وصول کرلی۔ جزوقتی کارکنوں کے اس بے ترتیب ہجوم نے ویت نام کی جنگ کے بعد ریاستہائے متحدہ کی سب سے بڑی فوجی رسوائی کا انتظام کیا۔

رمزفیلڈ کی طرف سے اپنے پسندیدہ ترین احمد شیلابی کو عراقی جنگ کے لیے بطور رہنما منتخب کرنا بھی غلط اور تباہ کن ثابت ہوا۔ عراقی قومی کانگریس کا یہ سابق سربراہ سزایافتہ مجرم ہے۔ اردن میں ملک بدری کے دوران اس پر Petra Bank عمان سے کروڑوں کے غبن کا مقدمہ چلا۔ شیلابی گاڑی کی ڈِگی میں چھپ کر فرار ہوا لیکن غائبانہ میں سزا دی گئی اور اسے واپسی کی صورت میں بائیس سال قید کی سزا کا سامنا ہے۔ ۱۹۸۹ء میں اردن سے فرار کے بعد شیلابی نے CIA کے ارکان سے قریبی تعلقات قائم کر لیے جنھوں نے اندازاً سو ملین ڈالر INC کو دیے جو کرد فوجوں کے عراق پر قبضہ

کی ناکام کوششوں پر منتج ہوئی۔ CIA اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو اس پر گہرا شبہ تھا لیکن نیل میں اس کی ذاتی دلچسپی اور نیو یارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ کا ذریعہ اطلاعات بن کر اس نے پینٹاگون کے جدید انتہا پسندوں سے قریبی تعلقات استوار کر لیے لیکن ان تمام نے شیلابی کے جھوٹ اور افترا پردازی کی بنا پر اپنے اعتبار کو آگ لگا دی بعد میں شیلابی ایک ایسا جاسوس نظر آیا جو ایران کو حساس اطلاعات فراہم کرتا رہا تھا۔

چنانچہ اتحادی افواج نے اس کے گھر پر چھاپہ مارا اور اس نے ماضی میں CIA سے رقوم وصول کرنے کا اعتراف کیا۔ افسوس شیلابی کے بارے میں حقیقت دیر سے دریافت ہوئی اور عوامی رائے اور اقوام متحدہ کی خواہش کے خلاف عراق پر جنگ مسلط کرنے کا خمیازہ بھگتنے سے بچنے میں اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔

عراق میں جز وقتی فوجیوں کی تعیناتی کے ذریعے سستے اور مختصر راستہ سے جنگ جیتنے کی بہترین کوشش اور شیلابی جیسے شخص کی رہنمائی کے نتیجہ میں اس فوجی غلط کاری کی قیمت ریاستہائے متحدہ کو اپنی ناک سے ادا کرنی پڑی ہے۔ معاشی، سیاسی اور اخلاقی نقصانات کا تخمینہ بے پناہ اور تباہ کن ہے۔

مئی ۲۰۰۴ء تک جنگ پر ریاستہائے متحدہ کے اخراجات کا اندازہ کم از کم ایک سو پچاس بلین ڈالر ہے۔ ریاستہائے متحدہ میں داخل ہونے والے تمام لوگوں کی چھان بین کے لیے مزید پندرہ بلین ڈالروں کے خرچ تجارت کے بڑھتے ہوئے خسارے اور یورپ سے مقابلہ کے ساتھ جو تجارتی اور فوجی طیاروں کی فروخت میں بازی لے جا رہا ہے ریاستہائے متحدہ اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلا رہا ہے۔ پچھلے تین سالوں ۲۰۰۳ء سے ۲۰۰۵ء تک) ڈالر کے مقابلہ میں یورو کی قدر میں پینتیس فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ویسٹ پوائنٹ میں ۲۹ مئی ۲۰۰۴ء کو خطاب کرتے ہوئے رمزفیلڈ نے کہا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ اختتام کے بجائے ابتداء سے زیادہ قریب ہے' اگر یہ جنگ جو چار سالوں سے جاری ہے' ابھی ابتدا ہی میں ہے تو اس کے انجام تک کب اور کہاں پہنچا جا سکتا ہے؟ اور اگر اس ابتدا پر ہی ڈیڑھ سو بلین ڈالر خرچ ہو چکے ہیں تو

اختتام تک ان ڈیڑھ سو بلین سے کتنی گنا زیادہ رقم خرچ ہو چکی ہو گی اور اس وقت تک امریکی معیشت کا کیا حال ہو گا جس میں ابھی سے کھوکھلے پن کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ افغانستان میں ''قابل ذکر'' فتح سے متعلق رمزفیلڈ کے بلند بانگ دعووں کا کیا بنا اور USS انٹرپرائز پر کیے گئے صدر بش کے اعلان کو کیا کہا جائے کہ ''عراق میں مقصد حاصل کر لیا گیا ہے'' اور ''اصل جنگ ختم ہو چکی ہے''۔

جنگ عراق اتنی ہی رسوا کن ثابت ہوئی جتنا ۱۹۲۹ء میں افغانستان پر روسی حملہ۔ ناقص خفیہ اطلاعات' اوپر سے یک طرفہ مہم جوئی' یورپ کا تمسخر' اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل سے گریز کر کے ریاستہائے متحدہ نے روایتی اتحادیوں کو دور کر دیا۔ اس کا اپنا روایتی قیادتی کردار کھو گیا اور مسلم دنیا اس کے خلاف ابل جانے کی حد تک پہنچ گئی۔ پچھلی صدی میں ریاستہائے متحدہ کبھی ایسی رسوا کن اور مایوس کن تنہائی کا شکار نہیں ہوا تھا۔

امریکہ کے ثقافتی اور تفریحی دائرے میں بھی ایسے رجحانات نظر آنے لگے ہیں کہ جنگ کا جنون اب امن اور سکون کی خواہش میں تبدیل ہو رہا ہے اور اس کے لیے حکومت کی تبدیلی ضروری سمجھی جانے لگی ہے۔ مائیکل مور کی فلم Farenheit 911 قصرابیض کی تبدیلی کے لیے بم کا دھماکہ اور دستی بم ثابت ہوئی ہے۔

دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی سب سے اہم نیابتی جنگ اسرائیلی فلسطینیوں کے خلاف لڑ رہے ہیں تاکہ اِسلام کے اس قلب کو زیرنگیں لا کر اسلامی طاقت کو ابھرنے سے روکا جا سکے جس سے امریکہ کی مطلق العنانی کو خطرہ ہے۔ جیسا کہ جم لوب نے Inter Press News Service میں اپنے مضمون میں انکشاف کیا کہ Douglas Feith اور ان کے مربی Perle جو ریاستہائے متحدہ کی انتہا پسندانہ پالیسی کے مشترک مصنفین تھے اور جو اب یا ماضی میں پینٹاگون یا اس سے متعلق اداروں میں اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں کھلم کھلا یا خفیہ طور پر ریاستہائے متحدہ میں اسرائیل کے مفادات کے لیے جاری مہم میں شریک رہے ہیں۔ Feith اور اس کے والد کو امریکی

صیہونی ادارہ نے انعام بھی دیا جس نے مقبوضہ علاقوں میں اسرائیلی آبادیوں کی تحریک کی ہمیشہ حمایت کی اورعیسائی دائیں بازو سے دوستی رکھی۔ فیتھ نے پرل کی طرح Jewish Institute of National Security Affairs کے بورڈ میں کام کیا جو ایک ایسا دانشور ادارہ ہے جو ریاستہائے متحدہ اوراسرائیل کے درمیان مشترکہ حکمت عملی کے تعلقات کو بڑھانے کا کام کرتا ہے۔ ۱۰ اپریل ۲۰۰۴ء کے ہفتہ وار اکانومسٹ نے بتایا کہ پچھلے دسمبر میں جناب Pat Robertson نے جو ایک دائیں بازو کے عیسائی ہیں اسرائیل میں تقریر کرتے ہوئے فلسطینی ریاست کے اصول کی مذمت کی۔ اسرائیل کی فوجی طاقت کو خدا کا معجزہ قرار دیا اور اسرائیل سے مطالبہ کیا کہ امن کے لیے زمین کے اصول کو ہرگز نہ مانے۔ چومسکی نے دو دہائی پہلے لکھا تھا کہ واشنگٹن معاصر روم ہے اوراسرائیل اس کا شریک جنگ اسپارٹا۔ ایک اور مکتبہ فکر بھی ہے جو اسرائیلی امریکہ کا تصور پیش کرتا ہے جس میں Capital Hill کی حیثیت ایک اور اسرائیلی مقبوضہ علاقہ کی ہے۔

فلسطینی ایک متبرک جنگ لڑ رہے ہیں جو صرف مسجد اقصیٰ کی آزادی کے لیے نہیں بلکہ پورے فلسطین کے لیے قرآن پاک کے اس حکم کی تعمیل میں ہے کہ" انھیں وہاں سے نکال دو جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا"۔ فلسطینی دنیا کی بہترین تربیت یافتہ اور ہتھیاروں سے لیس فوج کے خلاف لڑ رہے ہیں جبکہ ان کے پاس مقابلہ کے لیے پتھر غلیلیں ازکار رفتہ بندوقیں اور زیادہ سے زیادہ خودکش بمبار ہیں۔ لیکن بہرحال ان کے پاس الوہی امداد اور راہنمائی پر ناقابل شکست یقین ہے اور وہ شوق شہادت سے معمور ہیں۔ ایک اسرائیلی کرنل Galluft نے Foreign Affairs (جولائی اگست ۲۰۰۲ء) میں اپنے مضمون میں فلسطین کا ناقابل تسخیر ہونا تسلیم کیا ہے۔ کرنل کہتا ہے' اگر تاریخ کی رہنمائی تسلیم کریں تو خودکش بمباریوں کو روکنے کے لیے اسرائیلی فوج کی مہم کی کامیابی ممکن نہیں۔ دوسری ایسی قوموں کو جنھوں نے مرنے کے لیے تیار دشمنوں کا سامنا کیا بھگت کر پتہ چل گیا کہ سوائے پوری فوج کو ختم کر دینے کی کوئی فوجی حل ایسا نہیں جو اس

مسئلے کو حل کر سکے''۔اس نے مسئلہ کا خلاصہ یوں کیا ہے کہ اگر فلسطینیوں کا ایمان اللہ پر ہے تو اسرائیلیوں کا ٹینکوں پر۔''

پہلی جولائی ۲۰۰۲ء کے جریدہ ٹائم میں یروشلم سے Matt Ree نے اپنے مضمون میں Galluft کے استدلال کو یوں آگے بڑھایا ہے ''اسرائیلیوں کی اعلیٰ خفیہ معلوماتی صلاحیتوں اور بہترین ہتھیاروں سے لیس فوج کے باوجود ان کے دفاعی ماہرین کو پتہ ہے کہ وہ خودکش بمباروں کو مکمل طور پر روک نہیں سکتے۔ جب جنگجو اس قدر پرعزم ہو جائیں جیسے کہ فلسطینی ہیں تو اسرائیلی جوابی حملے مزید تیز کر دیتے ہیں اور ٹیکنالوجی اس قدر آسان ہے کہ مقامی طور پر تیار گولہ بارود کو فقط ایک خواہش مند انسانی بم کے ساتھ باندھ دینا کافی ہے۔

لیکن بہرحال وقتاً ''فوقتاً'' وقفے ہوتے رہے جس پر اسرائیلیوں نے انتفاضہ کو کچل دینے کا ڈھول بجایا جس کے بعد فلسطینیوں نے مہلک حملے کیے۔ جیسے ہی Road Map کی بنیاد پر کیا جانے والا معاہدہ ٹوٹا ایک فلسطینی نے ۱۹/اگست ۲۰۰۴ء کو یروشلم کی ایک بس میں خودکش حملہ کیا اور بس کے ۲۱ مسافر ہلاک ہو گئے۔ ۳۱/اگست ۲۰۰۴ء تک فلسطینیوں کے حملوں میں تین اسرائیلیوں کی ہلاکت کی خبریں آ چکی تھیں۔ ایک ذرا لمبے وقفہ کے بعد فلسطینیوں نے دو اسرائیلی بسوں پر حملے کیے اور ۱۶/اسرائیلیوں کو ہلاک اور اسی (۸۰) کو زخمی کر دیا۔

اس سے پہلے ۵/اکتوبر ۲۰۰۳ء کو ڈان نے بتایا کہ حیفہ میں ساحل سمندر پر ایک فلسطینی خاتون نے اپنے آپ کو اڑا دیا اور کم از کم ۱۹ افراد ہلاک ہوئے اور اسلامی جہاد نے ذمہ داری قبول کی۔ ۲۰۰۴ء کے پہلے تین ماہ میں فلسطینیوں کے خودکش حملوں کے بعد اکتوبر اور ۴ نومبر کو انھوں نے سینائی میں ایک میلے میں اسرائیلیوں پر حملہ کیا جس میں کم از کم ۱۲ افراد ہلاک اور کئی زخمی ہوئے۔ اور پھر ایک یا دو ماہ بعد انھوں نے اسرائیلی چیک پوسٹ پر حملہ کیا اور چار سپاہیوں کو ہلاک کر دیا۔ ۱۹ جنوری ۲۰۰۶ء کی ایک AFP رپورٹ کے مطابق ایک فلسطینی خودکش بمبار نے ایک Fast Food کے اسٹال پر حملہ

کر کے تل ابیب میں تیس افراد کو زخمی کر دیا۔ شیرون نے اپنی پہلی انتخابی مہم میں دعویٰ کیا تھا کہ انتفاضہ کو سو دنوں میں ختم کر دے گا۔ تقریباً اٹھارہ ماہ بعد اسی نے اعلان کیا کہ یہ جدوجہد لمبی ہوگی۔ اس کے ایک نمائندہ نے کہا کہ اس کی تقریر فوجوں کو اکٹھا کرنے اور یہ کہنے پر آمادہ کرنے کی کوشش تھی کہ ہم ایک لمبی جدوجہد میں مصروف ہیں ''۔اسرائیلی قیادت آخر کار شکست کے تصور سے ہیبت زدہ ہے۔

امن کے عمل کو شروع کرنے کے لیے آخری امریکی تحریک اس کا Road Map ہے جو اقوام متحدہ روس اور یورپی یونین کی مشاورت سے تیار ہوا اور جس کی گہرائی میں اسرائیل کی مدد کی کوشش تھی۔ اس نقشہ کا جائزہ لینے کے بعد جولائی اگست ۲۰۰۲ء کے Foreign Affairs کے ایک مضمون میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ '' یہ Road Map کہیں بھی نہیں لے جاتا''۔درست تناظر میں جانچا جائے تو یہ نقشہ جو دہشت گردی کی تنظموں اور اہلیتوں کو تباہ کرنے کا مقصد رکھتا ہے دراصل انتفاضہ کو ختم کرنے کے لیے ہے کیونکہ ریاستہائے متحدہ انتفاضہ کا تقابل دہشت گردی سے کرتا ہے۔اس طرح یہ Road Map اپنے تمام ارادوں اور مقاصد میں فلسطینیوں کے لیے ایک پھندا ہے۔

حال یہ ہے کہ ایک دفعہ انتفاضہ مکمل طور پر ختم ہوگیا اور اس کے تمام ارکان پکڑ لیے گئے اور ہتھیار ضبط ہوگئے تو اگر دوبارہ اس قسم کے حالات پیدا ہوگئے تو اسے دوبارہ زندہ کرنا ناممکن ہوگا' اس نقشہ میں ایسی کوئی وعید نہیں ہے کہ انتفاضہ ختم ہونے کے بعد اسرائیل پورا مغربی کنارہ اور مشرقی یروشلم خالی کر دے گا۔

Road Map پر عمل کرنے میں اسرائیل کی ہٹ دھرمی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دیوار کی تعمیر کو صدر بش کی طرف سے Road Map پر عمل میں رکاوٹ قرار دیے جانے کے باوجود اسرائیل نے صدر بش کے ردعمل کو دھتکار دیا اور تعمیر جاری رکھی۔ صدر بش کی ہٹ دھرمی کے آگے گھٹنے ٹیک دیے اور اس Road Map کو جو بڑی دھوم دھام سے ریاستہائے متحدہ روس اور یورپی یونین نے مشترک طور پر تحریر کیا تھا پرزے پرزے کر دیا۔ صدر بش پہلے امریکی صدر ہیں جو اسرائیل کے اس حق کو نہ صرف

تسلیم کرتے ہیں بلکہ حمایت بھی کرتے ہیں کہ وہ پورے مغربی کنارے کو خالی نہ کرے۔ غزہ سے واپسی دراصل اتنی اہم نہ تھی کیونکہ آٹھ ہزار پانچ سو اسرائیلیوں کی حفاظت جو ایک ملین فلسطینیوں کے درمیان بسے ہوئے تھے بہت مشکل تھی۔ جہاں تک مغربی کنارے کی بات ہے تو دو لاکھ تیس ہزار (۲۳۰،۰۰۰) اسرائیلی وہاں آباد ہیں جبکہ فلسطینیوں کی تعداد تئیس (۲۳) ملین ہے اور تمام چھوٹی بڑی بستیوں کو قائم رہنا ہے اور محض پانچ سو اسرائیلیوں کی ایک ننھی سی بستی کو ختم کیا جائے گا۔

اپنی حالیہ چالوں میں صدر بش اس قدر اسرائیل حامی اور عرب مخالف رہے ہیں کہ شیرون نے خود فخریہ کہا ''یہ چالیس فلسطینیوں کے لیے مہلک وار تھیں''۔ اور اسرائیل کے سب سے بڑے روزنامہ نے مرکزی خبر کی یہ سرخی جمائی ''شیرون کو سب کچھ مل گیا۔'' بش نے فلسطینیوں اور تمام مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر اسلامی دنیا کے غصہ اور غضب کو بھڑکا دیا ہے۔ اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ شاہ حسین صدر بش سے گفتگو کیے بغیر واشنگٹن سے واپس آ گئے۔ فلسطینی نمائندہ وزیر صائب ارکات نے کہا کہ اسرائیل کے لیے صدر بش کی حمایت عالمی قانون کی خلاف ورزی اور گفتگو میں آنے والے معاملات کی پیش بندی ہے۔ انھوں نے دنیا سے درخواست کی کہ اس کی سختی سے مخالفت کرے۔ اس نقشہ کے ایک ساتھی مصنف یورپی یونین نے صدر بش کی حالیہ اسرائیل حمایتی کارروائیوں پر اپنی تشویش اور مایوسی کا اظہار کیا۔ حکومتی لیکود پارٹی نے غزہ سے واپسی کے لیے شیرون کے یک طرفہ فیصلے کو کثیر اکثریت سے مسترد کر دیا۔ یہ صدر بش کے منہ پر ایک طمانچہ تھا جنھوں نے شیرون کے منصوبہ کی حمایت کی تھی۔ ۱۶ مئی ۲۰۰۴ء کو لاس اینجلس ٹائمز نے بجا طور پر لکھا کہ لیکود پارٹی کا ووٹ صرف شیرون کے خلاف نہیں بلکہ صدر بش کے بھی خلاف ہے۔ شیرون نے بہر حال اپنے مخالف وزیروں کو برخاست کر دیا اور اپنے منصوبہ پر قائم رہنے کا عہد کیا۔

اسرائیل کی طرف سے امن اور انسانیت کے خلاف جرائم میں ریاستہائے متحدہ کے ملوث ہونے کی اس حقیقت سے تشریح کی جا سکتی ہے کہ اسرائیل دراصل ریاستہائے

متحدہ کی جنگ فلسطین میں لڑ رہا ہے۔ یہ جنگ نہ صرف مشرق وسطیٰ کے تیل پر ریاستہائے متحدہ کے اختیار کے لیے ہے بلکہ آخرکار اسلام کی اس مرکزی سرزمین پر مکمل قبضہ کے لیے بھی ہے تاکہ نہ صرف اسلام کی نشاۃ الثانیہ کو روکا جاسکے اور اسلام کے مرکز کو اسرائیل اور امریکہ کے زیرنگیں رکھا جاسکے۔

پروفیسر شرمن نے اپنے مضمون میں اس بات کو نمایاں کیا کہ اسرائیل دہشت گردی کی جنگ میں امریکہ کی اکیانویں ریاست کا کردار ادا کر رہا ہے۔ انھوں نے لکھا:

''اسرائیل اور ہندوستان کے درمیان معاہدہ جسے ریاستہائے متحدہ کی کھلی حمایت حاصل ہو علاقہ میں توازن پیدا کرے گا اور مغربی اور وسطی ایشیا میں امریکہ مخالف انتہاپسند قوتوں کا سامنا کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ یہاں پر مغربی اور وسطی ایشیا میں انتہاپسند قوتوں'' کا اشارہ بلاشبہ مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیائی مسلم جمہوریاؤں میں اسلام کے ابھرنے کی طرف ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو اسرائیلی دراصل فلسطین میں امریکی جنگ نیابتی طور پر لڑ رہے ہیں تاکہ اسلام کے مرکز میں اسے ابھرنے سے روکا جاسکے۔

پیش بند فوجی حملوں کے مشترک مصنفین میں سے ایک Wursmar جس نے یہ نظریہ دیا تھا کہ امریکہ جھگڑوں کو بڑھائے تاکہ مہلک حملہ کیا جاسکے نہ صرف اس طرح انتہاپسندی کے مرکزوں یعنی دمشق، بغداد، ٹریپولی، تہران اور غزہ کو غیر مسلح کیا جاسکے بلکہ مزید بحران تلاش کیے جائیں کیونکہ بحران مواقع مہیا کرتے ہیں۔

اس لیے حماس اور اسلامی جہاد نے بجا طور پر یاسر عرفات کے جاں نشین عباس کی طرف سے قبضہ کے خلاف جدوجہد کو غیر مسلح کرنے کی تجویز کو رد کر دیا ہے۔ حماس کا کہنا ہے کہ مزاحمت کی غیر موجودگی میں شیرون امن کے لیے اپنی مرضی کی شرائط منوانے کے قابل ہو جائے گا۔

اسامہ اور یٰسین غیر موجود ہیں، لیکن ان کے نام زندگی کے مشن، نظریہ جدوجہد کی دعوت اور فتح کی امید ہیں۔ اسامہ، یٰسین، عمر اور نصر اللہ انسانی وجود کی صورت میں نابید

ہو جانے کے بعد بھی آنے والی نسلوں کے خیالات اور نظریات میں زندہ رہیں گے اور آئندہ نسلوں کو مبارک مقاصد اور انسانیت کے لیے جہاد کی ترغیب دیتے رہیں گے۔کیا ریاستہائے متحدہ کو اس بات کا ادراک ہے؟

امریکہ کی جنگی حکمت عملی کی غلطی یہ ہے کہ وہ ابھی تک اس یقین کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں کہ طالبان، القاعدہ اور عراق کے مجاہدین فقط جسمانی تنظیمیں ہیں جنھیں گرفتار کر کے یا ہلاک کر کے ختم کیا جاسکتا ہے۔ وہ لوگ بھی جو بش کی عراقی جنگ سے متفق نہیں ہیں یہی سمجھتے ہیں کہ عراق میں زیادہ فوجیں تعینات کر کے اور بعد از جنگ کاموں کے لیے بہتر منصوبہ بندی کے ذریعے امریکی افواج آسانی سے مزاحمت کو شروع ہونے سے روک سکتی تھیں اور ریاستہائے متحدہ افغانستان اور عراق میں جنگ کرنے کے مقاصد حاصل کرسکتا تھا۔ سابق امریکی وزیر خارجہ کولن پاول جنھیں انتہا پسند عقاب نہیں سمجھا جاتا، ان کا بیان بھی موجود ہے کہ مزید افواج بھیج کر ہم عراق سے اپنی مرضی منوا سکتے تھے۔ افغانستان اور عراق میں مزاحمتوں کے نظریاتی پہلو کو مکمل طور پر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور وہ بھی بہت ہی سرسری طور پر۔ حال ہی میں بش انتظامیہ نے مسلم ریاستوں کے حاکموں کے اشتراک سے نظریاتی محاذ اس طرح کھولا ہے کہ مسلمان ملکوں میں مذہبی تعلیمی نظام کو ریاست ہائے متحدہ کی ضروریات کے مطابق تراشا جائے اور جہاد اور قتال کے نظریات جو قرآن پاک میں ہیں ان کو نکال دیا جائے۔ مزاحمتوں کے نظریاتی پہلو کے پیش نظر ریاستہائے متحدہ سے جنگی حکمت عملی میں کچھ ردو بدل کے باوجود ریاستہائے متحدہ اپنی یک طرفیت اور پیش بند حملوں کے اصولوں پر سختی سے قائم ہے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے جنرل ابی زید جو مرکزی کمان کے سربراہ ہیں، ایران کو ریاستہائے متحدہ کی ناقابل شکست بحری اور ہوائی طاقت سے دھمکا چکے ہیں۔

David Ignatius جس نے عراق کے مزاحمتی علاقوں کا دورہ جنرل ابی زید کے ساتھ کیا تھا، واشنگٹن پوسٹ میں اپنے مضمون میں امریکہ کے طاقت کے غرور کے بارے میں لکھا ہے جو جنرل ابی زید کی حکمت عملی سے واضح ہے، جس کی بنا پر امریکی

قبضہ کے خلاف مزاحمت کرنے والوں کے جواب میں ان کو بہ زور ختم کرنے کی پالیسی پر فلوجہ کی تباہی کے بعد بھی زور وشور سے عمل ہو رہا ہے۔ Ignatius لکھتا ہے کہ جنرل نے غصہ میں بھر کر کہا کسی کی کوئی بھی فوجی کوشش ہمیں علاقہ سے نکال نہیں سکتی۔ اگرچہ یہ تسلیم بھی کیا ہے کہ اس قوت کے سخت ترین مکر کے بارے میں دھوکہ میں نہیں رہنا چاہیے۔ بعثی اور اسلامی جہادی جو ریاستہائے متحدہ کی زیر قیادت فوجوں سے لڑ رہے ہیں، کبھی ہار نہیں مانیں گے' ان جنگجوؤں کو یا تو پکڑنا پڑے گا یا پھر ہلاک کرنا پڑے گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مقامی کمانداروں کو ہدایت دی جو لوگ ہم پر یا عراقی فوجوں پر حملہ کر رہے ہیں ان کو تباہ کر دو۔ انھیں ڈھونڈ و، لڑ و اور ہلاک کر دو۔

جنرل ابی زید کے افسروں کو دشمنوں کو ڈھونڈ کر مار ڈالو کے حکم کے برخلاف اسامہ بن لادن کا حالیہ پیغام جو اواخر اکتوبر ۲۰۰۴ء میں نشر ہوا کہیں زیادہ نرم اور سنجیدہ تھا۔ اے امریکی لوگو! میں آپ لوگوں کو ایک اور مین ہٹن سے بچنے کا حقیقی طریقہ بتا رہا ہوں۔ جنگ' اس کی وجوہ اور نتائج کے بارے میں تحفظ انسانی زندگی کی اہم بنیاد ہے اور کوئی بھی اپنے تحفظ کو پھینک نہیں دیتا۔ بش کے اس دعویٰ کے باوجود کہ ہم آزادی سے نفرت کرتے ہیں ہم سویڈن پر حملہ کیوں نہیں کرتے؟

بعد میں اسامہ نے طاقت کے ارفع مقام سے ایک طویل معاہدہ کی شاخِ زیتون پیش کی جو انصاف پر مبنی شرائط پر ہو اور اس پر سختی سے عمل کیا جائے۔ الجزیرہ سے ۱۸ر جنوری ۲۰۰۶ء کو نشر ہونے والے اس پیغام کو ریاستہائے متحدہ نے فوراً رد کر دیا۔

کس قدر سنجیدہ اور گمبھیر ہیں یہ پیغام جو امریکی عوام کو دیے گئے ہیں۔ ان میں امن اور دوستی کا جو پیغام دیا گیا ہے وہ کمزور مقام سے نہیں بلکہ طاقت کے مقام سے آیا ہے۔ اسامہ کے کردار کے متعلق CIA کا تجزیہ تعریفی ہے۔ اسامہ یونٹ کے ڈائریکٹر انچارج نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ اسامہ دہشت گرد نہیں بلکہ ہنر مند جنگجو، باعزت اور منکسر المزاج شخص ہے۔ CIA میں اسامہ یونٹ کے سابق ڈائریکٹر انچارج Michael Shever کا کہنا ہے "ریاستہائے متحدہ کے قائدین نے سامنے کی بات کو

امریکی حملہ سے بہت پہلے فلوجہ سے نکل گیا تھا جس کا مطلب ہے کہ ایک بہت ہی حکمت عملی والا اور مثالی قائد امریکہ مخالف مہم جاری رکھنے کے لیے آزاد پھر رہا ہے"۔

"سانپ کا سر ابھی تک دھڑ پر موجود ہے، ہم نے اس کی دم کا بہت سا حصہ کاٹ دیا ہے اور جسم کو زخمی کر دیا ہے لیکن سر ابھی تک موجود ہے اور جب تک ہم سر الگ نہ کر دیں کسی قسم کی فتح کا اعلان خود فریبی ہے"۔ واشنگٹن کے ایک اعلیٰ دفاعی افسر نے کہا۔

اعلیٰ مرین کماندار لیفٹیننٹ جنرل John Settler کے زیادہ ہی خوش فہم تجزیہ کے خلاف کہ فلوجہ پر بڑے حملہ کی وجہ سے شورش کی کمر ٹوٹ گئی ہے جنرل اسمتھ جو مرکزی کمان کے سربراہ ہیں کہتے ہیں ابھی اس دعویٰ کا وقت نہیں آیا۔ ہمیں پتہ ہے کہ اہم بات یہ ہوگی کہ اس کامیابی کو جاری رکھا جائے اور کسی اور جگہ مثلاً مادی باقوبہ یا کسی اور جگہ محفوظ پناہ گاہ نہ بننے دی جائے نہ ہی کسی اور جگہ جہاں ہمیں پتہ ہے کہ یہ لوگ جا سکتے ہیں۔ جنرل اسمتھ نے فلوجہ کے شہریوں کی واپسی کا کوئی وقت نہ بتایا، اور کہا کہ شہر کے بعض حصوں میں ابھی بھی لڑائی ہو رہی ہے۔

AFP نے ۱۲ر دسمبر ۲۰۰۴ء کے آس پاس اپنی رپورٹ میں فلوجہ سے لکھا کہ امریکی مرین فوجیوں کے صاف کیے ہوئے علاقوں میں عراقی باغی واپس آ رہے ہیں جہاں فوج روزانہ گھروں کو محفوظ بنا رہی ہے اور ہتھیار جمع کر رہی ہے تاکہ دوبارہ استعمال نہ کیے جا سکیں۔ پچھلے دنوں میں گھر گھر تلاشی کے دوران بیس یا پچیس ایسے افراد ان علاقوں میں بھی ملے جنہیں فوجی صاف کر چکے تھے۔

رائٹرز نے ۱۵ر دسمبر ۲۰۰۴ء کو اپنے مراسلہ میں بتایا کہ لیفٹیننٹ جنرل اسمتھ نے اخبار نویسوں سے کہا کہ عراق میں امریکی رسد کے خلاف ایک دلیر اور پر کار شورش اب زیادہ مہلک ہو گئی ہے اور بارودی دھماکوں نے فوجی کارروائیوں کو سست کر دیا ہے۔ ان کے مطابق مزاحمت کاروں نے یہ راز پا لیا ہے کہ رسد کی نقل و حمل کو مفلوج کر کے امریکی فوج کو سخت ترین نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔ جنرل نے پینٹاگون کو مزید بتایا کہ مقامی

طور پر بنائے ہوئے بموں کے استعمال میں باغی بہت زیادہ بااثر ہو گئے ہیں اور مزاحمت کہیں زیادہ مہلک ہے۔ تعجب نہیں کہ مکمل گھبراہٹ میں عراقی حکومت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا ہے کہ جن صدامی فوجیوں کو انھوں نے مجرم کہہ کر مذمت کی تھی ان ہی میں سے کچھ کو واپس آکر فوج میں شامل ہونے کی دعوت دیں۔

۱۱ر یا ۱۲ر دسمبر ۲۰۰۴ء کو فلوجہ کی فتح کے تقریباً ایک ماہ بعد تک جبکہ یہ شہر تباہ ہو چکا تھا گویا مکمل طور پر برباد جس کے کھنڈروں میں سینکڑوں لاشیں ملی ہوئی تھیں اور کسی کو انھیں نکالنے اور دفن کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس تباہ شہر کی سڑکیں لاشوں سے اٹی ہوئی تھیں، جنھیں امریکی فوجی دریائے فرات میں پھینک رہے تھے۔

ایسی مکمل تباہی کے باوجود فلوجہ کی روح نے مرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اگر چہ شہر کا چپہ چپہ خون میں ڈوبا ہوا ہے' یہ شہر ان بہادروں کے ترانے گا رہا ہے جنھوں نے آخری گولی تک جنگ کی اور جو آج تک اس شہر کے کھنڈروں سے لڑ رہے ہیں۔ مزاحمت ابھی بھی بار بار بھڑک اٹھتی ہے۔ ۱۱ر اور ۱۲ر دسمبر ۲۰۰۴ء کو فلوجہ کے شمال اور جنوب میں لڑائی پھر بھڑک اٹھی یہاں تک کہ ۱۲ر دسمبر کو امریکی فوجیں فضائیہ کی مدد بلانے اور فضا سے میزائیل داغنے پر مجبور ہوئیں۔ جنرل Settler کے مزاحمت کی کمر توڑنے کے دعویٰ کے لیے تو اتنا کافی ہے۔ اگر دوسری جنگ عظیم میں لینن گراڈ کی ہر گلی میدان جنگ بن گئی تھی تو فلوجہ کا ہر تباہ شدہ گھر میدان جنگ بن گیا۔ AFP کے مطابق تجزیہ کاروں کو شبہ ہے کہ عراقی جنگ کے لیے فوجی راستہ درست ہے کیونکہ سمارا کو فوجی کارروائی کے ذریعے ظاہری طور پر باغیوں سے آزاد کرا لینے کے ایک ماہ بعد ہی شورش پھر شروع ہو گئی۔ AFP کی رپورٹ کے اخیر میں کہا گیا ہے کہ باغی فوجیوں کے دوبارہ جمع ہونے اور ریاستہائے متحدہ کی بے پناہ فوجی طاقت سے روبہ روسامنا کرنے کی صلاحیت کی تردید نہیں کی جا سکتی۔

فلوجہ کی اپنی ایک شاندار تاریخ ہے۔ اس شہر نے ۱۹۲۰ء میں برطانیہ سے جنگ کی اور انھیں عراق سے نکالنے میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ T.E.Lawrence نے

سنڈے ٹائمز میں لکھا انگلستان کے شہری میسو پوٹیمیا میں ایک ایسے پھندے میں پھنسا دیے گئے ہیں جس سے بچ نکلنا مشکل ہوگا۔ اس دفعہ یہ ریاستہائے متحدہ ہے جسے عراق کے پھندے میں پھنسا دیا گیا اور اب اس کا بچ نکلنا مشکل ہے۔

مزاحمت کاروں کا ذوق جہاد اور شوق شہادت اور اس کے نتیجہ میں ان کا ناقابل شکست ہو جانا اکیسویں صدی کے بڑے معجزات میں سے ہے۔

یہ سوال کہ امریکی زیر قیادت عراقی حکومت آزاد منصفانہ انتخابات منعقد کرواسکے گی یا نہیں، عراق میں امریکی قابض حکومت کے لیے لٹمس ٹیسٹ بن گیا ہے۔ جاری مزاحمت کے روز بہ روز زور پکڑنے کی وجہ سے ایک موقع پر اقوام متحدہ کے افسران نے متنبہ کیا تھا کہ شاید تشدد کی موجودہ فضا میں انتخابات نہ ہوسکیں۔ رائٹرز نے ۱۵ر دسمبر کو رپورٹ دی کہ اسی دن جب انتخابات کی مہم شروع ہوئی تو کربلا میں شیعہ قائد کے دفتر کے پاس بم پھٹا جس میں ۱۹ر افراد ہلاک اور ۳۲ر زخمی ہوئے۔ انتخابی دفاتر پر شیل داغنے کا سلسلہ بڑھ گیا۔

لخذر براہیمی نے جو اقوام متحدہ کے سیکرٹری کوفی عنان کے مشیر خاص ہیں اور حال ہی میں عراق میں اقوام متحدہ کے نمائندہ رہ چکے ہیں، کہا ۳۰ر جنوری کو رائے دہی اسی وقت ہوسکتی ہے اگر پہلے تحفظ کی حالت بہتر ہو۔ اگر عراق کے صرف محفوظ علاقوں میں انتخابات ہوئے تو سنی اکثریت کے علاقے جو متشدد علاقوں میں ہیں الگ رہ جائیں گے۔ اب جبکہ انتخابات ہو چکے ہیں اور دو ماہ کے لیت و لعل کے بعد حکومت بن گئی ہے جس کے لیے ایسے اہم سوالات کو کہ عراق مذہبی ملک ہوگا یا لادینی؟ کرکوک کردستان کے حوالے ہوگا اور پیش مرگہ جو کردستان کی نجی فوج ہے اس کی کیا حیثیت ہوگی؟ سہولت کے قالین کے نیچے دبا دیا گیا ہے۔

اس لیے یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا عراقی حکومت جو کہ سہولت کی شادی پر مبنی ہے سنیوں کے حقیقی نمائندوں کی غیر موجودگی میں جو دنیا کی طاقتور ترین فوج کو مشکل میں ڈال سکتے ہیں مستحکم اور پائیدار ہوسکتی ہے۔

ریاستہائے متحدہ کی افواج کا اخلاق، تہذیب اور لڑنے کی صلاحیت ابھی سے مضمحل نظر آنے لگی ہے۔ ۱۶/ اکتوبر ۲۰۰۴ء کو AFP نے ایک مراسلہ میں بتایا کہ کوارٹرگارڈ کمپنی کے امریکی فوجیوں نے اس علاقہ میں رسد کے قافلہ میں شامل ہونے سے انکار کردیا جہاں دیسی ساختہ بموں سے کئی سپاہی مارے گئے تھے۔ حربی علاقہ میں عدول حکمی بغاوت کے مترادف ہے۔ جیکس مسس پی کے اخبار Clarion Ledger نے کہا کہ کچھ خاندان والوں سے انٹرویو میں پتہ چلا کہ اس عدول حکمی کی وجہ یہ تھی کہ سپاہیوں کا کہنا تھا کہ انھوں نے مشن پر جانے سے انکار اس لیے کیا کہ انھیں محسوس ہوا تھا کہ نہ تو ان کے ساتھ محافظوں کی مناسب تعداد ہے نہ ہی گاڑیاں اچھی حالت میں ہیں۔ ایک دوسرے یونٹ کی خاتون فوجی نے شکایت کی کہ اس کے شوہر کو اس کی پلٹن کے ساتھ جھوٹا الزام لگا کر گرفتار کیا گیا کیونکہ انھوں نے خودکش مشن پر جانے سے انکار کردیا تھا۔ انھوں نے مزید زور دے کر کہا کہ اگر میرا شوہر حکم کی تعمیل سے انکار کرتا ہے تو یقیناً کوئی بڑی بات ہوگی۔ ایک سپاہی نے اپنی والدہ کے فون پر پیغام چھوڑا کہ جب تحقیقات ہو ہی رہی تھیں تو سپاہیوں کو گرفتار کرلیا گیا تھا۔

۲۱/ اکتوبر ۲۰۰۴ء یا اس کے قریب ہی بالٹی مورسن نے اس حکم عدولی کے بارے میں لکھا تھا کہ اسے غدر کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ یعنی فوجی نظم کا سقوط۔ اخبار نے مزید کہا کہ جیسا کہ ان ۱۹ سپاہیوں کے رشتہ داروں نے بتایا یہ بات تعجب کی نہیں کیونکہ اس یونٹ کو غیر مسلح سڑکوں پر خطرناک علاقوں سے گزرنے کا حکم دیا گیا تھا جب کہ کوئی فضائی مدد میسر نہ تھی اور ان کے پاس بھی دفاع کے لیے محض ہلکے ہتھیار تھے۔ سپاہیوں نے یہ شکایت بھی کی کہ ایندھن میں بھی تیل کی ملاوٹ کی گئی تھی۔ بالٹی مورسن نے یہ تجزیہ کیا کہ Army Reserves اور National Guards کے سپاہیوں میں بے اطمینانی بڑھ رہی ہے۔ وردیوں میں ملبوس ہزاروں مرد وخواتین کی تعیناتی کی مدت اس سے بہت بڑھ چکی تھی جس کا ان سے بھرتی کے وقت وعدہ کیا گیا تھا۔ مزید برآں عراق میں طویل عرصہ تک لڑنے والوں کے پاس راشن سے لے کر زرہ بکتر اور گاڑیوں

کی حفاظت کے لیے لوہے کی چادروں تک کی کمی تھی۔

Aiko Kyria Kau نے ڈان نیوز سروس (ڈان ۲۴ر اپریل ۲۰۰۵ء) کے مراسلہ میں عراق میں امریکی فوج کی بڑھتی ہوئی پریشان کن صورت حال پر یوں روشنی ڈالی: ریاستہائے متحدہ کی فوج کے چار لاکھ بیاسی ہزار سپاہیوں میں سے تین لاکھ باہر بھیجے جاچکے ہیں۔ان میں سے زیادہ تر عراق، افغانستان، کوریا اور سابق یوگوسلاویہ میں ہیں۔ملک میں متعین ہر ایک سپاہی کا ملک سے باہر تعینات ہونا جنگ کے لیے تیار فوج کی حکمت عملی کا الٹ ہے۔چاروں فوجی ادارے بھرتی کے اہداف حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فوج فاضل فوجی اور National Gaurds میں بھرتی کی سطح گذشتہ تین سالوں میں کم ترین درجے پر پہنچ گئی ہے۔نئی افواج مہیا کرنے کے لیے پینٹا گون کی صلاحیتوں کو سخت دھچکا لگا ہے چنانچہ اسے عراق میں ڈیڑھ لاکھ کی تعداد قائم رکھنے کے لیے باریوں کا سلسلہ جاری کرنا پڑا ہے۔پینٹا گون کی کرائی ہوئی رائے شماری نے انکشاف کیا ہے کہ انچاس فی صد فوجی مزید کام کے لیے نام نہ لکھوانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ بھرتی کے تسلسل کے بغیر اضافی فوجیوں اور قومی محافظین (National Gaurd) پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔قومی محافظ فوجی جن کی تعداد چالیس ہزار ہے انھیں مقررہ مدت کے بعد بھی تعینات رہنے کا حکم دیا گیا جس میں سے زیادہ تر کے نام ان کی مرضی کے خلاف شامل کیے گئے جس کی وجہ سے فوجی اعلیٰ کمان شدید تشویش میں مبتلا تھی۔۲۰ر جنوری ۲۰۰۵ء کو لیفٹیننٹ جنرل Ron Helmy نے ایک میمو میں بتایا کہ طویل عرصہ کی تعیناتی نے ان کی فوج کی چستی کو مفلوج کردیا ہے اور وہ ٹوٹی پھوٹی فوج بن کر رہ گئے ہیں۔جنوری ۲۰۰۵ء کو Air War College کے ایک گشتی پروفیسر نے متنبہ کیا کہ فوج شکستگی کی حد پر پہنچ رہی ہے۔جولائی ۲۰۰۴ء میں چار صدور کے مشیر Charles Marks کا بیان آیا کہ ہم جبری بھرتی کے بغیر اتنی فوج نہیں حاصل کرسکتے جتنی فوج کی عراق میں ضرورت ہے اور یہ طریقہ ویت نام میں تباہ کن ثابت ہونے کی وجہ سے ترک کردیا گیا تھا۔یہ تو حال ہے عراق میں ریاستہائے

متحدہ کی فوج کی زبوں حالی کا۔

عراقی قومی محافظوں اور پولیس کی حالت جنھیں ریاستہائے متحدہ نے بھرتی کیا ہے اور بھی پریشان کن ہے ۔۳فروری ۲۰۰۵ء کو Senate Arms Services Committee کو رپورٹ دیتے ہوئے Joint Chief of Staff کے سربراہ جنرل مائرز نے بتایا کہ انھوں نے ایک لاکھ چھتیس ہزار چھپن (136,056) عراقیوں کو تربیت دی تھی اور مسلح کیا تھا جن میں سے چھپن ہزار دوسو چھیاسی فوجی اور پچھتر ہزار دوسونوے پولیس والے تھے،لیکن ان میں سے تیس فیصد سے بھی کم اس قابل نہیں کہ کوئی مشن پورا کرسکیں۔ان میں سے صرف چالیس ہزار ایسے ہیں کہ جو کہیں جا کر خود کوئی کام کرسکیں۔ صدر بش نے ۲رفروری ۲۰۰۵ء کو اپنے State of The Union خطاب میں واپسی کی حکمت عملی کا خاکہ بتایا تھا جب انھوں نے کہا ''ہم زیادہ کارآمد عراقی محافظ فوجیں تیار کرنے کی کوشش میں مدد بڑھادیں گے'' بہرحال یہ نشان دہی کی جاسکتی ہے کہ واپسی کی امریکی حکمت عملی میں پورے عراق سے تمام امریکی فوجوں کی واپسی شامل نہیں۔ بلکہ شاید انھیں کثیر التعداد اڈوں میں مقیم رہنا ہوگا جن کی تعمیر بے حد تیز رفتاری سے کی جا رہی ہے۔ وقت کے ساتھ امریکی سپاہیوں کی اموات بڑھ رہی ہیں اس حد تک کہ انتظامیہ کو میدان جنگ میں مرنے والے فوجیوں کے خاندانوں کے لیے معاوضہ کی رقم پانچ لاکھ ڈالر تک بڑھانی پڑی۔عراق میں عراقی فوجی اس قدر بد دل ہیں کہ بھگوڑے پن کا رجحان ترقی پر ہے۔International Impact London نے جنوری فروری ۲۰۰۵ء کو رپورٹ دی ہے کہ عراقی فوجی پیسے لیتے ہیں، چھٹی پر جاتے ہیں اور واپس نہیں آتے۔ بھاگنے کے واقعات چالیس فی صد تک ہورہے ہیں۔ Senate Committee کے سامنے ایک ریپبلکن سینیٹر Susan Collin نے ایک مرین کرنل کی ای میل پڑھی کہ عراقی کمان دار جنگ کی بڑی خبروں سے گھبرا کر اپنی فوجوں کی تعداد زیادہ دکھا کر ان کے لیے آنے والی رقم ہڑپ کرتے رہے ہیں۔اب صدر بش نے زمینی حقائق کی چیختی ہوئی حقیقت سے بچنے کے لیے روایتی شترمرغ کی طرح اپنا سر ریت میں

چھپالیا ہے۔ جنوری، فروری کے Impact نے لکھا ہے کہ جب بش نے کولن پاول سے عراقی جنگ کا حال پوچھا تو پاول نے جواب دیا کہ ہم ہار رہے ہیں۔ یہ جواب بش کے لیے ناقابل برداشت تھا اور انھوں نے پاول کے چلے جانے کی درخواست کی۔

امریکی اور عراقی افواج کی عراق میں بدحالی یہ بات بہ بانگ دُہل بتاتی ہے کہ عراق میں صورت حال کسی قدر پریشان کن ہے اور عراقی اور امریکی افواج ایسی رگڑائی والی جنگ لڑنے کے قابل نہیں رہی ہیں۔ اگر یہ جنگ اسی طرح جاری رہی تو عراقی مزاحمت نہ صرف جاری رہے گی بلکہ بڑھے گی جیسا کہ دہشت گردی پر امریکی State Department کی حالیہ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے، جس میں حملوں میں بے تحاشا اضافہ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ ۲۰۰۳ء میں ایک سو بہتر اور ۲۰۰۴ء میں چھ سو پینسٹھ۔ ایسے بھیانک اضافہ سے گھبرا کر کنڈولیزا رائس نے اس رپورٹ کے امریکی عوام پر زلزلہ آسا اثر سے بچنے کے لیے حکم دیا کہ رپورٹ بدل کر اعداد وشمار کم بتائے جائیں کانچ کے گولے میں ابھرتی ہوئی ان حقیقتوں کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ ریاستہائے متحدہ اس دہشت گردی کی جنگ کو جیت نہیں سکتا۔

۲۹ اپریل ۲۰۰۴ء کو صدر بش نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ امریکہ حقیقتاً بہت اچھی ترقی کر رہا ہے۔ ایک دن پہلے اس دعویٰ کی بنیاد پر انھوں نے زور دیا کہ حفاظتی افواج بہت بہتر کارکردگی دکھا رہی ہیں اور عراقی باشندے ایک آزاد معاشرہ کے فوائد دیکھنے لگے ہیں۔ شاید اس بات سے ان کا مطلب عراق میں ایک منتخب جمہوری حکومت کا قیام تھا۔ منتخب حکومت کے قیام سے اس قدر امید باندھ لینے کا جواب مزاحمت کاروں نے اس طرح دیا کہ ایک ہی دن بعد دس خودکش کار بم دھماکے ہوئے جن میں سو افراد ہلاک ہوئے جن میں سے نوے (۹۰) عراق کے دارالخلافہ میں مارے گئے۔

۸ دسمبر ۲۰۰۴ء کو رائٹرز نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ گھبراہٹ میں امریکی سپاہی سیکرٹری دفاع جناب رمزفیلڈ سے الجھ پڑے کیونکہ وہ ضروری سامان مثلاً گاڑیوں کی حفاظت کے لیے لوہے کی چادروں کی سخت قلت سے دوچار تھے۔ کمی اس قدر شدید تھی

کہ انھیں گاڑیوں کی حفاظت کے لیے لوہے کی تلاش میں پہاڑ کھودنا پڑ رہا تھا۔ سیکرٹری دفاع کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ہر گاڑی کے لیے کافی سامان مہیا نہ تھا' سپاہیوں میں بددلی اس قدر تھی کہ ۔ ۔ ربش نے ان کی پیٹھ پر تھپکی دے کر ان کی اس ہمت کی تعریف کی جو انھوں نے سیکرٹری دفاع کے سامنے اپنی تکالیف بیان کر کے دکھائی تھی۔ اس کے بعد اخبار نے مایوس کن تبصرہ کیا ہے' اگر مورال گر رہا ہے تو فوجی ہی مور دالزام نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اصل مجرم تو وہ ہیں جنھوں نے جنگ شروع کرتے وقت سہانی پیش گوئیاں کی تھیں جبکہ بغاوت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر اخیر میں اخبار نے سب سے زیادہ شعلہ بار تبصرہ کیا ہے کہ عراق میں فوجیوں کو جو مسائل ہیں وہ انیس (۱۹) عورتوں اور مردوں کے ڈر سے کہیں زیادہ ہیں اور جنھیں جلدی اور دوٹوک طریقہ سے حل کرنے کی ضرورت ہے۔

اس وقت دنیا کیوبا کے میزائیل بحران کے بعد سب سے خطرناک دور میں داخل ہوگئی ہے۔ پرانے دہشت کے توازن کی جگہ غیر متوازن دہشت نے لے لی ہے۔ امریکی فوجی طاقت کے قریب بھی کوئی اور ملک نہیں پہنچ سکتا اور صدر بش کا دوبارہ انتخاب اور ان کا انتہا پسندوں میں گھرا ہونا دنیا کے امن کے لیے خطرہ ہے۔

ان حالات میں باقی دنیا ریاستہائے متحدہ کی بے پناہ فوجی طاقت سے خطرہ محسوس کرتی ہے کیونکہ اس کے نظریہ یک طرفیت اور پیش بند حملوں کا پھریرا لہرا رہا ہے۔ اس کی وجہ سے تیسری دنیا میں ایک گھبراہٹ آمیز اور تیز رو دوڑ جوہری چھتری حاصل کرنے کے لیے شروع ہوگئی جس میں گندے بم بھی شامل ہیں۔

عالمی جوہری ایجنسی کے سربراہ محمد البرادعی نے دنیا کو ۱۱ ستمبر کی قسم کی جوہری دہشت گردی سے خبردار کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ دو درجن سے زیادہ ادارے اور اشخاص غیر قانونی تجارت میں ملوث ہیں' یہ تجارت ایسے عناصر کرتے ہیں جن پر ریاستوں کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ جو بات زیادہ خطرناک ہے، البرادعی نشان دہی کرتا ہے کہ یورینیم کی افزودگی اور جوہری ہتھیاروں کی ساخت کی حفاظت کے روایتی طریقے فرسودہ ہو چکے ہیں۔ تیسری دنیا میں جوہری ہتھیار حاصل کرنے کی دیوانگی کو ہوا دینے کی

وجہ امریکی قومی حفاظتی حکمت عملی ہے جو اقوام متحدہ اور عالمی قانون کو یکسر نظر انداز کر کے پیش بند فوجی حملوں پر مبنی ہے۔

دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ ادائیگیوں کے توازن اور مرکزی و علاقائی بجٹ پر برا اثر ڈالنے کے علاوہ انسانی وسائل کی ترقی میں بھی رخنہ ڈال رہا ہے جس پر سائنس اور ٹیکنالوجی میں تمام تر برتری کے ساتھ ساتھ اس کی پیداواری صلاحیت اور پیداوار میں حیرت انگیز دریافتوں کا انحصار ہے جیسا کہ National Science Board نے ریکارڈ کیا کہ اعلیٰ سائنس اور انجینئرنگ کے میدانوں میں ۳۹ فیصد افرادی قوت غیر ملکی تارکین وطن ماہرین پر مشتمل ہے۔ تین سال پہلے MIT میں تین سو پچاس سائنس میجر تھے جبکہ آج دو سو چالیس ہیں۔ Stanford Carngie Mellon میں بھی یہی حال ہے۔ ویزوں کے حصول میں غیر معمولی پابندیوں نے ان غیر ملکی طلباء کی آمد کو جو گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ اور پی ایچ ڈی کورسوں میں داخلہ لیں محدود کر دیا ہے سائنس اور انجینئرنگ میں داخلہ لینے والے طلباء میں سے نصف تعداد غیر ملکی طلباء کی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے اعلیٰ تکنیکی افرادی قوت کا امریکہ سے انخلا بھی بڑھ گیا۔ یہ دونوں رجحان اگر جاری رہے تو ترقی اور اعلیٰ تکنیکی افرادی قوت کی رسد کے لیے ضرر رساں ثابت ہوگی جس پر معاشی سیاسی اور فوجی طاقت کا انحصار ہے۔

دہشت گردی کے خلاف ریاستہائے متحدہ کی طویل جنگ کے نتیجہ میں اس کا استحکام اور معاشی ایمان داری زبوں حال ہے۔ امریکی ڈالر کی قدر میں کمی نے صنعتی دنیا کے تمام معاشی بازاروں میں تشویش پھیلا دی ہے۔ اگست ۲۰۰۴ء سے ڈالر کی قدر میں ۹ فی صد کمی ہوئی ہے اور کمی جاری ہے جو تیزی سے روبہ زوال معیشت کی علامت ہے۔ امریکی عالمی خریداروں کی حیثیت سے ایسی خریداری کر رہے ہیں جن کے لیے ادائیگی نہیں کر سکتے۔ جن ملکوں سے امریکہ خریداری کرتا ہے ان کے قرض میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اور ایشیا کے مرکزی بینکوں کے جمع شدہ ڈالروں کا حجم بے حد بڑھ چکا ہے جن کا میزان 1.5 ٹریلین ہے جو زیادہ تر امریکی حکومت کی سیکیورٹیوں کی شکل میں ہیں۔

ریاستہائے متحدہ کا معاشی استحکام اب ان ملکوں کے رحم وکرم پر ہے جو ڈالروں کے ان ذخائر کے مالک ہیں۔ چونکہ ڈالر کی قیمت میں مسلسل کمی ہو رہی ہے وہ ممالک حکومت کی ان سیکیورٹیوں کو نقد رقم میں تبدیل کروا سکتے ہیں اور اس صورت میں American Federal Reserve Bank کو ڈالر کی قیمت مزید گرنے سے بچانے کے لیے شرح سود بڑھانی ہوگی۔ ریاستہائے متحدہ کے معاشی ڈیپارٹ منٹ نے ۳ مئی کو خبر دی کہ ۲۰۰۵ء کے پہلے تین ماہ میں امریکی معیشت 3.1 فی صد گر چکی ہے جو دو سالوں میں کم ترین ہے جس کی وجہ خریداروں اور تاجروں کی طرف سے اخراجات میں کمی تیل کی بڑھتی ہوئی قیمت اور بڑھتی ہوئی تجارتی خلیج ہے۔

مئی ۲۰۰۵ء میں IMF نے اپنے جریدہ "World Economic Outlook" میں خاکہ پیش کیا کہ اگر چین، جاپان، کوریا اور دوسرے ایشیائی ممالک جو امریکہ کے تجارتی خساروں کا خرچ اٹھا رہے ہیں باقی دنیا کی طرح اپنے ڈالر فروخت کرنا شروع کر دیں تو ڈالر کی قدر پندرہ فی صد گھٹ جائے گی اور شرح سود پندرہ فی صد بڑھ جائے گی جس کے نتیجہ میں یورو کے مقابل ڈالر 1.60 تک آجائے گا۔ ریاستہائے متحدہ کی معیشت کی ترقی کی رفتار صفر ہو جائے گی اور یہ ہلکی کساد بازاری کا شکار بھی ہو سکتی ہے۔ ملک سے باہر امریکی اثاثوں کے مقابل امریکہ میں غیر ملکوں کے اثاثے زیادہ ہیں۔ فرق کا اندازہ GDP کا پچیس فی صد تک ہے اور پیرس کے OECD کے مطابق یہ فرق اگلے دس سالوں میں پچاس فی صد تک بڑھ سکتا ہے۔ ۲۰۰۴ء میں ریاستہائے متحدہ نے غالباً بقیہ دنیا سے چھ سو ستر (۶۷۰) بلین ڈالر قرض لیے ہیں۔ غیر ملکی قرض خواہوں کی ایک کثیر تعداد کی امریکہ کو قرض فراہم کرنے کی خواہش کی وجہ سے اسے شرح سود کو بلند رکھنے میں مدد ملی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسی کی وجہ سے افغانستان اور عراق میں جنگ کا خرچ قرض کی ادائیگی کے کسی بڑے بوجھ کے بغیر اٹھایا جاتا رہا اور امریکی حکومت اس قابل رہی کہ امریکی شہریوں پر ٹیکسوں کا بوجھ کم کر سکے، اس طرح امریکہ اشیائے ضرورت کی بہت بڑی مقدار کی درآمد کرتا رہا اور

امریکی جنگ سے پہلے کی طرح چیزیں استعمال کرتے رہے اور اب تک جنگ کا کوئی دباؤ نہیں پڑا۔ لیکن اگر یہ جنگ مزید طول پکڑ گئی تو صورت حال بہت زیادہ بدل سکتی ہے ۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسامہ بن لادن امریکہ کو ایک تھکا دینے والی عالمی جنگ میں گھسیٹ رہا ہے تاکہ ریاستہائے متحدہ کی حکومت اور عوام دونوں کو تھکا مارے۔

موجودہ صورت میں بھی سماجی مصلح Michael Harrington نے اپنی کتاب The Other America میں لاکھوں امریکی شہریوں کی ابتلا کا حل طشت از بام کیا ہے جنھیں قومی معیشت کی بلندی اور اشیائے ضرورت سے بھرے امریکی بازاروں کی موجودگی میں نہ تو ڈھنگ کا کھانا ملتا ہے نہ کپڑا نہ مکان۔ افراط زر کے مقابل اوسط امریکیوں کی حقیقی آمدنی میں ۱۹۷۳ء سے اضافہ نہیں ہوا ہے۔ ایک عام گھرانے کی حقیقی آمدنی چار سالوں سے لگاتار کم ہو رہی ہے، اگرچہ ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۴ء تک GNP میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ دہشت گردی کی جنگ کے بے تحاشا اخراجات کے لیے سماجی بھلائی کے کاموں میں زبردست کٹوتی کی گئی ہے۔ ریاستہائے متحدہ کے ایسے باشندوں کی تعداد جو غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں اندازاً سینتیس (۳۷) ملین یا کل آبادی کا 12.7 فی صد ہے جبکہ سفید فام آبادی کا صرف آٹھ فی صد غربت کی لکیر سے نیچے ہے جبکہ سیاہ فام چوبیس (۲۴) فی صد اور ہسپانوی بائیس (۲۲) فی صد۔ امریکہ کی بارہ اعشاریہ سات (12.7) فی صد غربت ترقی یافتہ دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ ریاست ہائے متحدہ میں دس فی صد غرباء کو ملکی آمدنی میں سے صرف 1.9 فی صد مل سکا جبکہ جاپان میں 4.8 فی صد، جرمنی میں 3.2 فی صد، فرانس میں 2.3 فی صد اور اٹلی میں 2.3 فی صد۔ مزید برآں وقت گزرنے کے ساتھ غریب اور امیر کا فرق تشویشناک حد تک بڑھا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں ایک Chief Executive عام کارکنوں سے چوبیس گنا زیادہ کماتا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ ۲۰۰۳ء میں تمام نسلوں کی کم تنخواہوں کی وجہ سے یہ فرق ایک سو پچاسی (۱۸۵) گنا بڑھ گیا ہے۔ عام طور پر تنخواہیں اخراجات سے پیچھے ہی رہی ہیں۔ ملک سے باہر کام کروانے کی وجہ سے ملک میں ۲۰۰۱ء کی نسبت تقریباً 2.5 ملین

اسامیاں کم ہوگئی ہیں۔ حکومت کی ترجیح جنگ کو حاصل ہونے کی وجہ سے غربت کی صورت حال بگڑ رہی ہے۔ افغانستان اور عرب جنگ پر بے پناہ رقم ضائع ہو رہی ہے جبکہ وفاقی بجٹ میں سینکڑوں بلین ڈالر کا خسارہ سال بہ سال دکھایا جا رہا ہے' وبائی امراض اور صحت عامہ کے ایک ماہر پروفیسر Richard Wilkinson نے نامسابقت کے اثرات پر اپنے مقالہ میں انکشاف کیا ہے کہ بنگلہ دیش میں طویل عمری کا امکان ہارلم سے زیادہ ہے جو نیو یارک کا غریب ترین علاقہ ہے۔ جہاں صرف غرباء ذلت کی زندگی گزارتے ہیں۔

اواخر اگست ۲۰۰۵ء کی ایک رپورٹ میں جو دنیا کی سماجی صورت حال کے بارے میں ہے کہا گیا ہے کہ بے اندازہ معاشی ترقی کے باوجود پچھلے سالوں میں امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا رہا ہے۔ ۲۰۰۴ء کی انسانی ترقی رپورٹ نے روشنی ڈالی ہے کہ ایک سو دس (۱۱۰) امیر ملکوں میں سے ریاستہائے متحدہ کا Gini Index سب سے زیادہ ہے یعنی چالیس جبکہ سویڈن کا پچیس ہے۔

تیل کی قیمت ستر (۷۰) ڈالر فی بیرل کی حد تک بڑھ چکی ہے' عراقی جنگ سے متعلق دوسری وجوہات کے علاوہ اس وجہ سے بھی کہ تیل کی پائپ لائنیں جن کے ذریعے اس کی برآمد ہوتی ہے بار بار دھماکوں سے اڑا دی جاتی ہیں۔ عراق اور افغانستان کی جنگ اور سعودی حفاظتی فوجوں اور گوریلوں میں جھڑپوں کی وجہ سے تیل کے بازار میں خوف اور امکانی خطروں کی گرم بازاری ہے کہ نہ جانے مستقبل قریب میں کیا ہونے والا ہے۔ ۱۵/ اکتوبر ۲۰۰۵ء کی ایک AFP رپورٹ اس بات پر روشنی ڈالتی ہے کہ توانائی کی قیمت میں اضافہ کی وجہ سے اشیائے ضرورت کی قیمتیں پچھلے پانچ سالوں میں انتہائی تیزی سے بڑھی ہیں۔ اسی دن کی ایک اور رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ وال اسٹریٹ کے نگران جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ آیا بازار انتہائی پستی میں جا چکا ہے۔

تیل کے کچھ بڑے خریدار مثلاً ریاستہائے متحدہ، جاپان، چین تیزی سے خریداری کر رہے ہیں اور بڑے بڑے ذخائر جمع کر رہے ہیں۔ مانگ اتنی زیادہ ہے کہ

رسد اس کا مقابلہ نہیں کر پا رہی۔ نئے ذخائر کی تلاش اور نئی ریفائنریوں کی تعمیر کا کام پچھڑ چکا ہے۔ بے حد گرانی کی وجہ سے پیداوار اور حمل ونقل کے اخراجات بھی بڑھیں گے اور برآمد پر بُرا اثر پڑے گا اور اشیائے صرف کی قیمتیں بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور حقیقی تنخواہوں میں کمی کے نتیجہ میں مقامی بازار سکڑنے لگیں گے۔ امریکی معیشت خریداری اور صرف پر مبنی ہے اور خریداریوں اور صرف میں قابل ذکر کمی مقامی طور پر کساد بازاری پیدا کردے گی جس سے قومی معیشت پر مزید بُرا اثر پڑے گا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ نے نہ صرف قومی معیشت پر بُرا اثر ڈالا ہے بلکہ دوسرا انتہائی اہم امر یہ ہے کہ اس سے امریکہ نے خلیجی علاقوں میں تباہی مچادی تھی اور تقریباً دس ہزار لوگ ہلاک ہوئے تھے خاص طور پر نیو اورلینز میں۔ امریکی انتظامیہ کی قطرینا کی تباہی سے نمٹنے میں نا اہلی کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ کیوبا جو نسبتاً غیر ترقی یافتہ اور غریب ملک ہے، جب اسی شدت کے طوفان کا شکار ہوا تو بروقت انخلاء اور بچاؤ کے ذریعے بچ نکلا اور صرف سولہ (۱۶) اموات ہوئیں۔

نیو اورلینز کا شہر سطح سمندر سے کئی فٹ نیچے ہے۔ جو سرحدی بند اسے ڈوبنے سے بچائے رکھتے ہیں، عرصہ سے گھستے رہے ہیں اور ان کی مرمت اور مزید تعمیر کے لیے بڑی رقم درکار ہے۔

موسمیات کے ماہرین نے قطرینا سے زیادہ شدت کے طوفان کے امکانات کے بارے میں ۲۰۰۱ء میں ہی خبردار کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ انتباہ پر دھیان نہیں دیا گیا بلکہ بش انتظامیہ ہر سال رقوم میں کمی کر رہی ہے یہاں تک کہ ۲۰۰۴ء سے ۲۰۰۵ء تک یہ رقم ۲۰۰۱ء کا نصف رہ گئی۔

ایسوسی ایٹڈ پریس نے بتایا کہ فوج کے محکمہ انجینئرنگ کو صرف چالیس ملین ڈالر ملے جب کہ انھوں نے طوفان اور سیلاب کے پروگرام کے لیے ایک سو پانچ ملین طلب کیے تھے۔

انتظامیہ کی دہشت گردوں کی تلاشِ خام کی دیوانگی کی وجہ سے وفاقی ہنگامی

انتظامات کا ادارہ جس کا فرض ہے کہ قدرتی آفات سے متاثرہ لوگوں کی مصیبت دور کرے، رقم کی شدید کمی میں مبتلا ہے جس کے نتیجہ میں انخلا اور امداد کا کام شروع ہونے میں پانچ دن لگ گئے۔ جب کہ ایشیائی سونامی میں بھی اس سے کم وقت لگا تھا۔

۲۰۰۱ء سے زیادہ سے زیادہ وسائل دہشت گردی کے خلاف جنگ عراق اور افغانستان میں جھونکے جا رہے ہیں۔ جہاں اِن وسائل کا اتنا بڑا حصہ جو ملکی تحفظ کے ادارہ کو دیا گیا اس قدر فضول طریقہ سے خرچ کیا گیا وہاں وفاقی ہنگامی حالت جو اس ادارہ کا حصہ ہے اسے رقوم دینے سے انکار کر دیا گیا جس کی اسے اشد ضرورت تھی۔ متاثرہ ریاستوں کے زیادہ تر قومی محافظ دستے عراقی جنگ میں تعینات تھے۔ مقامی فاضل سامان کا بڑا حصہ بھی مقامی قومی محافظوں میں سے چالیس فی صد کے ساتھ عراق پہنچا دیا گیا تھا۔

اس بات کا ادراک اب ہونے لگا ہے کہ دراصل یہ عراق کی جنگ ہی ہے جو ان وسائل کا بڑا حصہ کھا گئی ہے جنھیں متاثرہ لوگوں کے انخلا اور بچاؤ کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یہاں تک کہ صدر بش کے لیے ضروری ہو گیا کہ قوم کو تسلی دیں کہ امریکہ کے پاس اتنے وسائل ہیں کہ عراق کی جنگ کے ساتھ قدرتی آفات سے بھی نمٹ سکے۔ اب امریکہ میں یہ احساس جڑ پکڑ رہا ہے کہ عراق پر حملہ کرنا شدید غلطی تھی اور یہ ادراک امریکیوں کے جنگ جاری رکھنے کے عزم اور ارادہ کو متاثر کرے گا۔

جب کہ Ferdinand Freeland نے اپنے ایک حالیہ مضمون The Levee Will Break میں بجا طور پر نشان دہی کی ہے: ''اب عوام کے دماغ میں قطرینا کی تصویریں چار سالہ ۹/۱۱ کے عنصر کی جگہ لے لیں گی۔ سب پر حاوی ۹/۱۱ کی یادوں کی یادگار کے طور پر دہشت گردی کی جنگ اپنا مقام کھو سکتی ہے۔ ۷/اکتوبر ۲۰۰۵ء کی AFP رپورٹ کہتی ہے کہ طوفان قطرینا اور ریٹا نے ایک سو تیس بلین سے آٹھ سو ستر بلین ڈالر تک کی جائیداد کو نقصان پہنچایا ہے جس کا اثر قوم کی یادداشت پر گہرا ہو گا، اگرچہ جلد مٹ جائے گا۔

Allistair Crook برطانوی محکمہ خفیہ کے سابق افسر جو پچھلے سال تک یورپی یونین کے اعلیٰ نمائندہ جاویر سولانا کے مشیر تھے اپنے مضمون میں کہتے ہیں جس چیز کا مغرب کو سامنا ہے وہ دہشت گردی نہیں بلکہ بڑھتی ہوئی سیاسی بغاوت ہے۔ دہشت گردی پر اصرار بڑی قیمت لے رہا ہے۔اس نے مغرب کو اس بات کے غلط تجزیہ کی راہ پر لگا دیا ہے کہ اسے کسی خطرہ کا سامنا ہے جس کی وجہ سے ہم مقابلہ کے غلط طریقوں کی طرف جا رہے ہیں۔اخیر میں وہ پیغمبرانہ اعلان کرتا ہے کہ میں نے کبھی مزاحمتوں کو بمباری سے ختم ہوتے نہیں دیکھا۔ پھر وہ جینن کی مثال کی تشریح کرتا ہے۔اسرائیل نے اس بنا پر مغربی کنارے میں جینن پر اپنا حملہ جائز قرار دیا کہ وہاں دس دہشت گرد چھپے ہوئے تھے۔فوجی حملہ کے بعد چھ ہلاک ہوگئے اور صرف چار بچے لیکن بہت جلد ان کی تعداد بڑھ کر چوبیس ہوگئی۔ بالادست فوجی طاقت کا استعمال کروک کے مطابق نفی نہیں بلکہ ضرب کا اوزار بن جاتا ہے۔ یہ احساس کہ عراق کی جنگ امریکہ کے حق میں نہیں جا رہی اور مزاحمت کار جیت رہے ہیں، افسوس کہ صدر بش کو دیر سے آیا ہے۔۲۰ ردسمبر ۲۰۰۴ء کو اخباری کانفرنس میں انھوں نے مایوسانہ کہا: ''ریاستہائے متحدہ کی تربیت کردہ عراقی فوج ابھی محافظت کے قابل نہیں'' اوپر سے جنوری کے انتخابات پریشانی سے خالی نہیں ہوسکتے۔ یہ پہلی دفعہ ہوا تھا کہ بش نے یہ بات تسلیم کی کہ ریاستہائے متحدہ کی تربیت کردہ عراقی افواج مزاحمت کاروں سے مقابلہ کے قابل نہیں کیونکہ جب مقابلہ گرم ہوا تو وہ بھاگ گئے۔اور یہ بھی کہ انھیں ایسی کوئی غلط فہمی نہیں کہ عراقی افواج لڑنے کے لیے بالکل تیار نہیں جیسا کہ خطرہ تھا۔ عراقی وزیر خارجہ نے ۲۷ ردسمبر ۲۰۰۴ء کو ایک بیان میں اعلان کیا کہ عراق کے جو علاقے شورش کی زد میں ہیں وہاں انتخابات ملتوی کرنے پڑیں گے۔ مایوسی اور تاریکی کے ان بڑھتے ہوئے اوقات میں اگر صدر بش کو عراقی سرنگ کے پار کوئی روشنی نظر نہیں آتی تو یہ قدرتی بات ہے۔امریکی قوم کو طویل عرصہ تک عراق سے کسی اچھی خبر کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ The Conflict Forum نے جس کا کروک بانی رکن ہے، اسلام سے گفتگو کی تجویز دی ہے اور اعتراف کیا ہے کہ

مغرب کی بنیادی قدروں کے لیے مسلمان کوئی خطرہ نہیں ہیں۔مسلمان ہماری قدروں سے نہیں، ہماری پالیسیوں سے نفرت کرتے ہیں۔یعنی ایسی کوئی چیز نہیں پائی جاتی جسے اسلامی دہشت گردی کا نام دیا جا سکے، جیسا کہ ۹/۱۱ کمیشن نے یقین دلانا چاہا ہے۔ ریاستہائے متحدہ کو دراصل تسلط کے مظالم اور جبر کے خلاف مسلمانوں کی مزاحمت کا سامنا ہے۔

عراقی جنگ کس قدر تاریک اور مایوس کن ہوگئی ہے۔ یہ حقیقت اور زیادہ نمایاں ہوگئی، جب ۲۱ر دسمبر ۲۰۰۴ء کو مزاحمت کار موصل میں امریکی اڈے سے ایوان طعام میں بم دھماکہ کرنے میں کامیاب ہوگئے جس میں ۲۲ افراد ہلاک اور ستاون زخمی ہوئے۔جن میں سے انیس (۱۹) امریکی فوجی تھے جیسا کہ Brian Lucas نے AFP کو بتایا' یہ حملہ اس وقت ہوا جب برطانوی وزیراعظم بغداد آئے اور فوجیوں کے سامنے دعویٰ کیا کہ جنگ جیتی جاسکتی ہے اور انتخابات ۳۱ر جنوری کو ہوسکتے ہیں۔

موصل میں آٹھ ہزار امریکی افواج کے کماندار میجر جنرل Carter Ham نے کہا کہ ہلاک شدگان میں امریکی فوجی اور امریکی اور عراقی ٹھیکیدار اور عراقی فوج کے ارکان شامل تھے۔معلوم ہوتا تھا کہ بم کمرۂ طعام کے اندر نصب کیا گیا تھا جو اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک کوئی ایسا فرد ملوث نہ ہو جس کی رسائی طعام گاہ کے اندر تک ہو۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مزاحمت کار عراقی فوج میں حلول کر چکے ہیں اور ایک کہیں زیادہ خطرناک پہلو مزاحمت کا سامنے آیا ہے۔اس طرح یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ فلوجہ کی فتح مزاحمت کاروں کی کمر توڑنے کے بجائے مزاحمت کو مزید تیز کرنے کا باعث ہوئی اور ایسے وقت میں جب کہ فلوجہ میں لڑائی جاری ہے یہاں تک کہ امریکی فضائیہ کو تباہ و برباد شہر پر بمباری کرنی پڑی' موصل مزاحمت کے دوسرے مرکز کے طور پر ابھرا۔ عراقی جنگ نے ایسا موڑ لیا ہے کہ فتح کی کوئی امید نہیں۔ABC اور واشنگٹن پوسٹ کی مشترکہ رائے شماری میں جو ۱۶ر اور ۱۹ر دسمبر ۲۰۰۴ء کے درمیان ہوئی تھی جواب دینے والوں میں سے ۶۵ فی صد اس بات پر متفق تھے کہ عراق کی جنگ کے نقصانات فائدوں

سے کہیں زیادہ وزنی ہیں اور ایسی جنگ کا کوئی فائدہ نہیں۔ امریکہ کی عراقی جنگ کے بعد یہ پہلی دفعہ ہوا ہے کہ رائے شماری میں ایک واضح اکثریت نے کہا ہے کہ عراقی جنگ کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ ہمیشہ عراقی جنگ کے بارے میں پرامید رہے ہیں کچھ دن پہلے ہی انھوں نے اصرار کیا کہ عراق میں امریکی فوجیں کامیاب ہو رہی ہیں لیکن موصل میں امریکی طعام گاہ میں بم دھماکہ اور ۲۲/ افراد کی ہلاکت بشمول ۱۶/ امریکی فوجیوں کے، رمزفیلڈ صاحب کے لیے پشت پر آخری تنکا ثابت ہوا ہے جو پہلی دفعہ مایوس نظر آئے اور اعتراف کیا کہ یہ پورا راستہ ہی اوبڑ کھابڑ اور مشکل تھا، اور ناکامیاں ہوئی ہیں، اس سے بھی اہم یہ کہ انھوں نے ۳۱/ جنوری ۲۰۰۵ء کو انتخابات ہونے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

۲۶/ دسمبر ۲۰۰۴ء کو رائٹر نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ عراق پر حملہ کے ایک اعلیٰ مقام ناقد اینگلیکن گرجا کے آرچ بشپ Rovan Williams نے اپنے سامعین کو ٹیلیویژن کی ایک دستاویزی فلم یاد دلائی جس میں دلیل دی گئی تھی کہ ریاستہائے متحدہ اور برطانیہ نے قصداً تحفظ کے خطرات کو بڑھایا تھا، تاکہ اپنی طاقت بڑھا سکیں۔

Thomas Fisks نے واشنگٹن پوسٹ میں اپنے مضمون میں ۲۴/ دسمبر ۲۰۰۴ء کو میجر ولسن کی بات دہرائی جنھوں نے مہم کے سرکاری تاریخ نویس کی حیثیت سے کام کیا تھا اور بعد میں عراق میں جنگ کے منصوبہ ساز بھی تھے۔ امریکی فوج نے بغاوت کی جنگ کو پہچاننے سے انکار کر دیا ہے، ایک عوامی جنگ، اگرچہ وہ باقاعدہ لڑ بھی رہے ہیں۔'' اس انکار کی وجہ سے ولسن کہتا ہے شاید امریکی فوج مبینہ طور پر جیتنے کے باوجود ہار کی پریشانی میں مبتلا ہے۔

اس کے بعد عراقی شورش نے امریکی تسلط کے خلاف خطرناک موڑ لے لیا۔ جنوری ۲۰۰۵ء میں انتخابات کے بعد مقتدیٰ الصدر نے سنیوں کی پوری مدد کے ساتھ ایک عظیم الشان ریلی نکالی جس میں امریکی افواج کی واپسی کا مطالبہ کیا اور عراقی مقننہ

سے مطالبہ کیا کہ مزاحمت کی عزت کریں اور قیدیوں کو رہا کریں۔ اس طرح انھوں نے مزاحمت کاروں کو اعلیٰ اخلاقی مقام عطا کر دیا۔ ان مطالبات کے پسِ پشت یہ امکان جھانک رہا ہے کہ اگر امریکی فوجیں جلدی واپس نہ گئیں تو مقتدیٰ اور ان کے حامی اپنے سنی بھائیوں کے ساتھ امریکی تسلط کے خلاف مسلح مزاحمت میں شامل ہو جائیں گے۔ مقتدیٰ الصدر کے ایک نمائندہ نے ریلی میں اپنے قائد کی طرف سے ایک دعائیہ نظم پڑھی جو ہماری گردن کاٹ رہے ہیں، ان کی گردن اسی طرح کاٹ دے۔ یہ نظم تمام عراقیوں شیعہ سنی اور کردوں کو یکساں روشنی دکھاتی ہے کہ وہ امریکی تسلط کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اگر امریکی فوجیں واپس نہ گئیں تو وہ ضرور اٹھیں گے۔ جن لوگوں کو امید تھی کہ جاری مزاحمت شیعوں اور سنیوں کے درمیان خانہ جنگی بن جائے گی وہ ضرور اپنی مایوسی اور ممکنہ شکست کے زخم چاٹ رہے ہوں گے۔

دہشت گردی کی جنگ میں ریاستہائے متحدہ کی حالیہ پسپائیاں

اپنی دہشت گردی کی جنگ کی وجہ سے ریاستہائے متحدہ ایک پسپائی سے لڑکھڑا کر دوسری پسپائی عالمی سطح پر اختیار کر رہی ہے۔ افغانستان ریاستہائے متحدہ سے شکست کے بعد چار سال اور کرزئی کے دوبارہ صدر منتخب ہونے اور اس کو فتح قرار دیے جانے کے ایک سال بعد بھی ابل رہا ہے۔

افغانستان کی طرح عراق میں بھی ۳۲؍ جنوری کے انتخابات کو متسلط افواج اور عبوری حکومت کی بہت بڑی فتح قرار دیا گیا۔ لیکن افغانستان اور عراق دونوں فتوحات نے فقط شورشوں کی آگ کو ایندھن مہیا کیا۔ اس سے بھی خطرناک بات یہ ہے کہ ازبکستان میں جو حال ہی میں وسطی ایشیا میں ریاستہائے متحدہ کی معاشی اور فوجی طاقت کا نیا اڈہ بنا ہے اسی وقت سے تشدد بھڑک اٹھا ہے۔ وادی فرغانہ میں شعلے بھڑک اٹھے ہیں اور عوام اسلام کریموف سے عہدہ چھوڑنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

جیسی کہ (Atlantic Monthly July 2005) Benjamin Shawz

نے نشان دہی کی کہ عراق پر حملہ کے ساتھ ہی امریکہ کے غلبہ کا شبہ بے حد بڑھ گیا ہے اور اب چین اور روس نے آپس میں فوجی اشتراک بڑھا لیا ہے اور مشترکہ فوجی مشقیں کرنے لگے ہیں۔ اس طرح روس اور چین دہشت گردی کی جنگ میں ریاستہائے متحدہ کے حلیف ہونے کے باوجود امریکہ کے خلاف اپنا بارود خشک ہی رکھ رہے ہیں۔

۵رمئی ۲۰۰۵ء کو طالبان نے گھات لگا کر حملہ کیا اور ۹ رافغان فوجیوں کو ہلاک اور تین کو زخمی کیا۔ ایک دن پہلے ریاستہائے متحدہ کی زیر قیادت فوجوں سے ان کا مہلک ترین مقابلہ ہوا تھا جس میں امریکی فضائیہ نے چالیس طالبان کو ہلاک کیا تھا۔ اس قتل عام کا بدلہ لینے کے لیے طالبان نے ۷رمئی کو جوابی حملہ کیا۔ کابل شہر میں جس کی حفاظت اٹھارہ سو (۱۸۰۰۰) امریکی فوجی کرتے ہیں! دو افغان سپاہی ہلاک اور کئی زخمی ہوئے۔ ایک یا دو دن بعد انھوں نے جلال آباد میں امریکی فوجیوں پر حملہ کر کے دو کو ہلاک کر دیا۔ افغانستان کی حکومت صورت حال قابو سے باہر پا کر طالبان سے دوستی کے لیے بے چین ہے جن کی طرف سے صرف خفت مل رہی ہے۔ اور پھر تفتیش کاروں کے ہاتھ گوانتا نامو کے قید خانوں میں قرآن پاک کی بے حرمتی کی خبریں پھیلیں اور افغانستان جو پہلے ہی ریاستہائے متحدہ سے متنفر اور غضبناک تھا پھٹ پڑا۔ ۱۱رمئی کو جو متشدد مظاہروں کا دوسرا دن تھا ہجوم امریکہ کی موت کے نعرے لگاتا ہوا ہنگامہ آرائی کرتا رہا اور ستاروں اور لکیروں والے پرچم اور بش کے پتلے کو آگ لگائی۔ جس وقت جلال آباد جل رہا تھا صدر کرزئی NATO کے سیکرٹری جنرل کو راضی کر رہے تھے کہ NATO کے فوجی افغانستان میں موجود رہیں کیونکہ ان کے خیال میں ان کے ملک کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں کئی سال لگیں گے۔ افغانستان کے بہادر اور غیور عوام کی اس سے زیادہ ہتک اور توہین نہیں ہوسکتی تھی۔ جیسا کہ AFP نے ۱۵ مئی ۲۰۰۵ء کو اپنے مراسلہ میں بتایا کہ کرزئی حکومت ایک نازک صورت حال سے گزر رہی ہے۔ جس کے قابو سے باہر ہونے کا خطرہ ہے۔ قرآن پاک کی بے حرمتی کے نتیجہ میں غضبناک مسلم مظاہرین اور افغان محافظ فوجوں میں جم کر لڑائیاں ہوئیں۔

۱۰ مئی کو جس دن یہ سب شروع ہوا افغانستان کے چونتیس (۳۴) میں سے دس صوبے خون خرابے اور تشدد میں گھر گئے۔ ۱۵ مئی تک ہنگامہ بڑھ کر محافظ فوجوں کے خلاف باقاعدہ جنگ میں تبدیل ہو گیا، جس میں چودہ مظاہرین کو گولیاں لگیں اور بائیس افراد بشمول تین پولیس والوں کے زخمی ہوئے۔ مظاین نے غیر ملکی ایجنسیوں کے دفاتر کو آگ لگادی جس میں پاکستانی سفارتخانہ بھی شامل تھا۔ مغربی شہر گردیز میں فوج نے تین مظاہرین پر گولی چلائی۔ ایک شخص ہلاک اور کم از کم تین زخمی ہوئے۔ صدر کرزئی کو اعتراف کرنا پڑا کہ امن کے دشمن جو حکومت اور ریاستہائے متحدہ کا اتحاد نہیں چاہتے اس بغاوت کے ذمہ دار ہیں۔ تھوڑی دیر بعد لوگوں کے امریکہ مخالف جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کرزئی کو امریکی فوجوں کی طرف سے افغان قیدیوں سے بدسلوکی کی مذمت کرنی پڑی۔ کرزئی واشنگٹن کی زیارت کو گئے جہاں امریکی صدر نے افغانستان کو حکمت عملی کے حصہ دار (Strategic Partner) کا درجہ مرحمت فرمایا، لیکن افغانستان میں امریکی افواج کی کمان اور اختیار میں کرزئی کو پوست کی کاشت اور یورپ کو منشیات کی ناجائز تجارت نہ روک سکنے پر جھڑکی بھی دی۔

غصہ اور نفرت کی لہر نے وسط ایشیائی مسلم جمہوریہ ازبکستان کو بھی لپیٹ لیا جو ایک امریکی اڈہ کا میزبان تھا جہاں سے نومبر۔ دسمبر ۲۰۰۱ء کی جنگ میں افغانستان پر بمباری کے لیے جہاز اڑا کرتے تھے۔ امریکی طاقت کا یہ مرکز بھی بغاوت میں مبتلا ہو گیا۔ نیتجتاً باغیوں اور ازبک فوجوں کے درمیان گھمسان کی لڑائیاں ہوئیں جس میں ۱۸ مئی ۲۰۰۵ء تک سات سو انچاس (۷۴۹) افراد ہلاک ہوئے۔ سینکڑوں ازبک پڑوسی کرغستان کو نقل مکانی کر گئے۔ بغاوت کے پہلے ہی دن مظاہرین نے فوج کے ٹھکانے پر حملہ کیا اور ہتھیار لوٹے، جیل پر حملہ کیا اور چھ سو (۶۰۰) قیدیوں کو آزاد کرا لیا۔ اس سے فرانسیسی انقلابیوں کے بیتیل پر حملہ اور قیدیوں کو آزاد کرانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

کریموف کی جابر حکومت کے خلاف وادی فرغانہ ہتھیار لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اسلام پسند جن کو دبائے رکھا گیا تھا اب آگے بڑھ رہے ہیں، حزب التحریر کے

تیئس (۲۳)اسلام پسندوں کی گرفتاری اور مقدمات نے اس بغاوت کو چنگاری دکھا دی۔ صدر کریموف نے خود اس بغاوت کو ازبکستان اور دوسرے وسط ایشیائی ممالک میں طاقت پر قبضہ کی کوشش قرار دیا ۔روسی وزیر خارجہ نے بغاوت کا الزام دوسرے اسلام پسندوں کے ساتھ القاعدہ پر لگایا ہے ۔۱۵رمئی کو کرغستان کی سرحد کے قریب ایک شہر پر باغیوں نے قبضہ کرلیا اور اس علاقہ میں حکومتی عمارتوں کو آگ لگادی۔

جس وقت امریکی فوجی طاقت کے دو مراکز امریکہ حمایتی حکومتوں کے خلاف بغاوت اور تشدد سے تباہ نظر آرہے تھے' عراق میں نئے وزیر اعظم جعفر کی زیر قیادت نئی عراقی حکومت بننے کے بعد شورش نئی انتہاؤں کو پہنچ چکی ہے ۔جب کہ ۱۵رمئی ۲۰۰۵ء کو ڈان کا ادارتی تجزیہ تھا روزانہ تقریباً ستر ہلاکتیں معمول کی بات معلوم ہوتی ہے ۔اپریل میں ایک سو پینتیس (۱۳۵) کار دھماکے ہوئے جبکہ مارچ ۲۰۰۵ء میں انسٹھ (۵۹) ہوئے تھے' اب مزاحمت کار امریکیوں کو باقاعدہ جنگ میں الجھا لیتے ہیں۔مئی میں اموات کا میزان ۱۸رمئی تک پانچ سو(۵۰۰) ہے ۔اب تک (۱۰مئی)ایک ہزار چھ سو دس (۱۶۱۰)امریکی ہلاک ہوچکے ہیں' عراق میں تحفظ کی حالیہ زبوں حالی نے گھنٹیاں بجادیں اور کنڈولیزا رائس بھاگتی ہوئی بغداد پہنچیں تاکہ جعفری حکومت کی گرتی ہوئی اختلافی حالت کو سہارا دے سکیں جبکہ تحفظ کے شدید فقدان کے باعث لاشیں گر رہی تھیں۔

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ کونڈی کے ساتھ عراقی وزیر خارجہ کے بجائے وزیر اعظم جعفری تھے ۔اور جب کونڈی نے اعلان کیا کہ جب تک عراقی فوج عراق کے دفاع کے قابل نہ ہوجائے امریکی فوجیں عراق میں موجود رہیں گی تو وہ افسردہ اور خشمگیں حالت میں کھڑے تھے۔

تعجب نہیں کہ ریاستہائے متحدہ نے افغانستان میں طالبان کے ساتھ اپنا رویہ نرم کرلیا ہے جن کے ساتھ کرزئی امریکہ کی آشیرباد سے مفاہمت کے طلبگار ہیں۔ ریاستہائے متحدہ اپنے پندار کی رفعت سے نیچے اتر کر بعثیوں سے بات کررہی ہے جنھیں

عراقی فوج اور انتظامیہ میں شریک کیا جارہا ہے۔

سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ نے افسوس بہت دیر سے اعتراف کیا ہے کہ ریاستہائے متحدہ دوسرے ملکوں کی مدد کے بغیر دہشت گردی کے خلاف جنگ نہیں لڑ سکتا۔ انھوں نے مزید تسلیم کیا کہ یہ جنگ فوجی ذرائع سے نہیں جیتی جاسکتی (ڈان ۲۶ مئی ۲۰۰۵ء)۔ اس طرح سیکرٹری رمزفیلڈ نے امریکہ کے نظریہ یک طرفیت کی کم وبیش مذمت کی ہے جو اسی مفروضہ پر قائم ہے کہ ریاستہائے متحدہ کوئی بھی جنگ اکیلا لڑسکتا ہے اور اس کی فوج اتنی مضبوط ہے کہ امریکہ مخالف کسی بھی ملک، طاقت یا تحریک کو شکست دے سکے۔ ۱۴ر مارچ ۲۰۰۶ء کی AFP رپورٹ کے مطابق صدر بش نے ایران پر الزام لگایا ہے کہ وہ زیادہ مہلک گولہ بارود ہی مہیا کر رہا ہے جو امریکی افواج کے خلاف استعمال ہور ہے ہیں۔ امریکی فوج کے محکمہ خفیہ اطلاعات نے مزید تصدیق کی ہے کہ زیادہ طاقتور دھماکہ خیز مادہ جوزیادہ تباہ کن اور پر کارٹریگر سے لیس ہیں ایران نے عراق کے مقتدی الصدر کومہیا کیے ہیں۔ امریکی فوج کے محکمہ خفیہ کی یہ تصدیق اس امر میں کوئی شبہ نہیں چھوڑتی کہ نہ صرف سنی بلکہ شیعہ برادری کا ایک حصہ بھی امریکی زیر قیادت فوجوں سے لڑنے میں مصروف ہے اور اس کی وجہ سے یہ بات نمایاں ہوجاتی ہے کہ متسلط مقتدرہ کی یہ سخت ضرورت ہے کہ شیعہ سنی فرقہ بندیوں کو مکمل خانہ جنگی میں تبدیل کر دیں۔

بڑھتی ہوئی شورش کو جس کی وجہ سے ہر روز ہلاکتیں بڑھ رہی ہیں دبانے کے لیے ایک بڑا آپریشن Lightning شروع کیا گیا جس میں چالیس ہزار عراقی فوجی دس ہزار امریکی افواج کے ساتھ مئی ۲۰۰۵ء کے دوسرے اور تیسرے ہفتہ سے بغداد کے اندر اور اطراف میں مشغول تھے۔ شہر میں آنے جانے کے تمام راستے بند کر دیے گئے۔ شہر میں آنے اور یہاں سے جانے والی تمام گاڑیوں کی امریکی افواج تلاشی لیتی ہیں، گھر گھر کی تلاشی۔ رات کے کرفیو اور محض شبہ پر ہزاروں عراقیوں کی گرفتاری۔ لیکن یہ سب کچھ ناکام رہا کہ (۱۰ جون تک) شورش میں کچھ بھی فرق ڈال سکتا۔ اگر کچھ ہوا تو یہ کہ شورش اور بھی ڈراؤنی اور مہلک ہوگئی اور مزید ہلاکتیں ہونے لگیں۔ اوسطاً بیس سے تیس فوجی

جن میں امریکی فوجی بھی شامل تھے اور بہت سے زخمی ہوئے تھے۔ ایجنسیوں کے حالیہ مراسلہ مورخہ جون ۲۰۰۵ء میں بتایا گیا ہے کہ مغربی عراق میں ایک بم حملہ میں پانچ امریکی مرین فوجی ہلاک ہوئے جبکہ سرحد پر سترہ لاشیں ملیں جن کی شناخت نہ ہوسکی۔ بغداد میں ایک کار بم دھماکے میں دس افراد ہلاک ہوئے۔

معجزہ سے کم نہیں لگتا کہ مزاحمت کار تمام رکاوٹوں اور قلعہ بندیوں کو توڑ کر فوج کے محفوظ ترین علاقہ میں گھس کر روزانہ تین سے چار کار بم دھماکے کر لیتے ہیں۔

فوجی طریقہ سے حل کرنے کے لیے یہ شورش بہت زیادہ ضدی ثابت ہوئی ہے۔

امن اور معمول پر واپسی کی معدوم ہوتی ہوئی امید اور UNSC کے تسلط کو تسلیم کرنے کی قرارداد کا وقت دسمبر ۲۰۰۵ء تک مکمل ہوجانے کے بارے میں، واشنگٹن میں قائم Middle East Research Information Project کے Chris Toesing نے تبصرہ کیا کہ Shia United Alliance جس کو ۳۰ رجنوری کو سب سے زیادہ ووٹ حاصل ہوئے ابھی سے اپنے وعدوں سے پھر چکی ہے، کہ وہ ریاستہائے متحدہ کی واپسی کے لیے وقت کی حد کا مطالبہ کرے گی۔ اس وقت ریاستہائے متحدہ ہی "United Alliance" کا محافظ ہے۔

عراق میں امریکہ کے احکامات بجالانے کے لیے ایک زبردست حکومت قائم کر لینے کے بعد بھی اس مخمصہ سے اپنے آپ کو نکالنے میں ناکامی ریاستہائے متحدہ کے معاشی اور دوسرے مسائل پر سخت دباؤ ڈال رہی ہے اور اسے معاشی، سیاسی اور فوجی طور پر کمزور کر رہی ہے۔ ۲۰۰۵ء میں Capital Hill کو مزید اسی (۸۰) بلین ڈالر عراق اور افغانستان میں فوجی کارروائیوں کے لیے دینا پڑیں گے۔ جس کے بعد بغاوت پر کیے گئے کل اخراجات دوسودس (۲۱۰) بلین ڈالر تک پہنچ جائیں گے۔ فروری ۲۰۰۶ء میں بش نے مزید ے بلین ڈالر کانگریس سے طلب کیے۔

۳۰ رجنوری کے انتخابات نے جو امیدیں پیدا کر دی تھیں وہ اب معدوم ہوتی جارہی ہیں۔ انتخابات کے نتیجہ میں ابھرنے والے سیاسی عناصر کے درمیان عراق کے

مستقبل کے نقشہ پر جھگڑوں میں مثلاً اسے اسلامی ریاست ہونا چاہیے یا لادینی اسے وفاقی ہونا چاہیے اور کردستان کو مکمل خودمختاری اور تیل پر اختیار ملنا چاہیے یا ایک متحد اور مضبوط عراق۔ تین ماہ گزرنے کے بعد بھی عراقی حکومت کی تشکیل نہ ہو سکی۔

نئی منتخب عراقی مقننہ کے قیام کا مقصد قوم کو ایک آئین دینا تھا جو دو تہائی اکثریت سے منظور ہوا اور جس کے مطابق نئی عراقی حکومت بنتی جو اس وقت کے گنجلک عراقی ماحول میں تقریباً ناممکن نظر آتا تھا۔

تعجب نہیں کہ عراقی وزیر خارجہ کو ۲۰۰۵ء میں اپنے واشنگٹن کے دورہ میں امریکی انتظامیہ سے التجا کرنی پڑی کہ عراق میں اس وقت تک رہیں جب تک کہ عراق معمول پر واپس نہیں آجاتا اور آئین سازی میں فیصلہ کن کردار ادا کرے۔ عراقی حکومت کس قدر جمہوری ہے جو متسلط مقتدرہ سے آئین بنانے کی بھیک مانگے۔ اس لیے عراق ایک مخمصہ میں ہے کہ امن اور معمول کی زندگی مزاحمت کی مسلط افواج کے ہاتھوں شکست کے بعد واپس چلے آئیں گے یا ریاستہائے متحدہ کے عراق سے واپس جانے سے؟ چنانچہ اب آئین بن چکا ہے اور ایک ریفرینڈم میں منظور بھی ہو گیا ہے اور اس کے مطابق مقننہ کے انتخابات مقررہ وقت پر ہو گئے لیکن مزاحمت پوری طاقت سے جاری ہے۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عراق کا اصل مسئلہ شورش نہیں بلکہ ریاستہائے متحدہ کی موجودگی ہے۔ Friday Financial Times نے درست نشان دہی کی ہے کہ امریکی افواج کی مسلسل موجودگی مسئلہ کا حل نہیں بلکہ خود مسئلہ ہے۔

اگرچہ مقتدیٰ کے علاوہ عراق کی شیعہ قیادت پس منظر میں متسلط امریکی فوجوں کی حمایتی رہی ہے، خود ریاستہائے متحدہ میں بعض لوگ ایسے ہیں جو حقیقی اقتدار شیعہ حکومت کو دینے کے مخالف ہیں۔ ایک مشہور جدید شدت پسند Ken Livingstone اپنے ان خیالات کا صاف اظہار کرتا ہے۔ اسے شیعہ مذہبی قائدین پر کوئی بھروسہ نہیں اور ان کے انتخابات کا جرمنی میں Adolf Hitler کے انتخابات سے تقابل کرتا ہے۔

دوسرے شدت پسندوں کے ساتھ وہ اس بات پر بھی یقین رکھتا ہے کہ آخر کار عراق ٹوٹ جائے گا اور شمال میں آزاد کردستان ابھرے گا اور امریکہ کو کردوں کا حق خوداراد ی تسلیم کرلینا چاہیے۔ Livingstone اکیلا ریپبلکن نہیں جو عراق کی توڑ پھوڑ اور آزاد کردستان کے قیام کا حامی نہیں' اس منصوبہ کی سرپرستی امریکی خارجہ پالیسی کے سب سے بڑے ماہر ہنری کسنجر نے کی تھی، جنھوں نے دوسال پہلے لکھا تھا عراق کا تین ملکوں میں تقسیم ہوجانا اس سے بہتر ہے کہ ایک کھلی خانہ جنگی کو پھر سے آزاد کردیا جائے۔

اس منظر نامہ میں عراق کی نئی منتخب حکومت نے ریاستہائے متحدہ سے ہاتھ جوڑ کر استدعا کی کہ عراقی حکومت اور اتحاد کو ڈھے جانے سے بچائے اور اس ملک کو آئین عطا کرے۔ امریکی مفادات کے محافظوں کی حیثیت سے یہ کرد ہیں جن کے پاس طاقت کی کلید ہے۔ اور یہ صرف ریاستہائے متحدہ ہے جو عراق کی اکثریت کی امیدوں اور آرزوؤں کے مطابق آئین سازی میں ان کے اوپر اثر ڈال سکتا ہے۔

لیکن امریکی مفاد اسی میں ہے کہ عراق کو تین حصوں میں تقسیم کردیا جائے اور کردستان ایک خودمختار ملک بن جائے۔ اس طرح امریکہ کی بنائی ہوئی جمہوریت نے عراق کو تحلیل کی حد پر لاکھڑا کیا ہے، تاکہ اسرائیل کو مشرق وسطیٰ کی سب سے بڑی طاقت بنا کر اس علاقہ میں امریکہ کی بلامقابلہ فوجی موجودگی اور تیل پر مکمل اختیار کی ضمانت بنایا جاسکے۔ اس طرح عراق امریکہ کے لیے وہ اڈہ بن جائے گا جہاں سے وہ ایران اور شام پر فوجی اور نظریاتی حملے کرسکے گا۔

۴ر جون ۲۰۰۵ء کو رائٹرز نے ایک خبر میں رپورٹ دی کہ ایک عراقی قومی محافظ یونٹ اس لیے ختم کردیا گیا کہ اس نے امریکی مشیروں کے زیر قیادت تربیت میں حصہ لینے سے انکار کردیا تھا، کیونکہ ان کو ڈر تھا کہ مقامی لوگ انھیں امریکیوں کا شریکِ کار سمجھیں گے اور ان کے خلاف کارروائی ہوگی۔ اس واقعہ سے پہلے بھی عراقی قومی محافظوں کے بارے میں مشہور تھا کہ مزاحمت کاروں سے لڑنے کے حکم پر عمل نہیں کرتے اور بھاگ جاتے ہیں۔ ۹ر جون ۲۰۰۵ء کو پاکستان ٹیلویژن کی خبروں میں مزاحمت

کاروں کے ۲۲ قومی محافظین کو اغوا کر لینے کی خبر آئی' اگر متسلط افواج اپنی بنائی ہوئی فوجوں کی حفاظت نہیں کر سکتیں تو وہ عراقی عوام کی حفاظت کا ذمہ کیسے لے سکتی ہیں۔

عراقی حفاظتی افواج کی حربی اور اخلاقی کارکردگی کی اس حالت میں ان افواج کا کبھی اس قابل ہونا کہ عراق کا دفاع کر سکیں گی جس پر امریکی فوجوں کی واپسی منحصر ہے دور کی بات معلوم ہوتی ہے۔

۹ رجون ۲۰۰۵ء کو گارڈین نیوز سروس کے نشر کردہ مضمون میں Rory Carroll نے یہ انکشاف کیا ہے کہ امریکی سفارت کار اور فوجی کماندار عراق میں مزاحمت کاروں سے خفیہ بات چیت کرتے رہے ہیں۔ایک حالیہ Gallop رائے شماری میں بتایا گیا کہ پچھتر فی صد امریکی اس بات پر یقین نہیں رکھتے کہ عراق پر حملہ کرنا درست تھا۔

اس طرح کرزئی امریکی آشیرباد کے ساتھ طالبان سے مصالحت کی شدید کوششیں کرتے رہے ہیں لیکن انھیں صرف تحقیر ہی ملی۔

عراق اور افغانستان کے یہ مزاحمت کار جن سے اب ہاتھ جوڑ کر گزارش کی جا رہی ہے کہ اپنی جدوجہد ترک کر دیں اور سیاسی عمل میں شریک ہو جائیں' وہی ہیں جنھیں شروع میں جرائم پیشہ کہا جاتا تھا، پھر انھیں القاعدہ کے دہشت گردوں کا نام دیا گیا۔ سابق عراقی صدر علاوی نے بعثیوں کی ایک بڑی تعداد کو عراقی انتظامیہ اور فوج میں شامل کیا۔نئی حکومت کی تشکیل پر سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ بھاگتے ہوئے عراقی حکومت سے یہ کہنے آئے کہ ان لوگوں کو نکالنے کے بجائے انھیں شامل رکھیں۔ دہشت گردی کی جنگ کے عراقی محاذ پر یہ ریاستہائے متحدہ کی سیاسی اور اخلاقی شکست نہیں تو اور کیا ہے؟ افغانستان کی مقننہ کے انتخابات میں طالبان کے حامی عناصر کی خاصی تعداد منتخب ہو چکی ہے۔ عراقی حکومت نے اس کے بعد اپنے محکمہ دفاع کے دروازے موقوف کردہ بعثی فوجی افسروں کے لیے کھول دیے ہیں۔

ایک دفعہ امریکی، مزاحمت کاروں سے معاملات طے کر کے عراق اور افغانستان کی گتھی سلجھا لیں تو وہ نام نہاد پہلی صف کے اتحادی ممالک کو چھوڑ کر بھاگنے میں دیر نہیں

لگائیں گے۔ لیکن اس سے برا یہ ہے کہ اگر ریاستہائے متحدہ کی شکست ہوتی ہے اور وہ عراق اور افغانستان سے ویت نام جیسی واپسی پر مجبور ہوتا ہے تو پھر کیا ہوگا؟

ایسا کس طرح ہوا کہ دنیا کی سب سے بڑی فوج کے مقابل مزاحمت کارنا قابل شکست ثابت ہوئے؟

ایک قابل اعتماد سفارتی ذریعہ نے نشان دہی کی ہے کہ شہادت کے طلبگاروں کی ایک لامتناہی قطار موجود ہے جو ساری اسلامی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ ذریعہ مزید بتاتا ہے کہ یہ غیر ملکی جہادی ہرگز اتنے کامیاب ثابت نہ ہوتے اگر انھیں عراقیوں کی مدد حاصل نہ ہوتی۔ ایک عراقی خفیہ اطلاعات کے افسر نے تصدیق کی کہ یمن' سعودی عرب' اردن' شام' ایران اور مصر سے حصول شہادت کے لیے لوگ عراق آئے ہیں اور عراقی جنگجوؤں اور تمام دنیا کے شہادت کے طلبگاروں کے درمیان شراکت کار ایک بڑی جہادی تحریک کی بنیاد ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور پھر اس وقت کیا ہوگا اگر جہادی تحریک عراق اور افغانستان میں کامیاب ہو جاتی ہے اور آخر کار اسلامی دنیا کے دوسرے ملکوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور ان ملکوں کو للکارتی ہے جو امریکہ کی دہشت گردی کی جنگ میں ''صف اول'' میں ہونے پر فخر کرتے ہیں اور طالبان کو پکڑ کر امریکہ کے حوالے کرنے اور طالبان مخالف نظریات کے پرچار پر فخر کرتے ہیں۔ کیا ان کے پاس ایسی صورتحال کے لیے کوئی پیش بند منصوبہ ہے؟ CNN کے ایک سوال جواب کے پروگرام میں صدر مشرف سے سوال میں اس گمبھیر حقیقت کو اجاگر کیا گیا کہ جو ممالک دہشت گردی کی جنگ میں ریاستہائے متحدہ کا ساتھ دے رہے ہیں وہاں کے عوام میں امریکہ مخالف جذبات بڑھ رہے ہیں۔ سوال تھا کہ اسلامی دنیا میں امریکہ کی مدد کے مسئلہ پر عوام اور حکومتوں کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو کس طرح پاٹا جا سکتا ہے؟ صدر مشرف نے جواب دیا کہ ان میں سے زیادہ تر لوگ میانہ رو ہیں اور بہت تھوڑے لوگ جو انتہا پسند ہیں ان سے فوجی اور نظریاتی طور پر نمٹا جا رہا ہے۔ اسلامی دنیا میں امریکہ مخالف جذبات کے اُبال اور جہادی تحریکوں کا پھیلاؤ عراق اور افغانستان میں جہادیوں کی جیت کے بعد

ناگزیر نظر آتا ہے۔ تعجب نہیں اگر اب ریاستہائے متحدہ مصر میں اپنی جمہوریت کے نفاذ کی مہم پر ہاتھ ہلکا کر رہا ہے کیونکہ اسے ڈر ہے کہ آزاد اور منصفانہ انتخابات کے بعد اخوان المسلمون پوری طاقت سے ابھر سکتے ہیں۔

پشاور سے ڈان کے نمائندہ نے اپنی انتہائی انکشافاتی رپورٹ میں طالبان کے لامتناہی حملوں کے سامنے امریکی افواج کے ڈھے جانے کی پیش بینی کی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق ۱۶ رنومبر ۲۰۰۵ء کو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں سفارت عامہ کے نائب سیکرٹری اور امریکی فوجی افسران نے سابق MNA جاوید پراچہ سے جن کے اسلامی جنگجوؤں سے تعلقات کی شہرت ہے رابطہ کیا کہ وہ واشنگٹن اور عرب لڑاکوں اور طالبان کے درمیان پل کا کام کریں۔ جب پراچہ صاحب سے اخبار والوں نے رابطہ کیا تو انھوں نے نہ صرف اس بات کی تصدیق کی بلکہ یہ انکشاف بھی کیا کہ ملاقاتی امریکیوں نے سابق سربراہ ISI جنرل حمید گل سے الگ ملاقاتیں کی تھیں۔ پراچہ صاحب نے مزید کہا کہ امریکی چاہتے ہیں کہ وہ طالبان سے بات کریں کہ وہ خودکش بمباری بند کردیں اور یہ بھی کہ اس سے قبل سابق وزیر خارجہ متوکل وکیل کے ذریعے طالبان سے رابطہ کیا گیا تھا لیکن طالبان نے ان کی پیش کش کو رد کر دیا۔ بہرحال ۲۱ رنومبر کی ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ ریاستہائے متحدہ نے پوری کہانی سے انکار کر دیا۔ تردید میں پانچ دن کی دیر اپنا جواب آپ ہے۔

عراق کے محاذ پر بھی اتنی ہی سنگین پسپائی ہوئی ہے۔ جیسا کہ ۱۷ رنومبر ۲۰۰۵ء کو AFP نے بتایا کہ کانگریس میں ایک قرارداد پیش کی گئی جس میں امریکی افواج کی عراق سے واپسی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس قرارداد کو بھاری اکثریت سے رد کر دیا گیا۔ صرف تین ارکان نے موافقت میں اور تین سو نے مخالفت میں ووٹ دیے۔

واشنگٹن نے شاید عراق میں مزاحمت کاروں کو خوش کرنے کی خاطر سنیوں کے ساتھ مفاہمت اور سمجھوتہ کی پالیسی شروع کی ہے۔ اس کے بعد سے ریاستہائے متحدہ نے عراقی حکومت کو قیدیوں کے ساتھ متشدد رویہ پر سخت سست کہا۔ یہ عمل مسلم دانشوروں

کی کمیٹی کی اس شکایت پر ہوا کہ عراق کی وزارت داخلہ نے قیدیوں پر تشدد اور ان سے تاوان وصول کرنے اور عراقی فوج اور پولیس پر نگہبانی کے لیے شیعہ ملیشیا کو تعینات کیا ہے۔اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عراق میں جنگ کی ہوا اب مزاحمت کاروں کے حق میں چل رہی ہے۔سوال اب صرف یہ ہے کہ جہادی جنھیں ریاستہائے متحدہ دہشت گرد کہتا افغانستان اور عراق میں فتح کا پرچم بلند کرتے ہیں اور اس پرچم کو ان ملکوں میں لے جاتے ہیں جو صدر بش کے الفاظ میں ''انتہا پسند اسلام سے جنگ کر رہے ہیں''۔

دہشت گردی کی جنگ میں پسپائی سے لڑکھڑاتے ہوئے ریاستہائے متحدہ نے مکمل مایوسی میں اپنی تمام امیدیں عراقی شورش پر مرکوز کر دیں کہ کسی طرح شیعوں اور سنیوں کے درمیان مکمل خانہ جنگی کی صورت بن جائے اور اس طرح ریاستہائے متحدہ شیعوں اور کردوں کا سنی مزاحمت کاروں کے خلاف محافظ بن جائے۔ ۲۰ رفروری کو سمارا کی شیعہ زیارت گاہ پر شرمناک بمباری پر فوراً ہی ایرانی قائد خامنہ ای اور حزب اللہ کے قائد حسن نصیر نے ریاست ہائے متحدہ کی طرف سے عراق میں خانہ جنگی شروع کروانے کی گھناؤنی سازش قرار دے کر مذمت کی۔ اس طرح یہ امید نہ صرف خاک میں مل گئی کیونکہ مزاحمت پورے زور شور سے جاری ہے اور خانہ جنگی کی صورتحال بننے کے کوئی آثار نہیں ہیں، بلکہ شیعوں اور متسلط افواج کے درمیان مفاہمت کی کہانی اس وقت ایک دھماکہ سے پھٹ گئی جب بصرہ میں نصف درجن برطانوی ٹینکوں نے ایک عراقی قید خانہ منہدم کر کے دو برطانوی قیدیوں کو چھڑایا جو عرب بھیس میں گھومتے ہوئے پکڑے گئے اور اس کے متعلق سوال پر گولیاں چلا کر ایک پولیس والے کو ہلاک اور ایک کو زخمی کر دیا تھا۔عراقی خودمختاری اور سیاسی سالمیت کی اسی مجرمانہ خلاف ورزی پر بصرہ کے عراقی مشتعل ہو گئے اور برطانوی فوج کے خلاف بہت بڑا مظاہرہ کیا اور ان پر حملہ کر کے زخمی بھی کیا ساتھ ہی ان کی فوری واپسی کا مطالبہ کیا۔مظاہرین نے دو ٹینکوں پر پٹرول بموں سے حملہ کر کے دو ٹینکوں کو تباہ کیا اور جب ان سے نکل کر جلتے ہوئے فوجی بھاگ رہے تھے تو ان پر پتھراؤ کیا۔

۲۲ر ستمبر ۲۰۰۵ء کو اپنی رپورٹ میں رائٹرز نے بصرہ کونسل کا ذکر کیا جس نے برطانوی فوجوں سے تعاون نہ کرنے کا عہد کیا اگر انھوں نے واقعہ پر معافی نہ مانگی، یا مستقبل میں ایسا نہ ہونے کا ذمہ نہ لیا اور نقصانات کی تلافی نہ کی۔ کونسل نے اپنے اہم نوٹ کے ان دور رس فیصلوں میں جو متسلط افواج کی موجودگی کے شدید مخالف تھے، صدر طالبانی اور وزیراعظم جعفری کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ شیعہ برادری اندر سے متسلط فوجوں کی مخالف تھی۔ جیسا کہ ۲۰ر ستمبر کو وزیراعظم جعفری کے مشیر حیدر العبادی نے ان سانحوں کے لیے برطانوی افواج کی مذمت کی اور متنبہ کیا کہ یہ عمل غیر ملکی فوجوں کے خلاف مخالفت پیدا کر سکتا ہے۔ اگلے ہی دن امریکی سیکرٹری خارجہ رمزفیلڈ نے اپنے تکبر میں العبادی کی تحقیر کی اور عراق میں برطانوی فوجوں کے اعلیٰ کام کی تعریف کی۔ رائٹرز کی ستمبر ۲۴، ۲۵ کی رپورٹ کے مطابق ایک عراقی جج نے قید خانہ پر حملہ کرنے والے اور غیر لائسنس یافتہ اسلحہ سے گولیاں چلا کر پولیس والوں کو ہلاک اور زخمی کرنے والے برطانوی فوجیوں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کیے۔ برطانوی سیکرٹری دفاع John Ried نے اس پورے معاملہ کو یہ کہہ کر ہوا میں اڑا دیا کہ وزارت دفاع کو کوئی معلومات نہیں اور بہرحال اس وارنٹ کا کوئی قانونی اثر نہیں ہوگا کیونکہ ان کے مطابق برطانوی فوجی عراقی قانونی عمل سے مستثنیٰ ہیں، وہ برطانیہ کے شہری ہیں، عراقی عوام اور حکومت کے لیے اس سے زیادہ توہین آمیز اور کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ یہ ہے وہ طرزِ عمل کہ کس طرح امریکی زیر قیادت متسلط فوجوں نے عراق میں عراقی خودمختاری کے خیال خام کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔

بہرحال حالیہ اخباری رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ مقتدیٰ الصدر نے الٹی چھلانگ لگائی ہے اور امریکہ حمایتی اتحاد میں شامل ہونے پر راضی ہو گئے ہیں جبکہ عراق ابھی تک امریکی قبضہ میں ہے۔ یہ یقیناً بڑھتے ہوئے شیعہ سنی اتحاد کے لیے ایک دھچکا ہے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اعلیٰ سطح پر یہ اتحاد حسن نصر کے غیر متزلزل عزم اور احمدی نژاد کے منظر پر ابھرنے کی وجہ سے بے اثر ہو گیا ہے۔

افغانستان میں نومبر ۲۰۰۴ء کے صدارتی اور ستمبر ۲۰۰۲ء کے پارلیمانی انتخابات کے بعد سے شورش مسلسل بڑھ رہی ہے۔ افغانستان میں امریکیوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا اور ستمبر ۲۰۰۵ء تک ایک سو اسی (۱۸۰) افراد ہلاک ہوئے جو طالبان کے سقوط کے بعد سے کسی بھی سال کی کثیر ترین تعداد ہے۔ مزاحمت کاروں نے ستمبر ۲۰۰۵ء کے اواخر میں ایک ہیلی کاپٹر مار گرایا جس میں ۵/افراد ہلاک ہوئے۔ ۲۸/ستمبر کی رائٹرز کی رپورٹ ہے کہ ایک موٹر سائیکل پر سوار خودکش بمبار نے جو فوجی وردی میں تھا اپنی موٹر سائیکل افغان افسروں کے ایک قافلہ سے ٹکرا دی اور ان میں سے ۱۲ ہلاک اور ۲۹ زخمی ہو گئے۔ یہ پہلی دفعہ ہوا تھا کہ ایک ایسے محفوظ ترین علاقہ میں اس قدر کامیاب کارروائی کی گئی جس کی وجہ سے جاری شورش کا ایک نیا مہلک ترین پہلو سامنے آیا۔

طالبان نے کابل میں امریکہ کے قائم کردہ فوجی تربیت کے مرکز پر حملہ کی ذمہ داری بھی قبول کی۔ چند ہی دنوں بعد ایک امریکی اور ایک افغان فوجی قندھار میں ہلاک ہوا جبکہ چند زخمی ہوئے، یہ ۱۳/اکتوبر کی بات ہے کہ طالبان نے امریکی سیکرٹری دفاع رائس کی آمد پر کابل میں راکٹوں سے حملہ کیا۔

مزاحمت کے خلاف فوجی حملوں میں کثیر اضافہ کے باوجود شورش بڑھتی جا رہی ہے اور اب قابو سے باہر ہوتی نظر آتی ہے۔ ۲/دسمبر ۲۰۰۵ء کو فلوجہ کے قریب پہرہ دینے والے کم از کم دس مرین فوجی سڑک کے کنارے نصب بم پھٹنے سے ہلاک ہوئے اور ۱۱/زخمی۔ جس کے بعد ۳/دسمبر ۲۰۰۵ء تک ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد دو ہزار ایک سو بیس (۲۱۲۰) تک پہنچ گئی۔ یہ ایک دن میں ہونے والی ہلاکتوں کی سب سے بڑی تعداد تھی۔ امریکی کمانداروں کو خدشہ تھا کہ انتخابات کی گہما گہمی شروع ہونے پر تشدد مزید بڑھے گا۔ تقریباً ایک ہفتہ پہلے مزاحمت کاروں نے رمادی کے پورے شہر پر قبضہ کر لیا اور امریکی افواج کو اسے آزاد کرانا پڑا۔ یہ چوتھی دفعہ ہوا تھا کہ امریکی فوجوں نے رمادی کو آزاد کرایا۔ AFP کی رپورٹ میں ۶/دسمبر کو بتایا گیا کہ بے حد قلعہ بند پولیس اکیڈمی میں دہرے خودکش حملہ کے نتیجہ میں ۳۶ عراقی پولیس والے اور زیر تربیت افراد مارے

گئے۔

Seymour Hersh نے جس نے ابوغرائب میں تشدد کا انکشاف کیا تھا Robert Fisk کے مطابق عراقی ٹوپی سے ایک اور کالا خرگوش نکالا کہ امریکی کمانداروں کو یقین ہے کہ مزاحمت اب قابو سے باہر ہو چکی ہے۔ اگرچہ عراق میں ریاستہائے متحدہ کی افواج شکست کھانے ہی والی ہیں لیکن صدر بش ابھی تک مصر ہیں کہ مکمل فتح کے علاوہ کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ اس طرح وہ فقط امریکی عوام کے دکھ اور کرب میں اضافہ کر رہے ہیں۔

تل عفار میں عراق سے ۲۸ ستمبر ۲۰۰۵ء کی ایک اخباری رپورٹ میں بتایا گیا کہ ایک عراقی خاتون خودکش بمبار نے فوجی دفتر کے سامنے خودکش حملہ کر کے پندرہ افراد کو ہلاک اور تین کو زخمی کر دیا۔ اگلے ہی دن AFP کی خبر کے مطابق ۲۹ ستمبر ۲۰۰۵ء کو عراقی شہر بلد میں خودکش حملوں میں بچاسی افراد ہلاک اور ایک سو دس زخمی ہوئے۔

تعجب یہ ہے کہ ریاستہائے متحدہ میں عوامی مظاہروں اور جلوسوں میں اضافہ ہوا ہے۔ جن میں فوجوں کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ جنرل مائرز نے کچھ دن پہلے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ جنگ کے متعلق عوامی اور فوجی تصور میں فرق ہے۔ اور اس وجہ سے جنرل ابی زید اور ان کے کماندار عراق میں جنگ کی سیاسی حمایت ختم ہونے سے خوف زدہ ہیں جس کی وجہ سے موجودہ فوجی حکمت عملی کو نقصان پہنچ سکتا ہے لیکن جیسے جیسے زمینی حقائق ابھر کر سامنے آ رہے ہیں فوجی قیادت اب عراق اور افغانستان سے کسی قسم کی واپسی کو ضروری سمجھنے لگی ہے۔ ڈیوک یونیورسٹی میں سیاسیات کے پروفیسر Christopher Gelpin نے کہا کہ ایسے امریکیوں کا تناسب جو سمجھتے ہیں کہ امریکہ فتح یاب نہیں ہو سکتا، ایک فی صد سے بڑھ کر اکتالیس (۴۱) فی صد تک پہنچ گیا ہے۔ اسی مایوس کن صورتحال کی وجہ سے ۲۱ مارچ ۲۰۰۶ء کو عراق پر حملہ کرنے کے تین سال بعد صدر بش نے اعتراف کیا کہ ہو سکتا ہے کہ عراق سے فوجیں ان کے دور صدارت میں واپس نہ آ سکیں اور واپسی کا فیصلہ اگلے صدر کو کرنا پڑے۔ انھوں نے مایوسانہ کہا کہ آگے

مزید خوفناک لڑائیاں ہوسکتی ہیں۔

جنرل Casey نے جو اب عراق میں امریکی زیر قیادت فوجوں کی سربراہی کررہے ہیں فیصلہ کرلیا ہے کہ مزاحمت کے لیے خفیہ عراقی فوجیوں سے کام لیں لیکن یہ فیصلہ یوں درست نہیں معلوم ہوتا کہ صدر بش کے اعتراف کے مطابق جب رات بڑھتی ہے تو عراقی فوجی پگھل کر غائب ہوجاتے ہیں۔

جنرل کا منصوبہ یہ ہے کہ ہر عراقی پلٹن میں دس امریکی مشیر تعینات کیے جائیں جو عراقی فوجوں کی نگرانی کریں اور جب ضروری ہو تو امریکی فضائیہ کو عراقی افواج کی مدد کے لیے بلائیں۔ ہر عراقی بریگیڈ میں دس امریکی مشیر مقرر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر پچاس سے زیادہ بھی عراقی بریگیڈ ہیں تو پانچ سو کے قریب امریکی زیر قیادت فوجی استعمال ہوں گے تو پھر بقیہ ڈیڑھ لاکھ فوج کیا کرے گی جن کی تعداد میں پینٹا گون مزید اضافہ کرنے والا ہے۔ اگر جنرل Casey کا منصوبہ روبہ عمل آتا ہے تو یہ فوج یا تو واپس بھیج دی جائے گی یا عراق میں نو تعمیر شدہ امریکی اڈوں میں مقیم رہے گی۔ افسوس کہ امریکی فوجی قیادت کو اس بات کا ادراک دیر سے ہوا کہ امریکی موجودگی کے خلاف عراقیوں میں غصہ اس قدر شدید ہے کہ جنگ عظیم دوم کی طرز پر قبضہ اب ممکن نہیں رہا۔

صدر بش کو عراق میں ہلاک ہونے والے ایک سپاہی کی ماں Cindy Sheehan کے ابھارے ہوئے جنگ مخالف مظاہروں کا بھی سامنا ہے۔ اس نے ٹیکساس میں صدر بش کے فارم کے سامنے کیمپ لگا لیا ہے اور اس کی بار بار درخواست کے باوجود صدر بش نے اس سے ملاقات نہیں کی بلکہ اسے گرفتار بھی کیا گیا۔ ڈان کے نمائندہ نے واشنگٹن سے ۲۲ اگست ۲۰۰۵ء کو اپنی رپورٹ میں بتایا کہ صدر بش نے اپنی عراقی جنگ کی ڈوبتی ہوئی حمایت کو سنبھالنے کے لیے چھٹیوں میں تین دن کا وقفہ کیا۔ Capital Hill سے کانگریس کے اندر طاقتور عناصر کی طرف سے عراقی جنگ میں پسپائی پر تشویش کا اظہار سنائی دینے لگا۔ دہشت گردی کی جنگ میں ان فوجی اور سیاسی

پسپائیوں کے ساتھ جو عنصر حقیقتاً فیصلہ کن ہوگا وہ یہ ہے کہ ریاستہائے متحدہ وہ اعلیٰ اخلاقی جواز کھو رہا ہے جو اسے انسانی اقدار اور عالمی تہذیب کو بچانے کے نام پر حاصل تھا۔

ایک نئی انجمن PSA (Partnership for Safe America) جو پرانے قانون سازوں اور اعلیٰ قومی تحفظ کے افسروں پر مشتمل ہے جن میں نصف درجن وزرائے دفاع اور قومی سلامتی کے مشیر شامل ہیں صدر بش کی انتظامیہ کو غلطی پر پاتی ہے۔ اس انجمن نے زور دے کر کہا ہے کہ دہشت گردی ایک سیاسی عمل ہے جس کا جواب بھی سیاسی ہونا چاہیے جس میں مسلم دنیا کی شکایات دور کرنا شامل ہے جس پر امریکی انتظامیہ غور کرنا نہیں چاہتی۔ NAF (New American Foundation) کے فیلو Nir Rosen جو نیویارکر کے لیے لکھتے ہیں اور جن کی تحریریں وسیع طور پر پڑھی اور پسند کی جاتی ہیں نے کہا ہے کہ مسلمان ہماری اقدار سے نہیں بلکہ ہمارے عمل سے نفرت کرتے ہیں۔ فلوجہ میں اپنے تجربات کی روشنی میں Rosen مزید کہتا ہے کہ امریکی سامراج پر حملے اسی وقت رکیں گے جب وہ کمزوروں پر جبر اور جابروں کی مدد ترک کر دے گا۔ Nir نے مزید کہا کہ مسلمان دہشت گردوں کی امریکہ کے خلاف تحریک کوئی راز نہیں اور بار بار بتایا جا چکا ہے کہ فسلطین، عراق، افغانستان، چیچنیا اور گوانتانامو میں ڈھائے جانے والے مظالم اور بدکردار جابر حکومتوں کے لیے امریکی حمایت ہی وہ محرک ہیں۔ اس لیے اس کا خیال ہے کہ عراق سے امریکی اور فلسطین سے اسرائیلی واپسی دہشت گردی سے جنگ کا بہتر طریقہ ہوسکتا ہے۔

جو بات Partnership اور Foundation اب کہہ رہے ہیں اسامہ کو حق بجانب ثابت کرتی ہے جس کو CIA کے ایک اہل کار اور Jame's Digest of Intelligence نے باعزت اور منکسر المزاج آدمی قرار دیا ہے جو دہشت گرد ہرگز نہیں ہے۔

اسی طرح شکاگو کے ایک ماہر سیاسیات جس نے اپنی حالیہ کتاب Dying to

Win The Strategic Logic of Suicide Terrorism میں زور دے کر کہا ہے کہ دہشت گردی جنوب کی طرف بڑھ رہی ہے اور جب تک واشنگٹن اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ خلیج میں اس کی موجودگی القاعدہ کے لیے بھرتی کا بہترین اوزار ہے، ایسا ہوتا رہے گا ۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے ماہر Stephen Walt نے اپنی کتاب Taming American Power: The Global Response to U.S.Primacy میں اعلان کیا ہے کہ ریاستہائے متحدہ trigger happy نظر آتا ہے اور اسامہ کا یہ الزام کہ امریکہ ساری دنیا پر تسلط چاہتا ہے درست معلوم ہوتا ہے۔ یہ عالمانہ اور اعلیٰ تحقیقی انکشافات نہ صرف صدر بش کے ان الزامات کو ختم کر دیتے ہیں کہ اسلامی انتہا پسند اس لیے دہشت گردی کر رہے ہیں کہ وہ امریکی آزادی اور خوشحالی سے نفرت کرتے ہیں۔ ان انکشافات نے بش کی اس دلیل کے غبارے سے بھی ہوا نکال دی ہے کہ اس وقت واپسی امریکی تحفظ کو خطرہ میں ڈال دے گی اور جب تک دہشت گردوں کا جال مکمل طور پر تباہ نہیں ہو جاتا دنیا میں کہیں امن نہیں ہوگا۔

Francis Fukuyama نے جس نے جمہوریت میں تاریخ کا انجام دیکھا شاید عراق میں امریکی ناکامی سے سبق لیتے ہوئے امریکی نظریۂ یک طرفیت اور پیش بندی سے بالکل الٹ امریکی خارجہ پالیسی کی وکالت کی ہے جو کہ امریکی طاقت کی حدود سے زیادہ باخبر ہو، فوج پر انحصار کم رکھے اور دوسرے ملکوں کے مفادات اور خیالات اور ابھرتے ہوئے عالمی طرز عمل اور اداروں کا احترام ملحوظ رکھے۔

لیکن بش انتظامیہ سمجھداری پر مبنی ان تمام مشوروں پر کان دھرنے کو تیار نہیں اور اس کے بالکل مخالف ایک چوالیس (۴۴) صفحات پر مبنی امریکی قومی تحفظ کی حکمت عملی پر مبنی دستاویز میں ۱۶/مارچ ۲۰۰۶ء کو متکبرانہ انداز میں امریکی پیش بند فوجی حملوں کے نظریہ کا اعادہ کیا ہے۔ مزید برآں جوہری ہتھیاروں پر انحصار کو مزید ترقی دی ہے۔

اس لیے خواتین وحضرات آیئے آخر میں ہم سب امریکیوں سے متعلق غلط فہمیوں

کو مناسب طریقہ سے دفن کر دیں۔ یہ غلط فہمی کہ یہ ایک معاشی جن ہے اور کوئی ملک اس
کا مقابلہ نہیں کر سکتا کیونکہ ۲۰۰۵ء کے دس ماہ میں ہی صرف چین سے اس کا تجارتی
خسارہ سو بلین ڈالر ہو چکا ہے اور بش کو ہاتھ جوڑے ہوئے اس ملک جا کر چینی سکہ کی
قدر دوبارہ مقرر کرنے کی استدعا کرنی پڑی تھی یا نہیں۔ ساتھ ہی کیا ایسا نہیں کہ سینتیس
(۳۷) بلین امریکی یعنی کل آبادی کا 12.7 فی صد غربت کے خط سے نیچے زندگی گزار
رہے ہیں جو کسی بھی ترقی یافتہ ملک سے زیادہ ہے۔ ۱۸ مارچ ۲۰۰۶ء کو لندن کے The
Economist نے بتایا کہ امریکی Current Account کا خسارہ سالانہ ایک
ٹریلین ڈالر کی حد کو چھونے کے قریب ہے' درآمدوں پر انحصار نے یورو کے مقابل
امریکی ڈالر کو اٹھائیس فی صدر کمزور کر دیا ہے۔ امریکی اداروں کی طرف سے خالص غیر
ملکی سرمایہ کاری دو سال پہلے کے دو سو پچیس بلین ڈالر سے گھٹ کر اکیس (۲۱) بلین رہ
گئی ہے اور کئی ملکوں میں ڈالر کے بجائے یورو میں اپنے ذخائر رکھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے
یہ غلط فہمی بھی کہ ریاستہائے متحدہ جدید تہذیب کا اعلیٰ ترین نمائندہ ہے کیونکہ مائی لائی،
گوانتانامو، ابوغرائب میں برپا کی گئی بربریت نے دوسرا رخ دکھا دیا جو ہن قوم، گوتھ قوم
اور منگولوں کو بہیں پیچھے چھوڑ گئی۔ یہ غلط فہمی کہ امریکہ انسانیت کو بچانے کے لیے دہشت
گردی کی جنگ لڑ رہا ہے جب کہ اس کے برعکس اس کی یہ حکمت عملی دہشت گردی کے
خلاف مزید دہشت گردیوں کو سلگا رہی ہے۔ اور پھر سب سے بڑی یہ غلط فہمی کہ اسلام
قرون وسطیٰ کے ماضی کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے اور نئے دور کے چیلنجوں کا مقابلہ نہیں
کر سکا اس لیے ناکامی سے نکالنے کے لیے اس کو جدید بنانا ضروری ہے۔ کیونکہ کیا ایسا
نہیں ہے کہ چار سالوں سے عراق اور افغانستان میں جاری جہادیوں کی کارروائیاں بغیر
کسی ریاستی امداد یا طاقت کے اب تک شکست نہیں کھا سکیں جبکہ ان کا مقابلہ دنیا کی
طاقتور ترین افواج کے مجموعہ سے ہے اور دور جدید کی سانس روک دینے والی فوجی
طاقت اور غیر فوجی اختیار سے جذبۂ شہادت کہیں زیادہ دہشت ناک اور فیصلہ کن ثابت

ہوا ہے۔ اور آخر میں کیا یہ معجزاتی حقیقت نہیں کہ کٹھ پتلیوں کے سوا پوری اسلامی دنیا نے اپنے خلاف امریکی قیادت اور پشت پناہی میں یا اسی آشیرباد کی حامل کارروائیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی بھی قربانی کو بڑا نہیں سمجھا۔

جب ان تمام غلط فہمیوں کے بھوت دفن ہو جائیں گے تو حقیقت کا ققنس بھوتوں کے مدفن سے ابھر کر یہ پیغام دے گا کہ اسلام کی تجدید کے بجائے یہ خود جدیدیت اس امر کی محتاج ہے کہ جسے اسلامی بنانا ضروری ہے۔

اس کتاب کے مصنف (محترم اسرار الحق صاحب) کا موقف ہے کہ گیارہ ستمبر (9/11) کے واقعہ کے بارے میں قائم کردہ امریکی کمیشن نے اندھا دھند جانب داری سے کام لیتے ہوئے ''اسلامی دہشت گردی'' کے اپنے اختراع کردہ تصور کے تحت دہشت گردی کے ان حملوں کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا ہے۔ ان کے نزدیک یہ حملے مغرب کے لیے ایک واضح دھمکی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امریکہ کے اس پروپیگنڈے سے متاثر امریکی باشندوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی شخصیات' بعض مغربی دانشوراں اور مغرب کے ذرائع ابلاغ نے پوری دنیا میں اسلام کے پیروں کاروں کے اذہان میں بھی شکوک وشبہات کے کانٹے بو دیے ہیں۔ اس صورتحال نے مسلمانوں کو اسلام کے خلاف مسلط کردہ اس جنگ کے لیے بھی متفکر و پریشان کر رکھا ہے۔ اسی طرح مغرب ان حالات کے تناظر میں اقبال جرم سے انحراف کرتے ہوئے بلا توقف اس بات سے دستبردار ہو گیا ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ میں جمہوری روایات کے مطابق سیاسی صورتحال کو فروغ دے گا' اور اس بات سے بھی کہ قانون کی حکمرانی کے اصول کو تسلیم کیا جائے گا اور اس کے ساتھ اس سے بھی کہ آزاد طرزِ معیشت کے پروان چڑھنے کی فضا پیدا کی جائے گی۔ اس پس منظر میں بحر ہند میں سونامی کی تباہ کاریوں اور پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں زلزلہ کی مصیبت میں گرفتار مسلمانوں کے زخموں کے اندمال کے لیے انسانی ہمدردی کا جذبہ عین وقت پر بڑی شدت سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن مسلمانوں میں پائی جانے والی اس تشویش ناک رائے عامہ کی ہمواری کے لیے مغربی دنیا کو مسلم ممالک کے لیے اپنائی گئی اپنی حکمت عملیوں کو جنہیں مسلمان اپنے لیے غیر منصفانہ اور معاندانہ خیال کرتے ہیں' ایسی داخلیوں پالیسیوں اور حقیقی انسانی قدروں کے تعین کا اساسی محرک بنانا ہوگا۔

آغا شاہی
سابق وزیر خارجہ پاکستان

نستعلیق
فضلی بک سپر مارکیٹ
اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 021-32212991, 32633887

Designed by: Naveed Ahmed 0321 8401998